زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

جلد-۴
شمارہ -۱۵-۱۶

جنوری تا دسمبر ۲۰۲۰ء

مدیر اعزازی
اقبال حسن آزاد

مدیر
ثالث آفاق صالح

سر ورق ......محمد نعیم یاد (پاکستان)

رابطہ: شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر-۸۱۱۲۰۱

Mob.+91 9430667003 whatsapp No. +91 8210498674
email.eqbalhasan35@yahoo.com
eqbalazad55@gamil.com
www.salismagazine.in

• پرنٹر، پبلیشر، پروپرائٹر ایڈیٹر ثالث آفاق صالح نے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے چھپوا کر شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ مونگیر ۸۱۱۲۰۱ سے شائع کیا۔
• 'ثالث' کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ثـــالـــث
شمارہ نمبر ۱۶.۱۵

اس شمارے کی قیمت۔	:	۵۰۰ روپے (مع ڈاک خرچ)............
قیمت عام شمارہ	:	۱۷۵ (۲۰۰ روپے مع ڈاک خرچ)
سالانہ	:	۸۰۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۰۰۰ روپئے)............
خصوصی تعاون	:	پندرہ ہزار روپئے یا ۳۰۰ امریکی ڈالر............

'ثالث' غیر ممالک میں

'ثالث' کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں زر تعاون کی ذیل میں صراحت کر رہے ہیں۔

امریکہ	:	اسی (۸۰) امریکی ڈالر
کناڈا	:	نوے (۹۰) کناڈا ڈالر
آسٹریلیا	:	ساٹھ (۶۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	:	ساٹھ (۶۰) برطانوی پاؤنڈ
یو۔اے۔ای	:	ایک سوستر (۱۷۰) یو۔اے۔ای درہم
عمان	:	تیس (۳۰) عمانی ریال
سعودی عرب	:	ایک سو ساٹھ (۱۶۰) ریال
قطر	:	دوسودس (۲۱۰) ریال
کویت	:	چالیس (۴۰) کویتی دینار
پاکستان	:	دو ہزار چھ سو (۲۶۰۰) پاکستانی روپے

جن ممالک میں WesternUnion یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے مدیر اعلیٰ کے پتے پر رقم بھیجی جاسکتی ہے۔
TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای۔میل پتہ پر بھیجی جاسکتی ہیں۔

eqbalhasan35@yahoo.com, eqbalazad55@gmail.com

سالانہ ممبر شپ کے لئے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Eqbal Hasan Azad
Allahabad Bank Jamalpur Branch
A/c No. 20962191966
IFSC Code-ALLA0210009

فہرست

اداریہ	عالمی خواتین نمبر	اقبال حسن آزاد	۷
مہمان اداریہ	اردو کا نسائی ادب......ایک جائزہ	ڈاکٹر افشاں ملک	۱۰
	حمد	شمسہ نجم	۲۰
	نعت	فوزیہ اختر ردا	۲۱
نظم	نوجوان خواتین سے	اسرار الحق مجاز	۲۲
غزلیں	دیا جیم، حیا غزل، رضیہ حیدر خان، فرحین چودھری، انجم عثمانی، سلمٰی حجاب		۲۳_۲۸
نظمیں	نسیم سید ، شاہین کاظمی ، سدرہ سحر عمران ، سلمٰی حجاب		۲۹_۳۶
ہندی نظم	رشمی بھاردواج / ترجمہ اسرار گاندھی		۳۷
انٹرویو	سدرہ سحر عمران / رومارضوی	ادارہ	۳۸
خصوصی	پالولر فکشن کے حوالے سے اکیسویں صدی کے	نورالعین ساحرہ	۴۳
مضمون	ادبی رجحانات وتضادات		
تانیثیت	تانیثیت......ایک نظریہ	نسترن احسن فتیحی	۶۱
	تانیثیت کیا ہے؟	مشتاق احمد نوری	۶۹
	عورت اور معاشرہ	شموئل احمد	۷۲
	اردو ادب میں تانیثیت	ریاض احمد	۷۵
مضامین	بولیں اماں محمد علی کی	شکور پٹھان	۸۱
	نوشابہ خاتون کی افسانہ نگاری، ''خلیج'' کی روشنی میں	ڈاکٹر منظر اعجاز	۸۵
	قرۃ العین حیدر اور ''آگ کا دریا''	ڈاکٹر اقبال حسن آزاد	۹۶
	قرۃ العین حیدر تہذیب وتاریخ کی داستان	ڈاکٹر سید احمد قادری	۱۰۸
	شبلی اور عطیہ فیضی	ڈاکٹر محمد جعفر احراری	۱۱۵

طنز ومزاح کی تاریخ میں خواتین قلم کاروں کی خدمات	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۱۱۹
موضوع اور مواد	ڈاکٹر ممتحنہ اختر	۱۳۷
خدیجہ مستور کا افسانہ ''محاذ سے دور'' ایک جائزہ	ڈاکٹر عرش کاشمیری	۱۴۵
بانو قدسیہ اور معاصر خواتین افسانہ نگار	ڈاکٹر مہناز کوثر	۱۵۲
ظفر کمالی کے تحقیقی تبصرے	ڈاکٹر افشاں بانو	۱۶۰
جاں نثار کے ''گھر آنگن'' کی عورتیں	ڈاکٹر ارشد جمیل	۱۶۵
زاہدہ زیدی کی شاعری کے چند امتیازی پہلو	ڈاکٹر نکہت پروین	۱۶۹
شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر قسیم اختر	۱۷۶
ڈاکٹر افشاں ملک کا افسانہ ''سمندر جہاز اور میں''	ڈاکٹر ریاض توحیدی	۱۸۱
''چوتھی کا جوڑا'' اور غریب طبقے کی عکاسی	ڈاکٹر توصیف مجید لون	۱۸۶
تنہائیوں، حیرانیوں کی ترجمان حمیرا رحمٰن	ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی	۱۹۲
کشمیری اردو ناولوں میں جنسی استحصال کی عکاسی	ڈاکٹر محمد سلیمان	۱۹۵
ادا جعفری کی ابتدائی دس غزلوں کا عروضی جائزہ	شبیر احمد ڈار	۲۰۲
پروین شیر......ایک نئی نسائی آواز	حارث حمزہ لون	۲۰۸
متن کی قرأت کے عناصر	عاتکہ ماہین	۲۱۶
پروین شاکر کی غزلیہ شاعری......ایک جائزہ	محمد ریحان	۲۲۱
مولانا آزاد اور مسلمان عورت	صدف اقبال	۲۲۶
خواتین کے افسانوں میں احتجاجی صدائیں	شاذیہ تمکین	۲۳۰
ترنم ریاض کی تخیلاتی تکثیریت	رافد اویس بھٹ	۲۴۳
کینوس کے رنگوں میں امر ہونے والی امرتا شیر گل	محمد نعیم یاد	۲۵۴
سکوت سے گویائی تک......اردو شاعرات کا سفر	اسماء شکیل	۲۵۸
بیدی کے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات	فرزانہ	۲۶۲
ترنم ریاض......ایک حقیقت پسند افسانہ نگار	عرفان رشید	۲۶۸
قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' ایک مطالعہ	جاوید احمد شاہ	۲۷۴
ذکیہ مشہدی کی افسانوی جہت	ریحانہ بشیر	۲۸۴

	عصمت چغتائی کی فلمی دنیا	شبیر احمد لون	۲۹۴
	معاصر اردو افسانوں میں خواتین کے مسائل	شافعہ بانو	۲۹۷
	ممتاز شیریں کی افسانوی کائنات	عروسہ فاروق	۳۰۱
منتخب افسانہ	خالی جھولی	نجمہ محمود	۳۰۷
افسانے	خلا	نیلم احمد بشیر	۳۱۰
	یہ عجیب عورتیں	نسترن احسن فتیحی	۳۲۱
	بوڑھی پڑوسن کا موبائل	ڈاکٹر صادقہ نواب سحر	۳۲۸
	دو نیناں	رینو بہل	۳۳۵
	گنگا بہتی کیوں ہو؟	انجم قدوائی	۳۴۴
	فاتح عالم	قمر جمالی	۳۴۷
	محبوبہ	ثمینہ سید	۳۵۲
	بے بی اماں	فریدہ انصاری	۳۵۸
	رشتوں کی دیمک	سلمیٰ جیلانی	۳۶۴
	سیلمون فش	سیمیں علی	۳۷۰
	پیار، پیاز اور پیلا ربن	شاہین کاظمی	۳۷۶
	آدھی خودکشی	فارحہ ارشد	۳۸۱
	زرمینے	ہما فلک	۳۸۷
	طوائف کہانی	مونا شہزاد	۳۹۳
	ادھوری عورت	گل ارباب	۳۹۹
	اعتراف	قرۃ العین حیدر راٹھور	۴۰۵
	انجام	فرحین جمال	۴۲۳
	پانچویں بوتل	صائمہ نفیس	۴۲۹
	پکھیرو	نوشابہ خاتون	۴۳۶
	آشواسن	سرفراز جہاں	۴۳۹

ثالث　　　شمارہ نمبر ۱۵.۱۶

	نیلا پردہ گلابی کناری	صفیہ شاہد	۴۴۳
	خصوصی اجازت نامہ	روبینہ فیصل	۴۴۸
	واپسی	نشاط پروین	۴۵۰
	شکستہ خواب	فرحین خالد	۴۵۳
	مایا	ناہید طاہر	۴۵۸
	زرد خواب	صوفیہ کاشف	۴۶۳
	گڑیا میلی ہو جائے گی	صبیحہ تزئین	۴۶۵
	قلاش	فرزانہ روحی اسلم	۴۶۸
	زخمی پرندہ	شوبی زہرا نقوی	۴۷۱
	دو بوری عزت	ابصار فاطمہ	۴۷۵
	بیم و رجا	فاطمہ عثمان زاہد	۴۷۹
خط	ایک خط علی گڑھ سے......	ڈاکٹر فریحہ ظفر	۴۸۱
تبصرے	جنگل کی آواز/ نجمہ محمود	سلمیٰ حجاب	۴۸۵
	روح دیکھی ہے کبھی/ ہما فلک	اقبال حسن آزاد	۴۸۷
	رعنائیاں درد کی/ عثمانہ اختر جمال	ڈاکٹر ایم اے جوہر	۴۸۹
مکتوبات	رینو بہل، ڈاکٹر ریاض توحیدی، عشرت ظہیر، عزہ معین، سلیم انصاری، وسیم احمد فدا، سریش کمار		۴۹۱ـ۴۹۶

﴿ثالث ملنے کے پتے﴾

☆ ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر +91 8210498674

☆ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ (بہار) +91 9304888739

● **اداریہ**

● **اقبال حسن آزاد**

عالمی خواتین نمبر

۲۰۲۰ء کا سال دنیا کی تواریخ میں عالمی وبا کورونا کی وجہ سے یادرکھا جائے گا۔ یہ وہ منحوس سال ہے جس میں بے شمار لوگ بھوک اور بیماری سے لقمۂ اجل بن گئے اور لاتعداد اس موذی وبا کے شکار ہوئے۔ایک طویل مدت تک لوگ اپنے گھروں میں محصور رہے۔ تعلیمی، مذہبی اور تجارتی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔سیاسی اور سماجی طور پر بھی یہ سال بہت اتھل پتھل کا رہا۔ایک عام انسان بے یقینی، بے اعتمادی اور شک کے گھیرے میں رہا۔اس دوران ہمارے بہت ہی اہم لکھنے والے اور دانشور بھی ہم سے جدا ہو گئے۔اللہ تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین! یہ ساری باتیں اپنی جگہ لیکن انسان کو ایک خوبی اللہ تعالیٰ نے دی ہے......وہ پریشانیوں، مصیبتوں اور آفتوں سے بچ کر نکلنا جانتا ہے۔راقم الحروف کا ایک شعر ہے:

مرے رستے جب کوئی بھی اُلجھن سر اُٹھاتی ہے   میں اپنی زندگی کا رخ وہیں سے موڑ دیتا ہوں

اسکول کالج بند ہوئے تو آن لائن تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔مشاعرے بھی آن لائن ہونے لگے اور سیمینار کی جگہ ویبنیار نے لے لی۔لیکن یہ سب وقتی حل ہیں۔زندگی کا اصل لطف تو تب آئے گا جب کورونا پوری طرح ختم ہو جائے گا اور زندگی پوری طرح معمول پر آجائے گی۔

اس پُر آشوب دور میں ایک بات قابلِ اطمینان رہی کہ اردو کتب ورسائل کی اشاعت بدستور جاری ہے۔اوروں کو دیکھ کر میرے دل میں بھی حوصلہ پیدا ہوا اور میں نے بھی ''ثالث'' کا تازہ شمارہ نکالنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا۔اول اول ۲۲۴ صفحات کا عام شمارہ نکالنے کا خیال تھا اور اسی حساب سے تیاری شروع کی۔جیسا کہ قارئین کو علم ہے ''ثالث'' کے ہر شمارے میں کسی ادبی شخصیت پر گوشہ نکالا جاتا ہے۔کبھی کسی مرحوم شاعر یا افسانہ نگار/ناول نگار پر اور کبھی کسی باحیات قلمکار پر مگر صاحبِ گوشہ سے اس کے لیے کبھی کوئی مالی معاونت طلب نہیں کی گئی۔خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اب تک مجھے دریوزہ گری سے محفوظ رکھا ہے۔بہر کیف! اس شمارے کے لیے ایسی کوئی مناسب شخصیت نہیں مل رہی تھی جس کے تعلق سے خاطر خواہ مواد حاصل

ہوسکتا۔خیر! جب رسالے کا اعلان ہوا تو بڑی تعداد میں خواتین قلم کاروں کی تخلیقات موصول ہونے لگیں۔یہ دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نہ اس دفعہ خواتین پر گوشہ نکال دیا جائے لیکن جب رسالے کی ترتیب شروع کی گئی تو اندازہ ہوا کہ خواتین کا پلڑا کچھ زیادہ ہی بھاری ہوگیا ہے،لہٰذا پہلے یہ ''خواتین نمبر'' ہوا پھر ''عالمی خواتین نمبر'' میں تبدیل ہوگیا۔اور اس کی ضخامت ۲۲۴ صفحات سے بڑھ کر ۴۹۶ صفحات ہوگئی اور اس طرح یہ ثالث شمارہ نمبر۔۱۵۔۱۶ کے مشترکہ شمارے کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔اس شمارے کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوگا کہ آجکل خواتین عالمی پیمانے پر کس طرح اردو زبان وادب کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔اس شمارے میں اگر ایک طرف خواتین کے ذریعہ لکھے گئے عالمانہ مضامین شامل ہیں تو دوسری جانب ان کے قلم سے نکلے ہوئے بہترین افسانے بھی ہیں۔ان افسانوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ آج کی عورت کیا سوچتی ہے؟ اس کی نظر میں دنیا اور سماج کی کون سی تصویر ہے؟ اس شمارے میں شامل افسانوں کے عنوانات دیکھ کر ہی آپ کو اس کا اندازہ ہو جائے گا۔''خالی جھولی''، ''خلا''، ''یہ عجیب عورتیں''، ''بوڑھی پڑوسن کا موبائل''، ''دو نیناں''، ''گنگا بہتی کیوں ہو؟''، ''فاتح عالم''، ''محبوبہ''، ''بے بی اماں''، ''رشتوں کی دیمک''، ''سیلمون فِش''، ''پیار، پیاز اور پیلا ربن''، ''آدھی خودکشی''، ''زر مینے''، ''طوائف کہانی''، ''ادھوری حقیقت''، ''اعتراف''، ''انجام''، ''پانچویں بوتل''، ''پکھیرو''، ''اشواسن''، ''نیلا پردہ گلابی کناری''، ''خصوصی اجازت''، ''واپسی''، ''شکستہ خواب''، ''زرد خواب''، ''مایا''، ''گڑیا میلی ہو جائے گی''، ''قلاش''، ''زخمی پرندہ''، ''دو بوری عزت''، ''بیم و رجا'' وغیرہ۔ان عنوانات میں جو درد ہے وہ دراصل آج کی عورت کے دل کا درد ہے۔

علامہ اقبال نے فرمایا ہے:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ   اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

عورت کیا ہے؟ عورت وہ ہے جس کے ساتھ رب اپنی محبت کو ملا رہا ہے۔رب وہ ذات ہے جسے کسی بھی چیز کی کمی نہیں ہے۔اُس ذات نے خود کی محبت کے بارے میں بتانا تھا کہ وہ انسان سے کتنی محبت کرتا ہے تو اُس نے ماں کا نام لیا کہ وہ ستّر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔جب کہ ماں ایک عورت ہے۔بیٹی کو اللہ نے اپنی رحمت قرار دے دیا جبکہ بیٹی بھی ایک عورت ہے۔عورت ہی وہ ہستی ہے جس کے قدموں تلے جنت رکھ دی گئی بس اسی بات سے ہی تو عورت کی شان کا اندازہ لگالیں۔جب وہ اُمید سے ہوتی ہے تو اپنی پسند کی سب چیزیں چھوڑ دیتی ہے اپنی اولاد کے لیے۔جب اولاد جنم دیتی ہے تو زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوتی ہے، پتہ ہی نہیں ہوتا کہ جیے گی یا مر جائے گی۔بائیس ہڈیاں بیک وقت ٹوٹنے کے جتنا درد سہتی ہے ایک بچے کو جنم دیتے وقت۔عورت کی سب سے بڑی خوبی کیا ہے؟ وہ بات بات پہ مرد کی طرح

مردانگی نہیں دکھاتی، وہ مرد پہ تھپڑوں کی بارش نہیں کرتی۔ وہ مرد کو اُس کی اولاد کے سامنے گندی گالیاں نہیں دیتی۔ وہ غیرت کے نام پہ مردوں کے قتل نہیں کرتی۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح کسی پہ جھپٹ کے اس کا ریپ نہیں کرتی۔ وہ مرد کو غُصے میں طلاق نہیں دیتی۔ وہ گلیوں بازاروں میں مرد پہ آوازیں نہیں کستی۔! ایک گھر میں روزانہ سب سے زیادہ بار جو نام لیا جاتا ہے وہ ایک ماں کا ہوتا ہے یا بڑی بہن کا اور یہ دونوں عورت ذات ہیں۔ ہمارے گھروں کا وجود عورتوں سے ہے۔ گھر مرد نہیں بساتے پُتر عورتیں بسایا کرتی ہیں۔ گھر کی رونقیں عورتوں کے ہی توسط سے ہوتی ہیں بیٹا۔ ہر چیز سلیقے سے ملتی ہے، کپڑے صاف ستھرے ملتے ہیں، برتن ڈھلے ڈھلائے ملتے ہیں، بہترین کھانے ہمیں نصیب ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال بخوبی سرانجام دی جاتی ہے۔ ریہ سارا جادو ایک عورت ہی چلاتی ہے ورنہ تو ایک سگا باپ بھی اپنے چھوٹے بچے کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتا۔ بچہ زیادہ روئے تو شوہر اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ اِسے کمرے سے باہر لے جاؤ میری نیند میں خلل پڑ رہا ہے۔ عورت بہت ہی پیاری چیز ہے۔ یہ مرد کے کردار پہ اُنگلیاں نہیں اُٹھاتی، یہ مرد کو اُس کے ماضی کے طعنے نہیں دیتی۔ عورت بیٹی ہے تو رب کی رحمت ہے۔ ماں ہے تو قدموں تلے جنت لیے پھرتی ہے۔

زیرِنظر شمارے میں خواتین کی تحریر کردہ حمد، نعت، غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں اور ان کا ایک الگ لطف ہے۔ دیگر تخلیقات کے علاوہ ایک طالبہ کا دلچسپ خط بھی آپ کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے گا۔

آخر میں میں اپنی شریک حیات محترمہ نشاط پروین کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے رسالے کی تیاری میں قدم قدم پر میری معاونت کی اور مجھے سکون کے ساتھ اپنا کام کرنے دیا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنے نوجوان دوست محمد نعیم یاد (خوشاب، پاکستان) کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اس شمارے کو خوبصورت سرورق سے مزیّن کیا۔

اس رسالے کی ویب سائٹ کو تادمِ تحریر ستاون ہزار دو سو چونتیس (۵۷۲۳۴) سے زیادہ بار وزٹ کیا جا چکا ہے۔ آپ بھی درج ذیل لنک پر جا کر اس کے گذشتہ شمارے نہ صرف مفت پڑھ سکتے ہیں بلکہ انہیں ڈاؤن لوڈ کر کے محفوظ بھی کر سکتے ہیں۔

www.salismagazine.in

www.facebook.com/salismag

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں آپ کی گرانقدر رائے کا انتظار رہے گا۔ (ادارہ)

◂◂ ● ▸▸

● مہمان اداریہ

● ڈاکٹر افشاں ملک

اردو کا نسائی ادب.....ایک مختصر جائزہ

کسی بھی ملک کے افراد کی تہذیبی و تمدنی صورت حال، علمی و ادبی کاوشیں، فنی خصوصیات اور سیاسی و سماجی کارناموں کی تاریخ خواتین کا تذکرہ کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی اور یہ تذکرہ بھی برائے نام نہیں خواتین کی صلاحیتوں کے اعتراف کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ کسی بھی عہد کا ادب ہو یا زبان اس کی ترقی میں خواتین کی حصہ داری چاہے براہ راست ہو یا بالواسطہ ناگزیر ہے۔ جب بات ہو نسائی ادب کی تو ہمیں ذرا پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آیا خواتین کا تخلیقی ادب کب اور کس طرح وجود میں آیا اور اس کی ابتدائی شکل کیا تھی؟

اب جب کہ عالمی سطح پر اس فکر کو تقویت مل چکی ہے کہ ''ادب'' کی قدیم شکل ''لوک ادب'' (folk literature) ہے تب یہ مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ''نسائی ادب'' کے ابتدائی خدوخال بھی لوک ادب میں صدیوں سے موجود تھے۔ لوک گیت، لوریاں، اور کہانی قصے سننے اور سنانے والی سخت گیر مرد معاشرے کی پروردہ سہمی ہوئی عورت، توہمات اور فرسودہ رسوم و روایات میں جکڑی ہوئی عورت، جاہل اور کم عقل ہونے کے طعنے سن سن کر خود کو واقعی جاہل سمجھ لینے والی غیر تعلیم یافتہ عورت اس وقت تخلیقی اظہار کی متحمل تو ہو ہی نہیں سکتی تھی، تشخص کی بحالی ہی اس کا پہلا مسئلہ تھا۔ لہٰذا زبانی اظہار و بیان ہی اس کے کیتھارسس کا وسیلہ بن سکتا تھا، یہی اس کا فن تھا اور یہی اس کا داخلی اظہار تھا۔ رفتہ رفتہ جب علم و تعلم کے دروازے عورتوں پر وا ہوئے اور ان کا رشتہ کاغذ قلم سے استوار ہوا انہیں تخلیقی اظہار کا سلیقہ بھی آ گیا۔ خواتین کی اس ابتدائی دور کی تخلیقات میں گھر آنگن کے معاملات اور ذاتی دکھ سکھ کے ساتھ ہی ہندوستانی تہذیب و تمدن کے رنگ بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان کی تخلیقات کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا، علاوہ ازیں سماجی نظریات اور صنفی امتیاز کی بنا پر مرد معاشرے میں نسائی ادب کی اہمیت سے بھی انکار کیا گیا۔ اس کے برعکس یہ حقیقت ہے کہ ''نسائی ادب'' کی صدیوں پر محیط ایک مکمل تاریخ ہے اور اس کی سماجی، لسانی، ادبی، تاریخی اور تہذیبی حیثیت مسلّم ہے۔

تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ برصغیر کے سماجی نظام میں ایک لمبے

عرصے تک ادبی افق پر خواتین کی تخلیقی حصے داری درج نہیں کی گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد معاشرہ عورت کی تخلیقی صلاحیتوں کا معترف ہی نہیں تھا۔ بالخصوص شعر گوئی تو عورت کے لیے معیوب ہی تصوّر کی جاتی تھی۔ لیکن مزے دار بات یہ ہے کہ خواتین نے ادب تخلیق کرنے کی ابتدا ہی شاعری سے کی، نثری تخلیقات کی طرف خواتین کا رجحان انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں ہوا اور بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں افسانہ نگار خواتین ادبی افق پر نظر آنے لگیں جب کہ اردو شاعری میں خواتین سترہویں صدی سے ہی نظر آتی ہیں۔

اردو ادب کی دنیا میں ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جب خواتین کی تخلیقات ادبی رسائل و جرائد میں شائع تو ہونے لگی تھیں لیکن ان کے اصل ناموں کے ساتھ نہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی حلقوں اور قارئین کے درمیان خواتین کی (بحیثیت تخلیق کار) کوئی ذاتی شناخت قائم نہ ہوسکی۔ ان کی پہچان صرف ''والدہ فلاں''، ''زوجہ فلاں''، ''بنت فلاں'' اور ''ہمشیرہ فلاں'' سے ہی بن سکی۔ وہ کیا لکھیں اور کیا نہ لکھیں اس کا فیصلہ بھی ان کے کفیلوں (جو بلاشبہ باپ بھائی شوہر اور بیٹے ہی تھے) نے ہی کیا۔ دراصل اس عہد میں خواتین کے داخلی جذبات کے اظہار کو برصغیر کا معاشرہ ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور خاندان کے وہ مرد جو اپنی عورتوں کی صلاحیتوں کے معترف بھی تھے ان کے داخلی جذبات کے اظہار سے شرمندگی محسوس کرتے تھے، خواہ اس کا اظہار ادب کے حوالے سے ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی تمام سماجی اور خاندانی بندشوں کے باوجود خواتین تخلیقی اظہار کرتی رہیں۔ لیکن ان کا تخلیقی سرمایہ اشاعت کے لیے مرد کی اجازت کا ہی محتاج رہا۔

خواتین کی تحریروں کے شائع نہ ہونے کی ایک اور وجہ جو مبنی بر حقیقت ہے، اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ مشہور محقق عینی زیدی نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''ان باؤنڈ'' (2,000 years of indian women's writing ''UN BOUND'') میں دو ہزار سال کی (کئی زبانوں کی) ہندوستانی خواتین کی تحریروں کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''انّیسویں صدی کے آخر تک تو لکھنا انہیں کے لیے تھا جن کے پاس پیسے ہونے کے سبب وقت تھا اور یہ عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں تھا۔'' عینی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''پہلے لکھنا اور اس کو محفوظ رکھنا یہ سب بہت مہنگا تھا، لیکن جیسے ہی اشاعت کے وسائل سامنے آئے، یہ یکسر بدل گیا۔ لکھنے اور اشاعت کے نئے مواقع پیدا ہو گئے۔''

عینی کے مذکورہ بیان کی روشنی میں اگر اردو ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس سچ سے ہمارا سامنا ہوتا ہی ہے کہ پچھلی صدیوں میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے ابتدائی دور کی جو تخلیق کار خواتین ادبی افق پر دکھائی دیتی ہیں وہ عام گھرانوں سے نہیں تھیں۔ یا تو یہ بادشاہوں، نوابوں، امراء اور رؤسا کی بیٹیاں اور بیگمات تھیں یا ان سب کا تعلق سماج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے اور علمی گھرانوں سے تھا۔ علاوہ ازیں

شاعری کے حوالے سے اگر دیکھیں تو متمول طوائفیں بھی اسی زمرے میں آتی ہیں۔ یعنی پیسہ اور وقت ہونے کے سبب ہی مخصوص طبقے کی خواتین تعلیم یافتہ بھی تھیں اور ادبی تخلیقی شعور بھی رکھتی تھیں۔ عام گھرانوں کی خواتین میں تخلیقی بیداری نہ ہونے کا اصل سبب ان کا غیر تعلیم یافتہ ہونا بھی تھا۔ ماضی قریب میں بھی امراء، نوابین اور اعلیٰ طبقے کے مسلم گھرانوں میں بہنوں بیٹیوں کی تعلیم کے لیے کئی علوم پر دسترس رکھنے والے اساتذہ مقرر کیے جانے کا رواج رہا ہے۔ یعنی اعلیٰ طبقے کے گھرانوں میں گھر پر ہی خواتین کی معیاری تعلیم کا نظم کیا جاتا تھا۔ لیکن یہاں بھی ایک بہت دلچسپ حقیقت سے ہمارا سامنا ہوتا ہے کہ ان خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کی آزادی تو دی جاتی تھی لیکن بحیثیت فنکار تخلیقی اظہار کی آزادی انہیں میسر نہیں تھی۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کی پہلی دوسری دہائی میں شاعری کے بام عروج پر پہنچنے والی جوانمرگ شاعرہ ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شروانیہ) کے والد کو ان کا غزلیں کہنا پسند نہیں تھا سو خود ان کا مرتب کردہ ''دیوان نزہت الخیال'' شائع ہونے سے پہلے ہی والد کے حکم پر ضائع دیا گیا۔ اسی ضمن میں چودھویں صدی کی کشمیری شاعرہ 'للیشوری عرف للد یدیا للاّ عارفہ'، سولہویں صدی کی کشمیری زبان کی مشہور شاعرہ 'حبّہ خاتون'، سولہویں صدی میں ہی راجستھان کی ہندی زبان کی شاعرہ 'میرا بائی'، سترھویں صدی میں مغل شہزادی زیب النساء مخفی وغیرہ وہ خواتین ہیں جن کو ادبی تخلیقی آسمان کی وہ کھلی فضا میسر نہ ہوسکی جس میں ان کا تخیل آزادانہ پرواز کرتا اور وہ خود مختارانہ انداز میں تخلیق فن کرتیں۔ زیب النساء مخفی کا اس کے عہد میں بطور شاعرہ نام لینا بھی ممکن نہ تھا۔ خود میر تقی میر جیسے بڑے شاعر تک نے اپنی بیٹی ''بیگم'' کا ذکر بطور شاعرہ کہیں نہیں کیا ہے جب کہ بعد کے تذکروں میں اس کا ذکر ہے اور کلام کے نمونے بھی دستیاب ہیں۔

وقت آگے بڑھا، معاشرہ بدلا، اقدار بدلیں، اصولوں اور روایتوں کی جکڑ ڈھیلی پڑی اور خواتین کی شناخت ان کے اصلی ناموں سے بننے لگی۔ شاعری، فکشن، مضمون نگاری، سفر نامہ نگاری، صحافت، تنقید اور تحقیق گویا ہر میدان میں خواتین نظر آنے لگیں۔ لیکن یہاں تک پہنچنے میں بڑا وقت لگا نیز یہ ماحول بھی ایک دم یا اچانک نہیں بنا۔ متوسط طبقے کی مسلم خواتین میں تعلیمی بیداری اور فکری شعور پیدا کرنے میں سرسید کی تہذیبی تحریک اور ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں کے ساتھ ہی اس عہد کے دانشوران ادب، مفکرین اور صحافی حضرات نے بہت اہم رول ادا کیا۔ ان عظیم شخصیات نے عام مسلم گھرانوں کی خواتین کے لیے اردو کے اخبار، رسائل اور جرائد نکالے۔ خواتین کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ مفکرین وقت اگر خواتین کی تعلیم اور اصلاح کے لیے اقدام نہ کرتے تو عام عورتوں کے لیے تحریر و تخلیق کی دنیا میں قدم رکھنے کا دورانیہ بڑھ بھی سکتا تھا۔

ہندوستان میں انیسویں صدی کا آخری دور اور بیسویں صدی کا اوائل عورتوں کے لیے کی گئی اصلاحی

کوششوں کا دور ہے۔شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی نے خواتین میں علمی وادبی ذوق پروان چڑھانے کے لیے اردو کا پہلا زنانہ ہفت روزہ اخبار ''تہذیب نسواں'' لاہور سے جاری کیا اور اس اخبار کی اولین مدیرہ اپنی اہلیہ 'محمدی بیگم' کو بنایا۔ یہ وہ وقت تھا جب پردہ داری کا عالم یہ تھا کہ خواتین کے ناموں تک کا پردہ رکھا جاتا تھا۔اخبار پر مدیرہ 'محمدی بیگم' کے نام کی جگہ یہ جملہ لکھا ہوتا تھا'' تہذیب نسواں جو ہر شنبہ کو ایک شریف بی بی کی ایڈیٹری میں لڑکیوں کے لیے شائع ہوتا ہے۔''اس کا پہلا شمارہ یکم جولائی ۱۸۹۸ء کو منظر عام پر آیا اور بہت جلد ہندوستان کے متوسط طبقے کے اردو داں مسلم گھرانوں میں مقبول ہو گیا۔اس اخبار کو جاری تو کر دیا گیا تھا لیکن اس وقت کے معاشرے میں جب خواتین کی تعلیم اور ان کی اصلاح کے لیے کی گئی کوششوں کو نہ صرف شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا بلکہ عام مسلم مرد حضرات ان کوششوں کو تاراج کرنے کے بھی درپے تھے اسے زندہ رکھنا بہت بڑا چیلنج تھا۔ان صبر آزما حالات میں لاکھ مخالفت کے باوجود مولوی سید ممتاز علی نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اخبار بند نہیں کیا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔اس اخبار کے حوالے سے قرۃ العین حیدر نے اپنی خود نوشت ''کارِ جہاں دراز ہے'' میں لکھا ہے کہ''.....اس (اخبار) کی وجہ سے معمولی تعلیم یافتہ پردہ نشیں خواتین میں تصنیف وتالیف کا شوق پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ناول لکھنے شروع کر دیے.....'' اس کے علاوہ خواتین کے لیے نکلنے والے اخبارات اور رسائل میں ''اخبار النساء'' دہلی،''شریف بیبیاں'' لاہور،''عصمت'' دہلی،''خاتون'' علی گڑھ اور''اُستانی'' دہلی وغیرہ وہ ادبی رسائل ہیں جنہوں نے متوسط مسلم طبقے کی خواتین کی اصلاح کے ساتھ ہی ان میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔

ذیل میں اب ایک نظر ان تخلیق کار خواتین پر بھی ڈال لی جائے جن کو اردو کی اولین شاعرہ ،اولین افسانہ نگار،اولین ناول نگار یا اولین تنقید نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔دراصل یہی وہ معتبر نقوش ہیں جن پر آگے چل کر نسائی ادب کی عمارت تعمیر ہوئی۔

محققین نے اردو شاعری کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ ''لطف النساء امتیاز'' کو قرار دیا ہے جبکہ اس سے پہلے بہت عرصے تک ''مہ لقاء بائی چندا'' کو پہلی صاحب دیوان شاعرہ مانا جاتا رہا ہے۔لطف النساء امتیاز کا دیوانِ شاعری ۱۷۹۶ میں مرتب ہو چکا تھا اور مہ لقاء بائی چندا کے دیوان کا سنہ ۱۷۹۸ء ہے۔مسلم دور حکومت کی شاعرات میں گلنار بیگم، گنا بیگم شوخ اور ملکہ زینت محل کا تذکرہ بعض مورخین اور تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ اردو کی تیسری اور اہم صاحب دیوان شاعرہ ''شاہجہاں بیگم شیریں'' ہیں۔اسی ابتدائی دور کی بہت اہم شاعرہ ز۔خ۔ش (زاہدہ خاتون شروانیہ، پیدائش ۱۸۹۴ بمقام علی گڑھ، وفات ۱۹۲۲ء) کو معتبر ناقد شان الحق حقی نے اپنے مضمون ''ز۔خ۔ش'' میں اردو کی پہلی ترقی پسند شاعرہ قرار دیا ہے۔پروفیسر قمر رئیس نے اپنے ایک

مضمون مشمولہ ''اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، مرتبہ قیصر جہاں، ۲۰۰۳ء'' میں ز۔خ۔ش کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''جدید اردو شاعری کے قافلے میں شامل ہونے والی وہ پہلی ذہین اور ممتاز شاعرہ تھیں۔'' دراصل ابتدائی دور کی شاعرات کے یہاں شعری اظہار روایتی انداز کا ہے، یہاں تک کہ ان شاعرات کا محبوب بھی مرد شاعروں کی طرح عورت ہی ہے۔اس کے بعد انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوئل میں مشہور ہونے والی شاعرات میں صفیہ شمیم ملیح آبادی، عزیز جہاں، کنیز فاطمہ حیا لکھنوی، رابعہ خاتون پنہاں بریلوی ،بلقیس جہاں بریلوی، حجاب دہلوی، حور میرٹھی، حیا میرٹھی، غزالہ اشفاق، نیلوفر ناہید، ناز بلگرامی، وفا ٹونکی، اختر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم بشیر، سیدہ سردار اختر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو شاعری میں آزادی کے بعد سے عہد حاضر تک مقبول ہونے والی شاعرات میں ادا جعفری، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، فہمیدہ ریاض، زہرہ نگاہ، مسعودہ حیات، شفیق فاطمہ شعریٰ، شاہجہاں بانو یاد، کشور ناہید، پروین شاکر، سارہ شگفتہ، شائستہ حبیب، پروین فنا سید، عرفانہ عزیز، عذرا عباس، بانو دار اب وفا ، بالقیس ظفیر الحسن، رفیعہ شبنم عابدی نگار عظیم، نسیم سید، ناہید قاسمی، شاہین کاظمی، شاہدہ حسن، حمیدہ شاہین، نسیم نکہت، سیدہ شان معراج، ترنم ریاض، زرینہ ثانی، عذرا پروین، شائستہ یوسف، شہناز نبی، نسرین نقاش، تبسم فاطمہ، روبینہ شبنم، روبینہ میر، نور جہاں ثروت، حمیرا رحمٰن، عشرت آفریں، عفت ذریں، نفیس بانو شمع، ملکہ نسیم ،شبنم عشائی، نصرت مہدی، قمر قدیر ارم، شفیقہ فرحت، کہکشاں تبسم، تسنیم جوہر، صبیحہ سنبل، نفیسہ سلطانہ عیاں، نینا عادل اور عارفہ شہزاد وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

نعت نگاری اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے، اس صنف کے حوالے سے بھی خواتین نے طبع آزمائی کی ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ نعت گوئی میں شاعر حضرات ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔پھر بھی اگر تلاش کریں تو دو چار نعوت یا چند اشعار ہر شاعرہ کے کلام کا حصہ ضرور ہونگے لیکن ۱۹۱۱ میں حیدر آباد میں پیدا ہونے والی نعت گو شاعرہ ''تہنیت النساء'' اپنے تین مجموعوں ''ذکر و فکر'' (۱۹۵۵)،''صبر و شکر'' (۱۹۵۶) اور ''تسلیم و رضا'' (۱۹۵۹) کے ساتھ اردو کے نعتیہ ادب میں اپنی موجودگی درج کراتی ہیں۔

اردو میں ناول نگاری کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''مراۃ العروس ،۱۸۶۹''، ''بنات النعش ۱۸۸۸'' اور ''توبۃ النصوح'' وغیرہ سے ہوتا ہے۔خواتین میں پہلی ناول نگار رشیدۃ النسا ہیں اور ان کا ناول ''اصلاح النسا'' جس کا سنہ ۱۸۸۱ ہے۔ اس کے بعد جو خواتین اس میدان میں نظر آتی ہیں ان میں محمدی بیگم، طیبہ بیگم، عباسی بیگم، مسز ا۔ض حسن بیگم، اکبری بیگم، صغرا ہمایوں مرزا، بیگم شاہنواز، مسز عبد القادر، مسز عباس طیب جی اور نذر سجاد وغیرہ کے نام آتے ہیں۔اس دور کی ناول نگار خواتین

کے ناول گھریلو زندگی کے عکاس ہیں۔ابتدائی دور کی ان ناول نگاروں میں ''اکبری بیگم'' کے ناول ''گودڑ کا لال'' بہت اہم اور مشہور ناول ہے۔درحقیقت یہ روایتی انداز کا ناول نہ تھا اور اس کا شمار (اس کے موضوع کی وجہ سے) ترقی یافتہ ناولوں میں کیا گیا، کیونکہ اس ناول میں پہلی بار آزادیٔ نسواں پر زور دیا گیا تھا، پردے کی مخالفت کی گئی تھی اور مخلوط تعلیم کا تصور پیش کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ مسلم متوسط طبقے کی خواتین کو درپیش دیگر خانگی مسائل پر بھی اس ناول میں روشنی ڈالی گئی تھی۔''گودڑ کا لال'' موضوع اور فنی تکنیک کے اعتبار سے بھی ایک اہم ناول گردانا گیا ہے، اس کے علاوہ اسی دور کی نذر سجاد نے بھی اپنے ناولوں میں روایت سے ہٹ کر عورتوں کی تعلیم، ان کی آزادی اور حقوق کی آواز اٹھائی۔

ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور میں تعلیم یافتہ اور روشن خیال ادیبہ حجاب امتیاز علی نے رومانی ناول لکھ کر ناول نگاری میں اپنی منفرد شناخت قائم کی۔حجاب کے یہاں تخیل کی ایک حسین کائنات آباد ہے، ان کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے۔اس کے بعد ترقی پسندی کے عروج کے زمانے میں بہت سی ناول نگار خواتین نے ادبی دنیا میں خود کو منوالیا۔تقسیم وطن کے بعد جن خواتین کے بہت اچھے ادبی ناول سامنے آئے ان میں عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، قرۃ العین حیدر، صالحہ عابد حسین، خالدہ حسین، رضیہ فصیح احمد، آمنہ ابوالحسن، الطاف فاطمہ، فردوس حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، واجدہ تبسم، ہاجرہ مسرور، صغریٰ مہدی، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، مسرور جہاں، اور رفیعہ منظور الامین وغیرہ اہم اور قابل ذکر خواتین ہیں۔اردو میں معاشرتی ناول لکھنے والی خواتین کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے، مثلاً اے۔آر۔خاتون، رضیہ بٹ، سلمیٰ کنول، بشریٰ رحمٰن، عفت موہانی، عطیہ پروین، ہاجرہ نازلی اور شہناز کنول وغیرہ نے بہترین معاشرتی ناول لکھے ہیں۔معاصر ناول نگار خواتین میں جہاں تک مجھے علم ہے جیلانی بانو کے بعد انجم بہار شمسی، نفیس بانو شمع، نعیمہ جعفری پاشا، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری، ترنم ریاض، ثروت خان، نسترن فتحی اور نصرت شمسی، نوشابہ خاتون وغیرہ کے ناول منظر عام پر آکر مقبول ہو چکے ہیں۔

اردو کے افسانوی ادب میں بحیثیت اولین افسانہ نگار خواتین میں عباسی بیگم ''گرفتار قفس''، نذر سجاد ''خون ارماں''، آصف جہاں ''شش و پنج'' اور انجمن آرا ''ریل کا سفر'' یہ چاروں خواتین بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے وسط میں اپنے پہلے طبع شدہ افسانوں کے ساتھ شامل ہوتی ہیں۔۱۹۱۶ میں امت الوحی اپنے افسانوں کے ساتھ ''تہذیب نسواں'' لاہور اور ''عصمت'' دہلی میں وارد ہوتی ہیں۔۱۹۱۸ سے ۱۹۲۰ تک کے عرصے میں افسانہ نگار 'خاتون اکرم' کے افسانے سامنے آتے ہیں، خاتون اکرم وہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے مختصر افسانہ لکھنے کے ساتھ طویل مختصر افسانوں کی بنیاد ڈالی۔۱۹۱۹ میں سعیدہ اختر، زبیدہ زری

۱۹۲۰۔۱۹۲۱۔آمنہ نازلی افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ہی ڈرامہ نگار بھی تھیں۔ابتدائی دور کی دیگر اہم افسانہ نگار خواتین میں رابعہ سلطان بیگم، خیر النساء بیگم، سیدۃ النساء، بیگم بھوپالی، صغریٰ ہمایوں مرزا، مسز عبدالقادر، نسیم ایوب، زبیدہ سلطانہ اور عزیز النساء کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

آزادی سے قبل افسانہ نگاری کے میدان میں شہرت حاصل کرنے والی خواتین میں حجاب امتیاز علی اور رشید جہاں کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔حجاب نے رومانی افسانوں میں ایک خوبصورت خیالی دنیا آباد کی اور اپنے نیم حقیقی اور نیم رومانی افسانوں کی بدولت خوب شہرت حاصل کی۔ڈاکٹر رشید جہاں کی افسانہ نگاری کا دور ۱۹۲۲ سے ۱۹۵۰ تک ہے اور ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے بنیادگزاروں میں ہوتا ہے۔وہ انقلابی ذہن رکھنے والی حقیقت پسند فنکار تھیں۔بیسویں صدی کے اوائل میں تانیثیت کی علمبردار بن کر سامنے آئیں۔افسانوی مجموعے ''انگارے'' میں شامل اپنے دو افسانوں ''دلی کی سیر'' اور پردے کے پیچھے'' کی وجہ سے معتوب ٹھہرائی گئیں۔دراصل یہ دونوں افسانے فحش قرار دیے گئے تھے جب کہ حقیقت یہ تھی کہ ان افسانوں کی بے باک اور چبھتی ہوئی زبان سے اس وقت کے مرد معاشرے کو اعتراض تھا ساتھ ہی کسی خاتون سے ایسی کھلی ڈلی زبان کی توقع اس وقت نہیں کی جاسکتی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ یہ افسانے معاشرے کے کھوکھلے پن، عورت کی سماجی آزادی، مرد کے سخت گیر رویوں، اس کے حاکمانہ تسلط اور ہوس پرستی پر انگلی اٹھاتے تھے اور بطور احتجاج لکھے گئے تھے۔یوں اردو افسانے میں پہلی احتجاجی آواز رشید جہاں نے بلند کی اور بعد میں آنے والی افسانہ نگار خواتین کے لیے ایک جہت متعین کردی۔یعنی رشید جہاں کا ورود اردو افسانے کی دنیا میں قدم رکھنے والی دیگر خواتین افسانہ نگاروں کے لیے ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔

عصمت چغتائی کا پہلا افسانہ ''کافر'' رسالہ ''ساقی'' میں ۱۹۳۸ میں شائع ہوا۔عصمت اپنے ابتدائی تخلیقی دور میں ہی رشید جہاں کی پراعتماد شخصیت سے مرعوب ہوگئی تھیں۔عام مظلوم و محکوم انسانوں بالخصوص عورتوں کے مسائل کو ادب میں جگہ دینے اور نڈر رہو کر صدائے احتجاج بلند کرنے کے رشید جہاں کے حوصلے اور جذبے سے عصمت اتنی متاثر ہوئیں کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے افسانوں میں بے باک اور تلخ اسلوب اپنایا نیز عوتوں کے مسائل اور جنسی موضوعات پر بے خوف ہو کر لکھا۔مولانا صلاح الدین نے عصمت چغتائی کو ''بصیرت کی ایک نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان'' قرار دیا تھا۔رشید جہاں کی روش پر چلنے والی افسانہ نگار خواتین میں عصمت چغتائی کے بعد خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، صدیقہ بیگم اور صالحہ عابد حسین وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

آزادی کے بعد خواتین افسانہ نگاروں کی جس نسل نے برصغیر میں نمایاں شناخت قائم کی ان

میں عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، بانو قدسیہ، شکیلہ اختر، سرلا دیوی (ہمشیرہ کرشن چندر)، اختر جمال، تسنیم سلیم چھتاری، آمنہ نازلی، ممتاز شیریں، جمیلہ ہاشمی، صدیقہ بیگم سیوہاروی، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، خالدہ حسین، واجدہ تبسم، آمنہ ابوالحسن، سلمیٰ صدیقی، زاہدہ حنا، صغرا مہدی وغیرہ کے نام امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ مذکورہ خواتین افسانہ نگاروں میں سے بیشتر نے ترقی پسند تحریک کے دور میں ہی اپنی منفرد شناخت قائم کرلی تھی، اس نسل کی افسانہ نگار خواتین کی انفرادیت فن کی پختگی اور وسیع کینوس میں مضمر ہے۔

معاصر افسانہ نگاروں کے موجودہ منظر نامہ نیلم احمد بشیر، جیلانی بانو، ذکیہ مشہدی، رفیعہ شبنم عابدی، قمر جمالی، نجمہ محمود، صبیحہ انور، قمر جہاں، عائشہ صدیقی، اشرف جہاں، نگار عظیم، رینو بہل، نسیم سید، کوثر جمال، نعیمہ جعفری پاشا، عذرا نقوی، عصمت آراء، شمیم صادقہ، نزہت نوری، نزہت پروین، سیمیں کرن، سبین علی، فرحین چودھری، شہناز شورو، نگہت نسیم، دلشاد نسیم، صادقہ نواب سحر، ثروت خان، ترنم ریاض، غزال ضیغم، زنفر کھوکھر، تبسم فاطمہ، نسترن احسن فتیحی، ھما فلک، گل ارباب، شاہین کاظمی، سلمیٰ جیلانی، نوشابہ خاتون، آصف اظہار، غزالہ قمر اعجاز، تسنیم کوثر، عشرت ناہید، آشا پربھات، کہکشاں انجم، کہکشاں پروین، صبوحی طارق، فرحین جمال، سیمیں درّانی، اسماء حسن، مریم ثمر، ثمینہ سید، نصرت شمسی، نصرت طارق ظہیری، عنبریں رحمٰن، رخسانہ صدیقی، نگہت فاروق، انجم قدوائی، شبینہ فرشوری، شہناز رحمٰن، نشاط پروین، سرفراز جہاں وغیرہ کے ناموں پر ختم نہیں ہوتا۔ اردو میں خواتین افسانہ نگاروں کے ورود کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ عرض کرتی چلوں کہ راقم السطور (افشاں ملک) بھی افسانہ نگار خواتین کے اسی قافلے میں پچھلی دو دہائیوں سے شامل ہے۔

۱۹۸۰ کے بعد سے عہد حاضر تک افسانہ نگار خواتین کے جس قافلے کا ذکر درج بالا سطور میں کیا گیا ہے اس کی نمائندگی بلاشبہ ذکیہ مشہدی کرتی ہیں۔ حالانکہ تعداد میں ان سے زیادہ افسانوں کی خالق بھی اسی قافلے میں موجود ہیں لیکن جس خلاقانہ بصیرت سے وہ افسانہ بنتی ہیں اور زبان پر جس بلا کا عبور رکھتی ہیں نیز جس فنی مہارت سے کرداروں کی تحلیل نفسی کرتی ہیں وہ انہیں کا خاصہ ہے۔

اردو ڈرامہ نگاری میں بھی خواتین نے اپنا حصہ ڈالا ہے نیز دوسری زبانوں کے ڈراموں کے اردو میں تراجم بھی کیے ہیں۔ ڈرامہ نویسی میں قدسیہ زیدی، صالحہ عابد حسین، بانو قدسیہ، حجاب امتیاز علی، جیلانی بانو، عصمت چغتائی آمنہ نازلی، رفیعہ منظور الامین، زاہدہ زیدی اور ساجدہ زیدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان خواتین کے علاوہ یک بابی ڈرامہ لکھنے والی بھی کئی خواتین ہیں جن کا ذکر پھر کبھی.....!!!

تحقیق وتنقید کے میدان میں خواتین بہت کم نظر آتی ہیں۔ اردو تنقید میں ممتاز شیریں کا ہمسر کوئی نہیں۔ ممتاز شیریں کے بعد صفیہ اختر اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے نام بے حد اہم ہیں۔ ان خواتین کے علاوہ

صالحہ عابد حسین، زرینہ ثانی، رضیہ اکبر، صغیرہ نسیم، عطیہ نشاط، پروین عالم، حمیرا جلیلی، شفیق النساء قریشی، ڈاکٹر زرینہ عقیل، ثریا حسین اور ڈاکٹر ام ہانی اشرف وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

تنقید کے مقابلے تحقیقی میدان میں خواتین زیادہ نظر آتی ہیں۔ زیادہ تر تحقیقی مقالے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن کئی خواتین کی ذاتی شوق میں لکھی گئی تحقیقی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ تحقیق وتنقید کی دنیا کا ایک اہم اور بہت بڑا نام سیدہ جعفر کا ہے جنہوں نے اپنے وقیع (تحقیقی وتنقیدی) کارناموں سے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ محقق خواتین کے کچھ اہم ناموں میں صالحہ عابد حسین، ڈاکٹر میمونہ دلوی، صغریٰ مہدی، ڈاکٹر زرینہ ثانی، بیگم انیس قدوائی، ڈاکٹر شمیم نکہت، ڈاکٹر صابرہ سعید، ڈاکٹر قیصر جہاں، ڈاکٹر کشور سلطان، ڈاکٹر انجمن آرا، ثریا حسین، ڈاکٹر عبیدہ بیگم، رضیہ سلطان علوی، داکٹر رضیہ حامد، نگار عظیم، ڈاکٹر وسیم بیگم، ثروت خان، آمنہ تحسین اور نسترن ف احسن تیجی وغیرہ کے نام اعتبار قائم کرتے ہیں۔ تحقیق وتنقید کے حوالے سے خاکسار بھی اپنی ہم عصروں کے ساتھ اس دشت کی سیاحی میں مصروف ہے۔

اردو میں سفر نامہ نویسی اور خودنوشت نگاری بھی اصناف ادب کا حصہ ہے۔ اس میدان میں بھی خواتین نے لائق تحسین کام کیا ہے اور کئی خواتین اس حوالے سے مشہور بھی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں سفر نامہ نگاری میں قرۃ العین حیدر کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ دیگر سفر نامہ نگاروں میں صالحہ عابد حسین، پروفیسر ثریا حسین، صغریٰ مہدی، بیگم تاج یاسین علی وغیرہ کے سفر نامے مقبول ہوئے ہیں۔ پاکستان کی کئی خواتین نے اچھے سفر نامے لکھے ہیں، ان میں اختر ریاض الدین ایسی سفر نامہ نگار ہیں جن کے بارے میں ناقدین ادب کا کہنا ہے کہ انہوں نے سفر نامے کی صنف کو اعتبار بخشا ہے۔

اُردو کی قلم کار خواتین نے خودنوشتیں بھی تحریر کی ہیں، یہاں سب کے نام اور کام کا احاطہ کرنا تو ناممکن ہے پھر بھی کچھ نام پیش ہیں مثلاً عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ادا جعفری، خدیجہ مستور، صالحہ عابد حسین، صغریٰ مہدی، بیگم انیس قدوائی، بانو سرتاج، بیگم حمیدہ اختر، جیلانی بانو کے علاوہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بہت معیاری ادبی انداز میں لکھی گئی آپ بیتی ''شورش دوراں'' از حمیدہ سالم ہے، جس کو نہ صرف نسائی ادب بلکہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ قرار دیا گیا ہے۔

خواتین کی درج بالا تخلیقی کارگزاریوں کا مجموعی جائزہ ثابت کرتا ہے کہ پچھلی ایک صدی میں خواتین نے مرد حضرات کے دوش بدوش ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اعتبار اور استناد حاصل کرنے والے خواتین کے تخلیقی فن پارے بلاشبہ اردو ادب کے خزانے میں باوقار اضافہ ہیں۔

(ضروری نوٹ) ہم عصر افسانہ نگار اور ہم عصر شاعرات کی درج بالا فہرست کے حوالے سے میرا معروضہ ہے کہ ہم عصر کا مطلب ہم عمر ہرگز نہیں ہے۔ بس ایک عصر یا ایک عہد میں لکھنے والے چاہے ان میں عمر کا تفاوت چار پانچ دہائیوں کا ہی کیوں نہ ہو یا ان کا ادبی قد بلند یا اوسط درجے کا ہی کیوں نہ ہو، یا انہوں نے مختلف ادبی رجحانات کی پیروی ہی کیوں نہ کی ہو وہ کہلائینگے ہم عصر ہی۔ دوسری عرض داشت یہ ہے کہ فنکار خواتین کے ناموں کی فہرست میں بہ اعتبار ''ادبی قد'' اگر ترتیب صحیح نہ ہو یا کوئی نام چھوٹ گیا ہو تو طالب درگزر رہوں۔ ایک اور اہم بات جس کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ اس مضمون میں پاکستان کی ان قلمکار خواتین کو شامل کیا گیا ہے جن کی تخلیقات ہندوستان میں اردو کے ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں یا ہو رہی ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

S-4 ,Azim Estate-2
New SirSyed Nagar،Medical Road
Aligarh U.P.,PIN 202002
91 9557654926 e-mail:.dr.afshanmalik@gmail.com

اقبال حسن آزاد

کے

اولین افسانوی مجموعے

قطرہ قطرہ احساس

کا دوسرا ایڈیشن

زیـــر تـــرتیـــب

- **حمد**
- **شمسہ نجم**

حمد باری تعالیٰ

شہِ رگ سے بھی تو قریب ہے یہ ترا کرم ہے، کمال ہے
مری خاک میں ہے جو روشنی ترا عکسِ روئے جمال ہے

اسے چاہتوں کا کہوں اثر کہ تو ساتھ میرے ہے ہر ڈگر
تجھے ذرے ذرے کی ہے خبر کہ تو آپ اپنی مثال ہے

یہ جو عاشقی کی ہے رہ گزر، ہے بہت کٹھن مرے ہم سفر
نہ رکھیں سنبھل کے قدم اگر، چلے وقت الٹی ہی چال ہے

مری خاک کیا مری ذات کیا، مرا عکس تک ہے فنا صفت
ترے تاجِ شاہی کی بات کیا نہ فنا اسے نہ زوال ہے

اسی چارہ گر کی تلاش ہے کرے منزلوں کو جو روبرو
اسی رہنما کی ہے جستجو اسی راہ بر کا سوال ہے

کوئی خواب ہے کہ گمان ہے، یہ جو ذکرِ کون و مکان ہے
جو یہ شمسہ حسنِ بیان ہے تیرے رب کا بخشا کمال ہے

◂◂ ● ▸▸

11006ColimaRoad
Whittier,California90604
USA

- **نعت**
- **فوزیہ اختر ردّاؔ**

نعت

ہے نبیؐ کے وقار کی خوشبو
غنچۂ شاندار کی خوشبو

دل میں سرکارؐ بس گئے ہیں اب
دل میں آئی قرار کی خوشبو

آمدِ نورِ مصطفیٰؐ بے شک
کفر سے ہے فرار کی خوشبو

نعت آقاؐ کی جب کہی میں نے
تب ملی ہے وہ پیار کی خوشبو

شہر بھر میں حرا کی یہ شہرت
شہر میں ایک غار کی خوشبو

نام جس دم میں لیتی ہوں اُنؐ کا
رب کو بھاتی ہے یار کی خوشبو

اے ردا کب وہ ؐخواب میں آئیں
ہے یہاں انتظار کی خوشبو

◂◂ ● ▸▸

5, Komedan Bagan Lane
Kolkata-700016
+91 7518713348

- **نظم**
- **اسرار الحق مجازؔ**

نوجوان خاتون سے

حجابِ فتنہ پرور اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا
خود اپنے حسن کو پردا بنا لیتی تو اچھا تھا

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

تری چینِ جبیں خود اک سزا قانونِ فطرت ہے
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھا تھا

یہ تیرا زرد رخ، یہ خشک لب، یہ وہم، یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا

دلِ مجروح کو مجروح تر کرنے سے کیا حاصل
تو آنسو پونچھ کر اب مسکرا لیتی تو اچھا تھا

ترے زیرِ نگیں گھر ہو، محل ہو، قصر ہو، کچھ ہو
میں یہ کہتا ہوں تو ارض و سما لیتی تو اچھا تھا

اگر خلوت میں تو نے سر اُٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آ کر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو سازِ بے داری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

عیاں ہیں دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے
انہیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا

سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اُٹھا لیتی تو اچھا تھا

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

◂◂ ● ▸▸

● غزلیں

دیا جیم

عمر گزری ہے سہارے نہیں بدلے میں نے
جو پیارے ہیں وہ پیارے نہیں بدلے میں نے

وہی آکاش وہی رات کی چادر سر پر
چاند کو دیکھ کے تارے نہیں بدلے میں نے

نیلے پیلے سے یہ لمحات ہیں جاگیر مری
ہجر میں اپنے اشارے نہیں بدلے میں نے

مدتوں بعد تری یاد کے میلے کپڑے
کچھ بدل بھی دیے سارے نہیں بدلے میں نے

میں ندی تھی تو مرے ساتھ کنارا تو تھا
ساتھ بہتی رہی دھارے نہیں بدلے میں نے

خواب کو صبح کی دہلیز پہ لے آئی ہوں
آنکھ کھولی ہے نظارے نہیں بدلے میں نے

تیرے خوابوں سے ہی روشن رہا یہ دل کا دیا
ہجر میں خواب تمہارے نہیں بدلے میں نے

◂◂ ● ▸▸

جب بھی ہو مجھ کو تھکن تم کو دعا دیتی ہوں
گھر کے کاموں میں مگن تم کو دعا دیتی ہوں

ایسا لگتا ہے محبت کا خدا ہے اس میں
دیکھتی ہوں جو گگن تم کو دعا دیتی ہوں

ڈوبتے چاند کے پاؤں میں مدھر ساز ہو جب
دل میں جھانکے جو کرن تم کو دعا دیتی ہوں

سوچتی رہتی ہوں تم کو ہی بٹھا کر دل میں
ایسی لاگی ہے لگن تم کو دعا دیتی ہوں

وحشتوں نے ہی جلایا ہے دیا تیرا بدن
چاند جیسا ہو یہ من تم کو دعا دیتی ہوں

◂◂ ● ▸▸

دیا جیم

پھول خوشبو ہو محبت کی کہانی بدلے
آتی جاتی ہوئی سانسوں کی روانی بدلے

نئے لوگوں سے ملے رنگ نئے اوڑھے وہ
اپنی پہنی ہوئی پوشاک پرانی بدلے

ہو جو افکار میں خم حرف بگڑ جاتے ہیں
ہو جو لہجے میں تحمل تو معانی بدلے

ڈوب جاتے ہیں سبھی بن کے بھنور رہتے ہیں
کاش وہ آنکھ نہیں آنکھ کا پانی بدلے

آؤ اب درد کی خوشبو سے ہی کچھ پل لے لیں
تا کہ اس ہجر کے موسم کی گرانی بدلے

عشق ایسے ہی بدلتا ہے ہر اک لمحے کو
جیسے اک سوچ کوئی شام سہانی بدلے

ہائے دھڑکن نے دیا دل سے کہا ہے اب تو
وقت کے ساتھ چلے غم کی مکانی بدلے

◂◂ ● ▸▸

بڑے بے جان سے کچھ قہقہے تھے
کبھی ہونٹوں پہ اپنے بھی کھلے تھے
نظر کی ڈال پہ لٹکی تھی الجھن
بنے سوچوں کے اپنے دائرے تھے
یقین و بے یقینی کے مری جاں
ہزاروں میل پھیلے سلسلے تھے
پریشاں کیوں ہو ان کو دیکھ کر تم
یہی غم تو مقدر میں لکھے تھے
ستاروں نے بلائیں لیں تھیں ان کی
بدن چاندی کا اوڑھے جو کھڑے تھے
کہیں پر تھے سراسر حاشیے ہم
کہیں پر سابقے اور لاحقے تھے
اُٹھا لائی انہیں چڑیا لپک کر
گھنے پیڑوں سے جو پتے گرے تھے
یہ ہم ہی تھے جلایا دل دیا سا
ہمیں تو چھوڑ کر تم چل دیئے تھے

◂◂ ● ▸▸

P o box 268‹, Taveuni Fiji Island 9454232
Mob: +679 9454232

حیاغزل

لرزشِ عشق کی تادیب مجھے لے ڈوبی
رنجشِ یار کی تعذیب مجھے لے ڈوبی
حاشیئے کھینچ کے عادی تھی سطر لکھنے کی
زندگی میں یہی ترتیب مجھے لے ڈوبی
حوصلہ ہوتا اگر تیرا قصیدہ لکھتی
تجھ گریزاں کی تو تشبیب مجھے لے ڈوبی
میں نے نفرت کا صلہ اس کو محبت سے دیا
میرے پُرکھوں کی یہ تہذیب مجھے لے ڈوبی
اس زمانے نے میاں ہم کو بھی للچایا بہت
زہدِ مکار کی ترغیب ہمیں لے ڈوبی
درد کو نم سے ملاتی تھی بناتی تھی ہنسی
کیمیا سازی کی ترکیب مجھے لے ڈوبی
کچھ بھی پوجا نہ سوا ایک بتِ بے پروا
خانۂ دل کی یہ تنصیب مجھے لے ڈوبی
میں نے انکار کیا جھوٹے خداؤں کا حیا
کیا اناؤں کی یہ تکذیب مجھے لے ڈوبی؟؟

◂◂ ● ▸▸

کیا ضرورت ہے ہیلو ہا ئے کی
میں نہیں ہوں تمہارے پائے کی

دھوپ کا لطف لینے والی ہوں
مجھکو خواہش نہیں ہے سائے کی

غا ئبا نہ شریک کر کے تمہیں
ایک چسکی بھری ہے چائے کی

ا ک محبت نہیں و گر نہ تو
گھر میں ہر چیز ہے کرائے کی

مشورہ مفت جو د یا ہے اسے
کوء وقعت نہیں ہے را ئے کی

مستقل کس کا ہے قیام یہاں
دنیا بھی ہے جگہ سرائے کی

◂◂ ● ▸▸

حیاغزل

ہم نے حد سے گزر کے دیکھا ہے
اپنے قد سے اُبھر کے دیکھا ہے
زندہ رہتے ہیں مرنے والے ہی
ہر کہانی میں مر کے دیکھا ہے
وقت بھی رک گیا وہیں جب سے
اس نے مجھ کو ٹھہر کے دیکھا ہے
ہر گلی ایک جیسی لگتی ہے
ہر گلی سے گزر کے دیکھا ہے
عکس کیسا دکھاتا ہے مجھکو
آئینے میں اتر کے دیکھا ہے
کیا حسیں گھاس تھی کنارے پر
پانیوں نے گزر کے دیکھا ہے
نہ گھروندے بنانا آیا مجھے
ریت سے ہاتھ بھر کے دیکھا ہے
زندگی بھر کی پیاس ختم ہوئی
اسکی آنکھوں پہ مر کے دیکھا ہے

◂◂ ● ▸▸

حالت وصل میں کیا عمر گذاری جائے
دل لگی آپ کریں جان ہماری جائے
سوچتے ہیں کہ نظر کیسے اتاری جائے
کیوں نہ صدقے میں ترے جان بھی واری جائے
ربط جڑ جائے دلوں کا یوں کسی تار کے ساتھ
ہم ہوں بے چین ادھر نیند تمہاری جائے
شرط یہ ہے کہ تو آئینہ سمجھ لے مجھ کو
روبرو ہو، کہ تری زلف سنواری جائے
اس نے غیروں کے حوالے بھی کیا اور کہا
کاش تو میرے حوالے سے پکاری جائے
تجھ کو دیکھے نہ نظر بھر کے کوء میرے سوا
خانۂ دل سے بھی تصویر اتاری جائے
اک خطا ہم سے ہوء اور گنوا بیٹھے تجھے
سوچتے رہتے ہیں وہ کیسے سدھاری جائے

◂◂ ● ▸▸

House no 3,block 20,area 4D,Landhi no 6
Karachi, Pakistan

رضیہ حیدر خان

راستے ویراں، سکوتِ مرگ طاری، ہے تو ہے
میرے دل کی دھڑکنوں میں آہ وزاری، ہے تو ہے
پھونک تو ڈالے ہیں میں نے یاد کے جنگل تمام
اب اگر دل میں مرے یہ سوگواری، ہے تو ہے
جانتی ہوں خوب پھر سے میں ہی ہاروں گی تو کیا
کچھ مقدر کا مرے یہ کھیل جاری، ہے تو ہے
ہے تعاقب میں مرے پھر وحشتوں کا اک ہجوم
اور سراپا پھر سے مجھ پہ لرزہ طاری، ہے تو ہے
ہم تو خنجر کا ترے ہر وار سہتے ہی گئے
درد کی شدّت سے اب یہ بیقراری، ہے تو ہے
وقت کی گردش نے ہم سے جانے کیا کیا لے لیا
دل ہے قابو میں مگر یہ اشک باری، ہے تو ہے
آئے گی رضیہ تری باری بھی اک دن دیکھنا
بس اسی لمحہ کی ہے یہ خوش گواری، ہے تو ہے

◂◂ ● ▸▸

c/o Khurram Khan,Aziz Manzil
(opposite Mumtaz Apartment)
house no 96 ..1st floor
Lane no 29 Zakir Nagar
Jamia Nagar New Delhi 110025
9999614041

فرحین چودھری

میں اس سے روٹھی ہوئی ہوں اسے بتائے کوئی
کسی بہانے کبھی اس کو ڈھونڈ لائے کوئی
میرے بدن پہ محبت نے تان دی چادر
ہوا کے تیر اندھیرے میں اب چلائے کوئی
اتر گئے ہیں کئی چاند گہرے پانی میں
نئے چراغ نئی شمعیں اب جلائے کوئی
میرے بدن نے سمیٹا ہے زہر صدیوں کا
میرے لبوں پہ ستارہ سا جھلملائے کوئی
قدم قدم پہ اسے سوچنے کا جرم کیا
قدم قدم پہ مجھے یاد کیوں نہ آئے کوئی
رگوں میں بہتا ہے میرے وہی لہو کی طرح
لہو کا رنگ اسے کیسے اب دکھائے کوئی
جو شخص آتشیں تنہائی میں جلا فرحین
اب اس کی راکھ ہواؤں میں بھی اڑائے کوئی

◂◂ ● ▸▸

House 389 street 43 G /9/1
ISLAMABAD PAKISTAN
00923341717879

انجم عثمان

گرفتِ حجرہء افلاک کے سراغ جلا
حصارِ خاک کو مسمار کر ،دماغ جلا
کرشمہ ہائے شب و روز کا فسوں ٹوٹا
سو کاروانِ زمان و مکاں کا باغ جلا
نہ رکھ قیودگمان و یقیں کے بیچ انہیں
خرد کی شعلہ نوائی سے دل کے داغ جلا
خبر کشا تھی ضیائے وفورِ آگاہی
قبائے بے خبری کا کفِ فراغ جلا
زمیں کی سات تہوں کے میاں ہے رازِ نمود
فشارِ کوہ سے پہلی پرت کا باغ جلا
نکال خرقِ سیہ پوش سے شعاعِ نور
تجلیات کے پیکار سے تو زاغ جلا
یہ حدتِ مے آتش صفت نہیں انجم
کہ عشقِ شعلہ نفس سے دمِ ایاغ جلا

◂◂ ● ▸▸

apartmentno:303
prime beach view apartments
clifton block 4
karachi.
03312333862

سلمیٰ حجاب

جہاں خنکی ہو موسم میں وہیں ساون سلگتا ہے
مسلسل آتشِ باراں سے سارا باغ جلتا ہے
نہ ہو قابو اگر اس پہ یہ خاروں سے الجھتا ہے
اگر سر پہ سجا لیں تو یہی آنچل مہکتا ہے
مرے ترکِ محبت میں کمی کچھ رہ گئی شاید
ابھی تک سانس چلتی ہے ابھی تک دل دھڑکتا ہے
کسی کی یاد ہے خوشبو یقیں کرنا پڑا دل کو
بھلا دو چار پھولوں سے کہیں آنگن مہکتا ہے
وہی درماندہ راہیں ہیں وہی ٹھہری ہوئی منزل
زمیں محور بدلتی ہے نہ سورج رخ بدلتا ہے
ازل سے سلسلہ جاری ہے رسمِ ناشناسی کا
میں جب چہرہ بدلتی ہوں وہ آئینہ بدلتا ہے
جہاں مستور ہوتی ہے کسی کی شعلہ سامانی
حجابِ آتشیں خود ہی وہاں منظر میں ڈھلتا ہے

◂◂ ● ▸▸

3/32vipul khandGomti
NagarLucknow....226010
U.PIndiaMobile No.9125106327

- **نظمیں**
- **نسیم سید**

کسی بھی جبر کی زنجیر جب ٹوٹے تو جابر تلملاتے ہیں

تم آخر اس قدر ناراض کیوں ہو
بات تو سمجھو
نہ جانے کیوں بگڑ جاتے ہو
ہم جب بھی کسی احساس محرومی کو
مجبوری کو
جبر و ظلم کو تصویر کرتے ہیں
چلو تم ہی بتاؤ
تم نے جو تک ہمارے واسطے دستور لکھے ہیں
میں ان کون سی شق رکون سے
نہیں تو یہ کرو جوتوں میں میرے پیر ڈالو
اور میرے ساتھ آؤ
تمہیں نا جائز و جائز کی سب تفصیل کی تواز بر ہے نا؟
تو دیکھو یہ قطاریں عورتوں کی سر جھکائے لوٹ کے سامان میں لائی گئی ہیں
ان کے ماتھے پر دہکتے سرخ انگارے سے اک فرمان لکھا ہے
''یہ سب جائز کنیزیں ہیں''
بدن ان کا ہے
لیکن اس بدن پر
کس کے جسموں کی حکومت ہے
ذرا سی دیر کو خود کو اسی جائز غلامی میں دھرو جاناں
بتاؤ کونسی تذلیل کا احساس ہوتا ہے
یہ کیچڑ چکھ کے دیکھو

ذائقہ یہ کیسا لگتا ہے؟
یہ چھوٹی چھوٹی قبریں دیکھتے ہو
ہمارا سانس لیتا جسم اس میں دفن ہے پیارے
ہمیں معلوم ہے
برجستہ کہہ دو گے ''پرانی بات ہے یہ تو''
ہاں..... یہ کہنے کو پرانی بات
لیکن یہ قبرستان یہ قبریں زمانوں کا سفر کرتی
ہمارے نام پر یہ وقف رہتی ہیں
مدرسوں، بیٹھکوں، کھیتوں میں
باعزت گھروں کے گونگے کمروں اندھے اوطاقوں میں
منہ کھولے ہمیں زندہ نگل لینے پہ قادر ہیں
ذرا سی دیر کو اُتر وانہی قبروں میں
اور سمجھو کہ ایک اک سانس کیسے ٹوٹتی ہے
فشار قبر جیسی زندگی جی کر کبھی دیکھو مرے پیارے
اِدھر دیکھو
چتا پر زندہ جلتی عورتوں کے پگھلے جسموں کی طرف دیکھو
اِدھر دیکھو..... ادھر یہ پگھلے چہروں کی قطاریں ہیں
تمہاری عزتوں کی بھٹیوں میں ہم
ہمارے جسم، زندہ جسم ان میں جھونکے جائیں
اور کہتے ہو کہ اپنے جسم کو اپنا کہا تو ہم خفا ہونگے
تو جاناں واقعہ یہ ہے
انہیں قبروں، چتاؤں، عزتوں کی بھٹیوں سے ہم
نمو کا رزق لیکے اپنی آوازوں کو تازہ رم سکھاتے ہیں
تمہیں معلوم ہے جاناں
کسی بھی جبر کی زنجیر جب ٹوٹے تو جابر تلملائینے
نئے دن کی بشارت کو مگر اہل ستم کب روک پائنگے۔

◂◂ ● ▸▸

● نسیم سید

مگر ایک ساعت

کوئی ایک جملہ
کوئی ایک لمحہ
کوئی ایک ساعت
مٹا کے دوبارہ سے لکھ دے ہمیں
کہاں ایسا ہوتا ہے.....
لیکن ہوا
بہت کم سخن ایک ساعت
مخاطب تھی
''تم ایسی دیوارِ گریہ ہو
جو سارے دکھ سوک لے
خود پہ بیتے ہوئے وقت کی
سب تہوں
ساری پرتوں کی گھمبیر خاموش شکنوں کو اذنِ سخن دوں
تردد، تذبذب بنا
بانٹ کے خود کو تم سے تمہیں
ذات کے ایک گوشہ میں چن دوں''
کوئی ایک ساعت
مٹا کر دوبارہ سے لکھ دے ہمیں
کہاں ایسا ہوتا ہے
لیکن بہت مہرباں ایک ساعت.....

◂◂ ● ▸▸

911-225-Webb DriveMississauga ONTARIO.
L5B4P2 CANADA

● شاہین کاظمی

خواب میں لکھی گئی ایک نظم

میرا عشق زمانی دائروں سے ماوراء ہے
کہیں روح کی پاتال میں پنپتا اور آکاش کی بلندیوں کو جا چھوتا ہے
میں نے صدیوں پہلے سر بمہر لفافے میں
اسے تمہیں ارسال کیا تھا
آج بھی وقت کی ہتھیلی پر تمہارے نام کی لکیر کھوجتی ہوں
لیکن درمیان میں حائل زمانوں کا بُعد
راہ روک لیتا ہے
تم دھند کے اس پار
کھائی کے دوسرے کنارے پر
کھڑے ملتے ہو
منتظر ہوں
جب تمہیں ڈاک موصول ہوگی
کیا تم کھائی کے اِس طرف آپاؤ گے؟

◂◂ ● ▸▸

● سدرہ سحر عمران

وینٹی لیٹر پر کینڈل لائٹ ڈنر

وقت تمہاری آنکھوں میں
خوف کا نقطہ بن کر ٹھہر جائے گا
مگر میری سانسوں کی ململ پر
زندگی نیا پھول نہیں کاڑھ سکے گی
ہمارے ہاتھ آخری بوسے کے منتظر رہیں گے
جیسے دھول کے بعد بڑی دیر تک
کچھ دکھائی نہیں دیتا
تم میرا چہرہ ڈھونڈتے رہو گے
دھاگے اچانک ختم ہوتے ہیں
کمرہ، فرنیچر، کتابیں، الماریاں
سب کچھ بدلا جا سکتا ہے
مگر ہمارے بیچ کا رشتہ
مصر کے کسی بازار میں نہیں ملے گا
میں موت کی چپلیں پہن کر
ان آوازوں سے بہت دور جا چکی ہوں گی
جو مجھے دیکھ کر پھول بن جاتی ہیں
اور خوشبو کے راستے میں
میرا مکان آئے گا
تم کبھی کبھی سفید بالوں کی چاندنی گرانے
میرے اندھیروں پر ضرور آنا

میں پتھر کی کتاب پر
تمہارے نام کے دستخط مدھم ہوتے دیکھ کر
روتے ہوئے مسکراؤں گی
تم میری ہنسی کی بالیاں
اس عورت کو پہنا دینا
جس کے ہونٹ تمہارے سینے پر دمک رہے ہیں

◂◂ ● ▸▸

اقبال حسن آزاد

کا

دوسرا افسانوی مجموعہ

مردم گزیدہ

صفحات ۱۶۰ قیمت ۱۵۰ سنہ اشاعت اول ۲۰۰۵

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

موبائل نمبر : +918210498674

● سدرہ سحر عمران

رات اپنا لباس بدلے گی

روشنی کی ٹرین جا چکی ہے
اب اندھیری گلیوں کی
عزت دار خاموشی
ہماری پازیبوں میں آ کر
بھونکنے لگے گی
تم اپنی رنگ دار پگڑیاں
ہمارے سبز پیروں میں بچھاؤ گے
رات پھنکارنے لگے گی
ہمارے جسموں میں زہر بویا جائے گا
ہم سکوں کی طرح
تمہاری سفید جیبوں میں
کھنکتی رہیں گی
تم اپنی عورتوں کی آنکھیں
باندھ کر رکھنا
دو اضافی سجدوں کے ساتھ
کہ تمہارے پارسا شہروں میں
ابھی مردوں کے کوٹھے
دریافت نہیں ہوئے!!

◂◂ ● ▸▸

● سلمیٰ حجاب

شرط

رابتدا سے پاؤں میرے منجمد ہیں
اور میرے سر کی زینت
برف کا اک تاج ہے
حکمرانی آگ کی/ چاروں طرف
سورج کا پھیلا راج ہے
اک کشش کی قید میں/ سارا بدن ہے
اور مسلسل برف میں/ جکڑے ہوئے
پیروں کو
حکم رقص ہے/ شرط ہے کہ
برف کو/ سر پہ سجا کر
رقص بھی کرتی رہوں
اور کرنوں کی تپش کو/ جذب بھی کرتی رہوں
کچھ اس طرح
کہ
ایک قطرہ بھی نہ پگھلے
اور مرے قدموں سے لپٹی/ برف کی پازیب میں
جنبش نہ ہو/ لیکن
وہ بجتی بھی رہے

◂◂ ● ▸▸

32vipul khandGomti Nagar
Lucknow....226010 U.P India Mobile No.9125106327

● رشمی بھاردواج
● ترجمہ: اسرار گاندھی

ایک نظم: شوہر کی محبوبہ کے نام

سوچتی ہوں کہ تمھیں ایک گھر
توڑنے کا الزام دوں
یا پھر اس آدمی کے نہاں خانوں میں جو جگہ رہ گئی ہے
اسے بھرنے کا کریڈٹ
جو گھر گرہستی کے جھمیلوں میں
شاید میری محبت کو ٹھیک سے حاصل نہیں کر پایا
تمھارے اور میرے بیچ
ایک دوسرے سے بندھ جانے کی کئی وجہ تھی
ہم اسی آدمی سے منسلک تھے/جو مجھے خالی کر کے
تم میں خود کو خالی کر رہا تھا/تمھیں جو ملا تھا وہ
میری محبت کا بچا کھچا تھا
ہمارے تعلقات سے بچی رہی گئی
خواہشوں کا بھوت/یہ کتنا مشکل رہا ہوگا کہ
تمام وقت مجھ سا ہونے کی تمنا میں
موجود رہتی ہوں گی/تمھارے اندر
اور اس کی سنائی کہانیوں کے سائے
آ جاتے ہوں گے تمھارے بستر تک
تم مجھ سے زیادہ پُرکشش ہو/زیادہ محبت بھری ہو
مجھ سے زیادہ خوبیوں کی مالک ہونے کے لیے
اور مجھ سے میرا جب سب کچھ چھن گیا
میں خود کو کھوجنے نکلی
ہم نے جی بھر کر ایک دوسرے کو کوسا
ایک دوسرے کے مرنے کی دعائیں مانگی
ہمارے بیچ ایک مرد کی محبت کا ہی نہیں
نفرت کا بھی اٹوٹ رشتہ تھا
میرے پاس تھا محبت کا ایک ماضی
ایک بیت گئی عمر
اور ایک بیتتی جا رہی جسم کے ساتھ
اس کے محبت کی نشانیاں
ایک اور زندگی تمھارے پاس تھی حال کی ایک محبت
جوانی کا جوش/اور جسم کا نچھاور کرنا
اپنے روپ کا گھمنڈ/اور میرے لیے ایک چُنوتی
لیکن اپنا مستقبل تو ہم دونوں نے
کسی اور کو سونپ رکھا تھا/یہ ہوتا ہے کہ تم نے میرا ماضی
اور میں نے تمھارے حال
کے دُکھوں کو ایک ساتھ جیا
کاش کہ ہمیں دُکھوں نے بھی
آپس میں باندھا ہوتا ہے

◂◂ ● ▸▸

Rashmi Bhardwaj, 129 2nd Floor
Gyan Khand -3 Indirapuram UP
Mob: 7838566265

Asrar Gandhi 18E/11J/6D
Karamat Ki Chauki, Paryag Raj
UP 211016 Mob: 9795126200

● انٹرویو
● سدرہ سحر عمران / روما رضوی

کوئی بھی تخلیق اس وقت جنم لیتی ہے جب انسانی تخیلات، جذبات اور احساسات؛ خیالات کی صورت اختیار کرتے ہیں، پھر اظہار کے لیے خیالات کو یا تو رنگ و تصویر کا لباس پہنایا جاتا ہے یا پھر ان کو الفاظ کا جامہ میسر آتا ہے۔ یہ اظہار یئے نت نئے روپ دھارتے ہیں اور اپنے ہم خیال قاری، سامع یا ناظر کے دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ پھر فنکار یا تخلیق کار چاہے کسی بھی صنف کو وسیلہ بنائے، تمثیلات کی مدد سے اپنے دل میں مقیم غم و اندوہ یا انبساط قلبی کو لطیف آہنگ میں ڈال کر دنیا کے سامنے لے آتا ہے اور پھر تخلیق کار یا تو داد و تحسین سمیٹتا ہے یا پھر تنقید کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نئی روایت کو قائم کرتا ہے۔ شعراء و مصنفین کے اسی حلقے سے ہماری آج کی مہمان شخصیت ایک نوجوان مصنفہ، کہانی نویس، ڈرامہ نگار و شاعرہ ہیں جن کا نام ہے سدرہ سحر عمران۔ سدرہ بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ نظمیں بھی وہ جو لوگوں کو داخلی قوت فراہم کرتی ہیں۔ سدرہ کے لکھے کئی ڈرامے سیریلز بھی مختلف چینلز پر نشر ہوتے رہے ہیں اور ان دنوں بھی ایک سیریل عوام میں مقبول ہو رہا ہے.....تو ہم سدرہ سحر عمران صاحبہ کو عالمی اخبار کی طرف سے خوش آمدید کہتے ہیں۔

سوال: ''سدرہ سحر عمران صاحبہ! آپ نے چھوٹی عمر میں اتنا کچھ کر لیا۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ کہاں پیدا ہوئی کہا تعلیم حاصل کی اور لکھنے پڑھنے کی طرف کیسے آئیں؟''

جواب: ''میں 8 اگست 1986ء کو کراچی میں ایک روایتی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کراچی سے حاصل کی اور کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ماسٹرز کیا۔ بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ وہی شوق مجھے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کی طرف بھی لے آیا۔''

سوال: ''آپ ادیب ہیں شاعرہ ہیں یہ بتائیں کہ آپ نے کس کس صنف میں طبع آزمائی کی اور کس میں سب سے زیادہ پذیرائی ملی؟''

جواب: ''میں نے کہانی، افسانہ، ناول، شاعری، کالمز اور ٹی وی چینلز کے لیے ڈرامے لکھے۔ میری نظم کو بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ اور مجھے خود بھی نظم زیادہ پسند ہے۔''

سوال: ''آپ کو نظم پسند ہے تو نظم سے شروع کرتے ہیں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں آپ کی نظم میں کیا خاص بات ہے جس کی وجہ وہ آپ کی پہچان بنی؟''

جواب: ''اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ میرا انداز بیان، میرے الفاظ کا چناؤ، اور جن سماجی اور معاشرتی

مسائل کو میں نے اپنی نظموں اجاگر کیا ہے ان کی وجہ سے میری نظم کو پسند بھی کیا گیا اور کچھ حلقوں میں تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔''

سوال: ''لڑکیاں تو بہت نازک احساسات اور خیالات کی مالک ہوتی ہیں۔ پھولوں، تتلیوں اور خوشبوؤں کی باتیں کرتی ہیں۔ جبکہ آپ کا ہاں معاملہ الٹ ہے۔ آپ کی نظموں میں تلخی کا عنصر غالب ہے اسکی کوئی وجہ؟''

جواب: ''میں نے ہمیشہ ناانصافی، ظلم، عدم برداشت، اور معاشرتی اور سماجی بے راہ روی کے خلاف لکھا۔ اس لیے میری نظموں میں تلخی ہے۔ بس یہ سمجھ لیجئے عام شاعرات کی طرح میرے دکھ اور مسائل ذاتی نہیں ہیں بلکہ میں ہر ظلم، نعرے، خواب، احتجاج میں پھینکے ہوئے پتھر، درد سے نکلی ہوئی چیخ، جہاں گولی کا جواب گالی ہو وہیں خود کو رکھ کر نظم کر دیتی ہوں۔''

سوال: ''شاید اسی تلخی کی وجہ سے آپ کی نظم پر کچھ حلقوں کی طرف سے تنقید بھی ہوئی؟''

جواب: ''جیسا کہ میں آپ بتا چکی ہوں اس جارحیت اور تلخ نوائی کی وجہ یہی ہے کہ میں سچائی لکھتی ہوں۔ گردوپیش میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ میرے تخلیقی وفور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ میں زمین پر رہ کر خلائی قصے، مصنوعی باتیں اور آسمانی کہانیاں نہیں لکھ سکتی۔ زمین کے دکھ بیان کرتی ہوں اور میرا خیال ہے ہر وہ شاعر اور ادیب جو نظریاتی بنیادوں پر لکھتا ہے اس کی تخلیق میں غم وغصہ، بغاوت، سرکشی، احتجاج اور تلخی نمایاں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے آپ کو تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔''

سوال: ''آپ کا نام ایک روشن خیال بلکہ کچھ حلقوں میں اپنی منفرد سوچ کے باعث الگ شناخت رکھتا ہے۔ ایسا کیوں کر ہے..... آپ نے وہ روش کیوں نہ اختیار کی جو عام لکھنے والوں کی ہے؟''

جواب: ''میں نے اگر ادب کا راستہ اختیار کیا تھا تو مجھے وہ سب نہیں لکھنا تھا یا دہرانا تھا جو سبھی کر رہے ہیں۔ شاعرانہ جگالی، مکھی پر مکھی مارنا، ایک ہی جیسے مضامین، سطحی پن کی عشقیہ باتیں، محبوب کی شان میں زمین آسمان ایک کرنا۔ میرا ذہن یہ قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ تخلیق کار کو انقلابی اور نظریاتی ہونا چاہئے۔ واہ واہ کی لت اسے نرگسی شخصیت بنا دیتی ہے۔ وہ کنویں کا مینڈک بن جاتا ہے۔ اور میں نے وہی لکھا جو میں لکھنا چاہتی تھی۔''

سوال: ''آپ کی نظمیں بہت ساری زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ کسی بھی شاعر کے لیے یقیناً یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ آپ کیسا محسوس کرتی ہیں اور ابھی تک کون کون سی زبانوں میں آپ کی نظموں کا ترجمہ کیا جا چکا ہے؟''

جواب: یقیناً میرے لیے یہ کسی اعزاز سے کم نہیں ہے کہ میری نظمیں ایک ہی جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہیں بلکہ وہ

مختلف زبانوں کے ذریعے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ تخلیق جب سفر کرتی ہے تو اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا جاتا ہے وہ ہر زبان کے ساتھ ایک بار پھر دہرائی جاتی ہے۔ میری نظمیں انگریزی، ہندی، پشتو، سندھی، بلوچی، اور دیوناگری زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

سوال: کیا آپ اپنے اب تک کے کام سے مطمئن ہیں؟ کون سی صنف آپ کے لئے اطمینان بخش ہے؟ یہ بھی بتائیں اپنی کس تحریر کو ماسٹر پیس سمجھتی ہیں؟''

جواب: جس دن مطمئن ہو گئی اس دن کے بعد تو ویسے ہی تخلیقی صلاحیت مر جائے گی۔ اطمینان تخلیق کی موت ہے۔ آگے کا سفر رک جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا کہ نظم ایسی صنف ہے جہاں میں پورے قد سے کھڑی ہوتی ہوں۔ مجھے اپنی نظم کبھی کبھی تو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ میں سوچ میں پڑ جاتی ہوں کیا یہ میں نے لکھا ہے؟ تو نظم ایسا میڈیم ہے جہاں میں خود کو سو میں سے سو نمبر دے سکتی ہوں۔ میری بہت سی نظمیں میرے لیے ماسٹر پیس ہیں۔''

سوال: وہ کون سے محرکات تھے جنہوں نے آپ کو شاعر و ادیب بنایا؟ اس بات کا احساس کب ہوا کہ آپ میں مصنفہ بننے کی صلاحیت موجود ہے؟ پہلی تحریر کیا تھی؟''

جواب: میں سمجھتی ہوں کہ ہر جینوئن تخلیق کار کے اندر اس کا تخلیقی وفور اسے اس وقت تک مضطرب و بے چین رکھتا ہے جب تک باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ تخلیق اندر کروٹیں بدلتی ہے۔ جب میں نے لکھنا لکھانا شروع کیا اس وقت ذہن میں یہی بات ہوتی تھی کہ جو سوچتی ہوں وہ لکھوں بھی۔ پہلے پہل بچوں کی کہانیاں اور مراسلات وغیرہ لکھے۔ شروع سے ہی اصلاحی پہلو کی طرف رجحان زیادہ تھا۔ پہلا افسانہ بھی اصلاحی پہلو لئے ہوئے تھا۔''

سوال: ''آپ کی اب تک کتنی کتابیں شائع ہو چکی؟''

جواب: ''پانچ کتابیں ہیں۔ جن میں سے دو نظم کی ہیں'' ہم گناہ کا استعارہ ہیں'' اور'' موت کی ریہرسل''۔ یہی زندگی کا حاصل ہیں۔ ایک کتاب'' نقش قلم'' کے نام سے آئی تھی۔ اس میں کافی تعداد میں اصلاحی، سماجی، تحقیقی اور علمی مضامین شامل ہیں۔ باقی دو ناول اور افسانوں کی ہیں۔ یعنی بچپنے کے خواب ہیں۔''

سوال: ''آپ نے شاعری کے علاوہ نثری حوالوں سے بھی شناخت قائم کی ہے۔ اس کی تفصیلات کیا ہیں؟''

جواب: ''جی میں نے افسانے، ناول، مضامین، خاکے، فکاہی تحریریں، انشائیے، کالم فیچرز، ڈرامہ رائٹنگ یا یوں کہئے جس میڈیم میں بھی مجھے لکھنے کا موقع ملا، میں نے لکھا، اور ہمیشہ لکھا۔''

سوال: ''آپ ادب برائے ادب کی قائل ہیں یا ادب برائے زندگی کی؟''

جواب: ''میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں۔ میرے نزدیک قلم محض رومانوی، تفریحی مواد لکھنے یا محظوظ کرنے کے لئے نہیں ہے۔ تخلیق کو بامقصد ہونا چاہیے۔ ادیب کا ہر لفظ اس کی شناخت اور حوالہ ہے۔ وہ اس کے لیے جواب دہ ہے۔ میں نے بہت کچھ ایسا بھی لکھا ہے جو محض تفریح یا اینٹرٹینمنٹ کے لیے ہے لیکن میں اسے سب سے آخر میں شمار کرتی ہوں۔''

سوال: ''قارئین اور ناقدین کی رائے کو اہمیت دیتی ہیں؟ اب تک جو بھی لکھا ہے اس پر کیسا رسپانس ملا؟''

جواب: میں جتنی زیادہ حساس ہوں اتنی ہی بے نیاز بھی۔ میں نے لوگوں کی رائے کو اہمیت دی مگر لکھا وہی جو دل سے نکلا۔ کوئی کچھ بھی کہتا رہے، اپنی ڈگر قائم رکھی۔ ہاں جہاں غلطی ہوئی اسے درست کیا۔ جب میں نے نظم لکھنے کا آغاز کیا تب سے تنقید کا سامنا کر رہی ہوں۔ یہاں جو بھی عام طرز سے ہٹ کر چلنے لگے وہ بھیڑ میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ میں بھی نمایاں رہی ہوں۔''

سوال: ''آپ کے پسندیدہ لکھنے والے جنہوں نے آپ کو متاثر کیا؟''

جواب: ''وقت سب سے بڑا استاد ہوتا ہے۔ شوق، لگن، اور سیکھنے کا جنون ہو تو انسان ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ عذرا عباس، فرحت عباس شاہ، ڈاکٹر ابرار عمر اور امین شیخ صاحب سے شروع شروع میں بہت رہنمائی ملی۔''

سوال: ''اب آتے ہیں ڈرامے کی طرف..... یہ بتائیں ڈرامے کی طرف کب اور کیسے آئیں؟ اب تک کتنے ڈرامے لکھ چکی ہیں؟ اور کس کس چینل کے لیے لکھ چکی ہیں؟''

جواب: 2017ء میں عمیرہ احمد کے ادارے ''الف'' کے ساتھ پہلا ڈرامہ ''امرت اور مایا'' لکھا۔ اس کے بعد پھر بول میڈیا سے وابستہ ہوگئی۔ پہلے نیوز ڈپارٹمنٹ میں تھی۔ پھر اینٹرٹینمنٹ میں ڈرامہ انڈسٹری کے معتبر حوالے نور الہدی شاہ اور عامرہ شاہد کے ساتھ بحیثیت اسکرپٹ رائٹر کام کا موقع ملا۔ یہی وہ وقت تھا جب ڈرامہ نگاری کو باقاعدہ سیکھا اور سمجھا۔ بول چینل کے لئے ایک سیریل لکھتے ہوئے زنجبیل عاصم شاہ سے 'جلن' کے حوالے سے بات ہوئی اور گذشتہ سال یہ سیریل مکمل ہوا جو اب اے آر وائی ڈیجیٹل سے ہر بدھ کی رات آٹھ بجے آن ایر ہوتا ہے۔''

سوال: ''آج کل آپ کا ڈرامہ 'جلن' آن ایر ہے۔ اس پر موضوع کے حوالے سے بہت تنقید ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ آپ اس تنقید کو کیسے دیکھ رہی ہیں؟

جواب: ''بات وہی ہے۔ جب بھی سچائی کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی شور وغل ہوگا۔ سماج اس طرح کے موضوعات پر بریکنگ نیوز تو سن لیتا ہے لیکن اسے ڈراموں کی شکل میں قبول نہیں کرتا۔ اینٹرٹینمنٹ کے نام پر انہیں فینٹسی ہی چاہیے۔ اس ڈرامے میں بھی میں نے ایک سماجی برائی کو

موضوع بنایا ہے، شاید اسی وجہ تنقید ہو رہی ہے۔

سوال: ''ڈرامے میں پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز اپنی مرضی سے حالات کے مطابق لائنز چینج کرواتے ہیں۔ کیا آپ ان کی مرضی سے اسکرپٹ میں تبدیلی کر دیتی ہیں؟ اور آپ اس رویے کو کیسے دیکھتی ہیں؟''

جواب: ''ڈرامہ ایک ٹیم ورک ہوتا ہے۔ بنیادی کردار چینل اور پروڈکشن ہاؤس ادا کرتا ہے۔ چینل کو آئیڈیا ہوتا ہے کہ اس کے ناظرین کس قسم کا مواد دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں وہ اسی حساب سے کانٹینٹ اور پروڈکشن فائنل ہوتی ہے۔''

سوال: ''کیا لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے پاس بہت ساری ڈگریاں ہوں؟''

جواب: ''ڈگریاں تو اچھی نوکریوں کی لیے ہوتی ہیں جب کہ لکھنے کے لیے اپنے اطراف سے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔''

سوال: ''آپ کے نزدیک ادب کا کیا مستقبل کیا ہے؟''

جواب: ''ادب اپنا مستقبل خود بناتا ہے۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ اصناف بدل رہی ہیں۔ مائیکرو فکشن اور پچاس سو لفظوں کی کہانیاں مقبول اور رہی ہیں۔ وقت کی قلت اور بھاگتی زندگی ہے۔ پہلے صرف کتابیں ہوتی تھی اب ڈیجیٹل دور ہے جس نے سب کچھ سمیٹ دیا ہے۔ مگر اچھے، باشعور، تخلیقی ذہن ہمیشہ سے تھے اور ہمیشہ رہے گے اور ادب بھی زندہ رہے گا۔ انشاءاللہ!''

سوال: ''لکھنے کے علاوہ آپ کے کیا کیا مشاغل ہیں؟''

جواب: ''شاید میں لکھنے کے علاوہ کچھ کر سکتی نہ کر سکتی ہوں نا کوئی ایسا شوق پال سکتی ہوں۔ شاید ہی کوئی ایسا دن ہوگا جب میں کچھ نا لکھا ہو۔ کبھی کبھار کھانا پکانے کا شوق بھی جاگ اٹھتا ہے۔ بس یہی زندگی ہے۔''

سوال: ''آخر میں قارئین کے لیے کوئی خاص پیغام جو آپ دینا چاہتی ہیں۔''

جواب: ''علم حاصل کرنا جاری رکھیں..... یعنی اسرار کائنات کو جاننے کا شوق، خود کو پہچاننے کا شوق، سوچنے اور سوال کرنے کا شوق، اور سوال کرنے کی لگن۔ یہی علم اور تعلیم ہے۔''

◂◂ ● ▸▸

Roma Rizvi,436- K Model Town ,Lahore(Pakistan)
03004727997

● خصوصی مضمون

● نورالعین ساحرہ

پاپولر فکشن کے حوالے سے اکیسویں صدی کے ادبی رجحانات وتضادات

''قلم تلوار سے زیادہ طاقت ور ہے''۔(The Pen is Mightier Than the Sword) یہ خیال (Edwar BulwerLytton) نے اپنے تاریخی ڈرامے (Richelieu: or,The Conspiracy Play) میں 1939 میں پیش کیا تھا۔کیا ہمیں آج بھی اس خیال اور خصوصاً ادب کے اس کمال کا معترف ہونے میں کوئی تامل ہے؟ بارھویں صدی عیسوی میں (نشاط ثانیہ،Renaissance) کی ابتداء کے بارے آپ سب جانتے ہیں کہ ابن رشد کے فلسفیانہ خیالات کا اس میں کتنا حصہ رہا.اس سے قبل یونان میں بھی ڈرامہ اور فلسفیانہ تحاریر نے ایک قابل رشک معاشرہ قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کیا تھا۔جن میں (ارسطو Aristotle کی بوطیقا Poetics, اورنکومیکیئن اتھکس Nicomachean Ethics ,) اس کے علاوہ (افلاطون Plato کی ری پبلک Republic,) سب سے قابل ذکر کتب ہیں۔(شیکسپئیر ، Shakespeare کے ٹیمپسٹ ، Tempest) جیسے ڈراموں نے کالونیئل مائنڈ سیٹ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔(پوشکن Pushkin's,) اپنی شاعری اور مزاحمانہ رویے کی وجہ سے (زار Tsar,) کے خلاف گویا تن تنہا کھڑا ہوا تو اس کے پاس سوائے قلم اور ادب کے اور کوئی ایسی طاقت نہ تھی جس سے زار خوف زدہ ہوتا۔ پھر دوستوفسکی ،(Dostoyevsky) کی ذلتوں کے مارے لوگ، The Insulted and Humiliated) اور دیگر ایسی کئی کتب نے انقلابی ذہن سازی میں بہت اہم کردار ادا کیا.(Maxim Gorky) انقلاب کا نقیب اپنی ادبی خدمات کی وجہ سے ہی کہا جاتا ہے۔ان سب کے علاوہ فیض، جالب جیسے دیگر ترقی پسند شعرا نے ہمارے ہاں انقلاب پسندوں کی کھیپ تیار کرنے میں بہت مدد کی۔

اس مضمون میں مجموعی طور پر اکسویں صدی کے ادبی منظر نامے اور خاص طور پر پاپولر فکشن کے

حوالے سے کچھ الجھے سوالات وخیالات سلجھانے کی کوشش کروں گی۔اعلا ادب ہے کیا اور کیوں اس قدر اہم ہے؟ کیا ہم نے بھی قلم کی طاقت کو مانا یا آزمایا اور اعلا ادب کو اپنی تخلیقات کا محور بنایا یا پیسے اور فیم کے لالچ میں پاپولر ادب کی بہتی ندیا میں ہاتھ دھوتے رہے؟ اس موضوع کو بھی زیر بحث لایا جائے گا کہ فی زمانہ ڈائجسٹ میں لکھنا باعث توہین کیوں سمجھا جانے لگا ہے اور کیا واقعی ان میں لکھی ہر تحریر کا بوگس یا کم تر ہونا لازم ہے؟ اس پوائنٹ پر بات بھی ہوگی کہ عالمی سطح پر بہت سے کام یاب مصنفین (Art for Art's sack) کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔۔۔ تو کیا ان سب کا لکھا ہوا ادب بھی صرف اسی وجہ سے پاپولر ادب کہلانے لگے گا؟ ادب میں آمد وآورد کا جھگڑا کیوں ہے، یہ اہم موضوع بھی زیر بحث آئے گا کہ آخر اردو ادب کو عالمی ادبی پیمانوں سے جدا کر کے برصغیر تک محدود کر دینے میں کیا بھلائی ہے؟ یا پھر عالمی تنقیدی پیمانوں کو رد کرنے کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی لایعنی کوشش کیوں کی جاتی ہے کہ برصغیر کا ادب ان پیمانوں کا محتاج نہیں ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ ہم (Hybrid and Upmarket fiction) کے بارے میں بھی تھوڑی سی بات کریں گے۔

اعلی ادب: ایک اہم مفروضہ ہے کہ یہ ہے کہ ہماری دنیا کا کوئی بھی دور اس کی مخصوص علاقائی حدود میں کیسا تھا، ان حالات کا متعلقہ افراد کے ساتھ انفرادی واجتماعی ،نفسیاتی ومعاشرتی ربط کیا رہا، وہ خوب صورت دور تھا، رنگین، پرسکون، خوش حال، پرامن یا پر آشوب، جنگیں، وبائیں، انسانی ترقی، سانحات یا مذہبی شدت پسندی وغیرہ کا اندازہ اس دور کے ادب میں سمٹا ہوتا ہے گویا کسی ایک یا کچھ کتابوں میں اس عہد کی تاریخ رقم ہو چکی ہوتی ہے۔ دورِ حاضر کے وہ ادیب جن کی فکر اور ادب کا مرکز انسان اور اس کی زندگی پر موجودہ حالات اور اس کے اثرات رہے۔ انہوں نے اس تنوع، تغیر کو اپنے اپنے انداز اور مخصوص ڈکشن، سٹرکچر فارم میں پیش کیا۔اعلا ادب میں تکنیکی ،لسانی ومعروضی عوامل کا نفس مضمون اور ابلاغ کے ساتھ متحرک عمل اس میں ایسی پرتوں کو جنم دیتا ہے جو ایک عمومی ذہن کی رسائی میں آنا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ادب قاری کے ذہن پر مثبت انداز میں اثر انداز ہونے کے بعد اس کی زندگی بدلنے پر قادر ہونے کے ساتھ ساتھ اسے بہت سے ایسے نئے زاویوں یا جہتوں سے بھی متعارف کرواتا ہے جو اس کے لیے (An Eye Opener) بھی ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ادب کو اعلا ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے جو ہمارے ہاں اشاعت کے لحاظ سے بہت کم نظر آیا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اکثر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اعلا ادب کو محض مختلف ڈیوائسز ،خوب صورت لسانی تشکیلات ، پیچیدہ تکنیکس اور نہ سمجھ آنے والا علامتی نظام یا بہترین کرافٹنگ وغیرہ کی مدد سے ہی اہم بنایا جاتا ہے جو کہ ایک بڑی غلط فہمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اعلا ادب میں سب سے زیادہ اہمیت آپ کے مذکورہ پیغام اور بہترین نظریہ کی ہے ہاں البتہ باقی سب چیزوں کے نمبر الگ سے شامل

ہوتے جائیں گے جو اسے بھی (Page Turner) بنا دے گا جس کا مطلب بے تابی پیدا کرنے والا یا ریڈا ایبلٹی بہت بڑھا دینے والا ادب۔ مگر سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ پاک و ہند کا وہ عمومی قاری، جسے محض پاپولر فکشن پڑھنے کی عادت ہے اس کے لیے یہ پیچیدہ کیفیاتی نظام یا بھیتر چھپے پیغام سمجھنا ناممکن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ جھنجلا کر اسے ''مقصدی ادب'' یا پھر ''سوچا سمجھا ادب'' یا پروپیگنڈہ ادب کہنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ادب عام قاری کو پاپولر فکشن جیسی آسانی اور روانی نہ دے سکنے کے باعث ذہنی خلجان میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ اس اذیت سے بچنے کے لیے بار بار بھاگ کر تین عورتیں تین کہانیاں یا عام سی ڈائجسٹی کہانیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے۔ کبھی یہ ادب کسی خاص میتھالوجی یا فلسفہ و منطق سے جڑا ہونے کے سبب بھی عام قاری کی ذہنی استعداد سے بڑھ جاتا ہے اور اس کی ناپسندیدہ لسٹ میں شامل ہو جاتا ہے۔

اچھے ادب کو پڑھنے، اسے سمجھ کر منفیت سے دور رہنے اور اثبات کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے ''تربیت یافتہ قاری'' پہلی شرط سمجھی جائے گی۔ ایک ایسا قاری جس کی زندگی کا حاصل کل محض کھانا، پینا، سونا یا بچے پیدا کرنا ہی نہ ہو بلکہ جو بین الاقوامی مسائل و وسائل کے بارے مکمل آگہی رکھنے کے ساتھ ساتھ'' دوسروں کے لیے بھی اچھا سوچتا ہو'' بہترین انسانی قدروں اور سب کے لیے یکساں اور مساوی ہونے پر مکمل یقین رکھے اور ان کے فروغ کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرے۔ بہ قول الطاف حسین حالی......!

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا　　مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ کچھ تخلیق کار کم از کم فیس بک کی حد تک ایسے دیکھے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اعلا ادب صرف اور صرف سمجھ نہ آنے والی عجیب و غریب علامتوں سے ترتیب پاتا ہے یا میتھالوجی میں کسی جدید نظریہ کو مدغم کرنے سے وجود میں آجاتا ہے۔ اس غلط سوچ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے کہنا چاہوں گی کہ تخلیق کو اعلا ادب کے نام پر چیستان بنا دینا تو الٹا ادب کے بارے کم فہمی کو ثابت کرتا ہے۔ کسی بھی بے مقصد تحریر کو محض اس کے پیچیدہ اسلوب کی بنا پر اعلا ادب سے جوڑ دینا، ادب اور قاری دونوں کے ساتھ بے پناہ زیادتی ہو گی۔ اعلا ادب کو بہت آسان عام فہم زبان میں بھی لکھا جا سکتا ہے اور اس میں بھی بہت دل چسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ اس ضمن میں جو بھی لکھا جائے وہ سردست انسانی شعور کی بالیدگی سے مملو ہو۔

اردو ادب میں ہمارے ہاں نثر میں شوکت صدیقی، سعادت حسن منٹو، عبداللہ حسین، رشید امجد، مرزا اطہر بیگ، انتظار حسین، قراۃ العین حیدر، عصمت چغتائی جیسے کئی تخلیق کاروں نے معاشرہ کے ذہنی، سیاسی، معاشی اور فکری المیات کو کمال حسن سے قلم بند کیا ہے۔ شعرا میں حبیب جالب، فیض احمد فیض، ساحر لدھیانوی، تنویر سپرا اہم نام ہیں جنھوں نے ادب برائے زندگی کے نظریہ کو اپناتے ہوئے لکھا۔ یہیں ن۔م راشد بھی ہیں جو کہ ادب برائے ادب کے قائل رہے مگر ان کی نظم ''زندگی سے ڈرتے ہو'' ایک سیاسی و معاشرتی المیہ کا بیان ہے۔

اعلا ادب والے موضوع کو یہاں ختم کرتے ہوئے معذرت کے ساتھ جناب ڈاکٹر طاہر نواز کی کتاب (اردو داستان کی شعریات) میں موجود اس خیال سے اختلاف کی اجازت چاہوں گی جہاں انھوں نے (ماریو ورگاس للوسا۔۔۔ناول نگار کے نام خط) سے اقتباس پیش کیا ہے'' فکشن خاص طور پر اعلا فکشن میں پیش کردہ زندگی کبھی صرف وہ زندگی نہیں ہوتی جسے ان لوگوں نے گزارا ہو، جنھوں نے اسے تصور کیا ہو، لکھا ہو، پڑھا یا تجربہ کیا ہو بلکہ اس کا فکشنی مماثل ہوتی ہے جسے وہ گھڑنے پر مجبور ہو گئے تھے کیوں کہ حقیقت میں وہ ایسی زندگی گزارنے سے قاصر تھے اور نتیجے کے طور پر اس پر قناعت کرنا پڑا کہ اسے صرف بلاواسطہ اور داخلی طور پر تجربہ کریں جس طور پر اس کا تجربہ کرنا ناممکن تھا۔ یہ وہ زندگی ہے جو کبھی واقع نہیں ہوتی۔ ایسی زندگی جو کسی عہد کے مرد یا عورت گزارنا چاہتے تھے، نہیں گزار سکے سو گھڑنے پر مجبور ہو گئے......'')

اب ایسا کیوں نہیں ہے؟ تو اس کی وضاحت ویسے تو مضمون میں جگہ جگہ ملے گی ہی مگر مختصراً میکسم گورکی کے ناول ماں کو ہی دیکھ لیجیے۔ ان کی زندگیوں اور واقعات و مشکلات کی کیسی حقیقی عکاسی کی گئی ہے نیز اس بات کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو (Realism) رئیل ازم کی بہت ساری تخلیقات ویسے ہی اعلا ادب سے خارج ہونے کا خطرہ ہو جائے گا۔ مثلاً شوکت صدیقی کا جانگلوس اور خدا کی بستی اور میکسم گورکی کا ''ماں'' کہاں جائیں گے؟ اس پر شک کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بہت سے اچھے تخلیق کاروں کے بارے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے آپ بیتی کو فکشن کے رنگ میں پیش کیا ہے جیسا کہ دوستوفسکی کے بارے اکثر سننے میں آتا ہے۔ ایک عمدہ تخلیق کے لیے آپ کے پاس خوب صورت تخیل، لغت پر عبور اور اپنے ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادب سے شناسائی بھی بہت ضروری ہے۔ یہ موضوع اس قدر ثقیل ہے کہ خود اس پر الگ سے ایک مضمون بنتا ہے نیز ٹی۔ ایس ایلیٹ نے اپنے مضمون (Tradition and the individual talent) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس مضمون میں ابھی بہت کچھ اور لکھنا باقی ہے تو اس موضوع کو یہاں سمیٹتے ہوئے کچھ اچھی کتابوں کے ریفرنس دے رہی ہوں جو شاید (Creative Writing) میں آپ کی مدد کر سکیں۔

1) اپنی کتاب (Seven Secrets a :Getting into Character Novelist Can Learn from Actors) میں (Brandilyn Collins) لکھتی ہیں کہ ایک بہترین ناول لکھتے وقت ان سات نکات کا خیال رکھنا بہت فائدہ مند ہوتا ہے۔ Personalizing Action Objectives Subtexting Coloring Passions Inner Rhythm Restraint and Control Emotion Memory

2) اپنی کتاب (The Writing Life) میں مصنفہ (Annie Dillard) میں لکھتی

ہیں۔

One of the few things Iknow about writing is this: spend it all, shoot it, play it, lose it, all, right away, every time. Do not hoard what seems good for a later place in the book, or for another book;give it, give it all, give it now. The impulse to save something good for a better place later is the signal to send it now. Something more will arise for later, something better. These things fill from behind, from beneath, like well water. Similarly, the impulse to keep to yourself what you have learned is not only shameful, it is destructive. Anything you do not give freely and abundantly becomes lost to you. You open your safe and find ashes۔

کتاب 3 (Plot &Structure:Techniques and Exercises for Crafting a Plot That Grips Readers from Start to Finish Paperback –October 6, 2004۔by James Scott Bell

پاپولر فکشن اور ہمارا ڈائجسٹی ادب آخر کیا ہوتا ہے؟ جی کے چیسٹرٹن نے کہا ہے کہ

G.K. ?''fiction is a necessity.Literature is a luxury;'')

Chesterton'')۔۔''ادب شاہانہ مسرت کا (حامل) ہوسکتا ہے لیکن فکشن (لازماً) ایک ضرورت ہے'' عرصے سے ہمیں ایک جھگڑا نما مسئلے کا سامنا ہے کہ ادب برائے ادب، پاپولر یا کمرشل ادب آخر ہوتا کیا ہے؟ بہت سے لوگوں کو یہ فریز یا مہا بیانیے سنائی تو دیتے ہیں مگر وہ اس کے مطالب و مقاصد سے قطعی ان جان بار بار یہ سوال دہراتے نظر آتے ہیں۔ سو اس مضمون میں تفصیل سے اس پر بات کرنے کی کوشش کروں گی۔ ویسے تو لغوی معنوں میں '' مشہور ادب '' ایک لسانی الجھن کا سبب بنتا ہے اور اصطلاحی معنوں میں ادب کی اعلا درجہ سے تنزلی مگر مقبولیت کی رو میں اول الذکر سے بڑھتا نظر آتا ہے نیز اس کے موضوعات میں تنوع کے بجائے تکرار کا عنصر پایا جاتا ہے جس کے باوصف قاری کے لیے اس میں کوئی نئی بات یا ذہن کو تبدیل کرنے کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے۔ اس میں نظریات یا عقائد کو غیر حقیقی و غیر معروضی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ شعوری اور لاشعوری سطح پہ کچھ مخصوص روایات اور رسوم کے اندر رہ کر ہی فکشن لکھتے ہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ پہلے سے مستحکم کو مزید مستحکم کرنے کی مسلسل کوشش ان کی تحریر کا حاصل جب کہ کوئی مثبت تبدیلی بے چاری اب یا پھر کبھی نہیں کی مجسم پکار بنی نظر آتی ہے۔ اس تنویمی قسم کے ادب میں مزاحمتی رنگ کا شدید فقدان ہوتا ہے۔ آج کل پاپولر فکشن لکھنے والوں اور داخلیت پسندوں کے فن پاروں کا ڈھیر بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے۔ مغرب میں تو طرح طرح کی طلسمات، عجیب و غریب مانسٹرز، جن اور بھوتوں کی مختلف اقسام اور پھر ان کی ایسی بہتات کہ پڑھنے والے دنگ رہ جائیں۔ اتنی اقسام تو شاید بیکٹیریا کی بھی نہ ہوں جتنی نسلوں اور قسموں کی یہ مخلوقات ان کتب و رسائل میں پائی جاتی ہیں جن کا حقیقی دنیا سے دور دور تک کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے۔ اس سب کے باوجود پاپولر فکشن میں اگر کچھ کمی محسوس ہوتی بھی تو (Harry Potter) اور بریم سٹوکر نے ڈریکولا (Bram Stoker's Dracula) جیسے سلسلے سامنے لا کر ایک بالکل الگ جہت سامنے رکھ دی اور ابدی حیات کا مسئلہ بھی حل کر دیا چاہے وہ ولن کی صورت ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح کے پاپولر فکشن کو اگر آپ'' یہ تو بس تفریح کا ذریعہ ہے'' سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہیں تو ان سٹڈیز اور ریسر چز کو مت بھولیں جہاں یورپ اور امریکی معاشرے میں کچھ خون پینے کے شوقین واقعی پیدا ہو چکے ہیں جو خود کو نہ صرف ڈریکولا کہتے ہیں بل کہ نت نئے کاسٹیومز پہن کر ان کرداروں کی عکاسی بھی کرتے نظر آتے ہیں اور کئی ایک تو باقاعدہ روزانہ خون بھی پیتے ہیں۔ ایسے کچھ جوڑوں کو نیٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔۔ اب یہ ''سوچنے والوں'' کا کام ہے کہ حساب لگائیں آخر ان کی ذہن سازی کس نے کس طرح کی ہے اور پاپولر فکشن کا اس میں کیسا کردار رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فلم اور ڈرامہ جو اب ایک باقاعدہ ''صنعت'' کا روپ اختیار کر کے علی الاعلان اپنے کمرشل ہونے کو فخریہ تسلیم بھی کرتے ہیں۔ ان کی کثیر آمدنی، ایلیٹ رول اینڈ سٹیٹس کا سرمایہ دارانہ مقصد اور حصول دولت بھی بہت حد تک اسی سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ یعنی کہ ایسا ادب قطعاً بے ضرر نہیں جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت معاملہ اس کے بالکل برعکس بل کہ شدید مضر ہے۔ جنسی مواد پر مشتمل ویڈیو گیمز جو آپ کے فون پر ایک کلک سے مل جاتی ہیں ان سب نے اس دور کے بچوں بل کہ پورے معاشرے میں جنسی بے راہ روی کو جو فروغ دیا ہے اس سے کون واقف نہیں؟ ایسی ہی مار دھاڑ سے بھرپور اور جنسی جذبات کو انگیخت کرنے والی گیمز کی وجہ سے لوگوں میں انتہائی منفی (Anti-human) رجحان بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ جو ایک بے حس اور اخلاقی گراوٹ کے شکار معاشرے کی تشکیل کا باعث بھی بن رہا ہے جس کے بے شمار ثبوت (dark web) پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں مقبول عام ڈائجسٹی ادب یا پاپولر فکشن موضوعات کے اعتبار سے اعلا ادب سے بہت مختلف صنف بنا ہوا ہے۔ عام سے مخصوص دائروں میں گھومتا رومان، ہیجان اور سنسنی کی بنیاد پہ لکھا جانے والا ادب جس کی پہلی لائن پڑھ کر ہی انجام معلوم ہو جاتا ہے۔ ایک غریب لڑکی اور امیر لڑکا یا وائس ورسا۔ انتیسویں روزے

کو اچانک ان کا ملن ہو جانا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دعا مانگنے کے تمام موقعے میسر آ جانا۔ دونوں میں شروع میں نفرت پھر اچانک محبت، لڑکی کا سیڑھیوں سے گرنا اور لڑکے کا عین موقعے پر اسے سنبھال لینا۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس قسم کا پاپولر فکشن اپنا معمولی سا اسلوب بھی خود ہی بنا لیتا ہے۔ جس کا متن بہت ہی آسان اور قاری اساس ہے اسی لیے ابلاغ عام سمجھ بوجھ رکھنے والے قاری تک با آسانی ہو جاتا ہے کیوں کہ اسے ذرا سی بھی دماغی مشقت نہیں کرنی پڑتی۔ (با آسانی سمجھ آنے کے باوصف قاری ذہن میں کہانی اور کرداروں کے بارے در آنے والے مفروضات کی خود بہ خود تصدیق پاتا چلا جاتا ہے یعنی کئی بار پہلے سے سنے، سمجھے کو ہی مزید سنتا سمجھتا رہتا ہے)۔ یوں اس کے ذہن میں موجود مغالطے اور رجحانات مزید راسخ ہو جاتے ہیں ہیں۔ اس کا نتیجہ عوام الناس کے فکری رویہ سے بہ خوبی ہو سکتا ہے جن میں بحث، تنقید اور دلائل پر غور تک کرنے کی روش نہیں نظر آتی، منطق اور سائنسی انداز فکر تو بہت فاصلے پر جا چکے۔ ایسے ادب میں دماغی صلاحیت بڑھانے کی کوئی گنجایش موجود نہیں ہوتی۔ ایسے ادب کے قاری شعوری اور لاشعوری سطح پہ مخصوص مذہبی، سماجی، معاشرتی روایات اور رسوم کے سختی سے پابند ہوتے ہیں۔ یہ لکھنے والوں کی اکثریت انسان اور انسانیت کو اہمیت نہیں دیتی بل کہ صرف اپنے تمدن، مذہب، سماج کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔ ان کے ہم سماج ہیرو ہمیشہ با کردار بہت پاک صاف، نیک و پارسا ہوتے ہیں اور مخالف ہمیشہ ولن کی صورت دیکھے جا سکتے ہیں۔ (اس کے برعکس اعلا ادب میں اس کے بالکل الٹ صرف سچائی اور انسانیت کو فوقیت دی جاتی ہے انجام خواہ کچھ بھی ہو)۔ زیادہ تر پاپولر فکشن انسانیت پسند ہونے کی بجائے منفی اقدار کا حامی اور فرقہ پرستی کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یوں کسی نہ کسی درجہ پر اس میں تعصب کا مادہ موجود ہوتا ہے۔ ایسا ادب نہ صرف انسانی ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنتا ہے بل کہ اسے ماضی کے دھندلکوں میں گھسیٹتا صدیوں پیچھے رہ جانے پر مجبور بھی کرتا ہے۔ پاپولر ادب لکھنے والے اکثر قلم کار خاص طور پر سب سے زیادہ مذہبی کارڈ استعمال کرتے ہیں اور ناسمجھ بھیڑوں کے ریوڑ نما عوام کو آسانی سے اپنے پیچھے لگانے اور ہانکنے میں کام یاب ہو جاتے ہیں۔ صدیوں پہلے سے لگی لکیروں کو خوب جی بھر کر پیٹنے کے بعد آگے بڑھنے کی بجائے اس سے بھی پچھلی صدی کی لکیروں کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر کے ہاں غلط رسم و رواج کے خلاف مزاحمتی رنگ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے اور الٹا ان کی غلط پاس داری کی روایت کا علم بلند نظر آئے گا۔ ایسے ادب کی بہترین مثالیں ہمارے ہاں آج کل پاپولر یا ڈائجسٹی کہانیوں اور ناولوں میں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ جہاں صدیوں سے ایک ہی کہانی نام بدل بدل کر دہرائی جا رہی ہے۔ وہی حالات وہی واقعات وہی نظریات وہی زاویے حتی کہ کھانے اور کپڑے تک وہی چلے آ رہے ہیں جو پچاس سال پہلے ہوا کرتے تھے۔ ان لکھنے والوں کو بین القوامی چھوڑ، مقامی مسائل و وسائل یا انسانی

ارتقائی مدارج سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا مقصد نام کمانا اور پیسہ بنانا ہے۔ پاپولر ادب میں اگر کچھ مختلف نظر آتا بھی ہے تو وہ محض تخلیقی کرداروں کے انتہائی مشکل اور مضحکہ خیز نام ہیں۔ جو انفرادیت کے اندھے شوق میں عجیب و غریب معنی لیے انسانی عقل دنگ کرنے کے لیے کافی ہیں مثلاً ہیرو یا ہیروئن کا نام کچھ اس ٹائپ کا ہوتا ہے (صلا المیام راستین- پوچھنے پر اس نام کا مطلب کچھ یوں بتایا جاتا ہے کہ آدھی رات کے چاند کے پیچھے جنوبی ایشیا میں ایک ہاتھ دل پہ رکھ کے ترچھے پہاڑ کے الٹے جھکاؤ کے دوسری طرف جوادھوری کہکشاں نظر آتی ہے اس کے اندر موجود ساتویں نمبر پر نیلا نظر آنے والا سیارہ جو ایک بڑے ستارے کے دائیں طرف آدھا چھپا ہوتا ہے، جو ٹوٹے ہوئے لکڑی کے بنچ پہ آدھی رات کے وقت الٹا کھڑے ہونے سے نظر آتا ہے)۔ اب آپ بھلے پانچ سال تک ایسے ناموں اور ان کے عجیب و غریب مطلب پر غور کریں یا دیواروں میں سر ٹکرائیں اور اپنی کم عقلی پہ جی بھر ماتم کناں ہونے کے باوجود کوئی واضح سینس نہ بنا پانے کے جرم میں خود اپنے ہی بال نوچا کریں تو بھی کچھ عجب نہیں۔

زیادہ تر پاپولر ادب اکثر پروپیگنڈہ ادب کا پرچارک بھی ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے کسی منفی یا خاص مقصد، نظریہ یا زاویہ کو ابھارا جاتا ہے۔ ایک روایتی قسم کے پاپولر ادب کی مثال لیں تو جیسا کہ اکثر ڈراموں اور افسانوں میں ساس، بہو کی آپسی جنگ، سازشیں تباہ کاریاں، ڈرامے بازی کا بیان نما بہتان اور چھوئی موئی فرشتوں کو مات دیتی رومانوی کہانیاں شامل ہیں جن کا حقیقی زندگی سے دور کا بھی تعلق نہیں۔۔ جو معاشرے میں عورت کا کردار مضبوط بنانے کی بجائے اسے کم زور سے کم زور تر بناتا چلا جاتا ہے اور اسے اخلاقی سطح پر انتہائی پست بھی ظاہر کرتا ہے۔ عورت کو بلا وجہ کبھی سازشی اور کبھی مظلوم ترین بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ایک اور بھی عجیب بات نسائیت کے بارے سٹیریوٹائپنگ ہے۔ جس کی رو سے اکثر کسی نسائی کردار کی جسمانی ساخت بگاڑ کر انہیں بدصورت ثابت کیا جاتا ہے۔ جیسے پاؤں پیچھے کو مڑے ہونا، گنجا ہونا، ایک آنکھ، تین آنکھیں، آنکھیں یا گردن مڑی ہونا، خون آشام ہونا، پچھل پیری اور چڑیل اور پھر ان کی پسندیدہ خوراک میں بچوں کا شامل ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں معاشرتی سٹیریوٹائپس کی ملاوٹ ہونے سے لاشعوری طور پر قاری کے دماغ میں ایسا ہی تصور قائم ہونے کے بعد مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے جس کا اطلاق سامنے موجود اس انسانی گروہ پر ہی ہو سکتا ہے جس میں مماثلت یعنی تانیث پائی جاتی ہو۔ سو عورت جیسی بھی کیوں نہ ہو اس کے مکر و فریب اور چال بازی سے اپنے مقاصد (جو اکثر منفی ہی ہوتے ہیں) کا حصول فقط ماضی کی داستانوں، اساطیر اور لوک کہانیوں تک ہی محدود نہیں بل کہ ماضی قریب اور عصرِ حاضر کے پاپولر فکشن میں بھی اپنی کسی نہ کسی نئی شکل میں ہر وقت موجود ہوتا ہے (پنجاب کی کچھ لوک داستانیں اور لکھنؤ کی کچھ مثنویاں اس مثال میں شامل نہیں)۔ انڈو پاک کے اکثر اردو حلقوں میں ادب کا ثقافتی مطالعہ نہ

ہونے کے برابر ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھیں صرف لکھنے کا جنون نہیں بل کہ عالمی ادب پڑھنے اور سمجھنے سے بھی گہرا شغف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریب کے کچھ عشروں میں ادبی صورتِ حال وہ رخ لے چکی ہے کہ جس کا کسی ترقی پذیر قوم کے لیے معاشی یا معاشرتی ترقی میں حصے دار ہونے کا تصور بھی محال ہے۔ ابھی تک ہمارے کچھ ایسے قلم کار بھی ہیں کہ تصوف اور مجازی عشق سے، عشق حقیقی تک کا سفر ان میں سے سے اکثر کا من پسند موضوع ٹھہرتا ہے جانے کیوں! جب کہ یہ کام صدیوں میں اپنی جزئیات تک کو مکمل کر کے اب جامد ہو چکا ہے اور اکثر قاری، ادیب سے بھی کہیں زیادہ اس موضوع پر دست رس رکھتے ہیں یعنی یہاں نئے کے نام پر کچھ بھی ملنے کی قطعاً توقع رکھی نہیں جا سکتی۔ پاپولر کا ایک اور ہم رخ یہ ہے کہ ایسے بہت سے ادیب ہتھیلی کا چھالا بنے جنھوں نے نا صرف تمام انسانی مسائل کو یک سر نظر انداز کر دیا بل کہ کسی ایشو کو اٹھایا بھی تو (Hedonism) کو اپنا ہتھیار بنا کر ''ادب کا کاروبار'' خوب چمکایا۔ ان ہی میں سے اکثر ایسے بھی ہیں کہ جن کو انسانی مسائل نظر تو آئے مگر کافکا کی طرح اسے قسمت کا لکھا مان کر اپنا سر تسلیم خم بھی کر دیا۔ کچھ ترقی پسندی کے دعوے دار بھی آسمانی آفتوں سے بچاؤ کے لیے اپنے روحانی پیشواؤں کے در پر مستقل حاضر رہے۔ میدان میں آ کر لڑنے کی بجائے مسائل اور انکی (paranormal) روحانی توجیہات گھڑ گھڑ کے صبر و شکر پر قانع ہوئے اور اسے اپنی روحانی قوتوں پر محمول کر کے قاری کو جی بھر بے وقوف بنانے میں کام یاب رہے۔ حیرت ہے ابھی تک بے شمار لوگ ان کے نام کا کلمہ پڑھنے سے باز نہیں آتے۔ غیبی امداد کے منتظر یہ رجعت پسند ادبی قبائل ہر مسئلے کے حل کے لیے ہاتھ پیر ہلانے کی بجائے اپنی نظریں خود بھی آسمان پر گاڑے رہتے ہیں اور یہی حال ان کے فکشن میں موجود متن کا بھی ہوتا ہے۔ یعنی ''کچھ کر گزرنے کا جذبہ'' اور ان کا عملی رجحان ہمیشہ نہ ہونے کے برابر رہا ہے جس کی وجہ سے ان کے ادبی تصورات بھی کمی یا کجی کا شکار رہے۔ ان کی نسبت وہ ادیب ہمیشہ آڑے ہاتھوں لیے جاتے رہے جنھوں نے ان مسائل کو اپنے متن میں نہ صرف خصوصی جگہ دی بل کہ ان کی وجوہات کو سامنے لانے کی سرتوڑ کوشش بھی کی جس کے اثرات معاشرے میں موجود ہوں اور تبدیلی لا سکتے ہوں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد (Anarchy) انتشار کی حالت نے پوری دنیا کے ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس دوران کچھ ادیب یاسیت کو ہی فکشن میں ڈھالتے رہے، کچھ نے ردعمل اور نئی تشکیل کی طرف قدم بڑھائے اور کچھ اپنی ہی داخلیت میں کلی طور ہر کھو گئے اور اسی سے اپنے ادب کو تخلیق کرنے لگے۔ ان کی تو الگ ہی دنیا ہے جس سے وہ باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے اور شاید اپنے قارئین کو بھی سلائے رکھنا چاہتے ہیں۔ (یہاں داخلی ادب سے اختلاف نہیں بل کہ قنوطیت و نرگسیت زدہ داخلی ادب زیر بحث ہے)

آمد اور آورد کا مسئلہ: عصری فکشن میں ایک اور اہم بحث جس کا شاید سب بھی نہیں معلوم ہو سکتا وہ

آمد اور آورد کا ہے۔ عموماً پاپولر ادب کی تخلیقی تفہیم میں ''آمد'' ایک نہایت اہم زیر بحث موضوع ہے اور جن معنوں میں ہمارے ہاں رائج ہے اس میں ادیب کسی ماورائی ہستی سے کم ہو ہی نہیں سکتا (یعنی کہ اسے کہانی اوپر سے کہیں وحی کی صورت ''عطا'' ہوتی ہے اور وہ بغیر سوچے سمجھے بند آنکھوں کے ساتھ کاغذ پر اتار دیتا ہے) جیسے مضحکہ خیز تصور کا وجود ہی بہت حیرت انگیز ہے۔۔ اس کے علاوہ کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ ''شاید یہ چُنے جانے اور برگزیدہ کہلانے کی مریضانہ خواہش کا عکس ہو تو ہو، اس کے سوا کچھ بھی نہیں''۔ ہمارے یہاں کچھ ادباء کی سوئی ''آمد'' پہ اس قدر اٹکی رہتی ہے کہ وہ خود کو خود ہی کسی پیغمبر یا ولی سے کم درجہ دینے پر کسی صورت تیار نہیں ہوتے جن پر تخلیق کسی وحی یا الہام کی صورت نازل ہو کر انہیں اس خصوصی منصب کا اہل ثابت کرتی ہے۔ ایسے تمام لوگ باقی سب کو نقلی (آورد) سمجھتے اور اپنے تئیں ''اصلی اور سچے ادیب'' ہونے کے داعی ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھنے پر تیار نہیں کہ ''آمد'' یعنی کسی تخلیق کا لاشعور سے شعور کی سطح پر آنا کوئی الہام یا وحی ہرگز نہیں ہوتی نہ آسمان سے اتری کوئی خاص کیفیت بلکہ یہ تو لکھنے کا ایک خاص موڈ یا ذہنی رو ہے جس کو آزادی اظہار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے آپ شاید ہر وقت لکھنے کے خاص موڈ میں نہ ہوں لیکن جب بھی چاہیں تو اسی کیفیت کے زیر اثر لسانی تشکیلات کو متن اور اسکے تناظر سے جوڑا جاتا ہے۔ مسائل اور وسائل کو بہتر انداز میں کہانی کی صورت تشکیل دے کر جو حتمی شکل دی جاتی ہے اسے ہی ''آورد'' کا نام دیا جاتا ہے اور سب ایسے ہی تخلیق کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اس کا تعلق کسی بھی طرح کسی پیرانارمل ایکٹیوٹی یا پیغمبری سے جڑا نہیں ہوتا بلکہ صرف آپکے مزاج، وقت، واقعات کے تسلسل، فرصت، ذہنی یکسوئی وغیرہ کے باہمی طور پر ایک خاص تناسب سے یکجا ہونے کا نام ہے۔ ویسے فکشن کو محض خواب کی طرح دیکھنا، لکھنا اور جاگتے سورج میں تلخ اندھیری حقیقت کشید کرنا دو الگ الگ انتہائیں یا بالکل مختلف صورتیں ہیں۔ اس میں پہلا والا شاید ''آمد'' کے وجود کا متقاضی ہو سکتا ہے مگر دوسرے کے لیے آورد کے معنوی جہاں کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ اب ایک سب سے اہم سوال۔۔۔! کیا ہم یہ طے کر لیں کہ ڈائجسٹ ہمیشہ سے ایسے تھے یا ایسے ہی رہیں گے؟ تو اس کا سیدھا سا جواب ہے کہ ''بالکل نہیں''۔ قصور بے چارے غریب ڈائجسٹ کا ہرگز نہیں ہے۔ اس کی بدقسمتی ہے کہ اسے ایک خاص قسم کے قاری اور لکھاری کم پیسوں میں بہت آسانی سے گھر بیٹھے میسر ہو گئے ہیں۔ طلب و رسد کا یہ قانون خوب سہولت سے پھل پھول رہا ہے۔ اس تصور کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ''جگاڈاکو، مولاجٹ'' ٹائپ فلموں کا تسلسل، معیار اور مقبولیت کی وجوہات پر غور کرنا ہماری بہت مدد کر سکتا ہے۔ ڈائجسٹ شروع میں ایسا بالکل نہیں تھا۔۔ تمام بڑے بڑے مصنفین ان ہی میں لکھ لکھ کر مشہور ہوئے ہیں۔ تب ان کا معیار بہت بلند ہوتا تھا۔ ابھی بھی کسی ڈائجسٹ میں کوئی بہت خوب صورت تخلیق ایسی مل جاتی ہے جسے اعلا ادب میں شمار کیا جا سکے مگر شاذ و نادر ہی ایسا ہو پاتا ہے۔ ان

سب باتوں کے باوجود ہم انہیں یک جنبش قلم رد نہیں کر سکتے کیوں کہ نئے ادباء کو سامنے لانے میں یہی ڈائجسٹ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ یہی مدیر نئے لکھنے والوں کو اعتماد دیتے ہیں اور ریڈر شپ بھی۔ ہمیں ان پر ناراض ہونے کی بجائے الٹا ان کے شکر گزار ہونا چاہیے لیکن ہاں ہم ان سے درخواست ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ براہ مہربانی اپنا معیار کچھ بلند کر لیں اور ان میں لکھنے والے لوگ بھی اعلا ادب کو ''مقصدی ادب'' سمجھ کر دھتکارنے کی بجائے معاملہ کی سنگینی پر غور فرمائیں۔ اگر ایڈیٹر صاحبان اب بھی کوئی پیمانہ یا معیار طے کر لیں۔ رواروی یا کسی لالچ، گروپ بندی، صنفی امتیاز یا پرچی وغیرہ کا لحاظ نہ کریں اور عمدہ معیاری تخلیقات کو اپنے جراید میں جگہ دیں تو ان کا معیار پھر سے بڑھنے لگے گا اور لوگ کسی معیاری جریدے میں چھپنے کو اعزاز سمجھیں گے۔(Art for Art's sack) اور پر ہم نے پاپولر فکشن کے وہ نکات بتائے ہیں جو ادبی دنیا میں فائدے کی بجائے نقصان کا باعث بنتے ہیں لیکن کیا سارا پاپولر ادب ہی اس پیمانے پر اترتا ہے جیسا کہ اکثر ہماری ڈائجسٹی کہانی میں مذکور ہوتا ہے؟ یا پھر جیسے ہمارے اکثر ادب برائے ادب کے بارے قاری اور قلم کار یہ گمان کرتے ہیں کہ ایسا ادب فقط حس جمالیات کی تسکین کے لیے لکھا جاتا ہے اور ہمیشہ ایسا ہی لکھنے یا پڑھنے کی کوشش بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک مغالطہ ہے۔ ادبی تخلیق کو نئے، خوب صورت اور منفرد پیرایہ میں پیش کرنے کے یہ معانی بالکل بھی نہیں لیے جا سکتے۔ ادب برائے ادب کی کئی تخلیقات میں انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی، نفسیاتی و معاشرتی مسائل کو بہت شدت سے بیان کیا گیا ہے۔ جدیدیت کے عظیم شاعر ٹی ایس ایلیٹ کی ''ویسٹ لینڈ''، ''سونگ آف الفریڈ پروفروک''، آسکر وائلڈ کی ''ہیپی پرنس'' اور پاؤلو کویلھو کی ''دی الکیمسٹ'' وغیرہ جیسی سبق آموز کہانی اور معاشرتی نفسیات پر لکھے گئے کچھ طنزیہ ڈرامے، ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ ادب برائے زندگی کا نظریہ رکھنے والوں میں بھی اس تصور سے کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ یہ صرف اس وقت سامنے آتا ہے جب آرٹ فار دی آرٹ سیک کا نعرہ لگانے والے انسانی اعلا قدروں اور مسائل کو یک سر فراموش کر کے محض حظ اٹھانے کے لیے ایسی تحاریر کا ڈھیر لگاتے جائیں جن سے بنی نوع انسان کو ارتقاء میں کوئی مدد نہ مل سکے۔ ادب برائے ادب (Art for Art's sack) کا تصور یہ ہے کہ تخلیق میں آرٹ کو بہت زیادہ اہمیت دی جائے۔ یہ تو ویسے بھی ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی تخلیق میں آرٹ کی نزاکتوں کا خیال رکھے۔ یہ کوئی خامی نہیں اور نہ ہی ادب برائے زندگی کے تصور سے متصادم یا اس کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ سو اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آرٹ فار آرٹس سیک کوئی بری چیز ہے تو ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ اگر یہ سچ ہوتا تو ہم (جمالیات ۔۔۔ Aestheticism), (جدیدیت، Modernism)، (مابعد جدیدیت Post Modernism) (ساختیات، structuralism) کے ماننے والوں کو کہاں رکھیں گے؟ جو آرٹ کو

آرٹ سیک میں دیکھنا ہی پسند کرتے ہیں کیوں کہ کچھ بھی اعلا ادب میں تخلیق کرتے ہوئے وہ ان میں موجود ڈیوائسیز کو استعمال کرتے ہوئے تخلیق کا معیار بہت بڑھا دیتے ہیں۔ ایسا بالکل نہیں ہوتا کہ خوب صورتی سے لکھتے وقت ان کا ادبی معیار کسی کم تر سطح یا بیک گراونڈ میں چلا جاتا ہو اور اس میں موجود انسانی قدروں کی اہمیت کم ہو جاتی ہو۔ وہ آرٹ کو صرف ایک خالی خولی نعرے یا محض تبلیغ سے بچانا چاہتے ہیں۔ ان میں جمیز جوائس، ٹی ایچ ایلیٹ، ورجینیا وولف وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اس کے علاوہ (Paulo Coelho) کی الکیمسٹ (The Alchemist,) پاپولر ادب ہونے کے باوجود بہت عمدہ تخلیق ہے اور اسی لیے دنیا کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ٹم اوبرائن نے ادب کے بارے میں کہا تھا''(That's what fiction is for. ''It's for getting at the truth when the truth isn't sufficient for the truth.'') Tim O'Brien? فکشن جہاں انسان کو ڈراتا اور خوف سے لرزاتا ہے وہیں ہیجان برپا کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی رکھتا ہے اور ایسے ہی اچھائی، برائی کی ترغیب بھی دیتا ہے۔ کبھی ہنساتا، رلاتا تو کبھی جذباتی پن کی آخری حد پر لے جا کر کچھ بھی کر گزرنے کو اکساتا ہے۔ شاید اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ ادب زندگی کو سچائیوں سے روشناس کرانے کے علاوہ شعور کو بہکانے، سلانے اور جگانے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ فکشن ابتداء سے یہ تمام خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ امریکی ادب کی تاریخ دیکھیں تو ہر عہد میں مختلف فکشنز سامنے آئے۔ آج اگر سائنس فکشن کا عروج ہے تو اس کی بھی وجہ ہے۔ ہپی کلچر، جینز اور ہیٹ جنریشن کی نفسیات نت نئے رنگ ایک الگ ہی دنیا بنائے ہوئے تھے۔ ترقی یافتہ اقوام کے اپنے سماجی مسائل اور الگ ہی ترجیحات ہیں۔ سائنس فکشن کو بھی ان ماہرین نے پاپولر فکشن کے رنگ میں لکھنے میں خاطر خواہ کام یابی حاصل کر لی ہے۔ جیسے جیسے معاشرت بدلتی جاتی ہے ویسے ویسے فکشن کے موضوعات اور اسلوب بھی بدلتے جاتے ہیں۔ اگر شعور کی رو کی تحلیل نفسی کی جا سکے تو شاید اندازہ ہو کہ جیسے ہی انسان خارج سے باطن کا سفر شروع کرتا ہے، اس کا لاشعور حرکت میں آ جاتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں لاشعور کی دھند میں تلاش کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور جب خارج میں خطرات، اضطراب اور بے چینی ہو تو باطن کا مضطرب ہونا ایک طے شدہ امر ہے، بے چینی، تضادات خوف اور وسوسے انسانی ذہن پہ بھوکے گدھ کی طرح منڈلانے لگتے ہیں۔ آج کا حساس اور باشعور پاکستانی ادیب اور اس کا شعور بری طرح دہشت گردی، سماجی، ثقافتی، لسانی ساختوں، سیاستوں اور بحرانوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ ناول اور افسانہ میں جگہ جگہ بارود، بم دھماکے، انسانوں کی چیخیں، دھاڑیں، التجائیں انسانی بے بسی کی تصویریں بنی اسپتالوں کو دوڑتی، سائرن بجاتی ایمبولینسز زخمیوں کو بچاتے دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہیں۔ حالیہ واقعات تو اس قدر لرزا

دینے والے ہیں کہ جب بھی آرمی پبلک سکول پشاور، شہر قصور اور زینب جیسی ہزاروں معصوم بچیاں یا سانحہ ساہی وال جیسے بچوں کی شکلیں سامنے آتی ہیں تو کھانے، پینے، سونے جاگنے کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔ آج کل نیا اہم ایشو کووڈ 19 (Coronavirus (COVID-19)) کرونا نے دنیا کی تاریخ بدل دی ہے۔ ایسا لگتا ہے دکھ کے یہ تمام لمحے وقت کی سرد تاریخ میں ہمیشہ کے لیئے منجمد ہو گئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس وقت اردو فکشن عصری زندگی کا پرتو ہی ہے۔ اس کو ہم دوسرے لفظوں میں تناظر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یوں تو انڈو پاک میں انسانی، معاشی اور ثقافتی صورت حال کم وبیش ایک جیسی ہے مگر آج کل کا فکشن دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید انڈین تناظر پاکستان سے کچھ مختلف ہو چکا ہے۔ وہاں موجود لکھنے والوں کے تمام مسائل بالکل ویسے نہیں ہیں جیسے پاکستانی ادیبوں کو درپیش ہیں۔۔ ویسے تو ٹی وی چینلز اور سوشل میڈیا کے سبب پاکستان میں ہونے والے ہر بم دھماکے کی گونج دنیا کے کونے کونے میں ہر ذی شعور انسان کو لرزاتی ضرور ہوگی لیکن پھر بھی شاید جو تجربہ ایک پاکستانی ادیب یا ادیبہ کا اس ضمن میں ہوگا وہ دنیا کے کسی اور خطے میں موجود ادیبوں کو اس طرح نہیں دہلا سکتا جیسے ان کے حواس پہ طاری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اقسام کے گہرے ثقافتی جبر نے ان کے قلم پر طرح طرح کی قدغن لگا رکھی ہے۔

آسکر وائلڈ نے اپنے ڈرامے میں ادب کے بارے کہا تھا کہ ''The good ended happily, and the bad unhappily. That is what Fiction means.'' Oscar Wilde, The Importance of Being Earnest'' ادب اپنے سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ انڈو پاک میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حد سے بڑھتی ہوئی کرپشن، غریبی، بے انصافی اور وسائل کی کمی نے ان میں سے اکثر ادیبوں کو یاسیت کی طرف مائل کرنا شروع کر دیا۔ پھر بدلتے وقت کے ساتھ حالات نے پلٹا کھایا اور تجریدیت کی طرف مائل اکثر ادیب ان حالات کے سامنے سینہ سپر ہونے کا عزم لے کر ان ہی مشکلات سے خوشیاں کشید کرنے پر کمربستہ ہو گئے۔ دبا دبا احتجاج پھیل کر مزاحمتی ادب کی طرف رجحان تیزی سے بڑھانے لگا ہے۔ انڈین تناظر میں بھی اپنے سماج کو لے کر غیر یقینی صورت حال کا خوف، ذلت، دلت اور اسلام کی وجہ سے اضطراب بہ ہر حال موجود ہے اور یہ اس خطے کے ادب سے جھلکتا دکھائی بھی دیتا ہے۔ دہشت گردی کے موضوعات، سانحہ بابری مسجد کے بعد کی صورت حال، سرمایہ دارانہ نظام اور استحصال کی کہانیاں ان کے موضوع بھی بنتے رہتے ہیں۔ شہری زندگی کے مسائل نے انسان کو کیسے مشین بنا دیا ہے یا انڈین میڈیا اور فلم انڈسٹری کے اثرات ادب میں کیا تبدیلی لاتے ہیں، اس کے علاوہ اکثر انڈین ادیبوں کا جھکاؤ انفرادی خواہشات، خوابوں کی شکست ریخت اور جنسی مسائل کی طرف بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے جلو میں کوئی گہرا نفسیاتی مشاہدہ اور مطالعہ بھی

شامل ہے۔ کچھ موضوعات ایسے بھی ہیں جہاں یہ تمام انڈو پاک کے ادیب ایک ہی چھتری تلے کھڑے نظر آتے ہیں۔ جیسے ان کے معمولات زندگی، دفاتر اور اداروں کی کرپشن اور اس معاشرت کے فرد کی داخلی زندگی پہ اثرات، سماجی گھٹن، روایات کا جبر اور عورت کی بقاء کی جنگ۔ عورت اس فکشن میں پوری دنیا کے ادب میں ایک اہم اور ووکل کیریکٹر کے طور پہ سامنے آتی ہے۔ ان کچھ ادیبوں نے اپنے ادراک اور شعور سے عورت کو ایک جیتی جاگتی ہستی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی جو مزاحمتی بھی ہے لیکن ساتھ ساتھ گھٹن اور روایات کے جبر کا شکار بھی ہے۔ یہی نسائی پیچیدگی اس عہد کے فکشن کو ممتاز کرتی ہے۔ آج کے عہد کے موضوعات میں ((paradox) پیراڈوکس (اس ضمن میں کنفیوژن بھی کہا جا سکتا ہے) بھی اس لیے سامنے آ رہے ہیں کہ زندگی خود بھی کئی قسم کے متناقضات کا شکار ہو چکی ہے۔ ساٹھ کی دہائی کے بعد جب جدیدیت پسندی کے اسلوب نے افسانہ نگاروں کو متاثر کیا۔ ان کی تحریروں نے ایک خاص طریقہ سے فکشن نگاروں کی ذہن سازی کی، کافکا کے اثرات بھی واضح طور پہ دیکھے گئے۔ یاسیت پسندی بھی عروج پہ رہی اور اس کا تسلسل آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ پاکستانی فکشن نگاری میں ایک اور تقسیم بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ایسا فکشن بھی موجود ہے جہاں فکر و فلسفہ، معاشرت، سماجی و سیاسی آگہی، نفسیات، سماجی جبر و گھٹن، جہاد و دہشت گردی، انارکی اور جنسی گھٹن جیسے مسائل شامل ہیں۔ علامتی افسانوں سے پہلے یہاں صرف داستان گوئی یا کہانی پن کا رواج تھا اور ابلاغ پر ہی سارا فوکس کیا جاتا تھا۔

اس کے بعد حقیقت نگاری کا دور شروع ہوا جو کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ جیسے زندگی ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہتی ویسے ہی ادب میں بھی تبدیلی کا عمل ناگزیر ہوتا ہے، اسی لیے اب مختلف تکنیکس میں افسانہ لکھا جا رہا ہے۔ جیسے کافکا اور ورجینیا وولف کا زمانہ مضمون اور اسلوب دونوں میں نئے تجربے کا زمانہ تھا اسی طرح اردو فکشن کے کردار بھی مختلف تبدیلیوں سے مسلسل گزر رہے ہیں۔ اب تو ایسی غیر یقینی صورت حال بھی آ گئی کہ بیسویں صدی کے آخر تک ابہام، انتشار، مرکز گریز زندگی، افراتفری، مارکیٹ، اصراف کا کلچر اور کرداروں کی جگہ مختلف ''ایشوز'' زیادہ اہمیت حاصل کر گئے ہیں۔ شہری زندگی کے مسائل کی نوعیت دیہی زندگی سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی دیہاتی کرداروں کی زندگی اور شہری معاشرت میں فرق ہوتا ہے۔ مقامیت کے ساتھ ساتھ عالمگیریت بھی آج کے افسانے کا موضوع بن گئی ہے۔ اب پاکستان اور انڈیا کے مضافات میں کوئی کردار ایک سطح پر اگر مقامیت سے جڑا نظر آتا ہے تو دوسری سطح پہ عالمگیریت سے بھی اتنا ہی وابستہ ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ انٹرنیٹ کی سہولت کے ساتھ بڑے پیمانے پہ انسانوں کی وسائل کی خاطر ترقی یافتہ ممالک کی طرف مسلسل ہجرت کرنا ہے۔ یہ تارکین وطن جسمانی طور پر تو یورپ اور امریکہ کینیڈا اور آسٹریلیا میں آباد ہیں مگر ذہنی اور نظریاتی طور پہ اپنی جڑوں سے وابستہ ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو سماجی و

نفسیاتی مسائل (Diasporic Literature)'' ڈیاسپورا ادب '' کی صورت سامنے آ رہے ہیں وہ اس عہد کے فکشن سے پہلے اتنی شدت سے کبھی موجود نہیں تھے۔ سوشل میڈیا کے ظہور کے ساتھ ہی اردو ادب اور خاص طور پہ اردو فکشن کی ترویج کے سلسلے میں کوششیں تیز تر ہوگئی ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں میں رہنے والے باشعور اور سنجیدہ ادیبوں نے اردو فکشن کے فروغ اور آپسی باہمی رابطے کے لیے مختلف فیس بک فورمز کا اجرا کیا اور میڈیا کو اپنا وسیلہ بنایا۔ جہاں دنیا بھر کے سینکڑوں ادیب اپنی تازہ ترین نگارشات کے ساتھ جلوہ گر ہو کر قارئین کے ساتھ اپنے علمی اور تنقیدی رشتوں کو مضبوط کر رہے ہیں جو کہ ایک خوش آئند بات ہے۔۔۔لیکن اس کا ایک منفی رجحان یہ بھی ہے کہ یہاں زیادہ تر '' کچھ بھی'' لکھا جا رہا ہے مگر پڑھنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ اکثر فیس بک فورمز ان دنوں ایڈورٹائزنگ یا کمرشل اسکرین کی طرح استعمال ہو رہے ہیں جہاں غیر میعاری تصانیف و تخلیقات کی بھرمار ہے۔ جس کی وجہ سے ادب کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچنے کا احتمال ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موضوعات، بیان، تخلیق کو تنوع اور عالمی ادب سے موازنہ کے ساتھ اپنایا اور لکھا جائے۔ اگر ڈائجسٹی پاپولر ادب کو یونہی پھلنے پھولنے دیا گیا تو شاید یہی کیفیت یعنی جمود آتی دہائیوں تک تغیر کی خواہش کو بھی کاہلی کا شکار کر دے اور قاری ہر قسم کے ادب کو فضول، لغو۔ اور اس کی قرات سے ہی خود کو مستثنیٰ قرار دے ڈالے۔

عالمی ادبی اور تنقیدی پیمانوں سے خفگی کا اظہار: ایک بڑے طبقہ کی طرف سے اکثر سننے میں آتا ہے کہ مغرب کی تقلید ادب میں مناسب نہیں۔ ہماری اپنی روایات ہے اور ہمیں بس اسی سے منسلک رہنا چاہیے۔ یہ سن کر بہت حیرت ہوتی ہے کہ آپ کے گھر میں موجود ہزاروں چیزیں دوسرے ملکوں سے آئی ہیں۔ آپ ان پر اعتراض نہیں کرتے تو پھر ادب پر اس قدر واویلا کیوں؟ اعلا ادب کے قدردان کبھی ایسی باتیں نہیں کہتے بل کہ شاید سوچتے تک نہیں۔۔۔اگر آپ غور کریں تو ایسے تمام اعتراضات اٹھانے والے گروہ زیادہ تر پاپولر ادب کے گرویدہ نکلیں گے جن کا مسئلہ صرف وقتی انجوائے منٹ ہے۔ ان پہ بھی سمجھ نہیں کہ قومی یا مقامی ادب اور بین الاقوامی ادب میں کوئی مخالف تعلق نہیں ہوتا۔ پھر اس اہم حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ افسانہ ناول جیسی اصناف ہم نے مغرب سے اپنائیں اور ان کے اصول بھی وہیں سے لائے۔ البتہ ہم نے جب اسے لکھا تو اپنی اپنی قومی اور مقامی زبانوں میں ڈھال دیا۔ یوں ہمیں ان اصناف سے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ بعینہٖ ان اصناف کی بہتری اور ان میں تغیرات کو (ان کے مقاصد کو سمجھتے ہوئے) اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ سادہ ترین الفاظ میں اس کی مثال کھانا پکانے کے آسان ترین عمل سے بھی لی جا سکتی ہے۔ کھانے پکانے والے بنیادی مصالحہ جات تقریباً ہر علاقے وہی ہوتے ہیں مگر ان کے تناسب اور مقدار سے مختلف ذائقے بنتے ہیں اور مختلف کھانوں میں ان کی مقدار و تناسب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہم ایسا نہیں کہتے کہ فلاں ملک کی سبزی

یا مصالحے اور گندم ہمارے ملک میں کیوں لائے جا رہے ہیں؟ ہاں مگر۔۔۔اپنی ذات میں ہمیں یہ اختیار ضرور ہے کہ ان میں سے کچھ پسند اور کچھ ناپسند کر سکیں مگر ان کو سرے سے رد کرنا چہ معنی دارد؟

دوسری ادبی اصناف یا ایک ہی صنف میں پائے جانے والے ان تغیرات میں بھی ایک حسن پایا جاتا ہے۔ ہم اپنی ثقافت اور زبان کا خیال کرتے ہوئے ان کو اپناتے رہے ہیں اور یہ ہمارے ادب میں تنوع اور ترقی کا سبب ہی بنا ہے۔ اس لیے یہ بحث بے بنیاد ثابت ہوگی کہ ہمارے ادبی و تنقیدی اثاثے فقط ہمارے ہیں اور ان میں کسی مغربی فلسفی، ناقد یا ادیب کا کوئی حصہ نہیں۔ تنقید و ادب کے لحاظ سے باقاعدہ پہلے ناقد ہمارے ہاں مولانا الطاف حسین حالی کو سمجھا جاتا ہے جو غالب کے شاگرد بھی ہیں۔ ان کے خیالات میں حقیقت نگاری (رئیلزم) کی گہری چھاپ ہے اور یہ تحریک اس وقت روس اور ادب میں پروان چڑھ رہی تھی تب سے اب تک ہمارے جن بھی مفکرین نے تنقید و ادب پر قلم اٹھایا ان کے خیالات انہی مغربی یا عالمی مفکرین کے افکار اور فلسفوں سے متاثر ہیں خواہ وہ تخلیقی تناظرات ہوں یا تنقیدی زاویہ نظر۔ ایک ہی طرز پر لکھنے والوں نے نئے انداز اپنانے کی طرف رجحان ظاہر کیا تو شعور کی رو جو کہ جیمز جوائس اور ورجینیا وولف سے فیض حاصل کرنا کہا جائے گا۔ وجودیت لاریب ژاں پال سارتر، سیموئیل بیکٹ وغیرہ کا فیض ہے۔ اسی طرح مارکسیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت ہوں یا، ردِتشکیل۔ ایک ہمارے ادب ہی نے نہیں بل کہ تمام عالم نے ان کے اثرات محسوس کیے۔ ادب اور تہذیب کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی ایک خطے نے دوسرے خطے کے ادب اور تہذیب سے استفادہ نہ کیا ہو یا اس نے فیض نہ حاصل کیا ہو۔ مصر اور بابل کی تہذیبوں کے یونان پر اثرات، یونانی فلسفہ کے دنیا پر اثرات اور ان تمام تہذیبوں کے آپس میں ایک دوسرے پر اثرات رہے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ادب، فلسفہ یا دیگر علوم کسی سرحد یا تہذیب کے لیے اس شدت سے منسوب نہیں ہوتے جس کو عصبیت کہا جائے۔ علم مومن اور تمام تشنگان علم کے لیے وہ دریا ہے جس سے وہ اپنے علم کی پیاس بجھاتے ہیں۔ دریا کوئی ہو کہیں کا ہو اس میں پانی ایک سا ہوتا ہے۔ علم اور فطرت خود تک پہنچنے والے کو بلا تفریق نوازتے ہیں۔ اب اگر ہمارے ادبا، شعرا اور ناقدین اس سے فیض یاب ہو رہے ہیں تو درحقیقت وہ اس عالمی دھارے سے اپنا تعلق جوڑ رہے ہیں اور اس عصبیت کی حد ختم کر کے اسے کم زور کر رہے ہیں جو کسی بھی معاشرے کو تنہائی کا شکار کر کے اسے تنہا کر دیتی ہے اور وہ اپنے اندر ہی شکست و ریخت کا شکار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ انسان سے وابستہ، علم اور معاشرتی مسائل جس نئے رخ پر سمجھے جا رہے ہیں یہ ادبی و تنقیدی رجحانات اسی کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ اگر ہم ان سے پہلو تہی کرتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک پینا ڈول کی دوا سے سر درد کے ساتھ ساتھ معدے کے السر سے کینسر تک کے علاج کی کوشش کی جائے۔ ایسا رویہ یا رجحان ادب کے لیے بہت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

ان تمام موضوعات پر لکھنے کے لیے ابھی بھی بہت مواد موجود ہے مگر مضمون کی طوالت اس کی اجازت نہیں دے رہی اس لیے آخر میں دونسبتاً غیر معروف اصطلاحات کے انتہائی مختصر تعارف کے ساتھ مضمون کو ختم کرنا چاہوں گی آپ حیران ہوں گے کہ ادب کی تو بہت سی اقسام ہیں تو پھر میں نے اپنے مضمون کے لیے ان دو کو ہی کیوں چنا ہے؟؟ تو اس کا آسان سے جواب ہے کہ مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ کسی نہ کسی طرح ہماری اوپر کی گئی تمام بحث سے متعلق ہیں۔ شاید یہ ہمارے عالمی ادب تناظر میں بہت اچھی طرح جذب ہو چکی ہیں اور ہمیں احساس تک نہیں۔ اور شاید کہ ڈائجسٹی ادب بہ مقابلہ اعلا ادب والے جھگڑے کو نمٹانے میں کسی حد تک حصہ ڈال رہی ہیں۔

(Hybrid Fiction and UpMarket Fiction) ہائبیر ڈ فکشن اور اپ مارکیٹ فکشن

(Hybrid Fiction) جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ انیسویں صدی کے آواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی فکشن دو مخالف افکار کے گروہوں میں بٹ چکا تھا۔ اعلا ادب جسے لٹریری فکشن بھی کہا جاتا ہے اور کمرشل یا زیادہ بکنے والا ادب۔ اعلا ادب کا مقصد قاری کو محض کچھ بھی پڑھانا نہیں ہوتا بل کہ اس کی ذہنی بالیدگی بڑھانا مقصود ہوتا ہے تا کہ وہ معاشرے میں فعال ہو سکے۔ یہ انسان کے ذہن سے گفت و شنید کر کے اسے سوچنے اور بہترین فیصلے لینے پر اکساتا ہے۔ بہ طور ادیب ہماری بھی کوشش ہوتی ہے کہ ہماری تخلیق قاری کے ذہن کو جھنجوڑ سکے اسے اپنے اردگرد جائزے لینے پر مجبور کرے۔

ہائبیر ڈ فکشن کی یہ قسم سائنس فکشن کے انسانی معاشروں اور ثقافتوں پر اثرات کے ایک ردعمل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ ان کے نظریہ دانوں کے نزدیک سائنس فکشن میں اور ان کے زیر اثر انسان اور ثقافتیں بری طرح مجروح ہو رہے ہیں۔(Cultural History of Literature by Roger Luckhurst)۔ یہ نظریہ دان سائنس فکشن کے حامی ہی کہے جا سکتے ہیں کیوں کہ ان کی تحاریر سائنس کو ایک بنیادی اور اہم ترین عنصر کے طور پر شامل رکھتی ہیں مگر اس کا اطلاق ایک حتمی سائنسی طرز پر کرنے کی بجائے ثقافتوں اور ان کے بیانیوں میں موجود اساطیر کو شامل کرتے ہوئے انہیں سائنس فکشن سے منسلک کر دیتی ہیں۔ یوں بہ ظاہر یہ دونوں تضادات ایک ہی فکشن میں ساتھ موجود ہوتے ہیں اور اسے اعلا ادبی قدروں سے جوڑتے ہوئے ہائبرڈ فکشن کی تخلیق کرتے ہیں۔ ہائبرڈ فکشن میں اساطیری ماحول کردار، فینٹاسی کے عناصر کے ساتھ دیگر انواع بھی شامل ہو سکتی ہیں مگر بنیادی اہمیت سائنس کو ہی دی جاتی ہے۔ یہ فکشن سائنسی ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اعلا ادب سے جڑت بنائے رکھنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔

(UPMarket Fiction): اعلا ادب اور کمرشل ادب (بہت حد تک پاپولر ادب) پر اس مضمون میں کافی بحث ہو چکی ہے ''ان دونوں نظریات و افکار کے درمیان بُعد جوں کا توں رہا تا آنکہ ''اپ

مارکیٹ فکشن'' کی ایک غیر معروف اور غیر مستند اصطلاح میں سمجھا جانے والا ادب سامنے آیا۔ اپ مارکیٹ فکشن ادب کی کوئی نوع نہیں فقط ایک اصطلاح ہے جو کہ زیادہ تر پبلشرز کے ہاں مستعمل ہے۔ '' اپ مارکیٹ فکشن میں بھی دو مخالف اقسام کا حلول (فیوژن) کہی جا سکتی ہے۔ اس میں بنیادی اہمیت قاری کی دلچسپی ہے مگر اسے لکھنے کے لیے اور موضوعات کے چناؤ میں اعلی ادبی قدروں کو پہلے نمبر پر چنا جاتا ہے۔ کردار اپنے اردگرد کے ماحول سے جڑے اور موضوع کے مطابق ڈھلے ہوتے ہیں۔ گو کہ یہ بھی پاپولر ادب کی طرح (Page Turner) ہوتا ہے لیکن اس کی بنیاد انسانی ارتقائی عمل میں معاون و مددگار سمجھی جاتی ہے۔ قاری کی ترجیحات کو اولیت کا درجہ دیتے ہوئے غیر محسوس طریقے سے بہترین ادب آسانی سے اس کے ذہن میں اتار دینا جو اس کی زندگی میں مثبت تبدیلیوں کا باعث بن سکے۔ جس کے ساتھ اعلی ادب کے موضوعی مقاصد کو شامل رکھا جائے۔ مثلاً جنگ کی تباہی سے معاشروں اور انسانوں کی اخلاقی بدحالی اور کسی نئی تبدیلی کیا اچھے یا برے اثرات '' جیسا کہ ایملی سینٹ جون کے مشہور ناول سٹیشن ایلون میں دیکھا جا سکتا ہے۔(Station Eleven by Emily St. John Mandel)

◀◀ ● ▶▶

حوالہ جات

1)-EdwardBulwer-Lytton،Richelieu:or,TheConspiracyPlay

2) -اردو داستان کی شعریات از ڈاکٹر طاہر نواز -

(3)TraditionandtheindividualTalentByT.S.Eliot

(4)-Getting into Character:Seven Secrets a Novelist Can Learn from Actors،BrandilynCollins

(5)-TheWritingLife،AnnieDillard.

6)-(Structure :Techniques and Exercises for Crafting a Plot That Grips ReadersfromStarttoFinishPaperback.

(7'')Literatureisaluxury;fictionisanecessity.''?G.K.Chesterton'

(8) -(Plot & Structure :Techniques and Exercises for Crafting a Plot That Grips Readers from Start to Finish ـby James Scott Bell(.9'')- (That's what fiction is for. It's for getting at the truth when)'' the truth isn't sufficient) for the truth.'' Tim O'Brien(.10)-("The good ended happily, and the bad unhappily That is what Fiction means.'' Oscar Wilde, The Importance of Being Earnest(''.11)-Science Fiction...Cultural History of Literature by Roger Luckhurst(12)--(StationElevenbyEmilySt.JohnMandel(

MaryLand ,America

● تانیثیت
● نسترن احسن فتیحی

تانیثیت (Feminism).....ایک نظریہ

ستر کی دہائی کے بعد، دنیا کی ادبی اور ثقافتی سیاست میں عورت نے علمی (academic) توجہ حاصل کی۔ اس کے باوجود کہ کسی نے اسے جنسی انارکی کا پیش رو خیال کیا، اور کسی نے مارکیٹ اور جدید ثقافت کے ایجنٹ کے طور پر دیکھا۔ بہتوں کی نظر میں عورت بیسویں صدی کے سیاسی آزادی کی تحریکوں، کے استحکام کی علامت کے طور پر ابھر کر آئی۔ اور بعض کی نظر میں وہ موڈرنٹی کی علامت بن کر ابھری۔ مگر یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ان کے جذبات میں ہمیشہ خلوص، ایثار، مروت، محبت اور شگفتگی کا عنصر غالب رہتا ہے۔ ''ایکوفیمینزم'' نے انسانی وجود کی ایسی عرق ریزی اور عنبر فشانی کا سراغ لگایا جو کہ عطیۂ خداوندی ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات میں تمام مظاہر فطرت کے عمیق مشاہدے سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ جس طرح فطرت ہر لمحہ لالے کی حنابندی میں مصروف عمل ہے اسی طرح خواتین بھی اپنے روز و شب کا دانہ دانہ شمار کرتے وقت بے لوث محبت کو شعار بناتی ہیں۔ خواتین تخلیق کاروں نے تخلیق ادب کے ساتھ جو بے تکلفی برتی ہے اس کی بدولت ادب میں زندگی کی حیات آفریں اقدار کو نمو ملی ہے۔ مغرب میں تانیثی جدوجہد کا آغاز اس وقت ہوا جب حقوقِ نسواں کے تحفظ کے لیے بعض عورتوں نے انفرادی طور پر آواز بلند کی۔ اس ضمن میں برطانیہ کی میری وول اسٹون کریفٹ (Wollstonecraft Mary) کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جس نے اٹھارویں صدی کے نصفِ دوم میں سماجی سطح پر عورتوں اور مردوں کے درمیان نابرابری (جینڈر تفریق) کے خلاف نہایت پرزور انداز میں آواز اٹھائی اور حقوقِ نسواں کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کا موقف تھا کہ عورتیں طبعاً مردوں سے ''کم تر'' (Inferior) نہیں ہوتیں، لیکن وہ کم تر اس لیے سمجھی جاتی ہیں کہ ان میں تعلیم کی کمی پائی جاتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ عورتوں اور مردوں دونوں کو Rational beings کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ نابرابری کے خاتمے کے لیے وہ ایک ایسے سماجی نظم و ضبط (Social order) کی ضرورت کو محسوس کرتی تھی جو Reason پر مبنی ہو۔ حقوقِ نسواں سے متعلق اس کی مشہور کتاب.....

A Vindication of the Rights of Woman تانیثیت پسندوں کو آج بھی دعوتِ فکر دیتی ہے۔ میری وول اسٹون کریفٹ کے بعد حقوقِ نسواں کے تحفظ کے لیے منظم طور پر جدوجہد کا آغاز ہوا جس نے مغرب میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس تحریک میں اولاً عورتیں ہی پیش پیش رہیں، لیکن بعد میں مرد بھی اس میں شامل ہو گئے۔

تانیثی تحریک کا بنیادی مقصد عورتوں کو مردوں کے مساوی سیاسی، سماجی، معاشی اور قانونی حقوق دلانا تھا اور ترقی کے میدان میں انھیں برابر کے مواقع فراہم کرنا تھا۔ تانیثیت، اپنے عام مفہوم میں، صرف عورتوں ہی کے مسائل کی ذمہ دار ہے اور جنس یا جینڈر کے تعلق سے نابرابری کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ جیسے جیسے تانیثی تحریک فروغ پاتی گئی، اس کے نظریاتی اور فلسفیانہ ڈسکورس میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ موضوعات، مواد، اسلوب، لہجہ اور پیرائے اظہار کی ندرت اور انفرادیت نے زندگی کی حیات آفریں اقدار کے ابلاغ کو یقینی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ تانیثیت کا اس امر پر اصرار رہا ہے کہ جذبات، احساسات اور خیالات کا اظہار اس خلوص اور دردمندی سے کیا جائے کہ ان کے دل پر گزرنے والی ہر بات برمحل، فی الفور اور بلا واسطہ انداز میں پیش کر دی جائے۔ اس نوعیت کی لفظی مرقع نگاری کے نمونے سامنے آتے ہیں کہ قاری چشم تصور سے تمام حالات کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔

Feminism فرانسیسی لفظ ہے جو لیٹین کے لفظ Femind سے لیا گیا ہے اور ذرا سی تبدیلی سے دوسری زبانوں جیسے انگلش اور جرمن میں بھی ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ Feminine عورت یا جنس مونث کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بطور اصطلاح Feminism اس طرز فکر یا اس تحریک کو کہا جاتا ہے جو سیاست و معیشت و معاشرتی جملہ تمام شعبوں میں عورتوں کی مردوں سے برابری کی دعویدار ہیں۔ خواتین کے حقوق کے دفاع اور مردوں کے ہمراہ ان کی برابری کے معنی میں کئی سو سال پرانی فکر ہے، لیکن انیسویں صدی کے وسط سے اس معنی میں باقاعدہ استعمال ہونے لگا، اور اس طرز فکر کو نافذ کرنے کے لئے دھیرے دھیرے بہت سی تحریکوں نے سر اٹھایا اور اپنے مطالبات کی بازیابی کے لئے بہت سے طریقے اپنائے۔ تاریخی پس منظر میں فیمینزم کے تکاملی مرحلہ کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے:

پہلا مرحلہ: انیسویں صدی کی ابتدا سے پہلی جنگ عظیم کے بعد تک

دوسرا مرحلہ: ساٹھ کی دہائی کے بعد کا مرحلہ۔

بعض دوسرے مفکرین کا خیال ہے کہ مغرب میں تانیثیت کی تحریک نے اپنی ابتدا (انیسویں صدی) سے زمان حال تک تین ارتقائی مراحل طے کیے جنھیں ''لہروں'' (Waves) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اجتماعی طور پر تانیثیت کی لہر اٹھنے سے پہلے حقوقِ نسواں کی تمام تر جدوجہد انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اس

وقت تک 'تانیثیت' (Feminism) کی اصطلاح بھی رائج نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی ان عورتوں نے، جنھوں نے حقوقِ نسواں کے تحفظ کے لیے آواز اٹھائی تھی، خود کو 'تانیثیت پسند' (Feminist) کہا تھا۔ یہ دونوں اصطلاحیں تانیثی ادب میں کافی بعد میں مستعمل ہوئیں۔

پہلی تانیثی لہر: ''پہلی تانیثی'' لہر برطانیہ میں انیسویں صدی کے وسط میں ابھری جب لندن کی متوسط طبقے کی خواتین نے بار براباڈ یکون (Barbra Bodichon) اور بیسی ریز پارکس (Bessie Rayner Parkes) کی سربراہی میں سماجی اور قانونی نابرابری، اور بے انصافی کے خلاف منظّم طور پر آواز اٹھائی اور متحد ہو کر حقوقِ نسواں کا پرچم بلند کیا۔ اسی وقت سے تانیثی جدوجہد نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ اس تحریک کی ''پہلی لہر'' تھی۔ اس لہر کے دوران تانیثیت پسندوں نے جن اِشوز پر اپنی توجہ مرکوز کی ان میں عورتوں کی تعلیم، ان کے لیے روزگار کے مواقع اور شادی سے متعلق قوانین تھے۔ ان تینوں میدانوں میں انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ عورتوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھل گئے، طب (Medicine) اور دوسرے پیشوں میں انھیں روزگار کے مواقع حاصل ہونے لگے، اور ۱۸۷۰ء کے ایکٹ (Act Propertys' Women Married of 1870) کی رو سے شادی شدہ عورتوں کو حقِ ملکیت بھی حاصل ہو گیا۔ تانیثیت کی یہ پہلی لہر پہلی عالمی جنگ تک جاری رہی۔

دوسری تانیثی لہر: تانیثی تحریک کی ''دوسری لہر'' نہ صرف برطانیہ، بلکہ دوسرے یورپی ممالک اور امریکہ تک پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے دوران ان تمام ممالک میں عورتوں کے حقوق کی پاس داری کے لیے آواز اٹھائی گئی اور زبردست جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا۔ نسلی بنیادوں پر تفریق کے خلاف بھی جدوجہد جاری رہی۔ لسبین (Lesbian) اِشوز اور اسقاطِ حمل کے حق کو بھی حقوقِ نسواں کی تحریک میں شامل کر لیا گیا۔ بعض جنسی و نسائی مسائل پر عدم اتفاقِ رائے کی وجہ سے دوسری تانیثی لہر تنازعات کا شکار ہو کر 1990ء کے آس پاس ختم ہو گئی۔

تیسری تانیثی لہر: تانیثی تحریک کی ''تیسری لہر'' بیسویں صدی کے آخری دہے سے ذرا قبل نمودار ہوئی۔ اسے 'جدید تانیثیت' (ModernFeminism) بھی کہتے ہیں۔ یہ لہر دوسری تانیثی لہر کی ناکامی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے تناظر میں معرضِ وجود میں آئی۔ اس تحریک سے نوجوان خواتین وابستہ ہوئیں جن کی عمریں ۳۰، ۳۵، یا ۴۰ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ اس تحریک سے عورت کی ایک نئی شبیہ ابھر کر سامنے آئی۔ اب عورت ادعائیت کی حامل (Assertive) ہے، طاقت ور ہے اور اپنی جنسیت (Sexuality) پر اسے خود اختیار ہے۔ تیسری تانیثی لہر کے دوران اس بات کا بھی احساس پیدا ہوا کہ عورت کا تعلق مختلف رنگ، نسل، طبقے، قومیت، مذہب، اور تہذیبی و ثقافتی بیک گراؤنڈ سے ہو سکتا ہے۔ یہ

تحریک یا لہر عورت کی معاشی، سیاسی اور سماجی مختاریت (Empowerment) کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادی مختاریت پر بھی اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ اس تحریک کے دوران عورت کا تشخص (Identity) واضح طور پر سامنے آ گیا ہے۔ اکثر عورتیں متضاد تشخصات کی حامل ہوتی ہیں۔ بعض خواتین کیریر وومَن، بیوی، اور نیک لڑکی کا کردار نبھاتی ہیں تو بعض ٹام بوائے، لسبین اور سیکس سمبل کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ تحریک عورت کو اپنا تشخص یا پہچان خود قائم کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تانیثی تھیوری درحقیقت ان فلسفوں سے نمو پذیر ہوتی ہے جو تانیثیت کے مختلف نظری ڈسکورس کے پسِ پردہ ہیں، جیسے کہ سوشلسٹ فلسفہ حیات جو 'سوشلسٹ تانیثیت' (جسے 'مارکسی تانیثیت' بھی کہتے ہیں) کی روح ہے۔ اس فلسفے کی رو سے عورتوں کو برابری کا درجہ صرف اسی وقت مل سکتا ہے جب سماج میں بہت بڑے پیمانے پر کوئی تبدیلی واقع ہو۔ سوشلسٹ تانیثیت پسندوں کا کہنا ہے کہ نابرابری سرمایہ دارانہ سماج (Capitalist Society) میں بری طرح جڑ پکڑ چکی ہے جہاں قوت (Power) اور سرمایے (Capital) کی تقسیم غیر مساویانہ ہے۔ صرف یہی کافی نہیں کہ عورتیں انفرادی طور پر جدوجہد کر کے سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کریں، بلکہ سماج میں اجتماعی تبدیلی (Collective Change) کی اشد ضرورت ہے تاکہ عورت اور مرد دونوں کو برابری کا درجہ حاصل ہو سکے۔ سوشلسٹ تانیثیت اسی لیے پدری سماجی نظام (Patriarchy) کی بھی مخالف ہے کہ یہ مردانہ اقتدار و قوت کی علامت ہے۔ 'ریڈیکل تانیثیت' سوشلسٹ تانیثی تھیوری سے کافی حد تک متاثر ہے۔ تانیثی مفکرین جو ریڈیکل نظریات کے حامل ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کسی بڑی ڈرامائی سماجی تبدیلی کے بغیر عورتوں کو برابری کا درجہ نہیں مل سکتا، نیز عورتوں کی پستی (Oppression) کی بنیادی وجہ پدری نظام ہے جس میں اقتدار مرد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور عورت مجبورِ محض تصور کی جاتی ہے۔ مرد کا عورت پر تفوق قوت (Power) کے بل بوتے پر ہے۔ اسی لیے وہ آئے دن مردوں کے ظلم و ستم کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ ریڈیکل تانیثیت پسندوں کا سارا ارتکاز اس ظلم و ستم پر ہے جو پدری نظام میں مرد عورت پر ڈھاتا ہے اور اپنے جابرانہ رویے سے اسے سماجی سطح پر زیر کر لیتا ہے اور پست (Oppressed) بنا دیتا ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب، گوری ہو یا کالی، تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ۔ اسی لیے ریڈیکل تانیثیت پدری نظام اور مردانہ اقتدار کے سخت خلاف ہے۔ سوشلسٹ تانیثی فکر کے 'لبرل تانیثیت' نابرابری کے خاتمے کے لیے اجتماعی سماجی تبدیلی کے بجائے انفرادی کوشش و عمل (Individualistic actions) کو ضروری قرار دیتی ہے۔ اس فلسفے کی رو سے عورتیں انفرادی طور پر کام اور جدوجہد کر کے سماج میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتی ہیں۔ اس حقیقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بہت سے مغربی ملکوں میں عورتیں آج ان عہدوں پر فائز ہیں جو پہلے

مردوں کی دسترس میں تھے۔ ہر چند کہ لبرل تانیثیت سیاسی و قانونی اصلاحات کے ذریعے مرد و زن میں برابری کی خواہاں ہے، تاہم اس کا ارتکاز عورتوں کی اپنی صلاحیتوں اور کوششوں پر ہے جنھیں بروئے عمل لا کر وہ سماج میں برابری کا درجہ حاصل کر سکتی ہیں۔

بعض یورپی ممالک (بالخصوص برطانیہ اور فرانس) نے جب تیسری دنیا کے ملکوں پر اپنا تسلط قائم کیا تو یہ ممالک ان کی کالونیاں (نوآباد بستیاں) بن کر رہ گئے جس کی وجہ سے وہاں کی سیاسی اور معاشی صورتِ حال بالکل بدل گئی اور تانیثیت کی ایک نئی شکل ابھر کر سامنے آئی جسے 'مابعد نوآبادیاتی تانیثیت' کا نام دیا گیا۔ اسے تیسری دنیا کی تانیثیت یا تھرڈ ورلڈ تانیثیت بھی کہا گیا جس کے مفکرین کا خیال ہے کہ مغربی نوآبادکاروں نے تھرڈ ورلڈ ممالک کو سماجی و معاشی پستی کے غار میں دھکیل دیا ہے جس کی وجہ سے مابعد نوآبادیاتی معاشرے (Post colonial-society) میں عورت کی حیثیت کم تر اور پست ہو کر رہ گئی ہے۔ مابعد نوآبادیاتی تانیثیت پسندوں نے مغربی نوآبادکاروں کی اندھی تقلید اور ان کی تہذیب اور طرزِ بود و باش کی بے جا نقالی اور تھرڈ ورلڈ ممالک کی عورتوں میں بڑھتی ہوئی مغربیت اور ماڈرنائزیشن کے مغربی معیارات پر بھی انگلی اٹھائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عورتوں کا معیارِ زندگی محض مغربی تہذیب کی نقالی کر کے بلند نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اسے اپنے ممالک کی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی قدروں سے ہم آہنگ کر کے بھی اونچا اٹھایا جا سکتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فیمینزم خواتین کی حق طلب تحریک کا نام ہے جو امریکا سے شروع ہوئی یعنی خواتین نے جنسیت کی بنا پر اس زمانہ میں رائج امتیازی برتاؤ کے خلاف اپنا حق کو حاصل کرنے کے لئے ایک تحریک کا آغاز کیا جو ایک خاص معاشرتی نظریات مطابق تھا۔

Feminism خواتین کی مردوں پر برتری کا قائل نہیں، اسی طرح جیسے نسلی و مذہبی برابری سے مراد صرف برابری ہے، برتری نہیں۔ اس سے بھی زیادہ حیرانی کی بات یہ ہے، کہ جو لوگ لفظ feminism کی مخالفت کرتے ہیں، ان سے اگر بات کی جائے تو وہ feminism کے تمام مقاصد کی حمایت کرتے نظر آئیں گے۔ تو پھر آخر اس لفظ سے کیا دشمنی ہے۔ اگر حق کی آواز ایک لڑکی اٹھائے، تو اسے باغی، ضدی، سرکش وغیرہ کہا جاتا ہے۔ کیوں خواتین کو غلط کردار کی حامل، اور معاشرے کے تاریک حصوں سے تعلق رکھنے والا کہا جاتا ہے؟

جنسی ناانصافی صرف تیسرے ممالک کا مسئلہ نہیں ہے۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی خواتین مردوں جتنی تنخواہیں حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جنسی ناانصافی اب بھی ترقی پذیر ممالک میں عام ہے۔ اس کے باوجود ترقی پذیر ممالک نے تو اپنی پہلی خاتون وزیرِ اعظم دیکھ لی ہے، لیکن امریکہ جیسے ملک کو ابھی بھی اپنی پہلی خاتون صدر کا استقبال کرنا باقی ہے۔ خواتین پر جنسی تشدد اور

ریپ امریکہ کے تعلیمی اداروں میں عام ہے۔ امریکہ میں ہر پانچ میں سے ایک خاتون جنسی تشدد کا شکار ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ شیرل سینڈبرگ اپنی کتاب ''ویمین ورک اینڈ دی ول ٹو لیڈ'' : "Women,Work,and the Will to Lead" میں امریکہ میں رہنے والی ایک خاتون کی حیثیت سے اپنے مرد کولیگز کے برابر آنے کی اپنی روزانہ کی جدوجہد کی کہانی سناتی ہیں۔ جنسی ناانصافی کے یہی واقعات ہیں، جنہوں نے دنیا بھر میں feminists کو جدوجہد کرنے پر مجبور کیا ہے، تاکہ نئی روایات قائم کی جا سکیں، اور کلچر اور ذہنیتیں تبدیل کی جا سکیں۔ یہ مسئلہ جتنا عالمی اہمیت کا حامل ہے، اتنی ہی فوری توجہ بھی چاہتا ہے۔ جیسا کہ ایما واٹسن کہتی ہیں، "اگر میں نہیں تو کون؟ اگر اب نہیں تو کب"۔ ''عورتوں پر ظلم و ستم اور جبر و استبداد کی روایت بہت پرانی ہے''۔ ''عورت نے پہلی بار بغاوت کب کی۔ اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تاہم Ellenkey کہتی ہے کہ نسائی تحریک کی شروعات وہاں سے ہوئی جب پہلے پہل حوّا نے شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔۔۔ غرض عورت کا اپنے مجوزہ حدود سے تجاوز کرنا ہی نسائی تحریک کی ابتدا تھی'' ظلم و ستم کی روایت تو بلاشبہ بہت پرانی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی ابتدا کا سرا شجرِ ممنوعہ کی طرف ہاتھ بڑھانے سے جوڑنا شاید مناسب نہیں۔ ایلن کی Ellenkey یہاں چوک گئی ہیں۔ جبر و استبداد کے خلاف بغاوت ہوتی تو سر آنکھوں پر۔ لیکن شجرِ ممنوعہ والی بغاوت سے پہلے تو کسی ظلم و ستم کے شواہد نہیں ملتے۔ نہ کسی مذہبی روایت میں نہ کسی غیر مذہبی روایت میں۔ اس لیے اگر یہ بغاوت تھی تو کسی ظلم و ستم کے بغیر ہی برپا کر دی گئی تھی۔ وگرنہ یہ کوئی بغاوت نہیں تھی بلکہ آدم و حوا کا مشترکہ طور پر شعور و آگہی کا پھل چکھنے کا عمل تھا۔ نسلِ انسانی کے پھلنے پھولنے کی راہ نکالنے کی طرف دونوں کا مشترکہ پہلا قدم تھا ۔ Heath Stephen نے لکھا ہے کہ:

''مرد چاہے کتنی ایمانداری سے اس تحریک میں شامل ہوں، ان کی نیت پر شبہ برقرار رہے گا''۔ ایک طرف تو یہ کہا گیا کہ تانیثیت کے حوالے سے کام کرنے والے مرد بھی تانیثی تحریک کا حصہ ہیں۔ اور دوسری طرف ان کے حوالے سے شک کی اتنی بڑی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ اس سے اس تحریک کی کچھ کمزوریوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۷۰ء سے ۸۰ کی دہائیوں میں فیمینیزم میں بہت سے رجحانات پیدا ہوئے، شدت پسند سے لیکر اعتدال پسند رجحانات بھی سامنے آئے۔ نتیجہ میں فیمینزم کے سلسلہ میں بہت سے نظریات اور رجحانات پیدا ہو گئے۔ لیکن سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ عورتوں کے حقوق پامال ہوئے ہیں اور مناسب طریقوں سے اس امتیازی برتاؤ اور حقوق کی پامالی کو روکنا چاہیئے۔ البتہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جن میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ الگ الگ رجحانات میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ان تھیوریز کے نام یہ ہیں۔

حریت پسند تانیثیت (Liberal Feminism)، مارکسی تانیثیت (Marxist Feminism)، انتہا پسند تانیثیت (Radical Feminism) تحلیل نفسی تانیثیت (Psychoanalytic-Feminism)، سماجی تانیثیت (Social Feminism)، وجودی تانیثیت (Feminism Existentialist)، مابعد جدید تانیثیت (Post Modern Feminism) اور ایکو فیمینزم (Eco Feminism) اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مختلف عہد میں تانیثیت سے متعلق مختلف تھیوریاں وضع کی گئی ہیں۔ چند لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ تانیثیت کی کوئی ایک تھیوری نہیں ہوسکتی۔ پدری سماج میں عورتوں پر جبر و استبداد کی مختلف وجہیں تھیں۔ تمام حالات و واقعات کے پیش نظر تانیثیت کو اپنے اپنے طور پر سمجھنے کی کوششیں ہوئیں' حریت پسند تانیثیت والے عورت کے حقوق مرد کے مساوی کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ مارکسی تانیثیت نے سماجی ناہمواری کے تناظر میں اشرافیہ کی عورتوں کے مسائل کے مقابلہ میں عام خواتین کے مسائل کو مختلف قرار دیا اور انہیں کے حق میں آواز بلند کی۔ انتہا پسند تانیثیت والے اپنے نام کی مناسبت سے یہ سمجھتے ہیں کہ ''عورتوں پر ظلم و ستم کی روایت اتنی پرانی ہے کہ اسے سماج سے طبقاتی فرق مٹا کر بھی ختم نہیں کیا جاسکتا''۔ یہ سارے حقوق مل جانے کے بعد بھی مزید کا نعرہ ہے۔ گویا ایک استحصالی طبقے کے خاتمے کے بعد دوسرے استحصالی طبقے کو جنم دینا مقصود ہے۔ تحلیل نفسی تانیثیت میں نام کے عین مطابق فرائڈ کے جنسی اور نفسیاتی حوالوں کو بنیاد بنایا گیا۔ سماجی تانیثیت نے پہلی چاروں تھیوریز پر غور و فکر کرتے ہوئے ان کی بعض باتوں سے اختلاف اور بعض سے اتفاق کرتے ہوئے کسی حد تک امتزاجی رویے کو اہمیت دی۔ وجودی تانیثیت میں وجودی فلسفے کی بنیاد پر عورت کی شخصی آزادی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا۔ وجودی تانیثیت کی تھیوری سیمون دی بوار (Simon deBeauvoir) کی عطا کردہ سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے ژاں پال سارتر کے ساتھ دوست بن کر ساری زندگی گزاری تھی۔ مابعد جدیدیت والے تانیثیت کے تعلق سے اتنے ہی الجھے ہوئے ہیں جتنا مابعد جدیدیت کا تصور الجھا ہوا ہے۔ ان کے ہاں تانیثیت کی کوئی بنیادی بات کرنے کے بجائے اپنی مخصوص لسانی فلسفے کی اصطلاحوں کے ساتھ اسے جوڑنے کی کاوش دکھائی دیتی ہے۔ فیمینزم جو کہ ایک معاشرتی تحریک تھی اس نے چند دھائی کی سرگرمیوں میں اپنے نظریات کو اتنا مستحکم کر لیا کہ دیگر یونیورسیٹیوں میں باقاعدہ womens studies کے نام پر شعبہ جات قائم کئے گئے جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں خواتین کے مسائل کے ماہرین سامنے آگئے ہیں۔ اس اہم نکتہ کی طرف متوجہ کرنا ضروری ہے کہ مغربی فیمینزم ایک خاص ماحول میں خاص اسباب کی بنا پر ایک ثقافتی، سماجی تحریک بن کے ابھرا ہے، لہذا اس کے نظریات اور دلائل پر باقاعدہ غور کرنے کے لئے کافی وقت درکار ہے۔ فیمینزم اپنی پہلی تقسیم بندی میں نظریاتی اور عملی بنیاد پر قابل تقلید نظر

آتی ہے۔ نظریاتی بنیاد پر ایک نظریہ کی صورت میں یا آئیڈلوجی کے قالب میں یا اسی کے مانند دوسری روشوں کے اعتبار سے پیش کی جاتی ہے اور عملی پہلو کی نظر سے ایک اجتماعی حادثہ کی صورت میں بیان کی جاتی ہے اور یہ دونوں پہلو اپنے درمیان تفاوتوں کے باوجود ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اجتماعی حادثات کے حوالے سے فیمینزم کا رشتہ تاریخی عوامل اور اقتصادی ڈھانچے منجملہ شناخت و معرفت سے مربوط ہے جس نے معاشرے کی شناخت میں اپنی الگ پہچان بنائی ہے اور نظریاتی حوالے سے اجتماعی زینہ سے متاثر ہونے کے علاوہ اپنے سے مربوط فلسفی بنیادوں اور معرفتی ڈھانچوں سے بھی فائدہ اٹھاتی ہے۔ فیمینزم، تاریخی لحاظ سے کئی ادوار پر مشتمل ہے اور ہر ایک دور میں ایک طرح کی نظریاتی اور عملی خصوصیات سے مختص رہی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں سب سے زیادہ موثر عوامل خصوصاً اس کے نظریاتی پہلو سے مربوط، معرفت شناختی اور فلسفی مبانی ہیں، اس وضاحت کے ساتھ بہت سے فلسفی اور معرفت شناختی حادثات نے فیمینزم میں جدید فکری تحریک کو جنم دیا ہے اور یہ تحریک اپنی نوبت میں فیمینزم کے معاشرتی نتائج میں اثر انداز ہوئی ہے، اس تاثیر کا واضح نمونہ فیمینزم کی تیسری موج میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے، فیمینزم نے تیسری موج کے اعتبار سے ایک ماڈرن نظریہ کے قالب میں ایک فلسفی روپ اختیار کر لیا ہے اور اپنی مدعیات کے دامن کو وسیع کر دیا ہے اور یہ امر سب سے زیادہ معرفت شناختی کے تغیّر و تبدل میں ریشہ دوان ہے، جب تک علم کا پوزیوٹسٹی نظریہ ماڈرن معاشر کے اوپر حاکم رہا فیمینزم نظریہ اپنے دامن کو علم کے قلمرو میں داخل نہ کر سکا، پوزیوٹسٹی کی نظر میں علم کی معرفت کا حلقہ ایک ایسا حلقہ ہے کہ جو اپنے اندرونی ڈھانچے میں دوسرے معرفتی مراکز سے مستقل شمار ہوتا ہے، ایک عالم اس حلقہ میں داخل ہوتے وقت اپنے تمام ثقافتی تعلّقات کو ایک طرف رکھ دیتا ہے، اس نظریہ کے مطابق علم حاصل کرنے کا مرکز ایک آزمائش گاہ (لیبارٹی) کی مانند ہے کہ جس میں وہیں سے مخصوص لباس درکار ہوتا ہے، ایک محقّق اس کی حدود میں داخل ہوتے وقت اپنے مخصوص لباس منجملہ جنسیت کے لباس کو اتار دیتا ہے اور آزمائش گاہ کے مخصوص لباس کو جو کہ عالموں سے مخصوص ہے زیب تن کر لیتا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ادھر جو گفتگو یا مباحث شروع ہوئے اس نے علمی معرفت کے متعلق مذکورہ نظریہ کو عملی بنا دیا ہے، اس نظریہ نے فیمینزم نظریہ کے حامیوں کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ جنسیت کو بنیاد بنا کر علمی معرفت میں ساجھے داری کا اعلان کر سکیں اور اس طرح وہ علمی مراکز کے جانبی مباحث سے آگے بڑھ کر علم کے اندرونی ڈھانچے میں داخل ہو گئے۔ بلاشبہ فیمینزم ایسا ریڈیکل ماڈرن نظریہ ہے کہ جو معرفت شناختی کے بنا استفادہ کئے بغیر اپنے وجود کو منوا سکتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

LISAN". Road No.-5, Iqra Coloy, New Sir Syed,Nagar,
Aligarh(UP) 202002.
MB NO.- 9599396218

- **تانیثیت**
- **مشتاق احمد نوری**

تانیثیت کیا ہے؟

تانیثیت ،نسائیت یانسوانیت پرالگ سے بحث کیوں؟
کیاادب میں صنفی تفریق ضروری ہے؟
اس موضوع پرالگ سے گفتگو کیوں ضروری ہے؟
اس طرح کے اور بھی بہتیرے سوالات ہیں جو ذہن میں دستک دے رہے ہیں۔

علامہ اقبال نے وجودِ زن کو کائنات کی رنگینی کے لئے لازمی قرار دیا تھا اور اس حسین وجود کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔آج زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں ہے جس کا تصور عورت کے بغیر ممکن ہو۔آج کی عورت زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی لازمیت بغیر کسی نسائی تحریک کے درج کرا چکی ہے۔

IAS ہو IFS, IPS ہو یا دیگر State Services ہر جگہ عورتوں کی موجودگی نظر آتی ہے اور کبھی کبھی قیادت کے معاملے میں مردوں سے بازی ماری جاتی ہے۔ایئر فورس ہو یا ملیٹری سروس..... ہر جگہ عورتوں نے اپنی مضبوطی کو ثابت کیا ہے۔Space میں بھی کلپنا چاولا اور سنیتا ولیم کے علاوہ کئی اور نے اپنے کارنامے سے حیران کردیا ہے۔

عورتوں نے اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ہر شعبہ میں اپنی اہلیت ثابت کی ہے۔وہ کھیل کا میدان ہو یا زندگی کا.....اس نے اپنی موجودگی سے اسے گلزار بنائے رکھا ہے،لیکن سچ یہ بھی ہے کہ ہر بار اسے ہی اگنی پرکشا سے گزرنا پڑتا ہے۔

آج صارفیت کے زمانے میں عورت کے بغیر کچھ بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ ہر اشتہار میں اس کی نمایاں موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے آپ عورت کی بیساکھی کے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔یہ بھی سچ ہے کہ صارفیت کے معاملے میں ان کا قدرے استحصال بھی ہوتا ہے،لیکن ان کی موجودگی کے بغیر گاڑی آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ٹرک کا بھی اشتہار ہو تو مرچ اور لیموں کی نظر کاٹ لے کر کوئی خوبصورتی لڑکی ہی نظر آتی ہے۔بلیڈ کے اشتہار میں بھی اس کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔غرض کہ آج کے زمانے میں ایک

بھی ایسا اشتہار نہیں جس میں عورت نہ ہو۔آج کی مردانہ ذہنیت ہر جگہ اس کا استحصال تو کرتی ہے،لیکن اس کا جائز مقام اسے آج تک نہیں ملا۔اس میں آخر کس کا ہاتھ ہے؟

کیا سماج کا موجودہ نظام جہاں مرد کو برتری حاصل ہے وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے؟
اگر دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں تو شاید سچائی نظر آجائے۔
آیئے ادب کی ہی بات کریں۔

جب اردو کے پہلے ناول کی بات ہو تو رشیدۃ النساء ہی سرفہرست نظر آتی ہیں،عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر ہوں یا رضیہ سجاد ظہیر اور صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو ہوں یا ذکیہ مشہدی.....قمر جہاں، شائستہ فاخری، صادقہ نواب سحر، ترنم ریاض سے لے کر ثروت خان تک پچاسوں ایسے نام ہیں جنہوں نے ادب میں بھی اپنی ریاست قائم کی ہوئی ہیں۔

شاعرات میں بھی کشور ناہید، پروین شاکر، سارا شگفتہ، زاہدہ زیدی، فاطمہ حسین، شفیق فاطمہ شعریٰ، عذرا پروین، شبنم عشائی، کہکشاں تبسم اور درجنوں ایسی ہیں جو سکہ رائج الوقت کا درجہ پا چکی ہیں۔

ہم ان پر گفتگو کرتے ہیں،لیکن خواتین کے زمرے میں رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔کیا اس طرح ہم صنفی تفریق کے مرتکب نہیں ہوتے؟ کیا اس طرح صنفی تفریق کو بڑھاوا دے کر ہم ان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں؟

تانیثیت پر کتابیں لکھی جارہی ہیں، بحثیں ہورہی ہیں، سمینار ہو رہے ہیں، مضامین بھی لکھے جارہے ہیں،لیکن انہیں ان کا جائز مقام دینے میں کہیں نہ کہیں ہم سے چوک ہورہی ہے۔

ایک ہی گھر میں اگر مرد افسانہ نگار یا شاعر ہو اور اتفاق سے اگر بیوی بھی اس صنف میں مہارت رکھتی ہو تو مرد کو کوفت ہونے لگتی ہے اور اگر اتفاق سے بیوی مرد سے بہتر تخلیق کر رہی ہو تو دونوں کے بیچ ایک انجانا سا حصار قائم ہونے لگتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ مرد بیوی کی ادبی آزادی کو پوری طرح قبول نہیں کر پاتا ہے۔خواہ مخواہ کی سبکی محسوس ہونے لگتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ خواتین قلم کاروں پر خواتین ہی لکھیں۔ایمانداری کا تقاضہ ہے کہ آج کے ناقدوں خصوصاً نئی نسل کے نمائندہ ناقدوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس نسائی ادبی تحریک پر مکمل گفتگو کریں۔

یہ سچ ہے کہ مردانہ تعصب ہمارے سماج کا حصہ ہے۔آج بھی سماج میں مرد سب کچھ کر گزرتا ہے لیکن اس کا کچھ نہیں بگڑتا کہ یہ اس کا مردانہ حق ہے،لیکن عورت غلطی سے بھی ذرا ''تاک جھانک'' کرلے تو وہ بدنام ہوجاتی ہے اور اس پر طنز کی بارش ہونے لگی ہے۔یہ ہماری کم نظری ہے ہمیں اس سے باہر آنا ہوگا۔

آج ہم عورت کو برابر کا درجہ تو دینا چاہتے ہیں،لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ''ڈور ہمارے ہاتھ میں ہی رہے۔''

کبھی کبھی عورتیں خود حصار سے باہو ہو جاتی ہیں اور خود کو سماجی بندھنوں سے آزاد تصور کرنے لگتی ہیں یا حد درجہ بندش انہیں حصار توڑ کر باہر نکلنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے، جس پر بھی گفتگو کی جا سکتی ہے۔

مدر ٹریسا اپنی مثال آپ ہیں جن کی عظیم قربانی نے انہیں امر بنا دیا ہے۔ ملالہ یوسف زئی جیسی کم سن طالبہ نے بھی طالبان کے مقابلے پر آ کر اور اپنے عزم کا اعلان کر کے سماج کو پیغام دیا کہ سچائی کے لئے کچھ بھی قربانی دی جا سکتی ہے۔

تاریخ کے آئینے میں جھانکئے تو وہاں بھی رضیہ سلطان، چاند بی بی، جھانسی کی رانی، لکھنؤ کی نواب بیگم محل کی مثالیں موجود ہیں جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں کوئی بھی کسر نہیں چھوڑیں، لیکن ہمارے اس سماج میں دلہنیں شعلوں کی نظر کی جا رہی ہیں، کنواری لڑکیاں پھانسی پر جھول رہی ہیں، معصوم بچیاں درندگی کا شکار ہو رہی ہیں، آئے دن اخبارات ایسی دل دہلا دینے والی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ اس درندگی میں مردانہ عصبیت نہیں تو اور کیا ہے؟

اب تو انتہا یہ ہے کہ بچیوں کو پیدا ہونے سے قبل ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔ لڑکی کا باپ ہونا خوار سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں ذلت کی نشانی بنا دی گئی ہیں، آخر کیوں؟ کون ہے اس کا ذمہ دار؟ خاندان کو آگے بڑھانے کے لئے لڑکے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ کیا کوئی لڑکا لڑکی کے بغیر خاندان کو بڑھا سکتا ہے؟ خاندان کو وراثت تو لڑکی ہی کی کوکھ دیتی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم صحیح معنوں میں عورتوں کو برابری کا درجہ دیں کیوں کہ انہیں عزت دیے بغیر ہم اس صنفی تفریق کی دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے ہیں۔ ہمیں منصفانہ طور پر ایک ایسا سماجی اور ادبی نظام قائم کرنا ہوگا جہاں عورتوں کو نہ صرف مساوی حقوق حاصل ہوں بلکہ انہیں بااختیار درجہ بھی دیا جائے تاکہ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ سر اٹھا کر زندہ رہ سکیں۔ ہمیں انہیں بھی وہی اختیار اور وقار دینا ہوگا جو ہم نے اپنے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ تب ہی ہم اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے اور عورتوں کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے مردوں کی آبرو کی پاسداری کرنی ہوگی۔

◀◀ ● ▶▶

"Nooristaan" 4-204, Hassan Palaza,Minhaj Nagar, Khalilpura Road
Phulwarisharif,Patna-801505-Mob:9771276062

● ثانیثیت
● شموئل احمد

عورت اور معاشرہ

معاشرے میں بالادستی مرد کی ہے۔ وہ خود کو صنف بہتر سمجھتا ہے۔ ادب عالیہ ہو یا اساطیری قصّے .....مرد نے ہر جگہ اپنی برتری ثبت کی ہے۔

ماہر نفسیات ولیم اسٹیکل کے مطابق عورت کے لاشعور میں ایک آئیڈیل مرد بستا ہے۔ عورت ادھر متوجہ ہوتی ہے جہاں اس کا آئیڈیل نظر آتا ہے۔ اکثر شاعر ادیب اور نامور فنکار کو بعض عورتیں اپنا آئیڈیل تصور کرتی ہیں اور اُن دیکھے ان کے عشق میں مبتلا رہتی ہیں۔ لیکن مرد کی نگاہ میں عورت فقط ایک جسم ہے۔ وہ اس کے جسمانی تقاضے کو لگام دینے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے جور و ستم کے راستے اپناتا ہے۔ مرد عورت سے کہیں خائف ہے تو بستر پر۔ قوت باہ بڑھانے کے لیے اس نے طرح طرح کے کشتے اور معجون ایجاد کئے ہیں۔ عورت کے لیئے کوئی معجون نہیں ہے۔ وہ سیکس کی بات بھی نہیں کر سکتی۔ اگر کرتی ہے تو فاحشہ قرار دی جاتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ کوئی مرد ایسا بھی ہے کہ تین سال کی بچّی کو بھی کمر سے نیچے دیکھتا ہے۔ ادب ہو یا معاشرہ مرد عورت کو ذلیل کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اس نے طرح طرح کی گالیاں عورت کی نسبت سے ہی ایجاد کی ہیں۔ گالیاں ماں اور بہن کی ہوتی ہیں۔ آج تک باپ یا بیٹے کو لگا کر کوئی گالی ایجاد نہیں ہوئی۔ نطشے کہتا ہے کہ محبت عورت کے لیے جسم اور روح کا مکمّل عطیہ ہے جب کہ مرد کے لیے محبت فقط ایک جز ہے۔

عورت سجتی اور سنورتی ہے مرد کے لیے۔ مرد کا گھر میں ہونا اسے راحت بخشتا ہے۔ اس کا داڑھی بنانا اس کو اچھا لگتا ہے۔ ایک ساتھ صوفے پر بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا اس کو سہانا لگتا ہے۔ وہ مرد کے ساتھ مختصر لمحات میں بھی خوش رہتی ہے۔ بس ایک نگاہ التفات چاہئے۔ مرد گھر سے باہر جاتا ہے تو اس کا انتظار کرتی۔ وہ رات دیر سے لوٹتا ہے تو غصّہ کرتی ہے۔ مرد سمجھتا ہے کہ وہ ہر دم قابض رہنا چاہتی ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتا کہ عورت مکمّل سپردگی پر یقین رکھتی ہے۔ وہ پسلی سے نکلی ہے تو پسلی میں ہی ضم ہونا چاہتی ہے۔ لیکن گھر اس کا نہیں ہوتا۔ گھر شوہر کا ہوتا ہے اور شوہر کے بعد بیٹے کا ہوتا ہے۔ مائکہ بھی اس کا نہیں

ہوتا۔ مائکے میں بھی وہ پرایا دھن سمجھی جاتی ہے اور سسرال میں باہر سے آئی ہوئی عورت ۔ساس کے بھی نشتر سہتی ہے اور نند کے بھی طعنے سنتی ہے ۔ساس اور نند دونوں ہی عورتیں ہیں اور قرۃ العین حیدر کہتی ہیں کہ عورت ہی عورت کے حق میں چڑیل ہوتی ہےَ۔

ترک شدہ یا گھر سے بھاگی ہوئی یا مغویہ عورت کو مرد قبول نہیں کرتا۔ بالمکی رامائن میں شری رام سیتا سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔

''یہ جو جنگ کی.....جو فتح حاصل کی وہ تمہاری خاطر نہیں کی ......جس کارن میں نے تمہارا اڈّ ہار کیا وہ اڈّیش سدھ ہو گیا۔اب تم میں میری کوئی آسکتی نہیں ...... جہاں اِچھّا ہو چلی جاو۔'' [بالمکی رامائن 21- 6/115/19]۔ المیہ یہ ہے کہ اگنی پریکچھا کے بعد بھی سیتا قابل قبول نہیں ہے۔اسے زمین کی کوکھ میں پناہ لینا پڑتا ہے۔ بیدی کی لاجونتی مغویہ عورت کی بدنصیبی کی سمبل ہے۔

اسلام میں نکاح عورت اور مرد کے مابین یک طرفہ سمجھوتا ہے ۔مرد اسے نان ونفقہ دیتا ہے بدلے میں عورت اس کو جسم دیتی ہے ۔مرد جب چاہے تین بول کے ساتھ اس سے چھٹکارہ پا سکتا ہے۔ عورت نہیں پا سکتی۔عورت خلع بھی لیتی ہے تو مرد کی مرضی ضروری ہے۔ خلع لینے پر وہ دان مہر کی حق دار نہیں رہتی ۔امام غزالی نے اپنی مشہور تصنیف سعادت کیمیا اور احیا العلوم میں عورت کے ساتھ معاشرت کے آداب بتائے ہیں اور بزرگوں کے اقوال درج کیے ہیں کہ بیوی کو چاہیئے کہ خاوند کی لونڈی بنی رہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ عورتوں سے مشورہ کرو لیکن ان کے کہنے کے خلاف عمل کرو۔حقیقت میں عورت کی ذات نفس سرکش کی مانند ہوتی ہے ۔اگر ذرا بھی مرد اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دے گا تو ہاتھ سے جاتی رہیں گی اور حد سے گزر جائیں گی ۔اگر کوئی شخص کسی عورت سے سیر ہو جائے اور اس کے پاس جانے کو جی نہ چاہے طلاق دے دے، قید میں نہ رکھے ۔شوہر اگر اونٹ پر بھی سوار ہو اور عورت سے حق تمتّع چاہے تو وہ انکار نہیں کر سکتی ۔انکار کرے گی تو دوزخ میں جائے گی ۔شوہر کے سر سے پاوں تک پیپ ہو اور عورت اس کو چاٹے تب بھی اس کا شکر ادا نہ کر سکے گی ۔ جو عورتیں شوہر کی نا فرمانی کرتی ہیں دوزخ میں جائیں گی ۔حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی بیوی کا مطیع بنا رہے کہ جو وہ چاہے وہی کرے تو حق تعالیٰ اسے دوزخ میں اوندھا گرا دے گا اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ عورتوں کی مرضی کے خلاف کیا کرو کہ ان کے خلاف کرنے میں برکت ہوتی ہے ۔حدیث شریف میں آیا ہے کہ عورت کی مثال ایسی ہے جیسی پسلی کی ہڈّی ۔اگر تو اسے سیدھا کرنا چاہے گا تو ٹوٹ جائے گی۔

مرد عورت کو آزادی نہیں دے سکتا۔عورت نے جب جب آزادی کی بات کی ہے مرد نے خطرہ محسوس کیا ہے ۔راجندر یادو کہتے ہیں کہ سماج میں عورت کی تین طرح کی حیثیت ہے ۔ بیوی ، داشتہ اور

طوائف ۔مرد اپنا نام اور تحفّظ دیتا ہے تو وہ بیوی ہے ۔ نام نہیں دیتا لیکن حصار میں رکھتا ہے تو داشتہ ہے۔ نام بھی نہیں دیتا اور حصار میں بھی نہیں رکھتا تو طوائف ہے۔عورت آزاد ہوتی ہے تو طوائف ہوتی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی سماج میں لڑکیوں کے نام درو پدی نہیں ہوتے اور شیعہ معاشرے میں عائشہ نام نہیں ہوتا ؟ شاید یہ بات قابل قبول نہیں ہے کہ عورت مردانہ سماج کو چیلنج کرے اور انتقام کا جذبہ رکھے۔

اردو کا سارا تانیثی ادب میری نظر میں ناقص ہے ۔ایک ہی بیان ملتا ہے......وہی عورت کی بے بسی، اس کی آہیں اس کے آنسو اور مرد کی بالا دستی کا نوحہ۔لیکن اس طرف پاکستان کی تانیثی شاعری کے تیور تیکھے ہیں۔ عذرا عبّاس، فہمیدہ ریاض اور نسیم سیّد وغیرہ نے مرد اساسی سماج کو الگ زاویئے سے دیکھا ہے اور کچھ تیکھے سوال اٹھائے ہیں جو مرد ناقد کو قابل قبول نہیں ہونگے۔

معاشرہ مردوں کا ہے۔اخلاقی قوانین اور ضابطے وہی خلق کرتا ہے۔عورت اپنی زندگی کبھی جی نہیں سکتی۔مردوں کے بنائے اخلاقی پیمانے میں اپنی زندگی جیتی ہوئی عورت ہمیشہ داغ دار نظر آئے گی۔

◄◄ ● ►►

201, Lily Blossom Apartment,Attapur,Chintalmet Road
In Front of Pillar No :177.Next to SDR ,Pearl Palace
Hyderabad 500048 Telanga
9835299303

سہ ماہی

دربھنگہ ٹائمز

مدیر: ڈاکٹر منصور خوشتر

ملنے کا پتہ

شوکت علی ہاؤس، پرانی منصفی، لال باغ، دربھنگہ بہار (انڈیا)

● تانیثیت
● ریاض احمد

اردو ادب میں تانیثیت .....ایک مطالعہ

اردو ادب میں جب بھی تانیثیت کی بات چھڑتی ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ تانیثیت کا تعلق عورت کی سماجی، اقتصادی اور سماجی زندگی سے جڑا ہے اور اس کا دوسرا تعلق ادب سے ہے۔ تانیثی تحریک مرد معاشرے کے برعکس ہے تانیثی تحریک عورت کی معاشی، سماجی، سیاسی، صنفی اور دیگر معاملات میں برابری و مساوات کا دعویٰ کرتی ہے۔ تانیثیت کے رجحان کی ابتدا تقریباً ۱۸۵۰ء میں ہوئی ہے۔ تانیثیت کے مرکز فرانس، امریکہ، برطانیہ رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے نصف تک آتے آتے تانیثیت کا تصور پوری دنیا میں پھیل گیا اور اس کی مختلف شکلیں آکر سامنے آئی اور ادبی سطح پر تانیثیت کے مختلف دبستان وجود میں آئے جیسے مارکسی تانیثیت، ترقی پسند تانیثیت، نفسیاتی تانیثیت، جدید تانیثیت، مابعد جدید تانیثیت وغیرہ اور اب تانیثیت ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے اور پتے پیمانوں کے ساتھ ادب، لسانی اور ثقافتی تاریخ بھی قریب کرنے میں مصر ہے۔ آج اردو ادب میں تانیثیت کی آواز نمایاں طور پر سُنائی دے رہی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادب میں تانیثیت کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ چاہے وہ شاعری کی نسبت سے ہوں یا افسانوی ادب کی نسبت سے ہوں بہت سے مرد ناقدین خواتین شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کو روائتی پیمانیسے جانچنے پر راضی ہیں اور کئی نسوانیت، نسائی اظہار اور نسائی حیثیت کو حلقہ کر دیتے ہیں جس کے سبب تانیثیت اور تانیثی ادب کا تصور ان کی پکڑ سے دور رہتا ہے لہذا تانیثی ڈسکورس کو ایک ادبی ڈسکورس کے طور پر لیا جائے۔ تا کہ ایسی زمین تیار کی جائے جو تانیثی ادب کے لیے مفید ہوں۔

ادب کی دنیا میں مرد حاوی رہا ہے اور عورت کو تانیثی نقطہ نظر سے خارج کیا جاتا رہا ہے کہ نام نہاد عورتیں تانیثی ادب کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں مگر تانیثیت ان نام نہاد عوتوں سے انکار کرتی ہے تانیثی تنقید عورت کو اس کا مقام اور حق دلوانے کے ساتھ ساتھ گذشتہ ادب میں عورت کے اظہار کی کمی کی بھی معافی چاہتی ہے۔ تانیثیت کے بہت مراتب ہیں اول کہ عورتوں کے تیار کئے ہوئے متن کو اس طرح بڑھایا جائے کہ ان کو وہ مرتبہ ملے جس کی وہ دعویٰ دار ہیں جیسے بہت سی ایسی ادباء و شرفاء ہیں جن کی تصانیف کو کوئی درجہ

نہیں ملا ہے لہذا ان کی تصانیف کو تاریخ میں بنیادی مقام دیا جائے۔ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے اس لیے نہیں ہوا ہے کیونکہ یہ عورتیں تھی گویا یہ کہ عورتوں کو مردوں کے خلاف نہیں بلکہ ایک اہم طبقہ قرار دے کر ان کے ساتھ برابر اور ہمدردانہ سلوک کیا جائے۔ تانیثیت میں محض ان کے ادبی متون کا ذکر ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ساری انسانی تاریخ، تہذیبی، سیاسی، سماجی مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے متعلق ناصر علی کہتے ہیں کہ:

''تانیثیت اس قول سے مراد لیتی ہے کہ عورت کا تصور و یکالیسی آئیڈیالوجی کی رو سے تیار کیا گیا ہے۔ جدید شاہی نظام کی زایید ہ ہے۔ جس میں مرد اور مردانہ اوصاف عمومی انسانی قدر کا پیمانہ کرتے ہیں اور اس پیمانے کی زو سے عورت ''ہم انسانی اوصاف سے تھی.....کم تر مخلوق ہے۔ تانیثیت اس صورتحال کے خلاف شدید احتجاج کرتی ہے اور ان تمام صورتوں اور حکمت عملیوں کو طشت از بام کرتی ہے.....''

عورت ایک ایسی تاریخ سے وابستہ ہے جو اخلاقی، تہذیبی اور استحصال نسواں کی تاریخ کہلاتی ہے۔ جس میں ہزاروں سسکیاں اور چیخیں ہیں ان سب بے آس اور شکستہ دل پہلوؤں کی عکاسی خواتین ادیبوں اور قلم کاروں نے مختلف افکار سے کی ہے۔ نفسیات نگاروں نے بھی عورت کی اس پیچیدہ حیثیت کو دیکھا اور ان تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ساختیات نظریہ نگاروں نے تانیثی ادب میں عورت ذات کے انجذ بات و احساسات کی نشان دہی کی جو ان کو مرد حضرات سے الگ کرنے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تانیثیت اور ادب کے حوالے دے ان تمام قلمکاروں کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کی کوششوں سے عورتوں کی آزادی اور حقوق نسواں اور مساوات کے لیے آواز اُٹھائی اور عورتوں کو ایسی راہ پر پہنچا دیا جہاں پر وہ متحدہ ہو کر خود سماج کے خلاف اپنے حقوق کے لیے لڑ سکیں۔ پریم چند اس پر گوہر افشانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> ''مرد جانتا ہے کہ عورت پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسے وہ رو کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اگر اسے خوف ہوتا کہ عورت بھی اس کی اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں، اینٹ سے بھی نہیں، محض تھپڑ سے دے سکتی ہے، تو اسے کبھی اس بدمزاجی کی جرات نہ ہوتی''۔
>
> (کسم، ماہنامہ عصمت، سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء ص ۱۳۵)

ملکی سطح پر یعنی ہندوستان میں تانیثیت کا جائیزہ لیتے ہوئے قدیم ہندوستان سے ہی عورتوں کی ہر پہلو میں جکڑ بندی سے انکار میں کیا جا سکتا ہے خاص کر ادب کے حوالے سے ان کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ ہر زمانے میں صورتوں کے متعلق خیالات پیش ہوتے رہتے ہیں کچھ نے ان کی حمایت کی اور کچھ نے مخالفت کی۔ غرض یہ کہ عورتیں اختلاف کی چکی میں پیش رہی اور مفروضیت سے دوچار ہوتی رہیں اور کبھی آنسو بہاتی کبھی سسکتی کبھی مردوں کے جبر کا نشانہ بنتی رہیں۔ اردو میں تانیثی ادب جس میں عورتوں کے موضوعات کو موضوع بحث بنانا انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوا ہے۔ ہندوستان میں عورتوں نے شعر و ادب کے

میدان میں ۱۸۹۱ء میں قدم رکھا اس بات کا علم ایک تذکرہ ''شمیم سخن'' سے ہوتا ہے۔اردو ادب کی مختلف اصناف کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ میں بھی عورت ادب کا خاص موضوع رہی ہے۔داستانوں، ناولوں، افسانوں، کہانیوں، غزلوں، نظموں وغیرہ میں عورت کو کئی زاویوں سے پیش کیا ہے۔شعروں کا محبوب موضوع بھی عورت ہی رہی ہے۔اس کے حسن و جمال، ناز و ادا کے دل دوز تذکروں سے اپنی شاعری کا سنگار کرتے اور سندارتے رہے۔ایک دلچسپ بات یہ کہ اس طویل عرصے کے بعد آخر مرد ادیبوں نے ہی خواتین کے مسائل اور ان کے حقوق کو موضوعِ بحث بنایا یعنی نذیر احمد نے اپنے مشہور ناول ''مرۃ العروس'' میں اکبری اور اصغری کی کہانی کو موضوع بنایا۔قلم کاروں کے نزدیک اس ناول میں نذیر احمد مسلم عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے۔ان کے بعد سرسید احمد خان، عبدالعلیم سرور، حالی، رسوا، پریم چند، منٹو وغیرہ نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے ذریعے عورتوں کی تعلیم اور ان کے متعلق کئی موضوعات کو موضوعِ بحث بنا کر شایع کیا۔اس کے ساتھ ساتھ شادی میں عورتوں کی رضامندی اور گھریلو زندگی میں ان کے ساتھ مشورے کی اہمیت پر بھی زور دیا۔بیسویں صدی کا آغاز اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ بہت ادیبائیں تحریک آزادی سے جوڑ گئی ان میں ایک اہم ادیب نذر سجاد حیدر نے ''آہ مظلوماں'' ۱۹۱۳ء میں ازدواجی زندگی سے پیدا ہونے والے معاملات کو پیش کیا ہے۔اردو ادب میں تانیثی رجحانات کی کارپردازی بیسویں صدی کی تیسری دھائی کے ختم ہونے کے بعد دکھائی دیتی ہے۔اس دور میں ایک اہم ادیب رشید جہاں ظاہر ہوئی اور اس نے ایک مجموعہ ''انگارے'' مرتب کیا اور اس میں اپنی دو کہانیاں بھی شامل کی ''دلی کی سیر'' اور پردے کے پیچھے'' ان کہانیوں میں سماج پر بہت طنز کیا۔مردوں اور عورتوں کے علحیدہ علحیدہ اصولوں اور معیاروں پر بحث کی ان کا مجموعہ ''انگارے'' کو اردو ادب میں باقاعدہ تانیثی روایت کا موجد کہا جاتا ہے۔رشید جہاں وہ خاتون ہے جن کی تحریروں میں تانیثیت کے اولین نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔وہ ذہین اور تعلیمیافتہ خاتون تھیں۔ترقی پسندی اور روشن خیالی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی اس نے بچپن سے ہی عورت ذات کے ظلم وستم اور اس کی مایوس کن زندگی کو قریب سے دیکھا۔اسی لیے اس نے ان کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تھا۔ان کے بعد اردو ادب میں تانیثیت کی سب سے بلند آواز عصمت چغتائی کی تھی۔عصمت نے بھی حقیقت نگاری کی اس دنیا میں نمایاں خدمات سرانجام دی۔ان کا لب ولہجہ اور اندازِ فکر مکمل طور پر تانیثی تھا۔انہوں نے اپنی بے باک طبعیت اور نڈرتا کی وجہ سے پہلی دفعہ عورت کو اس کے جذبات و احساسات، فطرت ونفسیات اور اصلی رنگ وروپ میں پیش کیا کہ شکست خوردہ عورت کو محسوس ہوا کہ وہ اپنی نفسیات سے ابھی تک ناوقف تھی۔ان کے ناولوں اور افسانوں کے موضوعات الگ الگ ہیں ان ہی کی طرح رضیہ سجاد ظہیر بھی ترقی پسند ہیں ان کا شمار بھی صف اول کی ادیباوں میں ہوتا ہے۔ان کے چار ناول

''کانٹے''، ''سمیتی''، ''سرشام''، ''اللہ میگھ دے'' اور افسانوی مجموعہ ''زرد گلاب'' شایع ہوئے ہیں ان میں عصمت نے لباس وسماجی بے انصافی سے پیدا شدہ حالات کو منظرِ عام پر لایا ہے اور ان کے خلاف طنز بھی کیا ہے۔خدیجہ مستور بھی بڑی حاصل نگار خاتون فکشن نگار ہے۔ان کے ناول ''آنگن'' اور ''زمین'' عمدہ ناول ہیں ان میں بھی تانیثی شعور کا اظہار خوب ہوا ہے۔ان کے بعد قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور افسانوں میں سب سے زیادہ تانیثی شعور کا پتہ دیتا ہے۔اردو میں شعور کی رو (Stream of consciousness) کو سب سے پہلے انہوں نے ہی اپنایا ہے۔ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ تانیثی شعور ''آگ کا دریا'' میں ملتا ہے۔جمیلہ ہاشمی کے ناول ''تلاشِ بہاراں'' میں بھی عورتوں کے جنسی استحصال کا بیان خوب ہوا ہے۔ایک اور اہم نام جیلانی بانو کا ہے ان کی تصانیف میں سماجی نابرابری کا ذکر خوب ملتا ہے۔ان کے دو ناول ''ایوانِ غزل'' اور ''بارش سنگ'' تانیثی میدان میں بہت اہم ہیں۔بانو قدسیہ بھی ایک منفرد ناول نگار ہیں انہوں نے اپنی ناولوں میں عورت کی مظلومیت کو موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے اس انداز کو کوئی دوسرا فکشن نگار نہیں پہنچ سکا۔اس میدان میں ان کا مشہور ناول ''راجہ گدھ'' ہے۔رضیہ بٹ نے بھی اعلیٰ ناول لکھئے ہیں ان کو سب مصنفوں میں سب سے زیادہ شہرت ملی ہے۔ان کے ناولوں میں تانیثی رجحان خوب کارفرما نظر آتا ہے ان کا ایک مشہور ناول ''فاصلے'' ہے اس میں بھی عورت کی نابرابری کی کشمکش نظر آتی ہے۔شیری رحمان نے بھی اپنے ناولوں اور افسانوں میں تانیثی رجحان کو خوب برتا ہے۔ان کا ناول ''عشق عشق'' تانیثی رجحان میں نمایاں مقام رکھتا ہے جس میں جابجا عورت کی بے بسی اور لاچارگی کو اجاگر کیا ہے۔ترنم ریاض اردو ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔یہ ناول نگار افسانہ نگار اور شاعرہ، نقاد سب کچھ ہیں ان کا ایک مشہور ناول ''مورتی'' ہے جس میں تانیثیت کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔عورت کی مظلومیت، جنسی استحصال اور سماجی نابرابری پر انہوں نے بڑے فنکارانہ انداز میں لکھا ہے۔صغریٰ مہدی بھی ایک اور اہم نام ہے یہ معتبر اور انقلاب پسند خاتون ہے۔ان کی تصانیف کے موضوعات خصوصاً انسان دوستی، فرقہ پرستی، رواداری اور خواتین کے مسائل ہیں۔یہ تانیثی شعور کو ابھارتی نظر آتی ہیں ان کا ایک مشہور ناول ''جو بچے میں سنگِ سمیٹ لد'' بہت شہرت حاصل کر چکا ہے۔اس میں بھی تانیثیت کے خوب جوہر دکھائے گئے ہیں۔

تانیثی ادب میں ثروت خان کا ناول ''اندھیرا پگ'' بھی مسخ شدہ صورتِ حال کو ابھارنے میں نمایاں رول ادا کرتا ہے۔اس ناول میں خاص کر بیوہ عورت کی بے بسی اور لاچارگی کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔یہ ناول راجستھان کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھا گیا ہے۔فریدہ رحمت اللہ کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں یہ ایک خاتون ہے انہوں نے معاشرے میں عورت پر ہونے والے ظلم وتشدد اور جبر و استبداد کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ان کے دو افسانوی مجموعے ''درکی گونج'' اور لڈی مالا موتی'' ہیں۔جن

میں تانیثی ادب کی عکاسی ملتی ہے۔

ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک میں رہنے والی عورتیں شعروادب میں برابر حصہ لے رہیں ہیں مثلاً سلطانہ مہریں، رضیہ فصیح احمد، پروین کمال، شکیلہ رفیق، صفیہ صدیقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ان ادباء و مصنفین نے مغربی معاشرے میں عورت پر ہونے والے ظلم وستم اور مغربی سمجھ میں مشرقی مروجہ گل کھلا رہے ہیں۔ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اور ان پر ظلم وستم واستحصال پر معاشرے کو غور وفکر کرنے کی بھی دعوت دی ہے۔صالحہ عابد حسین جب اردو ادب میں عمدار ہوئی تو اہرابِ نے بھی تانیثیت ادب میں عمدہ کار کردگی دکھائی تقریباً چالیس کتابیں ان کی تصانیف ہیں۔اصلاحی رنگ ان کی تحریر کے ہر پہلوں میں آباد ہے۔ان کا ایک مشہور افسانہ ''گذاری ہیں خوشی کی چند گھڑیاں'' تانیثی میدان میں عمدہ کارنامہ ہے۔رضیہ سجاد ظہیر بھی اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔انہوں نے بھی اپنے افسانوں میں عورت پر ہونے والے ظلم وستم اور جبر پر آواز اُٹھائی ہے اور سماجی نابرابری پر متوجہ کیا ہے۔ان کا افسانہ ''زردگاب'' بھی تانیثی دنیا کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔اردو نثر میں ادیباوں نے بیسویں صدی کی شروعات میں ہی اپنی شناخت والی شاعری کے میدان میں چوتھی دہائی تک کوئی خاتون نہیں دکھتی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ باعزت اور شریف گھروں کی عورتوں کے لیے گھر سے نکلنا لمبے عرصے تک عیب سمجھا جاتا تھا۔کئی عورتوں نے قلم اُٹھانا بھی چاہا مگر معاشرے کے ظلم وتشدد نے ان کو اس میدان میں اترنے نہ دیا۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ شاعری محض حسن وعشقیہ جذبات کے اظہار تک محدود تھی۔عصر حاضر میں شاعری کا دائرہ کھل گیا۔ہر قسم کے موضوع کو اس میں جگہ دی گئی ہے۔آج کی شریف زادیاں شاعری کے ذریعے بھی اپنے حقوق وانصاف کے لیے آواز بلند کرتی ہیں۔لہذا آج کا تانیثیتی ادب احتجاجی ادب ہے وہ فکشن ہو یا شاعری ہو اس متعلق حنا روحی کا کہنا ہے کہ:

''فیمنزم (Feminism) کا تصور ادب میں فحاشی اور بیمار زندگی کا اظہار نہیں ہے بلکہ فیمنزم عورت کی وہ پہچان ہے اور اس کی شناخت کا وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ معاشرے کی بے حسی، آمریت، یک طرفہ حکومت، جبریت، انانیت، بے زبان عورت پر مرد کی بالا دستی، عورت کی ہنسی اور مسکان پر مرد کی دقیانوسی سوچ کے تالے، عورت کی عصمت پر مرد کی جسمانی عیاشی کے خلاف کھلم کھلا اظہار ہے۔اپنی شناخت کے لیے عورت صدیوں سے برسر پیکار رہی ہے۔کبھی وہ تاریخ کا سہارا لیتی ہے، کبھی لٹریچر کے سمندر میں ڈوب کر اپنی شناخت کے موتی ڈھونڈ لاتی ہے۔کبھی تو وہ اپنے آنچل کے پرچم بنا کر آزادی کے گیت گاتی ہے تو کبھی اپنے پیروں میں بندھی زنجیروں کو توڑ کر اپنی بلند آواز سے معاشرے کی بے حسی کو جگانے کی کوشش کرتی ہے۔معاصر عورت نے اس جھلاہٹ کا خوب اظہار ملتا ہے۔نسائی ادب خود اس بات کا اظہار ہے اور اعتراف بھی کہ اسے وہ قبولیت نہیں ملتی جو مردوں کے ادب کو ملی ہے۔۔۔۔''

جدیدیت کے بعد بہت سی ایسی مصنفہ ظہور پذیر ہوئی جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ان زنجیروں کو توڑ کر باہر نکلیں اور ادب میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے لگیں۔احساس مظلومیت اردو ادباء وشعرا کا لمبے عرصے تک اہم موضوع رہا ہے۔آخر اس ظلم نے ان کو ایسا بھڑکا دیا کہ خواتین نے مظلومیت اور محرومیت کے خلاف باغیانہ رویہ اختیار کر لیا۔اب عورتیں ہر نوعیت کی جذبات واحساسات کو اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں یہ ان کی منفرد کوششوں کا نتیجہ ہے مگر مرد حضرات کی شاعری میں آج بھی تانیثی صورت میں جھلکتی ہے۔

بہر حال اس صورتِ حال کا مجموعی طور پر جائزہ لینے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی بدلاو تو اتنا جلدی ممکن نہیں مگر خواتین نے اسے نظر انداز کر کے اپنا الگ دائرہم منتخب کیا جس میں انہوں نے اپنا رویہ اپنایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں خودشناسی کے جوہر ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

Research Scholar,O.P.J.S University,Choru,Rajasthan(India)
.9596088326,qazirayaz343@gmail.com

سہ ماہی
جہانِ اردو
مدیر: ڈاکٹر مشتاق احمد
ملنے کا پتہ
رحم گنج، دربھنگہ بہار (انڈیا)

- **مضمون**
- **شکور پٹھان**

بولیں امّاں محمد علی کی.....

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

امی وہ سنائیں ''بولیں اماں محمد علی کی۔'' امی سانس لینے کے لیے رکی ہی تھیں کہ میں نے دوسری فرمائش داغ دی۔

یہ سردیوں کی راتیں تھیں۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں ہم سب لحافوں میں دبکے مونگ پھلی ٹھونگ رہے تھے۔ میں اور باجی جاگ رہے تھے۔ دو چھوٹے بہن بھائی سو رہے تھے (سب سے چھوٹی ابھی اس دنیا میں نہیں آئی تھی)۔ امی ہمیں اپنی سریلی آواز میں جواب شکوہ کے یہ اشعار سناتیں۔ مجھے یہ چند شعر تو تیسری جماعت میں ہی یاد ہوگئے تھے۔

''اچھا وہ؟ لو سنو۔''

بولیں اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہیں شوکت علی بھی

جان بیٹا خلافت پہ دے دو
تمہی ہو میرے گھر کا اجالا
تھا اسی واسطے تم کو پالا
کام کوئی نہیں اس سے اعلا

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

پتہ نہیں یہ کون سی طرز تھی کہ ہماری آنکھیں نم ہوتی جاتی تھیں۔ ہم نہ محمد علی کو جانتے تھے نہ شوکت علی کو۔ نہ ہی یہ پتہ تھا کہ خلافت کیا (یا کون) ہوتی ہے۔ بہت بعد میں ایک دن رفیع صاحب کا گانا کہیں

ریڈیو پر سنا ''رات بھر کا ہے مہمان اندھیر..... کس کے روکے رکا ہے سویرا'' اس گانے کی دھن پر شاید امی ہمیں سناتی تھیں..... ''بولیں اماں محمد علی کی''

سردیوں کی ان راتوں میں امی نہ صرف ہمیں کہانیاں، لوریاں سناتیں بلکہ اپنے بچپن کے قصے بھی سناتیں۔ میری امی اللہ بخشے، جو صرف چار جماعت پڑھی تھیں۔ خود بھی کتابیں پڑھنے کی شوقین تھیں اور شاندار یادداشت رکھتی تھیں، ہمیں دنیا جہاں کی باتیں بتاتیں۔

''جب جرمن اور بلٹس (برٹش) کی لڑائی لگی۔''

''بلٹس کے زمانے میں روپے کا چار سیر آٹا ملتا تھا۔''

''جب ماشلّا (مارشل لا) لگا تو ایوب خان نے پانی ملے دودھ کے ڈرم نالیوں میں بہا دیئے۔ ایسی سختی تھی۔'' ہمیں کچھ سمجھ نہ آتا لیکن مزہ آتا تھا یہ سب سننے میں۔ داستان طرازی کی یہ عادت شاید مجھے امّی سے ہی ملی ہے.

پھر ایک دن جنگ اخبار کے پہلے پورے صفحے پر مولانا محمد علی جوہر کی پوری رنگین تصویر تھی جن کا اس دن یوم پیدائش یا یوم وفات تھا۔ اندرونی صفحات پر مولانا کے بارے میں مضامین تھے اور ایک تصویر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور بی اماں کی تھی۔

یہ تب کی بات ہے جب 'جنگ' اور 'انجام' اخبار میں کبھی قائداعظم، تو کبھی لیاقت علی، تو کبھی ایوب خان، یا سردار نشتر، یا نواب بہادر یار جنگ کی بڑی بڑی رنگین تصویریں لگا کرتیں جنہیں ظہور الاخلاق، بنایا کرتے تھے۔ (یہی ظہور الاخلاق تھے جو کبھی ابن صفی کے ناولوں کے ٹائٹل بھی بنایا کرتے تھے)۔ ان اخبارات کی مہربانی تھی کہ ہمیں بچپن میں ہی اکابرین کے بارے میں تھوڑی بہت سن گن مل جایا کرتی تھی۔

''امی یہی ہیں وہ، بولیں اماں محمد علی، والی؟''

''ارے ہاں، وہی تو ہیں۔ محمد علی، شوکت علی کی اماں۔'' امی کی آنکھوں میں عقیدت کی چمک تھی۔ کچھ دیر تصویر دیکھتی رہیں پھر باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ امی پھر گنگنا رہی تھیں..... ''بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو.....''

اور تب سے بی اماں کا ایسا پاکیزہ تصور ذہن کے پردے پر قائم ہوا کہ آج بھی ان کا ذکر آتا ہے تو نظریں احترام اور عقیدت سے جھکتی چلی جاتی ہیں۔ بچے اور خاص کر بیٹے تو ماؤں کی جان ہوتے ہیں۔ ان کے جگر کے ٹکڑے، مائیں جن کی سلامتی کے لئے دن رات دعائیں کرتی ہیں۔ اور یہ بڑی بی اپنے بچوں کو خلافت کے لیے جان دینے کو کہہ رہی ہیں۔ خلافت جو اِن کے نزدیک اللہ کی امانت ہے۔ جسے وہ اسلام کی نشات ثانیہ کی ضامن سمجھتی تھیں۔ اور ایسی ماں نے پوت بھی جنے تو کیسے۔

شوکت علی، محمد علی، یا علی برادران، تحریک آزادی اور تحریک خلافت کے صف اوّل کے سپاہی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے ایک، جامعہ ملیہ دہلی جیسی درسگاہ کے موسس۔ مولانا محمد علی جوہر ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد'' جیسے شعر کے خالق۔ بی اماں نے جن کی تربیت ایسی کی کہ کہہ اٹھے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اپنی اولاد کو بھی اپنی ہی طرح تسلیم و رضا کا پیکر ایسا بنایا کہ محمد علی کی جواں سال بیٹی بستر مرگ پر ہے۔ محمد علی انگریز کی قید کاٹ رہے ہیں۔ بیٹی کے بچنے کی امید ختم ہوتی جارہی ہے اور زنداں سے اپنی جگر گوشہ کو لکھتے ہیں۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو ہم کو بھی منظور نہیں

محمد علی، میرے کراچی کے خالقدنا ہال میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ سزا ہو جاتی ہے۔ آزادی کا یہ مجرم میرے شہر کی سنٹرل جیل میں مقید ہو جاتا ہے۔ انگریز اس کی قابلیت جانتا ہے، آکسفورڈ کا تعلیمیافتہ، کامریڈ اخبار کا بانی، کوئی عام ہندوستانی نہیں ہے۔ محمد علی کو معافی کی پیشکش ہوتی ہے جسے وہ ٹھکرا دیتے ہیں۔ ماں کو خبر ملتی ہے۔ ذرا آج کے رہنماؤں کا تصور کریں جو ثابت شدہ جرم کے باوجود ضمانت، خرابی صحت کے بہانے اور نہ جانے کس کس طرح کے بہانے سے رہائی چاہتے ہیں۔ اور ذرا بی اماں کو دیکھیں۔ اطمینان سے خبر سنتی ہیں اور بڑے عزم سے کہتی ہیں ''محمد علی اسلام کا بیٹا ہے۔ وہ معافی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میرے بوڑھے ہاتھوں میں اس کا گلا گھونٹ دینے کی طاقت اب بھی ہے۔''

اور یہی بی اماں حج کے لیے جاتی ہیں تو کعبہ کا غلاف پکڑ کر التجا کرتی ہیں کہ ''مالک.....! تیرے کرم سے میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ میں تجھ سے دعا کرتی ہوں کہ انہیں سچا مسلمان بنا۔''

آبادی بانو بیگم (یا عبادی بانو بیگم) یعنی بی اماں نے آنکھ آزاد ہندوستان میں کھولی تھی۔ یہ ۱۸۵۰ء کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ کم سنی میں ہی ہندوستان کو غلام ہوتے دیکھا۔ ایک غیر تمند گھرانے کی بیٹی جس کے ستر سالہ چچا کو انگریز نے بغاوت کے الزام میں پھانسی دی تو انہوں نے آگے بڑھ کر پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے میں ڈال لیا۔ غدر کے ہنگاموں میں ہوش سنبھالنے والی آبادی بیگم نے حریت اور آزادی کی لو کو اپنے سینے میں کبھی مدھم نہ ہونے دیا۔ یہ تپش اور یہ تڑپ انہوں نے اپنے بیٹوں کے سینوں میں بھی جلائے رکھی۔ تسلیم و رضا تو جیسے گھٹی میں پڑی تھی۔ سب سے بڑے بیٹے نوازش علی کی موت پر لوگ پرسہ دینے آئے تو بڑی بہادری سے تعزیت کرنے والوں کو سمجھاتی ہیں کہ ہمیں اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکانا ہے۔ یہ اس کے اختیار میں ہے کہ جو کچھ دیتا ہے، واپس بھی لے سکتا ہے۔ اس کی امانت تھی، اس نے واپس لے لی، شکایت کیس؟

جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو محمد علی صرف دو سال کے تھے۔ بی اماں نے واجبی سی گھریلو تعلیم حاصل کی

تھی لیکن اس زمانے کے رواج کے خلاف شوکت علی اور محمد علی کو انگریزی تعلیم دلوائی۔ شوکت علی نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے کسب علم کیا تو محمد علی نے آکسفورڈ کی راہ لی۔ اور یہ بی اماں پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے عملی سیاست میں حصہ لیا۔ کبھی مسلم لیگ کے جلسوں سے خطاب کیا تو کبھی خلافت کمیٹی تو کبھی عدم تعاون کی تحریک، کبھی چندہ جمع کر رہی ہیں تو کہیں کسی رہنما کی رہائی کے لئے تحریک چلا رہی ہیں، ہندوستان کے گاؤں اور شہروں کے دورے کر رہی ہیں۔ ساری عمر پردہ کیا۔ اسی پردے میں لاہور میں ایک ایسی تقریر کی کہ ادب کا شاہکار قرار پائی۔

گاندھی جی خود کو بی اماں کا تیسرا بیٹا کہتے تھے۔ گاندھی جی اور علی برادران جیل چلے گئے تو بی اماں نے بیگم حسرت موہانی، بسنتی دیوی، سرلا دیوی چودھرانی اور سروجنی نائیڈو کے ساتھ مل کر آزادی کا پرچم بلند رکھا۔ بی اماں نے اپنے بچوں کو سادہ غذا، سادہ لباس اور اسلام کے اعلا اصولوں کی تربیت کے ساتھ بڑا کیا تھا۔ عدم تعاون کی تحریک میں یہی تعلیم ہندوستانی خواتین کو دیتی رہیں اور بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک کے ہراول دستہ میں شامل رہیں۔

خود صوم وصلوات کی پابند تھیں لیکن ہندو مسلم اتحاد کے لئے دن رات کام کرتیں کہ یہ آزادی کی بنیادی ضرورت تھی۔ اصل چیز دنیا سے بے نیازی اور آخرت کی کامیابی ان کے پیش نظر رہتی۔ اور ایسی کیا چیز تھی جو انہیں آخرت میں سرخرو نہ کرتی۔

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ روز حشر جزا و سزا کے فیصلے کرتے ہوئے اللہ انسانوں کی گواہی کو ضرور سنتا ہوگا اور بی اماں جیسوں کے لیے سوائے کلمہ خیر کے اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

◂◂ ● ▸▸

C/o. Daniyal Ahmed Pathan ,Dubai Creek Harbour Residence,
South Tower -1 Apartment 2701
Tel. 00971507762694/00971504280669
Dubai U.A.E.

● مضمون

● ڈاکٹر منظر اعجاز

نوشابہ خاتون کی افسانہ نگاری.....''خلیج'' کی روشنی میں

نوشابہ خاتون زمانۂ حال کی خواتین افسانہ نگاروں میں نمایاں اور مقبول ہونے کے ساتھ ساتھ معروف و ذی وقار بھی ہیں۔موقر رسائل و جرائد میں ان کے افسانے متواتر شائع ہوتے رہے ہیں۔تین مجموعے''نقار خانہ''،''بالا دست'' اور''خلیج'' شائع ہو چکے ہیں۔ان کے علاوہ ایک معاشرتی ناول''نیا شوفر'' بھی منظر عام آچکا ہے۔ان کا ایک سوانحی ناول''خزاں کے بعد'' بھی زیرِ طبع ہے۔اس تفصیل سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی جولانیٔ طبع اور قلم کی رفتار سست اور دھار کند نہیں ہوئی ہے۔میرے خیال میں انہوں نے خود کو ادبی تحریک یا رجحان سے بھی آزاد رکھا ہے۔تخلیقی وجدان کی رہنمائی اور معاشرے میں پھیلے واقعات و واردات کے مشاہدات و تجربات کے تانے بانے سے کہانیاں بنتی رہی ہیں۔ان کہانیوں سے حیات و کائنات اور معاشرتی مسائل و معاملات کے سلسلے میں ان کا زاویۂ نظر واضح ہوتا رہا ہے جو غیر منظّم اور غیر مرتب صورت میں یا بکھرا بکھرا سا دکھائی دیتا ہے لیکن ان بکھرے عناصر کو ترتیب دے دیا جائے تو وہ ایک فلسفۂ حیات بن سکتا ہے اور اس لحاظ سے سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے۔اس پہلو پر تفصیل سے لکھنے کے لئے جتنے صفحات و اوقات کی ضرورت ہے، وہ سرِ دست میسر نہیں، اس لئے یہاں اس پہلو سے گریز لازم ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی ادیب یا فنکار کے لئے خرد کے نظریات سے زیادہ اہم اس کے اپنے مشاہدات و تجربات ہوتے ہیں۔مشاہدات کا تعلق دیکھے ہوئے اور تجربات کا تعلق بھوگے ہوئے یا جھیلے ہوئے واقعات و واردات سے ہے۔پچیس افسانوں پر مشتمل''خلیج'' میں دونوں طرح کے واقعات و واردات اور مسائل و معاملات عکس ریز ہوئے ہیں جن کا بیان خوش سلیقہ اسلوب اور عظیم آباد، پٹنہ کے مضافات بالخصوص ضلع نالندہ کے شرفاء گھرانے کی خواتینِ خانہ کی زبان میں ہوا ہے۔یہ وضاحت شاید یہاں غیر ضروری نہ ہو کہ ادب کا سارا کھیل زبان و بیان ہی پر منحصر ہوتا ہے اور کوئی بھی ادبی متن یا ادب پارہ سب سے پہلے زبان و بیان ہی کی وجہ سے متاثر کرتا ہے اور مطالعے کے ذوق کو شوق کی راہ پر ڈالتا ہے۔کم از کم میں ایسا ہی سمجھتا ہوں اور''خلیج'' کے مطالعے میں سب سے پہلے میری توجہ نوشابہ خاتون کے اسلوبِ

بیان اور اندازِ زبان ہی کی طرف مبذول ہوتی ہے۔اس لئے میں یہاں مختلف افسانوں سے چند اقتباسات پیش کرنے پر مجبور ہوں۔

''اماں جی! آپ ایک طرف چپ چاپ بیٹھی رہئے۔کاہے کو بک بک کیجئے ہے''

(آشیاں اپنا)

''امی آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔آپ سے کچھ ہوتا جاتا نہیں ہے۔سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہیں''

(زندان)

''کبھی کبھی وہ باورچی خانہ میں جا کر نوکرانیوں سے گپ لڑاتی، ان کے کام میں مدد کرنے کی کوشش کرتی

''بفشہ بوا آپ اتنی کمزور کیوں لگ رہی ہیں۔آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''نہیں دلہن بیگم کئی روز سے بخار آرہا ہے۔''

''ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''کہاں اتنا پیسہ ہے۔اکیلی جان چھ چھ بچوں کا خرچ چلانا آسان ہے کیا موا نکما بیٹھ کر کھانے والا ہے۔'' (ڈرامے کا ڈراپ سین)

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں بغیر پیسے، بغیر عیش و آرام کے تمہارے ساتھ سڑکوں پر دھکے کھاتی پھروں گی۔نا بابا نا، میں ایسے خالی خولی عشق کی قائل نہیں ہوں۔''

(یہ عشق نہیں آساں)

''کا بتاویں بیٹا۔اب تو نہ وہ لوگ رہے اور نہ وہ پیار محبت رہا۔''

''تم لوگوں کو اتنے دنوں بعد دیکھ کر کا بتاویں کتنی خوشی ہو رہی ہے۔بیٹھو کھانا بنا ویں ہیں۔کھا کے جیّہو۔'' (خواب خواب زندگی)

افسانہ نگاری میں جملہ سازی اور فقرہ طرازی کی جو اہمیت ہے، اس سے افسانے کے قارئین اور ناقدین واقف ہیں۔یہاں تفصیل کی گنجائش بھی نہیں۔ویسے بھی مرصع نگاری ہر صنفِ ادب بالخصوص تخلیقی اور افسانوی ادب کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔مرصع نگاری کی خصوصیات میں صرف قافیہ پیمائی ہی لازمی عنصر نہیں، محاورے ترکیبیں اور تشبیہیں بھی عبارت آرائی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ تصنع، وضعیت اور بناوٹ کا انداز واضح نہ ہو۔بے تکلفی، بے ساختگی، شگفتگی اور والہانہ پن ہو۔ایسی خصوصیات نوشابہ خاتون کے افسانوں بالخصوص افسانوی زبان و بیان میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔زبان کا وہ معیار جو

مرزایانِ دہلی یا اردوئے معلیٰ سے مخصوص ومنسوب رہا ہے، کچھ اسی قسم کا معیار عظیم آباد، پٹنہ اور مضافات کی حویلیوں کی زبان کا بھی رہا ہے اور نوشابہ خاتون کا براہِ راست تعلق ایسی حویلیوں سے رہا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ حویلی والیوں میں رہی ہیں اور افسانہ نگار، ناول نویس یا ادب نگار کی حیثیت سے اس معاشرے کی روشن شمع ہیں۔ مجھے اس مخصوص خطے میں ان کے سوا دورِ حاضر میں کوئی دوسری خاتون نظر نہیں آتیں، جن کی زبان ایسی ہو اور جن کا معیارِ زبان و بیان ایسا ہو۔ چند فقروں اور جملوں سے میرے اس خیال کی تائید و توثیق ہوسکتی ہے۔ مثلاً ''صحرا جیسی ویران آنکھیں۔'' یہاں توجہ طلب آنکھوں کی ویرانی ہے، جسے صحرا سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ایک جملہ اور دیکھیں۔

''اگر کسی کے دل میں درد اٹھتا بھی ہے تو بس اتنی دیر کے لئے جتنی دیر چکنے پتھر پر پانی ٹھہرتے ہیں۔''

مشاہدے کی باریکی، نظر کی گہرائی اور گیرائی اور جملے کی ساخت و پرداخت اور جدت وندرت کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ ایسے ایسے بے شمار فقرے اور جملے ہیں جن سے نہ صرف زبان و بیان کا معیار مترشح ہوتا ہے بلکہ ان کی پور پور سے شعریت سی ٹپکتی محسوس ہوتی ہے۔

نوشابہ خاتون اپنے افسانوں کا آغاز بھی اچھوتے انداز میں کرتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قلم کی سمت ہی نہیں ہے، رفتار بھی ان کے دست قدرت کی رہینِ منت ہے۔ ان کے افسانوں میں تمہید کی عدم موجودگی احساس دلاتی ہے کہ وہ کسی منصوبہ بندی کے تحت یعنی Planned way میں تمہید رقم نہیں کرتیں جیسے ریگ زاروں میں پانی کا سوتہ کہیں بھی اور کبھی بھی پھوٹ پڑتا ہے اور صحرانوردوں کی آسودگی کا سامان بن جاتا ہے۔ اور نظامِ قدرت کے کرشمے جلوۂ طور کا منظر چشمِ تصور میں بھر دیتے ہیں۔ نوشابہ خاتون کی قدرتِ فن بھی کچھ اسی انداز سے ظاہر ہوتی ہے۔ افسانہ ''خلیج'' کے ابتدائی چند جملے دیکھیں:

''بچی رو رو کر بے حال ہو رہی تھی۔ ''پاپا! پاپا میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''

بس اس کی یہی ایک گردان تھی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ دل پر ایک بھاری بوجھ لئے رومال سے اپنے آنسو خشک کرتا ہوں، اسے خود

سے جدا کر دیا تھا۔ رومانہ نے بھی اپنی آنکھوں میں بے ساختہ امڈ آنے والے آنسو کو بڑی مشکل سے روکا اور اسے خدا حافظ کہا۔''

معاہدہ کا پہلا پیراگراف بھی دیکھتے چلیں:

''تو آخر وہی بات ہوئی جس کا اسے ڈر تھا۔ ایک پل میں سارے رشتے ناطے ٹوٹ گئے۔ سارے عشق، سارے جنون ہوا ہو گئے۔

یہ ذات ہی بے اعتبار ہے۔ نہ اس کی محبت میں پائیداری ہے، نہ وفا میں خلوص، عورت اس کے

ہاتھوں ایک کھلونا ہے۔ جب جی چاہا

کھیلا، جب دل بھر گیا توڑ پھوڑ کر پھینک دیا۔''

''جب بھی میں اس جھونپڑی کے پاس سے گزرتا، میرے قدم رک جاتے۔ نہ جانے اس عورت کے چہرے میں کیا بات تھی کہ دل

خود بخود اس کی طرف کھنچا چلا جاتا۔ کوئی انجانی سی طاقت مجھے اس راستے سے ہو کر گزرنے پر مجبور کر دیتی۔''

محولہ بالا اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے بعض دوسری خصوصیات کے علاوہ ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ دورانِ مطالعہ ابتدائی مرحلے میں ہی قاری کے ذہن میں تجسس کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اور وہ متجسسانہ تشنگی کے ساتھ آگے کے مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اختتام تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ اس کی ایک اہم وجہ ''خلیج'' کے افسانوں کا اختصار بھی ہے۔ اس مجموعۂ افسانہ کا غالباً طویل تر افسانہ ''قیدِ ہوس'' ہے لیکن اس کی قرأت میں بھی ایک گھنٹہ سے کم ہی وقت صرف ہوتا ہے۔

''خلیج'' کے افسانے طویل ہوں یا مختصر، ان کے بیانیہ میں سادگی و پرکاری دکھائی دیتی ہے۔ کوئی پیچیدگی نہیں جو بیشتر جدیدیت کے رجحان سے متاثر افسانہ نگاروں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ لیکن افسانوں کے پلاٹ میں جن واقعات و واردات کی ہم کاری اور پیوندکاری کی گئی یا جن کے تانے بانے سے پلاٹ تیار کیا گیا ہے۔ ان میں بعض ایسے معاملات و مسائل سے الجھنے اور سلجھانے کی فنکارانہ کوشش ملتی ہے، جہاں تک عام لوگوں کی نظر تو کیا، خاص لوگوں کی نظر بھی شاید ہی پہنچتی ہو۔ مسائل و معاملات بہر حال سماجی ہی ہیں کہ کسی نہ کسی سماج میں خواہ وہ ہندو سماج ہو یا مسلم سماج یا مشترکہ تہذیب پر مشتمل مخلوط معاشرہ جس میں بعض مسائل کی گتھیاں اس طرح الجھتی ہیں کہ ہوش ٹھکانے لگ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''شجرِ ممنوعہ'' کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں اسلامی معاشرے کا ایک ایسا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ جس پر کوئی افسانہ یا ناول آج تک میری نظر سے نہیں گزرا چنانچہ میرے نزدیک یہ ایک اچھوتا موضوع ہے۔ افسانے کے بیان میں سادگی ہے لیکن مسئلہ پیچیدہ ہے۔ اس کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے جہاں ناز و اور یوسف پندرہ سال بعد ملتے ہیں:

''پورے پندرہ سال بعد ہم دونوں ملے تھے۔ چند لمحے دونوں ہی خاموش نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر اس خاموشی کو یوسف ہی نے توڑا۔''

اس مختصر سی عبارت سے ہی تجسس ابھرنے لگتا ہے اور متجسس نگاہیں آگے قدم بڑھاتی ہیں:

''ناز و تم یہاں؟'' پھر قدرے توقف کے بعد انھوں نے افسردگی سے پوچھا۔ ''کیسی ہو؟'' اس مانوس سی آواز نے میرے اندر ایک ہلچل سی مچا دی۔ پھر خود کو سنبھال کر کہا۔ ''اچھی ہوں اور جینے کا سہارا

ڈھونڈنے یہاں آئی ہوں۔

تجسس کا عنصر ہنوز برقرار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بیشتر اس کا مدار اسی پر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پندرہ سولہ سال قبل یوسف، نازو کو آتے جاتے دیکھا کرتا تھا لیکن اس دید و باز دید میں شرافت کی بو باس موجود تھی۔ اس کے باوجود نازو نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔ ایک دن کالج سے واپس آئی تو گھر

میں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ والدین کو شادی کی فکر تو پہلے ہی سے تھی، رشتے کو معقول سمجھ کر قبول کر لیا گیا اور نازو کو یوسف میاں سے بیاہ دیا گیا۔ دونوں کی زندگیوں میں بہار آ گئی۔ یوسف کی جہاں پوسٹنگ تھی وہاں نازو کو ساتھ لے گیا۔ میکے بھی نازو آتی جاتی رہتی۔

لیکن جب ایک بار یوسف نے گھر میں قدم رکھا تو ایک عورت ان کے ساتھ تھی جو پاکستان سے آئی تھی۔ دو دنوں کے بعد کچھ اور لوگ ملنے جلنے آئے انہیں نے انکشاف کیا کہ یوسف نے اس عورت کا دودھ پیا تھا جس کا نازو نے پیا تھا۔ چنانچہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے شجر ممنوعہ بن گئے۔

اس مسئلے سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ بھی مزید پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے اور وہ ہے نازو کی کوکھ میں پلنے والا یوسف کا نطفہ۔ یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ اس صورت حال میں نازو کی کیفیت کیا ہوگی؟ نازو بالآخر حمل ساقط کرا دیتی ہے۔ اور پھر دوسری شادی بھی نہیں کرتی۔ پندرہ سولہ سال جیسے تیسے گزارنے کے بعد مستقبل و حال کا سہارہ ڈھونڈتے وہاں پہنچ جاتی ہے جہاں اچانک یوسف سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

یوسف بھی اس ملال میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں کہ اب پوری زندگی کیسے گذرے گی؟۔ یوسف کی یہ کیفیت نازو کو اور بھی ملول کر دیتی ہے۔ کہانی اپنے اختتام پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہے اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ایک ذرا سی بھول سے دو زندگیوں میں ایسا زہر گھل گیا جس کا کوئی توڑ نہیں۔

ایک دوسری کہانی ''انتقام'' بھی مسئلے کی پیچیدگی کے لحاظ سے ایسی ہی ہے۔ حالانکہ اس کے اصل موضوع میں عمومیت ہے۔ ضبط حمل یا ضبط تولید کا مسئلہ نیا نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تو سرکاری سطح پر بھی تحریک چلائی گئی ہے لیکن اس افسانے میں اولاد کی کثرت سے عاجز آ کر ضبط حمل کے نسخے آزمائے جاتے ہیں۔

اس افسانے کا واحد متکلم راوی اپنی بے خواب و بے قرار راتوں اور جگر کے پار ہو جانے والی خلش کی داستان بیان کرتے ہوئے اس موڑ پر آتا ہے۔ جہاں دھندلی دھندلی یادیں ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں ان میں ایک شبیہ صائمہ کی ہے۔ جو میری ہمسفر اور غمگسار تھی۔ بچپن میں میرے پیارے دوست، اپنے پرائے مجھے چھیڑ کے میری مجروح شخصیت کا مذاق اڑاتے تو وہ ڈھال بن جاتی۔ لڑنے بھڑنے کے لئے تیار ہو جاتی''۔

راوی کے اس بیان سے مترشح ہے کہ صائمہ اسے پیار کرتی تھی۔ آگے بڑھتی ہوئی کہانی احساس دلاتی ہے کہ، وہ ابھی بھی اسے چاہتی ہے۔ لیکن اسکی زندگی میں شامل نہیں ہو سکتی۔ یہ اسکی مجبوری تھی۔ اور

ہے۔ راوی کا یہ بیان اس کے دل کی لگی اور جگر کی خلش کا عکاس ہے۔:

''میرے اندر کسی کو چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش تھی، کسی ہمسفر کی آرزو تھی جو میری تنہائی کی شریک ہو، مجھ سے راز و نیاز کی باتیں کرے باتیں، کبھی پیار کی باتیں اور کبھی تکرار کرے۔''

راوی کے بیان سے ہی واقعات و واردات کے نشیب و فراز ظاہر ہوتے ہیں۔ راوی ہی اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور وہی اپنی روداد حیات بیان کرتا ہے اور اسی سے اسکی کیفیت کا بھی اظہار ہوتا ہے جس کی بے شمار خواہشیں، اور فطری خواہشیں ہیں۔ جو احساس دلاتی ہیں کہ ہر خواہش پر دم نکلا جا رہا ہے۔ بیان کی کیفیت قاری کو بھی اکثر گھٹن میں مبتلا کرتی ہے۔

کردار کی سعادت مندی، اس کی خاندانی نجابت اور شرافت کا احساس دلاتی ہے۔ اور واضح ہوتا ہے کہ وہ جس تہذیبی روایت اور روایتی معاشرے کا زائیدہ و پروردہ ہے وہ تصور خدا اور اس کی قدرت کاملہ کا معتقد ہے اور یہی اعتقاد اسے زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ وہ خودکشی کر کے جان

دے دیتا یا ایسے اقدام کرتا جو خاندان کے نام کو بٹہ لگا دیتا۔ وہ اپنے احساس کے عفریت سے نجات حاصل کرنے کے لئے خود کو مطالعے میں مشغول رکھتا ہے جو بظاہر ایک فراری میلان ہے۔ لیکن یہی چیز اسے زندگی سے رشتہ استوار رکھنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے اور زندگی سے پیچھا چھڑا کے بھاگنے نہیں دیتی۔ اس کی سعادت مندی کا اظہار اور اسکے ابو کا اعتراف ملاحظہ ہو:

''میں اپنی لائبریری میں محو مطالعہ تھا کہ اچانک ابو اندر داخل ہوئے۔ انکی آنکھیں نم تھیں اور چہرے پر حزن و ملال چھایا تھا۔ آتے ہی انہوں نے مجھے گلے لگا کر کہا۔

''بیٹا میں تمہارا دکھ جانتا ہوں۔ تمہاری محرومی کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں ہی تمہاری خوشیوں کا قاتل ہوں۔ بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ میں بہت تھک گیا تھا۔ بچے کبھی نعمت ہوتے ہیں اور کبھی زحمت بھی بن جاتے ہیں۔ اہل و عیال کی کفالت کرتے کرتے میری کمر ٹوٹ گئی تھی۔ شاید میرے بزرگوں نے یہ دعا دی تھی۔ ''دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو۔''

''دودھوں نہانا تو نصیب نہ ہوا لیکن خدا نے اولاد کی دولت سے جی بھر کے نوازا۔ جب مجھے خبر ہوئی کہ ایک بچہ اور میرے گھر آنے والا ہے تو میرے ہوش اڑ گئے مزید اور بوجھ اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہ تھی۔ میں کسی صورت اس بوجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کہاوت سچ ثابت ہوئی کہ'' جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے''۔

چنانچہ اسقاط حمل کی تدبیروں کا بھی حسب دل خواہ نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ اس کے مضر اثرات کی وجہ سے عضو خاص ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے تھی۔

اپنے باپ کے احساس گناہ اور اقبال جرم پر افسانے کے اس کردار کا جو ردعمل ہونا چاہئے تھا وہ دکھائی نہیں دیتا اور یہی اس کے سعادت مند ہونے کی دلیل ہے۔اس کا آخری بیان جس پر اس افسانے کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ ہے:

''میں حیرت وحسرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔کیا کوئی اولاد بھی اپنے والدین پر بوجھ بن سکتی ہے؟ اور پھر میری نظریں کسی معجزہ کی امید میں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔''

متذکرہ بالا افسانوں میں مرکزی کرداروں کو جن حالات سے گزرنا پڑا ہے، ان میں ہوش وحواس کا بجا رہنا حیرت انگیز ہے لیکن اعتقاد واقدار کی ان دیکھی قوت کی ایسی کارفرمائی ہے جس نے زندگی کے شیرازے کو بکھرنے سے بچالیا ہے۔لیکن زندگی کے ارتقائی سفر میں جو خلیج پیدا ہوئی ہے، وہ پٹ نہیں سکی ہے۔ایسی خلیج معاشرتی سطحوں پر کئی جگہ دکھائی ہے۔ایک افسانہ بھی ''خلیج'' کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل ہے، اور یہی سرنامۂ کتاب بھی ہے۔اس خلیج کی نوعیت متذکرہ افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔

اس افسانے میں رشتوں کے درمیان سیاسی خلیج دکھائی دیتی ہے۔ناقابل عبور خلیج! وہ خلیج جو تقسیم ملک سے پیدا ہوئی تھی۔ زمین بٹ گئی تھی، آسمان بٹ گئے تھے، خاندان بٹ گیا تھا۔رشتے بٹ گئے تھے۔اگر بٹنے سے کچھ رہ گیا تھا تو وہ تقسیم ہند کا المیہ تھا جس نے دونوں طرف سینے کے داغ کو تازہ رکھا تھا۔اور یہی آمدورفت اور ملاقات بات کا جواز تھا۔خلیج کے کردار اس المیہ کے شکار ہوتے ہیں۔رومانہ کسی تقریب سعید میں شرکت کے لئے انڈیا آتی ہے۔ یہاں آکر وہ اپنے کزن احمر کی پسند بن جاتی ہے۔فاصلے اور خلیج کے احساس کے باوجود حسب روایت بزرگوں کے فیصلے کے مطابق شادی ہو جاتی ہے۔تین مہینے کا ویزا ختم ہونے پر آتا ہے تو بار بار بڑھوایا جاتا ہے۔شہریت حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری رہتی ہے، اس طرح کہ رومانہ کو انڈیا کی یا احمر کو پاکستان کی شہرت مل جائے۔اس تک ودو کے درمیان رومانہ ایک بچی کی ماں بن جاتی ہے۔اس افسانے کا جو کلائمکس ہے وہی اس کا المیہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک نوٹس کے ذریعے اسے انڈیا چھوڑ دینے کا فرمان ملتا ہے اور لامحالہ اسکی تعمیل کرنی پڑتی ہے۔فنی تکنیک کے لحاظ سے افسانے کی ابتدا کراچی کے لئے پرواز سے ہوتی ہے جس کا اختتام کراچی ایرپورٹ پر لینڈنگ سے ہوتا ہے کہانی فلیش بیک کی تکنیک میں اپنا سفر کرتی ہے۔

''تاوان'' کی کہانی بھی الم انگیز تاثرات سے لبریز ہے ہر چند کہ یہ آج کی کہانی نہیں لیکن جاگیردارانہ نظام اور سماجی حقیقتوں کی عکاس ہے۔ماضی بعید اور اس کی تاریخ میں ایسے انگنت اوراق ہیں جن میں رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والی ''خلیج'' کا تعلق معاشی نشیب وفراز ہے۔

اس کہانی کا راوی واحد متکلم ہے اور یہی اس کا مرکزی کردار بھی ہے۔حسب معمول اس کہانی

کا آغاز بھی تجسس آمیز ہے:

''کئی مہینوں کی ذہنی کشمکش اور انتشار کے بعد آخر میں نے ایک فیصلہ کر ہی لیا۔فیصلے کی گھڑی بہت کٹھن تھی لیکن دل کے اوپر سے بھاری پتھر سرک گیا تھا۔''

راوی اپنا خاندانی پس منظر یوں بیان کرتا ہے:

''میں اس گاؤں کا باشندہ تھا جو ایک روایتی گاؤں ہے۔اس کا اپنا ایک الگ ہی رکھ رکھاؤ تھا۔رعب تھا دبدبہ تھا۔وہاں کے رؤساء اور سابق زمینداروں کے خلاف پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ہماری بلند وبالا حویلی اپنے جاہ وجلال کے اعتبار سے پورے گاؤں میں بے مثال تھی۔میرے والد جوانی ہی میں ملک عدم کو سدھار گئے تھے۔لہٰذا نظیر احمد صاحب یعنی میرے بڑے ابو ہی ساری دولت اور جائداد کے مختار کل تھے۔''

سابق زمیندار نظیر احمد صاحب ساری دولت اور جائداد ہی کے نہیں بلکہ اپنے چھوٹے بھائی کی وراثت کے علاوہ وارث کے بھی سرپرست ونگراں اور مختار کل تھے۔اور ان کے حکم سے سرمو اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔انہوں نے اپنے بھتیجے سے اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ طئے کر دیا جب کہ لڑکی لڑکے سے عمر میں کافی بڑی تھی لیکن مسئلہ عمر کے اس طویل فرق کا نہ تھا۔بقول راوی:

''جو سزا مجھے ملی تھی اس میں اس ہستی کو شریک کرنا مجھے گوارا نہ تھا جو مجھے سب سے زیادہ عزیز، سب سے زیادہ پیاری تھی۔جس کا دامن پکڑ کر میں نے چلنا سیکھا تھا۔جس نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی تھی۔جس نے میرے بکھرے وجود کو سمیٹ لیا تھا۔اگر رشتوں کے شکنجے میں جکڑا اور احسان کے بوجھ سے دبا ہوا میں اتنا بے بس نہ ہوتا تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔میری بزدلی اور سعادت مندی نے مجھے بہت دکھ دئے۔''

شادی میں آڑے آنے والا مسئلہ لڑکے کے لئے نہ عمر ہے نہ رشتہ جو معاشرتی طور پر ظاہر ہے لیکن ہے بہر طور رشتہ ہی جس کی نوعیت مختلف ہے۔جیسا کہ راوی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے:

''پورے پانچ سال تک وہ اس حویلی اور ماں باپ کے دل پر تنہا راج کرتی رہیں آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنی رہیں۔ان کی ہر خواہش زبان سے نکلتے ہی پوری ہو جاتی۔انکے سامنے کھلونوں کا ڈھیر لگا رہتا لیکن جس دن میں آیا انہوں نے سارے کھلونے پھینک دئے۔انہیں تو وہی گڈا چاہئے تھا جو چھوٹی امی کی گود میں تھا۔وہ ہر وقت ان کے پہلو سے لگی بیٹھی رہتیں۔ بچے کو گود میں لینے کی ضد کرتیں۔کبھی نظر بچا کر بچے کا منھ کھول کر دیکھتیں اور کبھی آنکھیں۔''

''جب میں پانچ سال کا تھا تو ایک ناگہانی حادثہ میں میرے ابو امی چل بسے۔ یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس نے میری زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا کر دیا تھا۔میں رو

روکر بے حال ہو جاتا۔ان کے پاس جانے کی ضد کرتا۔ پورے گھر کو سر پر اٹھالیتا
۔ایسے میں بڑے ابو اور بڑی امی نے مجھے گلے لگالیا اور آپا کا دامن تھامے ان کے
پیچھے لگا رہتا۔ہم دونوں کا ہر وقت کا ساتھ تھا کھیلتے کودتے بڑے ابو کے کمرے میں
ان کے آزو بازو بیٹھنے کے لئے یا بڑی امی کی گود میں بیٹھنے کے لئے ''پہلے ہم، پہلے
ہم کی گردان کرتے ہوئے ہم بڑے ہوتے گئے۔''

ان کے بیانات سے مترشح ہے کہ آپا ہی نہیں رہ جاتیں اور عمر میں پانچ چھ سات سال کی بڑائی، چھوٹائی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔آپا کا ماں جیسا سلوک اس رشتے کو اور گہرائی اور پیچیدگی عطا کر دیتا ہے اور چھوٹے بھائی کے دل و دماغ میں نفسیاتی گرہ ڈال دیتا ہے۔اس کا دل گوارہ نہیں کرتا کہ اس کی شادی آپا سے ہو۔اسکی بزدلی یا سعادت مندی بڑے ابو کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے لیکن وہ اس معاشی پہلو کو نظر انداز نہیں کر پاتا کہ بڑے ابو نہیں چاہتے کہ انکی پشتینی جاگیر میں کسی دوسرے خاندان کی شرکت ہو۔گھر کی دولت جائداد گھر میں رہ جائے یہی بہتر ہے۔

وقت وحالات کے جبر سے شادی تو ہوگئی لیکن طرفین نے اس رشتے کو دل سے قبول نہیں کیا۔اس کہانی کا اختتام یوں ہوتا ہے:

''پھر طلاق نامہ اور جائداد سے دست بردار ہونے کے کاغذات انکے ہاتھوں میں تھما کر کسی کو کچھ بتائے بغیر نامعلوم سمت کی طرف چل پڑا۔اس عزیز ہستی سے ناطہ توڑتا اور اپنی جائداد سے دست بردار ہوتے وقت دل کے ٹکڑے ہو رہے تھے لیکن مجھے اسخاندان میں پیدا ہونے کا تاوان تو ادا کرنا ہی تھا۔''

جاگیر دارانہ نظام، زمیندارانہ مزاج ومیلان اور حویلیوں کے کلچر والی اور بھی کہانیاں اس مجموعے میں شامل ہیں۔''ڈرامے کا ڈراپ سین''

اور''آخری وعدہ'' کا تعلق بھی ایسی ہی کہانیوں سے ہے۔

''آخری وعدہ'' کی لاوارث حویلی میں جھونپڑی والی عورت کا بچہ معاہدے کے تحت گود لے لیا جاتا ہے۔اور سگی اولاد کی طرح پالا جاتا ہے لیکن اس پرورش میں گرم جوش محبت کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور بالآخر بڑا ہونے پر بچے کو پتہ چلتا ہے کہ اس کی ممی اسکی حقیقی ماں نہیں اسی لئے ان سے وہ ممتا بھرا پیار نہ مل سکا جو اس کی کھلائی سے ملا کہ وہی اس کی حقیقی ماں تھی۔لیکن اس کا کیا ہوا وعدہ یاد دلا کر اسے کہیں اور نامعلوم جگہ پر جا بسنے کا حکم دیا گیا۔

اس کہانی میں ممی اور ماں دونوں ہی زد آتی ہیں رشتوں کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج یہاں بھی ناقابل عبور نظر آتی ہے۔

حویلی اور نوابی شان وشوکت کے پس منظر کی کہانی ''ڈرامے کا ڈراپ سین'' بھی ہے۔نور نظر مرد اور شہوار عورت کردار ہیں۔نور نظر نے ولایت سے وکالت پاس کی ہے۔پریکٹس خوب چلتی ہے۔اس لئے زیادہ مصروف رہتے ہیں۔حویلی میں شہوار کو کسی بات کی کمی نہیں لیکن یہی

فارغ البالی اور خوش حالی نہ صرف اسے تنہائی کے شدید احساس میں مبتلا کر دیتی ہے بلکہ وہ خود کو شوکیس میں سجائی ہوئی چینٹرے کی گڑیا سمجھنے لگتی ہے کیونکہ اس کے احساسات وجذبات یا مرضی اور خواہش کا اس حویلی میں کوئی پرسان حال نہیں:

''اماں حضور نے تو مجھے قیدی بنا کر رکھ لیا ہے۔نہ میری اپنی کوئی مرضی ہے نہ کوئی زور، مجھے مائکے جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔''

اسی احساس قید وبند سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ اماں حضور کو زندگی کے حصار سے نکال باہر کرنے کی تدبیر کرتی ہے۔لیکن وہی تدبیر سے پُر دودھ کا گلاس بھول سے نور نظر کو چلا جاتا ہے جس کے پیتے ہی ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ڈاکٹر کو بلانے کی بھی نوبت نہیں آتی۔اور کہرام برپا ہو جاتا ہے اماں حضور کی ایسی چیخ نکلتی ہے کہ دوسری بار چیخنے کا موقع نہیں ملتا۔یہی چیخ زندگی کی آخری ہچکی ثابت ہوتی ہے۔

نوشابہ خاتون کے اس مجموعے میں کل پچیس افسانے ہیں۔ان کے اصل موضوعات اور مسائل میں تنوعات ہیں۔معاشرتی نظام اخلاقیات میں بھی تنوع ہے۔یہ کہانیاں عورت اور مرد دونوں قسم کے کرداروں کے مسائل پیش کرتی ہیں۔بچوں اور بوڑھوں کی نفسیات کی بھی عکاس ہیں ماضی اور حال کا معاشرہ بھی ان کہانیوں میں عکس ریز دکھائی دیتا ہے۔اونچے، درمیانہ، اور نچلے طبقے کی بھی کہانیاں اس میں موجود ہیں۔علاوہ ازیں اپنے وطن عزیز ہندوستان سے بسلسلہ کسب معاش نکل کر دوسرے خلیجی اور یورپی ،امریکی ملکوں میں بود وباش اختیار کر لینے والوں اخلاقیات، نفسیات اور رویوں کا فنکارانہ تجزیہ بھی کئی کہانیوں میں ملتا ہے۔ہوس زر کے مثبت اور منفی اثرات کی بھی جھلک ان کہانیوں میں ملتی ہے۔مقیم ان مغرب کی عدیم الفرضی اور بے حسی کے اشارے بھی دکھائی دیتے ہیں خاص طور پر اولڈ ایج ہاؤس کے حوالے سے بھی میرے مطالعے میں ایک کہانی آئی ہے جس سے معاشرتی اور اخلاقی سطح پر نفسیاتی خلیج کا احساس اجاگر ہوتا ہے۔اس طرح افسانہ خلیج کے علاوہ دوسرے افسانوں میں بھی معنوی کیفیات کے لحاظ سے اسے ایک قدر مشترک قرار دیا جاسکتا ہے۔اس سے نوشابہ خاتون کی بنیادی تخلیقی فکر ورجحان کا انعکاس ہوتا ہے۔

ایک دوسری مشترک قدر بھی ہے جسے اسلوب زبان وبیان اور فنی نکات کے تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ عصر حاضر کے فنی میلانات کے تناظر میں بعض مقامات پر تشنگی کا بھی احساس ہوتا ہے لیکن حکایات دلپذیر کا بیان از خود اس تشنگی کو بجھا دیتا ہے۔اور ایک کہانی کو دوسری کہانیوں سے کسی حد

تک مربوط و مسلسل بھی رکھتا ہے۔ کرداروں کا ماحول، معاشرہ یا منظر و پس منظر کچھ بھی ہو، ان میں عمومیت ہے۔ یہ ہماری مختلف معاشرتی سطحوں کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے ہیں۔ کوئی انقلابی اور مثالی کارنامہ انجام نہیں دیتے لیکن متعلق کہانی کے حدود میں اپنی کارگزاریاں انجام دیتے ہوئے اپنے قاری کی توجہ کا محور و مرکز بنے رہتے ہیں۔

ان کہانیوں کا عمومی میلان سنجیدہ ہے۔ زبان و بیان شستہ اور شائستہ ہے جو مکالمات کے برمحل اور برجستہ فقروں اور جملوں سے بھی ظاہر ہے۔ محاوروں میں علاقائیت بھی ہے اور عمومیت بھی لیکن سب سے بڑی خوبی ان کی یہ ہے کہ عبارت آرائی کے درمیان یہ بڑے ہی دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اور کہانی کی فضا کو خوشگوار بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

67/B P.c.Colony, Kanker Bagh , Patna-80020
9431840245

اقبـــال حســـن آزاد

کا

تیسرا افسانوی مجموعہ

پـــورٹـــریـــٹ

صفحات ۱۹۲ قیمت ۱۲۵/ سنہ اشاعت اول ۲۰۱۷

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

موبائل نمبر : +918210498674

● **مضمون**

● **ڈاکٹر اقبال حسن آزاد**

قرۃ العین حیدر اور ''آگ کا دریا''

قرۃ العین حیدر کا تعلق اتر پردیش کے ضلع بجنور کے ایک ذی علم اور ذی شان خانوادے سے تھا۔ ان کے والد ماجد سجاد حیدر یلدرم اردو کے مشہور افسانہ نگار گزرے ہیں۔ وہ منشی پریم چند، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی اور مجنوں گورکھپوری کے ہم عصر تھے۔ اول اول انہوں نے ترکی افسانوں کے اردو ترجمے کیے مگر بعد میں طبع زاد افسانے بھی لکھے۔ وہ ادب برائے زندگی سے زیادہ ادب برائے فن کے قائل تھے۔ وہ کہتے ہیں ''ادب کا زندگی سے تعلق ہے لیکن زندگی کا ہر رخ ایسا نہیں کہ جسے ادب کا موضوع بنایا جا سکے۔ ادیب کو نہ تو مصلح اور مبلغ ہونا چاہیے اور نہ ادب کو وعظ و نصیحت کا دفتر۔'' ان کے افسانوں کا مجموعہ ''خیالستان'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس کے مطالعہ کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب میں ادب برائے ادب یا ادب لطیف کی بنیاد رکھنے والے پہلے شخص سجاد حیدر یلدرم ہی تھے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں سر عبدالقادر نے رسالہ ''مخزن'' کی اشاعت شروع کی تھی جس کے قلم کاروں میں مولانا شبلی نعمانی، سر محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی عبقری شخصیتیں شامل تھیں۔ اس رسالے میں بنت باقر نام کی ایک خاتون افسانہ نگار بھی شامل ہوا کرتی تھیں۔ ۱۹۱۲ء میں موصوفہ کی شادی سجاد حیدر یلدرم سے ہوئی اور وہ نذر سجاد کہلائیں۔ سجاد حیدر یلدرم علی گڈھ مسلم یونیورسیٹی میں رجسٹرار کے عہدے پر فائز تھے۔ وہیں قرۃ العین حیدر عرف عینی کی پیدائش ہوئی۔ قرۃ العین حیدر کی صحیح تاریخ پیدائش کا کسی کو علم نہیں۔ بعض ان کی تاریخ پیدائش ۱۶/جنوری ۱۹۲۶ء لکھتے ہیں اور بعضے ۲۰/جنوری ۱۹۲۶ء مگر Global Media Publications کے مطابق ان کا سن ولادت ۱۹۲۷ء ہے۔ اس میں تاریخ اور مہینے کا ذکر نہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اندر پرستھ کالج دلی سے بی۔ اے کی ڈگری لینے بعد لکھنؤ یونیورسیٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔ اے کیا۔ تقسیم ہند کے وقت وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ مملکت خداداد کو ہجرت کر گئی تھیں۔ مگر اپنے ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے وہاں معتوب ہوئیں اور وہاں سے برطانیہ چلی

گئیں۔انتظار حسین نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''قرۃ العین حیدر نے آگ کا دریا میں تقسیم کو برصغیر کی ہزار سالہ ہندو مسلم روایت کی شکست قرار دیا۔اس نقطہء نظر کے ساتھ ان کا پاکستان میں رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔'' مگر قرۃ العین حیدر کو ہجرت راس نہیں آئی اور وہ پھر ۱۹۶۰ء میں وطن مالوف ہندوستان آ گئیں اور زندگی کے بقیہ ایام پرورش لوح وقلم اور سیر و سیاحت میں گزار کر اسّی برس کی عمر میں مالک حقیقی سے جا ملیں۔وہ ایک طویل عرصے سے بیمار تھیں اور دلی کے نواحی شہر نوئیڈا کے کیلاش اسپتال میں زیر علاج تھیں۔۲۰،۲۱/اگست ۲۰۰۷ء کی درمیانی شب تین بجے انتقال فرمایا اور اسی روز شام ساڑھے چار بجے جامعہ نگر نئی دلی کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔

قرۃ العین حیدر بچپن ہی سے نہایت زیرک اور حساس تھیں۔ان کی ذہانت وفطانت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جس عمر میں لڑکیاں گڈے گڑیا کا بیاہ رچاتی ہیں،انہوں نے کہانیوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔اس وقت ان کی عمر گیارہ سال تھی اور پھر محض انیس سال کی عمر میں ایک کامیاب ناول ''میرے بھی صنم خانے'' پیش کر دیا۔اس کے بعد انہوں نے قلم کو ہی اپنا رفیق حیات بنالیا۔زندگی بھر کنواری رہنے والی اس ادیبہ نے اردو ادب کو ایسے ایسے لعل و گہر سے نوازا ہے جن کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔موصوفہ نے دو درجن سے زیادہ تصانیف اپنے پیچھے چھوڑیں جن کے نام حسب ذیل ہیں؛

افسانوں کے مجموعے: (۱) ستاروں سے آگے (۲) شیشے کے گھر (۳) پت جھڑ کی آواز (۴) روشنی کی رفتار

ناول: (۱) میرے بھی صنم خانے (۲) سفینہء غم دل (۳) آگ کا دریا (۴) آخر شب کے ہمسفر (۵) گردش رنگ چمن (۶) کار جہاں دراز ہے (جلد اول دوم،سوم) (۷) چاندنی بیگم

ناولٹ: (۱) سیتا ہرن (۲) چائے کے باغ (۳) دلربا (۴) اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو

رپورتاژ: (۱) کوہ دماوند (۲) گلگشت (۳) جہاں دیگر (۴) خضر سوچتا ہے (۵) ستمبر کا چاند

تراجم: (۱) ہمیں چراغ ہمیں پروانے (پورٹریٹ آف اے لیڈی از ہنری جیمز)

(۲) آدمی کا مقدر (میخائل شولوخوف) (۳) آلپس کے گیت (واسل بائی کوف) (۴) ماں کی کھیتی (چنگیز اعتمادوف) (۵) کلیسا میں قتل (ٹی،ایس ایلیٹ) (۶) تلاش (ٹرومین کاپوٹ)

علاوہ ازیں انہوں نے اپنے ناول آگ کا دریا کا ترجمہ The River Of Fire کے عنوان سے خود ہی کیا۔ Wikipedia'The Free Encyclopedia کے مطابق:

Her best known novel was the epic"Aag ka darya"(The River Of Fire),a massive historical tale that moves from the

fourth century B.C.to the modern period and which the author herself translated into English.

موصوفہ کی تحریریں دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہو کر قبول عام کی سند پا چکی ہیں۔ان کے افسانوں کے مجموعے ''پت جھڑ کی آواز'' کا ترجمہ "The sound of Falling Leaves" کے عنوان سے ۱۹۹۷ء میں اور ان کے ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' کا ترجمہ "Travellers unto Night" کے عنوان سے انگریزی میں ہوا۔شکاگو یونیورسیٹی میں south Asian Languages کے شعبہء زبان وادب کے استاد چودھری محمد نعیم نے Seasons of Betrayel کے عنوان سے موصوفہ کے دو ناولٹ ،سیتا ہرن (Sita Betrayed) اور ہاؤسنگ سوسائٹی (Housing Society) اور ایک افسانہ ''پت جھڑ کی آواز'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔علاوہ ازیں ان کے افسانوں کا ہندی ترجمہ ''قرۃ العین کی شریشٹھ کہانیاں'' کے عنوان سے سامنے آیا۔ان کتابوں کے علاوہ ان کا ایک انگریزی ناول "Fireflies In The Mist" کے ٹائٹل سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔

موصوفہ کے انگریزی افسانوں کا مجموعہ "The street singers of lucknow and other stories" کے نام سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔حقیقت اور رومان کے امتزاج سے بنی گئی یہ کہانیاں ہجو ملیح کی عمدہ مثال ہیں۔ٹائٹل کہانی "The street singers of lucknow" میں ستم رسیدہ عورتوں کے حال زار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے "A woman's life" کے عنوان سے انگریزی میں ایک ناول تحریر کیا جو ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔انہوں نے حسن شاہ کے اردو ناول کا ترجمہ "The dancing girl" کے عنوان سے ۱۹۹۳ء کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت کیا کہ اردو کا پہلا باضابطہ ناول نگار حسن شاہ ہے نہ کہ ڈپٹی نذیر احمد جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا رہا تھا۔

قرۃ العین حیدر نے چند کتابیں دوسرے مصنفوں کے اشتراک سے بھی لکھیں مثلاً "Ghalib'His life and poetry" علی سردار جعفری کے اشتراک سے،اور ہندوستانی کلاسیکل شہنائی نواز بڑے غلام علی خان کی سوانح عمری محترمہ میناتی گلاٹی کے اشتراک سے لکھی۔

قرۃ العین حیدر نے کیلی فورنیا یونیورسٹی ، شکاگو ، وزکونسن (Wisconsin) اور ایری زونا (Arizona) جیسے تعلیمی اداروں میں تشنگان ادب کی پیاس بجھائی۔محترمہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں خان عبد الغفار چیئر کے لئے بھی مامور کی گئی تھیں جہاں انہوں نے بحیثیت پروفیسر اپنی تدریسی خدمات سے پوری ایک نسل کو سیراب کیا۔ وہ صحافت کے بھی وابستہ تھیں اور السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا اور Imprint جیسے اعلیٰ رسالوں کے شعبہ ادارت سے منسلک رہیں۔موصوفہ کو ۱۹۶۷ء میں ان کے ناول ''آخر شب کے ہمسفر''

کے لیے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں انہوں سویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں غالب ایوارڈ ۱۹۸۹ء میں گیان پیٹھ ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اردو ادب میں پیش بہا خدمات کے صلے میں انہیں حکومت ہند کی جانب سے ۱۹۸۵ء میں پدم شری اور ۲۰۰۵ء میں پدم بھوشن جیسے اعلیٰ اعزازات دئے گئے ۔

قرۃ العین حیدر دنیا کی بہترین فکشن نگاروں میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے اردو میں اس وقت ناول نگاری کا آغاز کیا جس وقت اردو ادب پر شاعری اور بالخصوص غزل غالب تھی اور فکشن چند ناولوں اور مختصر افسانوں تک محدود تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی، عبدالحلیم شرر کے تاریخی، مرزا ہادی رسوا کے سماجی اور منشی پریم چند کے نیم ترقی پسندانہ ناولوں اور افسانوں کے علاوہ اس کے پاس اور کچھ نہیں تھا۔ روایت شکنی قرۃ العین حیدر کے خمیر میں شامل تھی۔ انہوں نے فکشن کے جمود کو توڑا اور اسے خیالی باتوں، فنتاسی، گھٹیا رومان اور بیہودہ حقیقت نگاری کے دائرے سے باہر نکال کر ایک ایسے آفاق سے روشناس کرایا جس پر اب تک لوگوں کی نگاہیں نہیں پڑی تھیں۔ انہوں نے فکشن کے قاری کو ان زمینوں کی سیر کرائی جہاں اب تک دوسروں کے قدم نہیں پڑے تھے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی ہنرمندی، وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدے سے اردو فکشن میں تخیل اور رومان کے ساتھ ساتھ معقولیت پسندی کو بھی راہ دی۔ اپنی تخلیقی صلاحیت اور حقیقت پسندانہ نظریہ کے لئے مشہور قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں آگ کا دریا آخر شب کے ہمسفر اور چاندنی بیگم کے ذریعہ برصغیر کی عظیم الشان تاریخ کو نثر کے پیرائے میں بحسن وخوبی پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں شعور کی رَو (Stream Of Concious) کی تکنیک استعمال کیا۔ اسی لئے انہیں اردو کا ''ورجینیا وولف'' کہا جاتا ہے۔ ان کا ناول آگ کا دریا ایک Magnum Opus ہے۔ یہ ناول ماری پور، کراچی میں اگست ۱۹۵۶ء اور دسمبر ۱۹۵۷ء کے دوران تحریر کیا گیا اور ۱۹۵۹ء میں پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا۔ مصنفہ نے اس کا عنوان جگر مرادادی کے مشہور شعر:

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجئے اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

سے مستعار لیا ہے۔ مندرجہ بالا شعر زبان زد عام ہے اور ایک عام قاری اس کا مفہوم یہی نکال سکتا ہے کہ عشق ایک آگ کا دریا ہے جس میں ڈوب کر ہی دوسرے کنارے پر پہنچا جاسکتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ عشق میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے انسان کو آگ کے دریا سے گزرنا پڑتا ہے مگر شہرہ آفاق مصنفہ محترمہ قرۃ العین حیدر نے اپنے لافانی شاہکار کا عنوان ''آگ کا دریا'' رکھ کر اس شعر کو ایک نئی جہت عطا کر دی ہے۔ تقسیم ہند کے المیے پر مبنی یہ ناول ایک ایسی تخلیق ہے جس پر وقت اور آتے جاتے موسموں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکا۔ یہ ناول کل بھی نیا تھا۔ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ اس ناول کو ضبط تحریر میں لانے کی وجہ وہ یوں بیان کرتی ہیں:

''ملک کیوں تقسیم ہوا؟ کیا تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگزیر تھی؟ اس سوال نے مجھے فلسفہ تاریخ کی سمت کھینچا اور اس کا جواب دینے کی کوشش میں ایک ناول آگ کا دریا لکھ کر میں نے تین ہزار سال کی پھیلی ہوئی اور الجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت رفتہ کو گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔''

آگ کا دریا کا موضوع تاریخ ہے اور وقت اس کا مرکزی کردار ہے۔ ناول کی ابتداء میں محترمہ نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی ایک نظم کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی انہوں نے خود ہی کیا ہے۔ اس نظم میں وقت کو مرکز مان کر شاعر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نظم اس طرح ہے:

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے، تندمزاج، غصیلا
اپنے موسموں اور اپنے غیظ وغضب کا مالک' تباہ کن
وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے، سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے
خاتمہ کہاں ہے..... بے آواز چیخوں کا
خزاں میں خاموشی سے مرجھائے پھولوں کا
جو چپ چاپ اپنی پنکھڑیاں گراتے ہیں
جہاز کے بہتے ہوئے شکستہ ٹکڑوں کا خاتمہ کہاں ہے؟
خاتمہ کہیں نہیں ہے صرف اضافہ ہے
مزید دنوں اور گھنٹوں کا گھٹتا ہوا تسلسل
ہم نے کرب کے طول کو ڈھونڈ نکالا
(سوال یہ نہیں کہ یہ کرب غلط فہمی کا نتیجہ تھا
یا غلط چیزوں کی تمنا کا یا غلط چیزوں کے خوف کا)
یہ لمحے مستقل ہیں جس طرح وقت مستقل ہے
ہم اس بات کو بہ نسبت اپنے کرب کے دوسرے کے کرب میں
بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں
کیونکہ ہمارا اپنا ماضی کرم کی دھاراؤں میں چھپا ہے

لیکن دوسروں کی اذیت ایک غیر مشروط تجربہ ہے
جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتا
لوگ بدل جاتے ہیں مسکراتے ہیں مگر کرب موجود رہتا ہے
لاشوں اور خس وخاشاک کو اپنی موجوں میں بہاتے ہوئے دریا کی مانند
وقت جو تباہ کن ہے قائم بھی رکھتا ہے
میں اکثر سوچتا ہوں کیا کرشن کا یہی مطلب تھا
کہ مستقبل ایک مدھم گیت ہے
اور ان کے واسطے جو ابھی پچھتانے کے لیے پیدا نہیں ہوئے
پچھتاوے کا گل سرخ
جو ایک ایسی کتاب کے پیلے اوراق میں رکھا ہے
جو کبھی کھولی نہیں گئی۔
آگے بڑھو، مسافرو ماضی سے بھاگ کر
تم مختلف النوع زندگیوں یا کسی قسم کے مستقبل کی طرف
رواں نہیں ہو
آگے بڑھو۔ تم جو سمجھتے ہو کہ سفر میں ہو
تم وہ نہیں جنہوں نے بندرگاہوں کو پیچھے ہٹتے دیکھا
یا جو دوسرے ساحل پر اتروگے
اس لمحے کے دونوں کناروں کے درمیان وقت معطل ہے
مستقبل اور ماضی پر یکساں دھیان کرو
یہ لمحہ کرم یا نہہ کرم کا نہیں، جانو
کہ موت کے سمے انسان کا دماغ وجود کے جس نقطے پر
بھی مرکوز ہو (اور موت کا سمے ہر لحظہ ہے)
وہ محض ایک کرم ہے
جو دوسروں کی زندگیوں میں بار آور ہوگا
کرم کے پھل کا خیال نہ کرو۔ آگے چلو
اور مسافرو اور ملاحو!

تم جو گھاٹ پر اتروگے اور
تم جن کے جسم سمندر کے فیصلے سہیں گے
یا جو کچھ بھی تم پر بیتے گی۔ یہ تمہاری منزل ہے
کرشن نے ارجن سے میدان جنگ میں کہا
الوداع نہیں بلکہ۔ آگے بڑھو
مسافرو! (ٹی۔ایس۔ایلیٹ)

اس ضخیم ناول میں قرۃ العین حیدر نے تاریخ کے مختلف ادوار کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے ہندوستان کے تہذیبی پس منظر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کے مطالعے سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر کو عصری مسائل سے ہی نہیں بلکہ اپنی ہزار ہا سالہ تہذیب اور تاریخی روایت سے بھی دلچسپی ہے۔ تین ہزار برسوں کی نہایت پیچیدہ اور الجھی ہوئی تاریخ کو مصنفہ نے چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور ہر دور سے متعلق چار مختلف کہانیوں کو اس طرح ایک لڑی میں پرو کر پیش کیا ہے کہ ہندوستان کی پوری تاریخ ،ارتقائی دور سے لے کر تقسیم ہند کے سانحے تک ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ناول کی پہلی کہانی چندر گپت موریہ کے عہد سے تعلق رکھتی ہے جس کا مرکزی کردار گوتم نیلمبر ہے۔ وہ سراوستی کا طالب علم ہے اور فلسفہ کے گہرے مطالعہ کی وجہ سے تشکیک میں گھر جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مہاتما بدھ کی تعلیمات پورے برصغیر میں پھیل رہی تھیں۔ اس کی ملاقات ہری شنکر نام کے ایک نوجوان سے ہوتی ہے جو بودھ مت کا پیرو ہے۔ دونوں دوست بن جاتے ہیں۔ پھر وہ چمپا نام کی ایک لڑکی سے ملتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ وقت کا دریا بہتا رہتا ہے اور ایک عہد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے دور میں پھر گوتم، ہری شنکر اور چمپا ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ مغلوں کا عہد تھا اور سرزمین ہند پر اسلام کی روشنی پھیل چکی تھی۔ بغداد سے ایک شخص ابو المنصور کمال ہندوستان وارد ہوتا ہے۔ اس کی ملاقات گوتم، ہری شنکر اور چمپا سے ہوتی ہے۔ یہ سارے کردار مختلف تہذیبوں کی آویزش کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ چمپا کا نام ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ ڈھائی ہزار سال پہلے وہ چمپک تھی۔ اسلامی دور میں چمپاوتی ہوگئی، اودھ میں اس کا تیسرا دور شروع ہوا تو وہ چمپا جان بن کر ابھری اور آخری دور میں چمپا احمد ہوگئی۔ اس وقت دنیا کی دو بڑی قوموں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب وجود میں آرہی تھی۔ اس ناول کا تیسرا دور ایشیا میں انگریزوں کی آمد سے شروع ہوتا ہے اور کہانی میں ایک نیا کردار سرل ایشلے (cyril Ashley) ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ ایک انگریز ہے۔ یہ سبھی کردار وقت کے تسلسل کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ چوتھی کہانی ان لوگوں کی ہے جو ۱۹۴۷ء تک ایک قوم کی حیثیت سے مل جل کر رہتے تھے اور بعد از تقسیم ہند دو مختلف قوموں اور

مختلف تہذیبوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ہندوستان انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہوا مگر آزادی کے ساتھ ساتھ اسے تقسیم کے کرب کو بھی جھیلنا پڑا اور دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک پاکستان اُبھر آیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس نئے ملک کی جانب ہجرت کی اور تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ مسلمان کس طرح ہندوستان آئے اور کس طرح یہاں سے دربدر ہوئے اس واقعہ کو محترمہ قرۃ العین نے چند جملوں میں سمیٹ دیا ہے۔ آگ کا دریا کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

پھر یک بیک وہ چپ ہو گیا۔ ندی پر شفق کی سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دونوں بے حد اداس ہو گئے۔

''یار گوتم!''

''ہاں!''

''یار کمال ہمیں دغا دے گیا۔'' ہری شنکر نے چند لمحوں آہستہ سے کہا۔

''ہاں!''

''تم کو پتہ ہے، سالی دلی ہوتا ہوا گیا۔ اگر مجھے تار دے دیا تو میں اس سے آکر وہیں مل لیتا۔''

''میں تو دلی میں موجود تھا۔ اس کے باوجود مجھ سے نہیں ملا۔'' گوتم نے آہستہ سے جواب دیا۔

وہ دونوں پھر چپ ہو گئے۔

''نہ جانے اس وقت وہ کہاں ہوگا۔'' ہری شنکر نے تاسف سے کہا۔

''کراچی میں ہوگا۔ اور کہاں ہوگا۔'' گوتم نے نیچی آواز میں جواب دیا

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید دونوں اکھٹے سوچ رہے تھے کہ ابوالمنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستانی سے نکل گیا۔

مندرجہ بالا اقتباس میں محترمہ نے جس اختصار کے ساتھ تاریخ کے ایک تاریک پہلو کو روشن کیا ہے اس کی مثال اردو ادب میں کہیں اور نہیں ملتی۔

کسی ضخیم ناول کی پلاٹ سازی کرنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔ مختلف کہانیوں کو ایک دھاگے سے اس طرح باندھنا کہ انہیں دیکھ کر کسی اکائی کا گمان ہو، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قرۃ العین حیدر کا کمال یہ ہے کہ تین ہزار برس پر محیط اس کہانی کو انہوں نے گوتم نیلمبر سے شروع کیا ہے اور گوتم نیلمبر پر ہی اسے ختم کیا ہے۔ ناول کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔

گوتم نیلمبر نے چلتے چلتے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا۔ راستے کی دھول
بارشوں کی وجہ سے کم ہو چکی تھی گو اس کے اپنے پاؤں مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

برسات کی وجہ سے گھاس اور درخت زمرد کے رنگ کے دکھلائی پڑ رہے تھے۔ اشوک کے نارنجی اور سرخ پھول گہری ہریالی میں تیزی سے جھلملاتے تھے اور ہیرے کی ایسی جگمگاتی پانی کی لڑیاں گھاس پر ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ ندی کے پار پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی۔ گوتم کو خیال آیا۔ گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں اور برگد کے نیچے کسی من چلے ملاح نے زور زور سے ساون الاپنا شروع کر دیا تھا۔ آم کے جھرمٹ میں ایک اکیلا مور پر پھیلائے کھڑا تھا۔ شراوستی یہاں سے پورے پچیس کوس تھا اور گوتم نیلمبر کو ندی تیر کر پار کرنا تھی۔ گھاٹ پر تین لڑکیاں ایک طرف کو بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے ہنسنے کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔ لڑکیاں کتنی باتونی ہوتی ہیں۔ گوتم نے سوچا۔ انہیں بھلا کون سے مسئلے حل کرنا ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ نظر بھر کر انہیں دیکھ لے۔ خصوصاً اس کسری ساری والی لڑکی کو جس نے بالوں میں چمپا کا پھول اُڑس رکھا تھا۔ اس کے ساتھ نچلی سیڑھی پر جو لڑکی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی اس کے گھنگھریالے بال تھے اور کتابی چہرہ اور جڑی ہوئی سیاہ بھنویں۔ قریب پہنچ کر گوتم نے ان دونوں کو لحظہ بھر کے لئے دھیان سے دیکھا اور جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ گھاٹ کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے تیزی سے پانی میں چھلانگ لگا دی اور دوسرے کنارے کی طرف تیرنے میں مصروف ہو گیا۔

اور ناول کا اختتام ان الفاظ میں ہوتا ہے۔

گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کمیونیٹی پروجیکٹ کے سینٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ لوک گیت منڈلی نے سالانہ یوتھ فیسٹیول کے لئے اپنی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کی آوازیں تیرتی ہوئی ان دونوں تک آ رہی تھیں۔ دور گاؤں کی چوپال میں نوٹنکی ہو رہی تھی۔ آم کے جھنڈ کے باہر آلہا اودل گایا جا رہا تھا۔ کانگریس کمیٹی کے دفتر میں الکشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دور مسلمانوں کے محلے میں پنڈال لگے تھے اور گیس کے ہنڈے نصب تھے اور شاید میلاد شریف پڑھا جا رہا تھا۔ آگے سول لائنز میں ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی میں پوروپین مہمان ڈنر کھا رہے تھے۔

گوتم نے ایک الٹی ہوئی ناؤ پر پیر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ ندی کے کنارے اکیلا کھڑا تھا۔ ہری شنکر کسی کسان سے باتیں کرتا کمیونیٹی پروجیکٹ سنٹر کی طرف جا چکا تھا۔ بادل اب دریا پر بہت نیچے

جھک آئے تھے۔

اس نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو دیکھا۔ بڑھتی ہوئی تاریکی پر نظر ڈالی لیکن ڈرنے کی کیا بات تھی۔ وہ زمین کے ساتھ تھا۔ زمین اس کی ماں تھی۔ زمین اس کا ساتھ دے گی۔

اس نے آگے چلنا شروع کیا۔

گھاس کی بھینی خوشبو، پتھروں کی خنکی اور مٹی کی قوت اس نے اپنے تلووں کے نیچے محسوس کی۔ اس نے بازو پھیلا کر ہوا کو چھوا اور آہستہ آہستہ دہرانا شروع کیا۔ زمین تیری پہاڑیاں، برفانی پہاڑ اور جنگل مسکرا رہے ہیں۔ میں تیری سطح پر کھڑا ہوں۔ میں مغلوب نہیں ہوا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ مجھے زخم نہیں لگے۔ میں سالم ہوں مجھے کوئی ختم نہ کر سکا۔

طرح طرح کے پودے اور پھولوں کی ٹہنیاں اس کے راستے میں جھک آئیں۔ پرندے اسکے ہمراہ سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ساون کی بوندیں کنول کے پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔

وہ ایک منڈیر پر کھڑا ہو گیا اور بھیگی آنکھوں سے اس نے کھیتوں کو دیکھا۔ بڑھتی بڑھتی جاؤ! جو کی بالیو تاکہ ہمارے گھڑے بھر جائیں۔ طوفان سے محفوظ رہو جو کی الوہی بالیو۔ سمندر کی طرح اتھاہ رہو۔ وہ سب امر رہیں جو تمہاری خدمت کرتے ہیں، تمہارے کھلیان امٹ رہیں۔

وہ منڈیر پر سے اتر کر پگڈنڈی پر آ گیا اور دریا کے کنارے کنارے سڑک پر چلنے لگا۔ افق پر سیاہ بادل گرج رہے تھے۔ اس کے دل میں طوفانی دریا لہریں مار رہے تھے۔ اس کے دماغ میں سریلے آبشار گیت گا رہے تھے۔ مور جھنکار رہے تھے، پپیہے چلاتے تھے۔ بھنورے گونج رہے تھے۔ کدم کے بہت سے پھول ڈال سے ٹوٹ کر اس کے قدموں میں آن گرے۔

گانے والوں کی آوازیں قریب آئی گئیں۔

منڈلی نے گایا۔

بنجر آج ہرے رے
کھتن میں ناج بھرے

جیون آج سپھل رے
اچھی دھان اچھی فصل رے

وہ ٹہنیاں ہٹاتا اس طرف بڑھنے لگا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔

ڈالوں کے بچوں بیچ پتوں کے بیچ بیچ
موتین کی لالن کی لڑیاں اُگائیہو
اونیرے آئے ہو

وہ غور سے سنا کیا۔ جب الفاظ سمجھ میں آئے تو تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھر گیا۔ چٹانیں ،اولانش، گلیشیر، آندھیاں، طوفان، جھکڑ، ان سب سے گزرتا سر کی لہروں پر بہتا وہ گوری شنکر کی اونچی چوٹی پر چڑھ کر بادلوں میں چھپ گیا ۔ چوٹی پر وہ دوزانو بیٹھ گیا۔ اور اسنے دیکھا کہ چاروں اور خلا ہے اور اس میں ہمیشہ کی طرح وہ تنہا موجود ہے، دنیا کا ازلی و ابدی انسان، تھکا ہوا، شکست خوردہ، بشاش پر امید، انسان جو خدا میں ہے اور خود خدا ہے۔ وہ مسکرا کر نیچے اترا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔

جاگنے والو کو جاگنا مبارک ہو
قانون کا پرچار مبارک ہو
سنگھ میں امن مبارک ہو
ان لوگوں کی ریاضت مبارک ہو
جنہیں شانتی میسر آ گئی ہے
شاکیہ منی نے کہا

وہ منڈیر پر سے اترا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم رکھتا بستی کی طرف واپس چلا گیا۔

ان کا یہ ناول پچھلے تمام ناولوں سے زیادہ وقیع اور تکنیکی اعتبار سے مکمل ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اندرونی زندگی اور اس کی تنہائیوں سے اکتا کر بیرونی دنیا پر حیرت و مسرت سے نظریں ڈال رہی ہیں۔ اس ناول کے مطالعے سے تاریخ کے پس پردہ پوشیدہ بہت سے دلچسپ معنی خیز اور توجہ طلب حقائق منکشف ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ہزاروں برس پیچھے کی تہذیبی تاریخ میں سفر کرتے کرتے عصری مسائل کی طرف متوجہ ہوتی ہیں تو فطری طور پر انہیں عالمی سیاسی پہلوؤں پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔

پھر انہیں تقسیم شدہ برلن کے باشندوں کے انسانی مسائل کا خیال آتا ہے، کوریا کی جنگ سے پیدا شدہ مسائل پر نظر پڑتی ہے۔ ہندوستانی شرنارتھیوں اور پاکستانی مہاجرین کے دکھوں کا مداوا تلاش کرتے کرتے امریکن نیگرو، جرمن یہودیوں اور عرب پناہ گزینوں کے مسائل کی طرف ان کا ذہن چلا جاتا ہے اور آخر کار انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ انسان مسائل کا حل سرحدوں کی حدود میں نہیں پایا جاسکتا ہے۔ اپنے وسیع کینوس کی وجہ سے اس ناول کو Gabriel Garcia Marquez کے One hundred years of solitude کے برابر رکھا جاسکتا ہے۔ ٹائمز لندن نے اپنے ادبی صفحات میں لکھا تھا کہ اردو فکشن میں آگ کا دریا کو وہی حیثیت حاصل ہے جو ہسپانوی ادب میں تنہائی کے سو برس (One hundred years of solitude) کو۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا مقام چیکوسلاواکیہ کے مشہور مصنف میلان کندیرا اور مارکوس سے بلند تر نہ سہی مگر ان کے مساوی ضرور ہے۔

محترمہ قرۃ العین حیدر نے طویل عمر پائی اور ایک بھرپور زندگی گذاری۔ لیکن ان کی موت سے ادبی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید کبھی پر نہ ہوسکے۔

موت اس کی ہے زمانہ کرے جس کا افسوس ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

◂◂ ● ▸▸

Shah Colony Shah Zubair Road
Munger 811201 Mob 8210498694

ماہنامہ

تمثیلِ نو

مدیر: ڈاکٹر امام اعظم

ملنے کا پتہ

اردو ادبی سرکل، گنگوارا، دربھنگہ بہار (انڈیا)

- **مضمون**
- **ڈاکٹر سید احمد قادری**

قرۃ العین حیدر.....تہذیب و تاریخ کی داستان

قرۃ العین حیدر نے ۲۷ جنوری ۱۹۲۷ء کو علی گڑھ میں آنکھیں کھولیں، اور اپنا افسانوی سفر اپنے افسانہ ''یہ باتیں'' (ہمایوں، لاہور، ۱۹۴۴ء) سے شروع کر افسانوی ادب میں نہ صرف اعلیٰ مقام حاصل کیا، بلکہ اردو افسانے کی آبرو بن گئیں۔ اگر ان کے افسانوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ قرۃ العین حیدر ایک بے حد مشکل پسند اور منفرد فنکار کا نام ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات، کردار، ماحول، واقعات، اسلوب، آرٹ اور طرزِ بیان سب کچھ مختلف ہیں۔ مشکل پسندی اور عام ڈگر سے الگ ہٹ کر افسانے لکھنا ہی ان کی خاص پہچان تھی۔ گرچہ انہوں نے جو کچھ لکھا، وہ خود ان کے مطابق، اپنے ماحول کے بارے میں لکھا، جو لوگوں کو اجنبی لگا، لیکن قرۃ العین حیدر کا اصرار تھا کہ ان کے ابتدائی دور میں ان کے گرد و پیش جو فیوڈل ماحول تھا، مغرب زدہ امیر طبقے کے جو لوگ تھے، جن کی لڑکیاں کانونٹ کالج میں پڑھ رہی تھیں، فوجی افسران تھے، پارٹیاں، کلب اور ڈانسیز تھے، غرض پورا میلو ہندوستان کے بہت ہی خاص طبقے سے تعلق رکھتا تھا، جن کے یہاں کئی نسلوں سے مغربیت تھی اور یہ خاص طبقہ برٹش انڈیا کا تھا، اسی ماحول میں عینی نے آنکھیں کھولیں، گھر کا پورا ماحول تعلیم یافتہ اور مغربیت کے زیر اثر تھا۔ گھر کا ہر فرد کسی نہ کسی آرٹ سے جڑا ہوا، کوئی موسیقی کا دلدادہ تھا، تو کسی کو مصوّری کا شوق، کسی کو شاعری سے تو کسی کو نثری ادب سے۔ والد اور والدہ کو افسانے سے دلچسپی تھی۔ والد سیّد سجاد حیدر یلدرم (۱۹۴۳ء-۱۸۸۰ء) کو اس وقت اس فن میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ فطری طور پر فن افسانہ نگاری نے عینی کو بھی متوجہ کیا اور بہت کم عمر میں انھوں نے کہانیاں لکھنے کی شروعات کی، پہلی کہانی ''بی چوہیا کی کہانی'' لاہور سے شائع ہونے والے بچوں کے ایک اخبار ''پھول'' میں ۱۹۳۹ء کے شمارہ میں شائع ہوئی، اس کہانی کی پذیرائی سے عینی کا حوصلہ بڑھا اور انھوں نے بچوں کے لئے کئی کہانیاں لکھیں، فکر و احساس میں تھوڑی پختگی آئی تو عینی نے بڑوں کے لئے کہانیاں لکھنے کی ابتدا کی اور پہلی باضابطہ کہانی ''یہ باتیں'' کے عنوان سے لاہور کے مشہور زمانہ رسالہ ''ہمایوں'' میں ۱۹۴۴ء کے ایک شمارہ

میں شائع ہوئی اس وقت عینی کی عمر چودہ پندرہ سال کے قریب تھی، یہ عمر یقیناً ایسی نہیں تھی، جو اس وقت چل رہی تحریکات کی شدت کو محسوس کر سکتی تھی، گرچہ ان کے گھر کے اندر اور باہر ان تحریکات کے مباحث اور مناظر پوری طرح جلوہ گر تھے۔ بورژوا، رومانیت، Feudal کے درمیان جو ایک کشمکش تھی، ان حالات اور واقعات کے Shadows، ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' (۱۹۴۷ء) کے کئی افسانوں میں ملتے ہیں۔ گرچہ ان افسانوں میں وہ پختگی اور فنّی التزام موجود نہیں ہیں، جو بعد میں عینی کی مخصوص پہچان بنے۔ اس مجموعہ کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جو عینی کے خاندان اور نجی حالات سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تعارف میں رئیسانہ شان وشوکت کی خود نمائیاں زیادہ اور فن کی کارفرمائیاں بجھی بجھی سی ہیں، اس کی وجہ فکری اور فنّی ناپختگی ہے، گرچہ کچھ بڑا اور اہم کام کر گزرنے کا جنون بھی ہے۔ Nostalgia کی وادیوں میں عینی کو سیر کرنا بے حد پسند رہا اور یہ شوق شروع سے آخر تک برقرار رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں سے لے کر آخری ایام تک کے افسانوں میں سوانحی انداز بتدریج عرفان وآگہی کے منازل طئے کرتا ہوا بام عروج تک پہنچا۔

عینی کے ابتدائی افسانوں میں یہ عناصر کس طرح نمو پاتے ہیں۔ اس کے نقوش ''ستاروں سے آگے'' کے کئی افسانوں میں نمایاں ہیں۔ ان افسانوں میں بیشتر کردار عینی کے اسکول وکالج کی لڑکیاں ہیں، ماحول بھی پوری طرح ان کا اپنا ہے۔ مثلاً :

''...... ہائے دہرہ دون میرا پیارا بچپن کا رفیق...... (صفحہ۱۴۰) 'آہ' آئے دوست، ہائے دہرہ دون، گرمیاں آرہی ہیں، یعنی کیلے اور فالسے کے جھنڈوں میں بھنورے گونجنا شروع کر دیں گے، ہائے یوپی، میرا پیارا یوپی، تم نے کبھی یوپی کی گرمیاں نہیں دیکھیں۔ آم کے باغوں میں دوپہر کے سنّاٹے کی خاموش موسیقی کا بوجھ محسوس نہیں کیا۔ ارودوں کے جھرمٹ میں سے بلند ہوتی ہوئی برہا اور آلھا اُودل کی تانیں نہیں سنیں۔ شاید کبھی ملیح آباد جا کر آم نہیں کھائے اور گومتی کے خربوزے۔ آہ میرا اودھ۔ قیصر باغ کی بارہ دری میں اندر سبھا ہو رہی ہے......''

(صفحہ۱۴۱)

......ارے تو گویا قنوطیت پسندی بھی الٹرا فیشن بنتی جا رہی ہے......''

(صفحہ۱۴۲)

یہ بات واضح رہے کہ عینی نے ابتدائی وثانوی تعلیم دہرہ دون، لاہور اور لکھنؤ میں پائی، انٹر بھی لکھنؤ کے ایک کالج سے کیا۔ بی.اے، دہلی کے ایک کالج سے اور پھر ایم.اے کے لئے انھوں نے لکھنؤ

یونیورسیٹی میں داخلہ لیا۔

افسانہ ''آہ اے دوست'' میں مندرجہ بالا جملوں سے کس قدر لکھنؤ اور دہرہ دون سے جذباتی لگاؤ عینی کو تھا، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

عینی اپنی ذہانت، قابلیت اور علمیت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں، یہ دیکھئے____

''حیاتین کی کمی سے انسان کمیونسٹ بن جاتا ہے اور راز حیات پر گفتگو کرنے لگتا ہے۔ میں اتنی دیر سے کس قدر بصیرت افروز گفتگو کر رہی ہوں، بڑی گہرائیاں ہیں، اس حیات مستعار میں جناب عالی وہ تو یہ سمجھو کہ کیا کیا فلسفے ہیں، افوہ کیا ٹھکانہ ہے، میری قابلیت کا۔ بہت قابل ہوں۔ چین اور روس اور فرائیڈ پر ساری کتابیں پڑھ چکی ہوں، گو یہ معلوم نہیں کہ ان کتابوں میں کیا کیا لکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں رہ کر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بہت کم نظری اور رجعت پسندی اس ملک میں عام ہے اور سوئز پار کر لینے کے بعد ایک نہایت ہی وسیع قسم کی بلند نظری انسان میں پیدا ہو جاتی ہے۔ دماغ کے اندر بے حد اعلیٰ اعلیٰ خیالات آتے ہیں۔''

(افسانہ ''آہ اے دوست'' صفحہ۱۴۳)

عینی کا یہ اعتراف بھی قابلِ توجہ ہے۔

''بات یہ ہے بھئی کہ میری اردو کافی سے زیادہ کمزور ہے۔ بچپن سے کانونٹ میں پڑھا ہے اس لئے.... بات بات میں انگریزی کی مدد لینی پڑتی ہے۔ یعنی جملے کے جملے انگریزی کے ٹھونسے جاتے ہیں.....''

(افسانہ ''ایں دفتر بے معنی'' صفحہ۱۵۳)

پھر دوسری طرف اس امر کا بھی اظہار ہے کہ......

''خوب مس حیدر، آپ کی تو نثر میں نظم کی سی حلاوت، روانی اور لچک ہے۔''

(افسانہ ''ہم لوگ'' صفحہ۱۷۵)

عینی کے ابتدائی افسانوں میں ''دیودار کے درخت'' اور ''جہاں کارواں ٹھہرا تھا'' اچھے افسانے ہیں، ان میں رومانیت کی بھرپور فضا، محبت کے لطیف اشارے اور مناظر فطرت کا حسن پوری طرح جلوہ گر ہے۔ افسانہ ''اودھ کی شام'' میں ہندو، مسلم اور انگریز کے اختلاط سے جدید ہندوستانی تہذیب کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا خوبصورت اظہار ہے۔

ویسے تو عینی نے خود اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ''میرا مسئلہ یہ ہے کہ پہلے تو میں نے لکھا بالکل

انٹ سنٹ ،Emotionally،Compulsively'' ۔لیکن جیسے جیسے ان کا شعور بیدار ہوتا گیا، احساسات و جذبات میں گہرائی و گیرائی اور مطالعہ و مشاہدہ میں وسعت پیدا ہونے لگی، وہ فکری و فنی بلندیوں کو چھونے لگیں۔ تاریخ و تہذیب سے گہری دلچسپی، مختلف ممالک کی سیر یا قیام کے دوران وہاں کے ماحول اور معاشرتی تہذیب کے براہ راست مطالعہ و مشاہدہ نے عینی کے افسانوں کو وسیع کینوس اور متنوع موضوعات دیئے، جن پر انھوں نے بے حد سنجیدگی سے لکھا۔ نقادوں کو وہ ماحول اور حالات اجنبی لگے، لیکن عینی کا اردو ادب پر اس قدر رعب طاری تھا کہ اچھے اچھے نقاد، ان کے فن پر تنقید کرنے سے گھبراتے، اس کی وجہ عینی یہ بتاتی ہیں کہ.....

''ہمارے یہاں ادب میں ایک Anti intellectual attitude چل رہا ہے۔ ان دنوں پڑھنے کا شوق نہیں رہا۔ میرے افسانوں میں بہت کافی Variety ہے اور اس طرف کسی نقاد نے توجہ نہیں دی۔ میرے مختلف افسانوں کی جو Back Ground ہے، وہ کہیں منیلا کی ہے، کہیں جاپان کی ہے، کہیں ایران کی۔ جہاں جہاں میں گئی ہوں اور جن چیزوں نے مجھے Inspire کیا ہے، میں نے لکھا اور نقادوں نے ان کو سنجیدگی سے پڑھا نہیں ہے۔ اگر کسی نقاد نے ۱۹۵۱ء میں میری کوئی تخلیق پڑھ لی تو آج تک اسی چیز کے متعلق اور اسی نظریے سے لکھے کو دہرایا جائے گا۔ کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوگی کہ ذرا آگے بھی پڑھ لیں۔ پھر پہلے نقاد نے جو بات کہہ دی۔ دوسرے بھی وہی دہرائے جائیں گے اور دہراتے رہیں گے۔''

(ماہنامہ ''شاعر'' صفحہ ۲۴۔ جلد ۴۹ شمارہ: ۷، ۱۹۷۸ء)

''ستاروں سے آگے'' کے بعد عینی کے اندر غایت سنجیدگی، متانت اور خود احتسابی کی کیفیت پوری طرح جلوہ گر ہوئی اور انھیں اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ فنکار کو خود اپنے فن کی خامی یا خوبی سے واقف ہونا چاہئے، فنکار کیا لکھ رہا ہے، کیوں لکھ رہا ہے اور اس کی اہمیت اور معنویت کیا ہے، اس احساس نے بھی ان سے بہت اچھے اور معیاری افسانے لکھوائے، جو ان کے مختلف افسانوی مجموعے مثلاً'' شیشے کے گھر'' (۱۹۵۴ء) ''پت جھڑ کی آواز'' (۱۹۶۶ء) ''روشنی کی رفتار'' (۱۹۸۲ء) اور ''جگنوؤں کی دنیا'' (۱۹۹۰ء) میں شامل ہیں۔

ان افسانوی مجموعوں کے افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عینی نے حیات و کائنات کے بہت سارے اسرار و رموز کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا اور قومی اور بین الاقوامی

تناظر میں دیکھنے اور برتنے کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ گرچہ عینی کے افسانوں کے بعض موضوعات وہی ہیں، جو ان کے بعض ہم عصر یا پیش رو افسانہ نگاروں کے تھے، مثلاً تقسیم ہند، ہجرت، فرقہ وارانہ فسادات، جاگیردارانہ نظام اور زمین دارانہ نظام کا خاتمہ، تہذیب و اقدار کا بکھراؤ اور عورت کے نت نئے روپ وغیرہ۔ لیکن ان تمام موضوعات میں عینی کا جو اندازِ بیان اور فکر و احساس کی ندرت اور انفرادیت ہے، وہ دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ مثال کے طور پر جلا وطن، پت جھڑ کی آواز، ہاؤسنگ سوسائٹی، ''ملفوظات حاجی گل بابا بیک تاشی'' یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے، کیکٹس لینڈ، وغیرہ ایسے افسانے ہیں، جو موضوع، مواد، کردار، اسلوب کے لحاظ سے شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ چند اقتباسات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''اب میں نے دیکھا کہ آفتاب اور بدر کامل دونوں افق پر موجود ہیں۔ صنوبروں پر رات کے پرندے نغمہ زن ہوئے۔ پھر سورج اور چاند دونوں جھیل کے پانیوں میں گر گئے۔ جھیل کا رنگ سیاہ ہو گیا۔''

(ملفوظات حاجی گل باب بیک تاشی)

ان چند سطروں میں عینی نے عصر حاضر کی مادہ پرستی اور لادین سیاسیین کے ظلم و استحصال سے ترکی، مشرقی یورپ اور ایشیائے کوچک میں تصوفِ اسلامی کی خانقاہوں کی تباہی و بربادی کا المناک پہلو اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح افسانہ ''پت جھڑ کی آواز'' میں افسانہ کی ہیروئن تنویر فاطمہ، جس نے پُر بہار زندگی گزاری، اپنے حسن سے خوش وقت سنگھ، فاروق وغیرہ کو داد عیش دیا، لیکن خواہش ہمیشہ یہ رہی ہے ــــ

''اس رات تیمار پور کے اس سنسان بنگلے میں اس (خوش وقت سنگھ) نے میرے ہاتھ جوڑے اور رو رو کر مجھ سے کہا کہ میں اس سے بیاہ کر لوں، ورنہ وہ مر جائے گا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں، قیامت تک نہیں۔ میں اعلیٰ خاندان سیّد زادی بھلا اس کالے تمباکو کے پنڈے ہندو جاٹ سے بیاہ کر کے خاندان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگاتی۔ میں تو اس حسین و جمیل، کسی بہت اونچے مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ کے خواب دیکھ رہی تھی، جو ایک روز دیر یا سویر بارات لے کر مجھے بیاہنے آئے گا۔''

(پت جھڑ کی آواز)

اس افسانہ میں تقسیم ہند کے تناظر میں ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال عورت کی نفسیاتی کشمکش کو بڑے فنکارانہ انداز میں عینی نے پیش کیا ہے۔ افسانہ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' یقینی طور پر ایک ایسا افسانہ جسے

بین الاقوامی سطح کے افسانوں میں بھی سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔اس افسانہ میں بدلتے سیاسی حالات، نئی تہذیب اور جدید معاشرہ پر جس انداز سے طنز کیا گیا ہے، وہ صرف اور صرف عینی کا حصہ ہے۔اس طویل افسانہ کے چند جملوں سے اس کا اندازہ لگائیے۔۔۔۔

''آج کی دنیا ایک بہت عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے، جس میں ذہنوں، دماغوں، دلوں، روحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید وفروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے فنکار، دانشور، عینیت پسند اور خود پرست میں نے اس چور بازار میں بکتے دیکھے ہیں۔میں خود اکثر ان کی خرید وفروخت کرتا ہوں۔''

(ہاؤسنگ سوسائٹی)

افسانہ ''جلاوطن'' میں عینی فکر وفن کے لحاظ سے بھی کافی بلندی پر نظر آتی ہیں۔اس افسانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب اور قدروں کے واقعات کے تانا بانا کو جس انداز میں بُنا گیا ہے، وہ صرف تہذیبی اور تاریخی روایت کا سرچشمہ ہے، بلکہ تقسیم ہند سے جو مشترکہ تہذیب وتمدن کے بکھرتے شیرازہ کا جو المناک فضا بنائی ہے، اس کی زبردست ٹیس ہے، ایک اقتباس دیکھیں۔۔۔۔

''رفیقو' انسان نے خودکشی کرلی۔پرانی اقدار تباہ ہوگئیں۔اپنے پرائے ہوگئے۔ یہ سب پچھلے سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔یہ جو کچھ ہوا، یہی ہونا تھا اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصوّر لئے بیٹھی تھیں، گویا زندگی نہ ہوئی، شانتارام کی فلم ہوگئی۔''

(جلاوطن)

ایسے خوبصورت، معنی خیز اور زندگی کے حرکت وعمل کو وسیع تناظر میں پیش کرنے والے، ان افسانوں کو جو موضوعات سے لے کر کردار، واقعات تجسس، تحیر، تکنک، ٹریٹمنٹ، زبان، ماحول اور کلائمکس تک ایک خاص معنویت اور انفرادیت بخشتا ہے، فراموش کرنا ممکن نہیں۔لیکن اس کے باوجود ہمارے نقادوں نے ان پر توجہ نہیں دی۔عینی اپنی زندگی کے آخری ایام یعنی ۲۰ رمئی ۲۰۰۵ء کو بھی نظر انداز کئے جانے کا شکوہ، ان لفظوں میں کرتی ہیں۔

''ہمارے فکشن کے ناقدین ناچیز کے ناولوں کے بارے میں تو لکھ لیتے ہیں، لیکن افسانوں کو انھوں نے تقریباً نظر انداز کر رکھا ہے۔''

(پیش لفظ' آئینۂ جہاں' جلد۔اول)

ویسے عینی بذات خود افسانے کے معیار کی جو تعریف پیش کرتی ہیں، وہ یہ ہے کہ:

''افسانہ، افسانہ ہے، افسانہ اچھا بھی ہوسکتا ہے، بُرا بھی ہوسکتا ہے۔میرے نزدیک معیار یہ ہے کہ وہ اچھا ہو، ہر لحاظ سے۔''

As a human doccuments, As a piece of literature and as something to enjoy, and as something which disturbs you, something which stimulates you."

عینی ہمیشہ اپنے ان خیالات پر کاربند رہیں، اور کئی ایسے شاہکار افسانے لکھے، جو افسانوی ادب میں قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

7-New Kareem Gujn,Gaya(Bihar,India)
8969648799
email:squadri806@gmail.com

سہ ماہی

انتساب

مدیر

ڈاکٹر سیفی سرونجی

ملنے کا پتہ

سیفی لائبریری، سرونج، مدھے پردیش

(انڈیا)

● مضمون

● ڈاکٹر محمد جعفر احراری

شبلی اور عطیہ فیضی

شبلی کی شخصیت کا سب سے دلچسپ اور متنازع فیہ پہلو وہ خطوط ہیں جو عطیہ فیضی کو لکھے گئے۔ شبلی اور عطیہ فیضی کے تعلقات اور معاشقے کی داستان بڑی طویل ہے جسے کچھ ادیبوں نے بہت چٹخارے لگا کر بیان کی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شبلی رنگین مزاج تھے اور اُنھوں نے عطیہ کو جو کچھ بھی لکھا وہ دل کی گہرائیوں سے لکھا۔ عطیہ نے ہمیشہ شبلی کو معزز سمجھا اور احترام کی نظر سے دیکھا لیکن شبلی عطیہ کو کس نظر سے دیکھتے تھے یہ ایک خالص نفسیاتی مسئلہ ہے۔ شبلی اپنے عہد کے نامساعد حالات سے بے حد متاثر تھے، چنانچہ کسی کو اپنا درِ دل سنا کر اور اس میں کسی کو شریک کرنا اگر معاشقہ ہے تو اس صورت میں سارے انسانی اقدار پامال ہوتے نظر آتے ہیں۔ ظاہری اسباب کو دیکھ کر کسی کو موردِ الزام ٹھہرانا یا اس پر بدطینتی کا فتویٰ لگانا آسان کام ہے لیکن اس کی تہوں میں اُتر کر بات کرنا ایک مشکل ترین کام ہے۔

شبلی کی شخصیت کا ایک رنگین پہلو ''خطوطِ شبلی'' مرتبہ مولوی محمد امین زبیری کی اشاعت کے بعد سامنے آتا ہے۔ اس پر مولوی عبدالحق کا مقدمہ معنی خیز ثابت ہوا۔ انھوں نے عطیہ بیگم کے نام شبلی کے خطوط کو رنگین بنا کر پیش کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ شیخ محمد اکرام اور وحید قریشی نے اسے اور بھی زیادہ ہوا دی۔ ان لوگوں نے شبلی کے خطوط کو ضرورت سے زیادہ رومانی بنا دیا اور بین السطور کو پڑھ کر قیاس آرائیاں کیں۔ ''خطوطِ شبلی'' کی اشاعت کے بعد ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ لوگ اسی کے منتظر تھے۔ جو سمجھ میں آیا کہہ دیا اور اپنی مرضی کے مطابق معنی پہنانے میں بھی دریغ نہیں کیا، یہ بھی ہوش نہ رہا کہ کون سا خط کس کے نام ہے۔ ابنِ فرید نے لکھا ہے کہ ''اکثر اقتباسات کو جو اصلاً زہرہ بیگم کے خطوط سے ہیں، عطیہ کی طرف منسوب کر کے زبردستی حیاتِ معاشقہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔''[1]

عطیہ سے شبلی کی خط و کتابت کا سلسلہ 17 فروری 1908ء سے شروع ہو کر 28 مئی 1911ء کو ختم ہوا۔ شبلی عطیہ کی شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ مسلم عورتوں میں کوئی سروجنی نائیڈو کی طرح مقرر بن سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ عطیہ ایک اچھی مقرر، پاکیزہ مذاق کی ادیبہ اور تعلیمی میدان کی سرگرم

کارکن بنیں۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں چاہتا ہوں کہ آپ ان مشہور عورتوں کی طرح اسپیکر اور لیکچرار بن جائیں جو انگریز اور پارسی قوم میں ممتاز ہو چکی ہیں۔ لیکن اردو میں، تاکہ ہم لوگ بھی سمجھ سکیں۔ آپ میں ہر قسم کی قابلیت موجود ہے۔ صرف مشق کی ضرورت ہے۔''[2]

شبلی، عطیہ کے نام جو خط بھیجتے ہیں وہ عزیزی، خاتونِ محترم یا قرۃ العینی سے شروع ہوتے ہیں۔ یہی القاب وہ اپنی بیٹی فاطمہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ رومانیت کے کھلاڑی کچھ اور ہی القاب و آداب سے مخاطب کرتے ہیں اور جواب میں آئے ہوئے خطوط اپنے اہل و عیال یا کسی دوسرے کو دکھانا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی اس کا سرِ عام ذکر کرتے ہیں۔ عطیہ کے نام ایک خط میں شبلی لکھتے ہیں:

''میری لڑکی علاج کے لیے آئی ہوئی ہے۔ وہ تمھارے خط پڑھ کر سخت حیرت زدہ ہوتی ہے کہ اس قابلیت کی بھی عورتیں ہوتی ہیں۔ میں نے اس کا بھی جواب دیا کہ وہ عورت کب ہے؟''[3]

عطیہ اور شبلی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ کبھی کبھی طویل وقفے تک بند نظر آتا ہے۔ اس کی تفصیل سیّد شہاب الدین دسنوی اپنی کتاب میں پیش کرتے ہیں:

''کبھی کبھی دو خطوں کے درمیان خاصا طویل عرصہ ہے۔ 28 اپریل سے 13 اکتوبر 1908 (44 دن)، 21 ستمبر سے 26 مئی 1909 (515 دن)، 5 جولائی سے 13 اکتوبر 1910 (تین ماہ 8 دن)؛ یہ وقفے کافی طویل ہیں۔ کیا اس درمیان مراسلت بند رہی؟ یا یہ کہ مراسلت جاری رہی مگر وہ خطوط منصۂ شہود پر نہیں آئے۔ جس احتیاط کے ساتھ عطیہ شبلی کے خطوط کو بقولِ محمد امین زبیری 'آہنی الماری' میں سنبھال کر رکھتی تھیں اس سے ان کے ضائع ہونے کا امکان تو بعید معلوم ہوتا ہے۔''[4]

خط و کتابت کے درمیان طویل وقفے کی حقیقت کیا ہے؟ جولائی اور کتوبر 1910 کے درمیانی سکوت کے بعد عطیہ کا جو خط آیا اسے رومان کا رنگ دیتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''مدت کے بعد جب ادھر سے ایک شفقت بھرا خط آیا تو شبلی کے تصور نے انگڑائی لی اور دفعتاً بہت سے مردہ خیالات پھر زندہ ہو گئے۔ اب انھوں نے پھر 'عزیزی' سے خطاب شروع کیا بلکہ تصویر کی فرمائش کی لیکن غالباً جواب حوصلہ افزا نہ تھا۔ شبلی کے دل میں عطیہ کی یاد آخر تک ایک خوش گوار نقش کی طرح محفوظ رہی۔ کبھی کبھی ملاقاتیں بھی ہوئیں لیکن ٹوٹے ہوئے دل پھر نہ جڑ سکے۔''[5]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کا وہ خط بھی تحریر کیا جائے جس کی بنا پر شیخ محمد اکرام نے مولانا کے

رومان کی کہانی بنائی ہے:

''عزیزی! مدت کے بعد تم نے یاد کیا، دفعتاً بہت سے مردہ خیالات زندہ ہو گئے۔ کانفرنس تو ناگپور ہی میں ہوگی لیکن تم ضرور الٰہ آباد آؤ۔ افسوس ہے کہ میرے خاندان کی عورتیں وہاں نہ ہوں گی ورنہ تم سے بڑے شوق سے ملتیں کیوں کہ تمھارا اکثر تذکرہ میری زبان سے سنتی رہتی ہیں۔ الٰہ آباد میں میرا چھوٹا بھائی اسحاق رہتا ہے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ تم کو اسی مکان میں اُتاروں لیکن اطمینان نہیں کہ تمھاری مرضی کے موافق تم کو آرام مل سکے گا۔ دریا قطرہ میں نہیں سما سکتا، تاہم فوراً مجھ کو مطلع کرو کہ کیا کوئی خاص بندوبست کیا ہے یا گورنمنٹ کی مہمان ہوگی اور نمائش میں قیام کروگی۔ بہرحال میرے ملنے کو خود تشریف لاؤ گی تو بہتر ورنہ میں خود آؤں گا۔ پتہ دے دینا وہاں کے اسلامی گرل اسکول بھی دیکھنا جس کے سکریٹری سیّد کرامت حسین ہیں۔ میں آج کل بہت پژمردہ رہتا ہوں، طبیعت اچھی نہیں، تفریح بھی نہیں کرسکتا۔ اس ویرانہ میں سال پورا ہوگیا۔ الٰہ آباد کی نمائش نے قلمی یادگاروں پر میرا لیکچر مقرر کیا ہے لیکن توقع نہیں کہ میں تیار کرسکوں۔ اپنی تصویر بھیج دو۔[۶]

شبلی، 13 اکتوبر 1910ء''

یہ وہ خط ہے جس سے شیخ محمد اکرام شبلی کے تصور کو انگڑائی لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ''مردہ خیالات'' سے فوراً ان کا ذہن منتقل ہوتا ہے کہ شبلی عطیہ سے نکاحِ ثالث کا ارادہ رکھتے تھے۔ شہاب الدین دسنوی ان جملوں کی بہت اچھی توجیہ کرتے ہیں کہ مردہ خیالات سے مراد وہی خیالات ہیں جن کے تحت شبلی عطیہ کو ایک اچھی مقرر اور خطیب دیکھنا چاہتے تھے۔ شیخ اکرام کو نہ جانے کیسے اس بات کا علم ہوگیا کہ ان کا دل ایسا ٹوٹا کہ پھر جڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ شیخ صاحب نے نہ جانے کیسے جان لیا کہ عطیہ نے تصویر نہیں بھیجی۔ انھیں یہ نہیں پتہ چلا کہ تصویر جس تحکمانہ لہجے میں طلب کی گئی ہے اس کا مقصد کیا تھا؟

عطیہ میں بے پناہ صلاحیت تھی۔ وہ اردو، فارسی، انگریزی، فرنچ، مصوری، نقشہ کشی، پالٹکس اور قوتِ تحریر میں ممتاز تھیں۔ ایسی صلاحیتوں کی مالک مسلمان خاتون کی عزت نہ صرف شبلی بلکہ دوسرا دانشور طبقہ بھی کرتا تھا۔ مسلمان عورتوں میں ان کا اہم مقام تھا جس کی وجہ سے لوگ ان کی جانب متوجہ ہوتے تھے۔ شبلی عطیہ کی ذہنی صلاحیتوں سے کام لینا چاہتے تھے۔ یہی وہ پہلو ہے، شبلی جس کے گنہگار ہیں۔ ان پر عشق و محبت، رشتۂ ازدواج اور نرگسیت کے رنگ کو تیز کرکے پیش کیا گیا اور انھیں مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شبلی پر الزام لگانے والوں میں وحید قریشی کا بھی نام اہم ہے۔ انھوں نے شبلی اور عطیہ کے تعلقات کو مکمل معاشقہ کی نظر سے دیکھا ہے۔ چنانچہ وہ بہت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں:

''(1905 میں شبلی کی دوسری بیوی فوت ہوگئیں) اس کے بعد ابوالکلام اور عطیہ بیگم سے بیک

وقت محبت کا آغاز ہوتا ہے... مولانا کا مزاج ان دنوں بڑا رومانی تھا... چندے کی خاطر اور بعض دوسرے کاموں کے لیے مولانا کو اب بمبئی بھی جانا پڑتا تھا۔ بمبئی اور اس کی رونقیں اکثر مولانا کو گرمیوں میں وہاں کھینچ لے جاتیں۔''[۷]

مولوی عبدالحق، شیخ محمد اکرام اور وحید قریشی نے شبلی کی جو تصویر پیش کی ہے حقیقت میں انھوں نے مولانا کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے اور صرف ایک طرفہ فیصلہ سنایا ہے اور مولانا کی ذات کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر اخلاق نے بالکل درست کہا ہے:

''عشق کسی کی میراث نہیں۔ حافظ ہوں یا خیام، غالب ہوں یا شبلی، ہر ایک کو اپنے ذوق وشوق اور جمالیاتی حسن کو اجاگر کرنے کا پورا حق حاصل تھا۔ یہ ذاتی، طبعی اور جبلّی چیزیں ہر ایک میں یکساں نہیں پائی جاتیں۔ ان کا تعلق جنس سے نہیں بلکہ فن اور تشکیل سے ہوتا ہے۔ شبلی ایک عظیم فن کار تھے... عشقِ خدا اور عشقِ رسول سے نہ کسی کو انکار ہوسکتا ہے نہ عشقِ بتاں کو روکا جاسکتا ہے۔''

◂◂ ● ▸▸

Associate Professor,Departement of Urdu,Zakir Husain Delhi ollege,
Jawaharlal Nehru Marg,New Delhi-110002
Mobile No. 8368932800

حواشی:

۱۔ (ماہنامہ) 'ادیب' شبلی نمبر، ص 273، علی گڑھ، 1960۔
۲۔ محمد امین زبیری، خطوطِ شبلی، ص 2، بھوپال۔
۳۔ ایضاً، مکتوب 15 جولائی 1909۔
۴۔ سیّد شہاب الدین دسنوی، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، ص 68، دہلی، 1987۔
۵۔ شیخ محمد اکرام، یادگارِ شبلی، ص 342، لاہور، 1971۔
۶۔ محمد امین زبیری، خطوطِ شبلی، ص 48، بھوپال۔
۷۔ وحید قریشی، ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ، ص 36-35، لاہور۔
۸۔ (سہ ماہی) فکر ونظر، شبلی نمبر، ص 97، علی گڑھ، 1993۔

● مضمون
● ڈاکٹر صالحہ صدیقی

طنز ومزاح کی تاریخ میں خواتین قلم کاروں کی خدمات

ہنسنا ہنسانا انسانی نفسیات اور اس کی فطرت میں شامل عمل ہے۔جس کا جنس سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔عورت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔مزاحیہ ادب (شاعری اور نثر) کی تخلیق بھی مرد یا عورت کسی ایک جنس سے مختص نہیں، جہاں تک بات اس صنف سخن کی ہے تو اردو ادب میں طنز ومزاح کو عموما یکساں معنوں میں ایک ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ طنز ومزاح میں فرق ہے۔دونوں کی اپنی حدیں ہیں، لیکن اس کے باوجود اکثر ایک دوسرے کے متوازی بھی چل رہے ہوتے ہے اور بعض اوقات تو ان کی سرحدیں ایک دوسرے سے ایسے مل جاتی ہیں کہ ان کو الگ کرنا دشوار ہو جاتا ہے، طنز سے مراد طعنہ، ٹھٹھہ، تمسخر یا رمز کے ساتھ بات کرنا ہے، جب کہ مزاح سے خواش طبعی، مذاق یا ظرافت مراد لیا جاتا ہے۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ایسی تحریریں جو ہنسنے پر مجبور کرے لیکن اس تحریر میں تنقید کو مزاح کا جامہ پہنا دیا جائے تو اسے طنز ومزاح کہتے ہیں۔یہ اردو کی ایک مقبول صنف لطیفہ ہے۔جس میں ہنسی مذاق کے پیرائے میں سماج ومعاشرے کی حقیقتوں کو فاش کیا جاتا ہے۔

اردو کی اس اہم صنف میں خواتین نے بھی طبع آزمائی کی ہیں۔اردو ادب میں طنز ومزاح کی تاریخ کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ یوں تو بیسویں صدی سے قبل خواتین کی اس قسم کی تحریریں نظر نہیں آتیں البتہ بیسویں صدی میں جب خواتین میں لکھنے پڑھنے کا عمل بڑھا، ان میں لکھنے کا رجحان فروغ پانے لگا تو انہوں نے مزاحیہ ادب کی طرف بھی توجہ کیں۔جس کے سبب آزادی کے بعد اس عمل میں اضافہ ہوا اور کئی خواتین نے مزاح نگاری کو بھی اپنایا اور اس میں طبع آزمائی کی۔خواتین کی مزاحیہ تحریریں شاعری کے علاوہ نثر میں کئی اصناف میں جزوی یا کلی طور پر مزاح پیش کر کے لکھا گیا ہیں۔جن میں مزاحیہ مضامین، انشائیے، مزاحیہ افسانے، ڈرامے،

ناول، کالم، ادب الاطفال، سفر نامہ، رپورتاژ، خطوط، خاکے وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ان تحاریر کو یا تو پورے یا کچھ مزاحیہ عناصر استعمال کر کے پیش کیا گیا ہے۔کچھ خواتین نے تو خالص مزاحیہ ادب کو ہی اپنایا ہے۔جیسے شفیقہ فرحت اور کچھ نے دیگر تحریروں کے ساتھ اس صنف کو اپنایا جب کہ کچھ نے اپنی تحریروں میں مزاح کو داخل کیا ۔ان میں سے چند اہم خواتین کی طنز ومزاح نگاری کی خدمات کا جائزہ یہاں پیش کیا جاتا ہیں۔

آصف جہاں۔مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ کی بھانجی تھی۔وہ بھی اس میدان میں سیاحت کا شوق رکھتی تھی۔انہوں نے مختلف موضوعات پر جو مضامین بھی لکھے ہیں۔ان کا ایک ''مجموعہ گل خنداں'' حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔اس کے مضامین کے موضوعات گھریلو واقعات ہیں۔جس کے اظہار کے لئے افسانہ کی تکنیک استعمال نہ کرتے ہوئے مضمون نویسی کا رنگ دیا گیا ہے۔اسے مزاح کی دنیا میں خواتین کے ابتدائی نمونے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔معیار کے لحاظ سے یہ بلند پایہ تصنیف نہیں کہی جاسکتی۔لیکن طنز و مزاحیہ ادب میں خواتین کی کاوشوں کے ابتدائی نقوش ہونے کے باعث اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

انیس قدوائی۔مشہور سیاسی رہنما رفیع احمد قدوائی کی بھاوج اور شفیع احمد قدوائی کی بیوی تھی۔اگر چہ اپنی سماجی فلاحی سرگرمیوں کے باعث انہیں لکھنے فرصت نہیں ملتی تھی لیکن اس کے باوجود بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی۔وہ ہلکے پھلکے خاکے، مضامین، مزاحیہ انداز میں لکھتی تھی۔ان کے خاکوں کا مجموعہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔جس میں ان کی مزاحیہ تحریریں 'کیا مولانا آزاد کبھی بچے تھے'، 'حسن مسرت ہے یا غم'، 'غالب گپ شپ'، 'رسوائیاں'، 'آدھ گھنٹے'، 'بزم ادب میں شوہروں کی قسمیں'، 'یہ مرد' شامل ہیں۔انیس قدوائی کو طنز ومزاح اور انشائیہ سے دلچسپی اپنے والد ولایت علی بمبوق سے ورثہ میں ملی تھی۔جو اردو کے مشہور مزاح نگار وانشائیہ نگار ادیب تھے۔انیس قدوائی نے اپنے انشائیے نہایت شگفتہ پر لطف زبان میں لطیف انداز میں طنز ومزاح کی چاشنی میں ڈوبو کر لکھے ہیں۔زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کا انہیں یہی راستہ نظر آتا ہے کہ کسی پر ہنسو، اپنے آپ پر ہنسو اور دلی سکون حاصل کرو۔کیا مولانا آزاد بچے تھے۔میں انہوں نے اپنے خیالات کی اڑان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا اس میں ان کا مزاح عروج پر ہے۔حسن مسرت یا غم یہ مضمون بھی وسعت تخیل کی مثال ہے۔مصنفہ کے ذہن میں جو خیالات آئے جس جس طرح سے انہوں نے دوسروں کو دیکھا یا خود محسوس کیا اور خوش وغم کے جو تصورات ان کے ذہن میں ابھرے اس کا پر لطف بیان اس انشائیہ

میں دیکھنے کو ملتا ہے۔اسی طرح غالبؔ غپ شپ بھی ان کے تخیل کی عمدہ مثال ہے۔غالب کی ذات کو مرکز بنا کر انہوں نے عجیب وغریب انبساط افزا خیالات پیش کئے۔غالبؔ کے اشعار کا انطباق دور حاضر کے واقعات پر ایک باغ و بہار کیفیت پیدا کرتا ہے۔رسوائیاں میں رسوائیوں کی مختلف اقسام اور ان سے نبرد آزمائیوں کا بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔

''آدھ گھنٹے بزم ادب میں''۔بیانیہ انشائیہ ہے۔کیا پیش آسکتا ہے اس کا مرکزی خیال ہے۔ بزم ادبیات کو بوالعجبیاں اس کا موضوع ہیں۔شوہروں کی قسمیں اس میں انیس قدوائی نے شوہروں کی ایسی ایسی قسمیں گنوائیں اور ان سے ایسی ایسی صفات ملحق کردیں کہ شاید شیطان بھی انہیں پیش نہ کرسکے۔یہ مرد بھی اس قسم کا انشائیہ ہے۔سال صدی کیوں نہیں۔یہ انشائیہ آج کل دہلی کے خواتین نمبر میں شائع ہوا تھا یہ بھی اک پر لطف تحریر ہے۔اس طرح انیس قدوائی نے بہت کم لکھا لیکن جو بھی طنز ومزاح کے پیرائے میں بیان کیا اس سے سماج کی حقیقتوں کا آئینہ پیش کردیا۔

اس فہرست میں ایک اہم نام انیس سلطانہ کا ہے جن کا تعلق بھوپال سے ہے یہ وہاں کی معروف ادیبہ ہیں۔طنز ومزاح سے ان کی فطری دلچسپی تھی۔انھوں نے اس موضوع پر ایک مقالہ بھی لکھا۔(حیدرآباد میں طنز ومزاح کی نشو ونما) جو شائع ہو چکا ہے۔ان کی مزاحیہ تحریریں رسالہ شگوفہ وغیرہ میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتی رہتی تھی۔ان کی تحریریں زیادہ تر انشائیہ کی شکل میں ملتی ہے۔(۱)''ہر فن مولا'' (شگوفہ سالنامہ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۳۰۷) انیس سطانہ کا پر لطف انشائیہ ہے۔اس میں ان لوگوں پر طنز ہے جو ہوتے تو کچھ بھی نہیں۔لیکن دعویٰ ہر فن مولا ہونے کا کرتے ہیں، ہر معاملہ میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔یہ دراصل ایک ایسی خاتون کا بیان ہے جو اس صفت کی موصوف تھیں۔ان کی لن ترانیاں سن سن کر مصنفہ کا دماغ بگڑ سا جاتا ہے اور اس سے جو ماحول بنتا ہے کیا کیا حالات پیدا ہوتے ہیں اسی کا بیان ہیں۔ایسی عورتیں معاشرہ میں اکثر وبیشتر نظر آجاتی ہیں۔جو ڈینگیں مارنے میں مہارت رکھتی ہیں، ان کا ایک اور طنز ومزاح (۲)''اے کاش'' کے عنوان سے ہے جو کتاب نما دہلی۔اکتوبر ۱۹۸۸ء ص ۵۷ میں شائع ہوا۔اس میں غالبؔ کے اس مصرعے ہزاروں خواہشیں ں ایسی کو مرکزی خیال بنایا گیا ہے۔انسان لامحدود تمناؤں آرزؤں خواہشوں کا مرکز ہے اور انسان ہمیشہ یہی سوچتا رہتا ہے، خواہش کرتا رہتا ہے کہ اے کاش ایسا ہو۔اس کی خواہشیں لامحدود ہے، نہ ختم ہونے والی ہے اور ساری زندگی ایک کے بعد دیگر خواہشات میں الجھا رہتا ہے، یہ انسانی حقیقت کے اسی پہلو کی نمائندگی کرتا ہے۔(۳)''اردو رزمیہ کی تلاش'' (شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۰ء ص ۸۹) یہ

افسانوی انداز کا انشائیہ ہے۔اس میں ان شاعروں پر طنز کیا گیا ہے جو ادبی دنیا میں ہنگامے کھڑے کرتے رہتے ہیں۔اس انشائیہ کے مطابق رزمیہ شاعری کو دنیا کی بہترین شاعری کہا گیا ہے۔اس انشائیہ میں مرزا خواجہ بیگ خاں دل میں ٹھان لیتا ہے کہ باپ دادا رہے ہوں گے اصل ترکستانی، وہ خود تو ہندستانی ہیں اور اردو ان کی مادری زبان ہے۔فارسی گو کہ پدری زبان تھی۔لیکن زبانوں کو پدری ہونے پر کبھی فخر نہ ہوسکا۔ اس لئے اردو شاعری کو دنیا کی بہترین شاعری کے مقابلے پر لاکر کھڑا کردینا ان کا فرض ہے۔اس عبارت سے فکاہیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر مختلف واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔رزمیہ تخلیق کرنے کے لئے اردو کے مشہور مراثی اور رزمیہ کتابوں جیسے بلّی نامہ وغیرہ کی فراہمی اور مختلف شاعروں کی سرگرمیاں اور ادبی نوک جھونک، اشعار، ان کی تحریک مختلف واقعات وحالات اس میں بیان ہوتے ہیں۔اس طرح پورا انشائیہ ایک خاص ماحول کے اردگرد گھومتا ہے اور بڑی خوبصورتی سے شاعروں پر طنز کیا گیا ہیں۔ان کا ایک اور طنز مزاح (۴)''خموشی آرزو دارم''۔(شگوفہ، اگست ۱۹۹۱ء ص ۳۹) میں مہنگائی، سیاست، مختلف مشکلات زندگی، الیکشن بازی، ریڈیو پر عجیب قسم کے پروگرام، وغیرہ کئی امور ومسائل کو پیش کیا گیا ہیں۔یہ بھی اہم انشائیہ ہے جو سماج کی حقیقتوں کو مزاحیہ انداز میں منظر عام پر لاتا ہیں۔(۵) چھ دہائیوں کے بعد (شگوفہ، ستمبر ۲۰۰۳ء ص ۲۳) اس میں آزادی کے بعد مختلف حالات کی تبدیلیوں کا بیان مثلاً مہنگائی، آلودگی، ٹی وی پروگرام، ان میں اشتہارات، معاشرتی تبدیلیاں وغیرہ پر پر طنز کیا گیا ہیں۔یہ بھی سماج کی حقیقتوں کا پردہ فاش کرتا ہوا دلچسپ طنز ومزاح ہے، جس کا زبان و بیان انتہائی دلچسپ اور پر لطف ہے۔(۶) یہ تماشا نہ ہوا۔(شگوفہ، جنوری ۲۰۰۴ء ص ۵۹) دوسروں کے گھروں میں وقت بے وقت بال بچوں کے ساتھ جا کر ہڑبونگ مچانے والے لوگوں پر طنز ہے۔کیسے کیسے حالات پیش آتے ہیں اور لوگوں کی زندگی میں خلل ڈالا جاتا ہے۔اس کا پر لطف بیان، واقعات کی شکل میں ہے۔یہ ایسا مسئلہ ہے گو ہر گھر کی کہانی ہے روزمرہ کی زندگی کے اس واقعہ کو مصنفہ نے بڑے ہی مزاحیہ انداز میں لکھا ہے، اس کا مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کس قدر باریک بینی سے چھوٹے چھوٹے واقعات پر گہری نظر رکھتی ہیں ان کا انداز وبیان قابل دید ہیں۔(۷) جو خط لکھوں تو۔(شگوفہ، ستمبر ۲۰۰۴ء ص ۲۵) ایک صفحہ پر خط نویسی پر انشائیہ ہے۔(۸) یکے از یاران مہربان (بیگم شاہ جہاں)۔(شگوفہ، دسمبر ۲۰۰۴ء ص ۴۳) ایک خاکہ ہے۔اس میں بھوپال کی حکمراں نواب شاہ جہاں بیگم کا تذکرہ ہے۔یہ بھی انتہائی اہم طنز ومزاح ہے، ان تمام تصنیفات میں مصنفہ کی باریک بینی، مشاہدہ، انداز بیان، زبان، لفظوں کا انتخاب وترتیب اور طنز ومزاح پر ان کی گرفت کا قائل ہونا پڑتا ہیں۔

ثریا صولت حسین کا قلمی نام ثریا صولت حسین اور اصل نام ثریا بانو ہے۔ بنیادی طور پر افسانہ نویس وشاعرہ ہے۔لیکن انہوں نے کچھ مزاحیہ خاکے اور انشائیے بھی لکھے ہیں۔ان کے مجموعہ افسانہ مدوجزر میں کچھ مزاحیہ تحریریں شامل ہیں۔(۱)''مدوجزر'' (مصنفہ، ناگپور۔۱۹۸۶ء) کے بعد ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ (۲)''شیشہ وسنگ'' شائع ہوا۔جس میں ان کی پرانی نئی تحریریں یکجا ہیں۔اسمیں بھی ان کی مزاحیہ تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔(مصنفہ، بمبئی ۲۰۱۰ء) (۳)''نیند پری''، ایک انشائیہ ہے۔جس میں ثریا نے نیند اور اس سے وابستہ تصورات وحالات وغیرہ کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔مختلف افراد کی نیند، بچوں کی بڑوں کی نیند، ذمہ داروں کی نیند، مجبور انسانوں کی نیند، قوموں کی نیند کے بارے میں خیالات پیش کئے ہیں۔اس میں نیند کو بنیاد بنا کر سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔اسی طرح (۴)''رنگ بہار ''میں بہار موضوع ہے۔بہار سے وابستہ تصورات وخیالات، واقعات وغیرہ کو انشائیہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔اسی طرح (۵)''یورآنز'' ان ایک خاکہ ہے۔جس میں ثریا نے اپنے شریک حیات جسٹس قاضی صولت حسین کا خاکہ پرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔ان تمام تصانیف سے ان کی طنز مزاح نگاری کا قائل ہونا پڑتا ہے، ان کا انداز بیان پراثر اور شگفتہ ہے۔

جہاں بانو نقوی (حیدرآباد) کا شمار عہد حاضر کی معتبر خواتین ادیبہ میں ہوتا ہے۔ان کا اصل میدان تحقیق وتنقید ہے۔لیکن انہوں نے کچھ مزاحیہ تحریریں بھی لکھی ہیں۔ان کی مزاح نگاری کے انشائیوں میں نمایاں ہوئی ہے۔حالانکہ ان کے انشائیہ تحریروں میں مزاح سے زیادہ مضمون نگاری کا انداز ملتا ہے۔ان کا ایک انشائیہ ''یاد'' (مطبوعہ ایوان اردو حیدرآباد، سالنامہ ۱۹۴۸ء) میں بطور مثال پیش کیا ہے۔یہ ایک ادبی تحریر ہے۔جس میں یاد سے متعلق یادوں اور تصورات کو شگفتہ پرلطف تحریر کے رشتے میں پرودیا گیا ہے۔اسمیں تصورات خیالات، تخیل کی کی پرواز کے عناصر ہیں۔ان کے انشائیے بھی خواتین طنز ومزاح کی تاریخ میں اہم اضافہ ہیں۔

ڈاکٹر حبیب ضیاء کی مزاحیہ تحریریں مختلف جرائد خصوصاً رسالہ شگوفہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ان کے مزاحیہ مضامین انشائیوں وغیرہ کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ان کا پہلا مجموعہ ''گویم مشکل'' کافی مقبول ہوا تھا۔یہ پندرہ مضامین پر مشتمل ہیں۔اس میں گھریلو زندگی، اور مختلف سماجی مسائل پر اظہار خیال ملتا ہے۔حبیب ضیا خالص مزاح کی قائل نہیں۔طنز کے نشتر بھی چلاتی ہیں۔ان کے اسلوب میں نسوانیت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ان کے کچھ مضامین بے ساختہ داد تحسین وصول کر لیتے ہیں۔جن میں (۱) آئی بلا کو ٹال تو۔(شگوفہ سالنامہ جنوری ۱۹۷۹ء ص ۴۵) اس انشائیہ میں انہوں نے مہمان کو موضوع بنایا ہے۔بن بلائے

یا بلائے مہمانوں سے کس طرح نپٹا جائے اس کی ترکیب حبیب ضیا نے بتائی ہیں۔بیرونی ممالک سے آنے والے مہمان، سسرالی مہمان، میکے کے مہمان، اور طرح طرح کے مہمانوں کا پرلطف انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔آخر میں وہ کہتی ہیں۔

''اس کے علاوہ مہمان سے قرض مانگنا، اس کے بچوں سے پانی بھرانا، شریک زندگی سے خواہ مخواہ جھگڑا مول لینا۔یہی مہمان بھگانے کے طریقوں میں چند موثر طریقے ہیں۔''(ص ۴۷)

بن بلائے مہمانوں پر لکھا یہ دلچسپ انشائیہ انتہائی پرلطف ہے۔(۲) ہوائی جہاز کا سفر (شگوفہ، سونیر، نومبر ۱۹۸۹ء۔ص ۵۱) جیسا کہ نام سے ہی واضح ہو جاتا ہے اس مزاحیہ مضمون میں حبیب ضیاء نے ہوائی جہاز کے سفر کو مرکز مزاح بنایا ہے۔ایک عام مسافر کو ہوائی سفر میں کیا کیا حالات اور مصائب و بوالعجبوں سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ کس طرح گھبراتا اور عجیب عجیب حرکتیں کرتا ہے۔اس کا پرلطف بیان اس انشائیہ میں کیا گیا ہے۔اسی طرح (۳) عمر، استدلال اور انتقال (شگوفہ سونیر، نومبر ۱۹۹۹ء۔ص ۳۱) میں عمر موضوع ہے۔اس میں خواتین کے اپنی عمر چھپانے کے رویے کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔خواتین کس کس طرح اپنی عمر کم بتاتی ہیں اس کا پرلطف بیان اس تحریر میں دیکھنے کو ملتا ہے۔(۴) شادی خانہ آبادی۔(شگوفہ اکتوبر ۲۰۰۰ء۔ص ۹) بھی پرلطف انشائیہ ہے۔اس کا موضوع شادی ہے۔جو ایک عام سماجی عمل ہے۔اس کے بیان میں مصنفہ نے جو جو رنگ آمیزیاں کی ہیں وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔لڑکے لڑکی کے لئے رشتے کی تلاش، مناسب جوڑا پسند کرنے کا عمل، شادی کی تیاریاں، مشکلات حالات سبھی کا دلچسپ بیان ملتا ہے۔شادی کی تقریب میں جو جو خرافات ہوتے ہیں۔ہر دنگ مچتا ہے اس کا بیان بھی پرلطف ہے۔یہ انشائیہ شادی کی تیاریوں سے لے کر ودائی تک ہونے والی تمام کارکردگیوں، مسائل اور پیش آنے والے تمام واقعات کا دلچسپ بیان اور مزاح کے پیرائے میں طنز بھی ہیں۔اس میں مصنفہ کی قابلیت اور ہنرمندی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔(۵) حیدرآباد کی سڑکیں۔(شگوفہ سالنامہ ۲۰۰۴ء ص ۲۷) بھی ایک پرلطف مضمون ہے۔اسمیں حیدرآباد کی سڑکیں نشانہ مزاح ہیں۔ڈاکٹر حبیب ضیاء کے مضامین کا ایک مجموعہ انیس بیس اور ایک جومژگاں اٹھائیے بھی شائع ہو چکا ہے۔اس میں ان کے سترہ مضامین ہیں۔جلسے، ادھ جل گگری چھلکنا جائے، حیدرآباد تہذیب، جومژگاں اٹھائیے، بچہ باہر گیا ہے وغیرہ انشائیے بھی خوب ہیں۔ان کے دیگر مضامین میں، (۶) بدیسی مال (شگوفہ، سالنامہ، جنوری ۱۹۸۲ء) اور (۷) جلسے (شگوفہ، اپریل ۱۹۸۳ء) بھی قابل ذکر ہیں۔مصنفہ نے بہترین انشائیے قلم بند کیے، جو طنز ومزاح کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔

حیدرآباد کی پروفیسر رشید موسوی بھی مزاح نگار ادیبہ ہیں۔ان کے ہلکے پھلکے مضامین وانشائیے

شگوفہ میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ان کا ایک مجموعہ ’’کاغذی پیرہن‘‘ شائع ہوا ہے جس میں ان کے مختلف موضوعات پر مزاحیہ تحریریں، مضامین، انشائیے شامل ہیں۔اس میں کل ۲۰ مضامین شامل ہیں۔

رشیدہ قاضی بمبئی کی رہنے والی مزاح نگار ادیبہ ہے بمبئی کی ایک درس گاہ میں پرنسپل کے عہدے پر فائز رہ چکی ہیں۔انہوں نے مزاح نگاری کا میدان پسند کیا۔ پہلے وہ رشیدہ مُلّا کے نام سے لکھا کرتی تھی۔ شادی کے بعد انہوں نے اپنا نام رشیدہ قاضی رکھ لیا۔ان کی مزاحیہ تحریریں مختلف رسائل کی زینت بنیں پھر ان کے انشائیوں کا ایک مجموعہ ’’پرواز‘‘، کوکن اردو رائٹرز گلڈ کینیا (۱۹۸۸ء افریقہ نے شائع کیا۔اسے کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔رشیدہ قاضی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بمبئی جیسے شہر کی ایک تعلیمی شخصیت ہیں۔کھلے دل و دماغ کی مالک ہیں۔ان کا مشاہدہ گہرا اور ادب پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔(۱)) ’’پرواز‘‘ رشیدہ قاضی کی یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔اس میں ان کے انشائیوں میں حقیقت نگاری، عصری حیثیت، سماجی شعور، خیالات کی اڑان، تبسم زیرلب، طنز کی نشتریت، زبان واسلوب کی دلکش خصوصیات موجود ہیں۔اسمیں گائے، سرگذشت آٹوگراف بک کی، ثریا سے زمین پر، سفر یاد آیا، سگ رہ بری بلا ہیں۔قصہ قاضی کا، پیام تعزیت، پلیٹ سے پیٹ تک، بارے بندر کا کچھ بیاں ہوجائے، کرشمہ سازیاں الیکشن کی، سورج نے زباں کھولی، کوّے، افواہ گرم ہے۔ بجیا نے بلی پالی، مسز بھروچہ (خاکہ) شامل ہیں۔ یوسف ناظم نے اس پر لطف دیباچہ لکھا ہے۔رشیدہ کے انشائیوں میں جا بجا افسانویت کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔اظہار خیالات کرتے کرتے کوئی واقعہ بیان کر جاتی ہیں اور اپنے خیال کی وضاحت کرتی ہیں۔کہیں کہیں پورا بیان ہی قصہ کی شکل میں پیش ہوتا ہے۔(۲) ’’گائے‘‘ میں انہوں نے اس بے زبان کو نشانہء طنز و مزاح بنایا ہے۔جس قدر خیالات ومحاورات و باتیں اس جانور سے متعلق ہوسکتی ہیں اس انشائیہ میں ان کو بیان کیا گیا ہے۔اسی طرح (۳) ’’سگِ رہ بلا ہے‘‘ میں کتوں کا اور ’’کوّے‘‘ میں کوّے کا اور ’’بارے بندر کا کچھ بیان‘‘ میں بندر کا ذکر ہے۔قصہ قاضی کا میں قاضی مشق مزاح ہے۔ان کے بیانات میں مشگافیاں پڑھتے ہی بنتی ہیں۔(۴) ’’سورج نے زباں کھولی‘‘ ایک سائنسی انشائیہ ہے۔افواہ گرم ہے۔کرشمہ زباں الیکشن کی، سماجی بوالعجبیوں پر مبنی ہے۔اس طرح یہ تمام انشائیے انتہائی دلچسپ ہے جس میں مصنفہ نے بڑی ہنرمندی سے ان موضوعات کو بیان کیا ہیں۔

سرور جمال۔مشہور مزاح نگار احمد جمال کی اہلیہ ہے، محترمہ سرور جمال خود بھی ایک مزاح نگار ہیں۔احمد جمال پاشا کا شمار دور حاضر کے اچھے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے ذکر کے بغیر اردو طنز و مزاح کا کوئی جائزہ مکمل نہیں کہا جاسکتا۔جمال ہم نشیں ڈرمن اثر کرو کے مصداق ان کی محبت کے اثرات ان

کی بیگم سرور جمال میں آنے ناگزیر تھے۔ان کی عربیہ مضامیں رسائل میں شائع ہوتے رہے اور دو مجموعے مشق ستم اور مفت کے مشورے شائع بھی ہوچکے ہیں۔احمد جمال پاشا نے اپنی بیگم کو ترقی پسند ظرافت نگاری سے وابستہ بتایا ہے۔حالانکہ کئی نقادوں کے نزدیک طنز و مزاح وہ صنف ادب ہے جسے کسی ازم سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا جیسے کہ ہنسی کو نہ کسی قوم ملک زبان ادب ازم سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔بہرحال سرور جمال کے دونوں مجموعے ان کی فکر وفن طنز و مزاح کے نمایندہ ہیں۔مفت کے مشورے، حرفوں کے بنے، مانگے کی مصیبت، ہمارا شہر ترقی کی راہ پر، وقت کی مار، ایسا بھی تو ہوتا ہے، ملاوٹ کی مصیبت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ان کے یہاں طنز کا عنصر کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کا کینوس گھریلو زندگی اور گردوپیش کی دنیا تک محدود ہے لیکن انداز بیان کی شگفتگی اور روانی قاری کو غور وفکر پر نہ سہی مسکرانے پر ضرور مجبور کردیتی ہے۔مثلاً مفت کے مشورے میں ’’ڈاکٹر پوچھتا ہے کیا آپ کے یہاں گائے بھینس یا بکری بلی ہے۔عورت بولی ڈاکٹر صاحب میں ایک بڑی عمارت کی پانچویں منزل کے ایسے چھوٹے سے کمرے میں رہتی ہوں جسے ڈربہ کہا جائے تو مناسب ہے وہ گائے، بھینس تو کجا مچھر مکھی تک پالنے کی گنجائش نہیں۔‘‘

اس طرح کے طنزیہ اسلوب میں مزاح کے لبادے میں سماجی حقیقتوں کی عکاسی ان کی تحریروں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہیں۔

رشید احمد صدیقی ہمارے مزاحیہ ادب کی بڑی اہم شخصیت گزری ہے۔ان کا اثر ان کی بیٹی سلمیٰ صدیقی میں آنا حیرت کی بات نہیں۔سلمیٰ صدیقی نے بہت کم لکھا ہے جو لکھا غنیمت ہے۔مزاحیہ تحریروں میں ان کی چند انشائیے، خاکے اور ایک چھوٹا سا سوانحی خاکہ نما ناول، سکندر نام ان کی اس ادب میں یادگار تحریریں ہیں۔(۱) ’’سلیقہ بھی ایک کلا ہے‘‘ (دور حیات بمبئی۔آزادی نمبر ۱۹۶۴ء۔ص ۲۳) ان کی شگفتہ تحریر کی نمایندگی کرتا ہے۔اس میں انہوں نے سلیقہ کو ایک کلا (فن) بھی بتایا اور ایک روگ بھی کہ جو انسان اسمیں مبتلا ہوجاتا ہے عمر بھر اس میں مبتلا رہتا ہے۔فلمی ہیروئن سے انٹرویو میں انہوں نے انٹرویو لینے والوں کی بوالعجبیاں بتائی ہیں۔ان کا قرۃ العین کا خاکہ بھی مزاح لئے ہوئے ہے۔(۲) سکندر نامہ۔اسٹار پبلی کیشنز دہلی سلمیٰ کی مزاح نگاری کا شاہکار ہے۔یہ دراصل سلمیٰ صدیقی کے ایک گھریلو ملازم سکندر کے کردار پر مبنی ہے۔وہ نہایت سادہ لوح ہے، کنوارا ہے۔لوگ اسے شادی کے نام پر بے وقوف بناتے ہیں۔اس کی حرکات سکنات گفتگو، الفاظ تلفظ رویے خیالات سبھی عجیب وغریب ہیں۔وہ مغل اعظم کو مرغِ اعظم کہتا ہے۔اچھے خاصے ناموں کا خون کردیتا ہے۔واقعات کو غلط کردیتا ہے اس کی سائیکل پطرس کے افسانے کی سائیکل

کی طرح عجیب ہے وہ گائے کا شوقین ہے لیکن مصرعوں کو غلط سلط واقعات کر دیتا ہے۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ طوائفوں کو بھی نہیں۔ اس کی زبان تیکھی ہے۔ وہ اپنی سادہ لوحی سے پریشانیوں کا شکار بن جاتا ہے۔ لیکن وہ دنیا کے مشہور بدھوں کی طرح بڑی گہری باتیں بول جاتا ہے۔ سلمیٰ نے اس سوانحی خاکہ نما ناول میں طنز و مزاح کے ایسے رنگ بھرے ہیں کہ ہمارے ادب میں اس کی مثال مشکل سے ہی ملتی ہے۔ سلمیٰ کا ایک انشائیہ نور جہاں کا لوٹا بھی مزے دار تحریر ہے۔ اس طرح سلمیٰ نے بہت کم تصانیف سے ہی اپنی قلم کی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ ان کی تصانیف یقیناً خواتین طنز و مزاح میں اہم اضافہ ہے۔

حیدر آباد سے تعلق رکھنے والی رضیہ صدیقی کا ایک انشائیہ ''ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے'' (شگوفہ اکتوبر ۱۹۸۸ءص ۱۹) ایک پر لطف انشائیہ ہے۔ اس میں غالبؔ کے اشعار کو دور حاضر کے چند واقعات پر منطبق کر کے مزاح پیدا کیا ہے۔ مثلاً طالب علموں کی بے اطمینانی توڑ پھوڑ پر، الیکشن میں لیڈروں کی حرکات پر انہیں غالبؔ کا یہ شو یاد آتا۔ دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا۔ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ نہ ہوا۔ جامعہ عثمانیہ کے آرٹس کالج کی سیڑھیوں کے عین اوپر بلور پر عثمانیہ یونیورسٹی کا مونوگرام دیکھ کر یاد آتا ہے۔ دیکھے مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہوں۔ ایک لکچرار پی ایچ ڈی کے لئے بار بار گائڈ بدلتے ہیں تو یاد آتا ہے کہ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں وغیرہ کو بڑے پر کشش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کیہ انجم نئی دہلی کی رہنے والی ہیں ان کا انشائیہ ''بہروپیا'' ۔ (شگوفہ، جولائی ۱۸۸۱ءص ۲۹) ایسے لوگوں پر طنز ہے جو کچھ ہیں۔ لیکن ظاہر کچھ اور کرتے ہیں۔ ان میں سادھو سنیاسی رہنا، شاعر سبھی شامل ہیں۔

سعدیہ غوری (ریاض) ان کا انشائیہ ''کاک ٹیل'' (شگوفہ نومبر ۱۹۹۲ء) مختلف ادیبوں کی مزاحیہ تحریروں، کالموں خبروں لطائف وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس میں عبدالمجید سالک کا کالم افکار و حوادث ظریف لکھنوی کے اشعار، احمد ندیم قاسمی کا کالم حرف و حکایت وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر صادقہ ذکی نے بھی انشائیے، مزاحیہ انداز میں لکھے ہیں۔ ان کا ایک انشائیہ ''عمر رفتہ'' (کتاب نما دہلی، نومبر ۱۹۸۸ءص ۷۳) مزاح نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ مصنفہ نے عمر کو مرکز خیال بنا کر تخیلات کا تانا بانا بنا ہے۔ کاروان عمر دھیرے دھیرے اس طرح گزر جاتا ہے کی آہٹ بھی انسان کے کانوں تک نہیں پہنچتی اور نہ مسافر حیات کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی عمر کی کتنی منزلیں گزر گئی ہیں اور منزل گور کس قدر قریب ہے۔ اس انشائیہ میں مصنفہ ہلکے پھلکے انداز میں اظہار خیال کیا ہے لیکن انداز بیان پر لطف ہے۔

مشہور مصنفہ ناول و افسانہ نویس ڈاکٹر صغریٰ مہدی بھی اپنی مختلف النوع تحریروں میں مزاح سے

کام لیتی ہیں۔ انہوں نے اس کا زیادہ استعمال اپنے سفر ناموں میں کیا ہے۔ مشاہدات ابن بطوطی،، سیر کہ دنیا کی غافل، ذرا یہیں پڑوس سے اور دیگر مختصر سفر ناموں میں انہوں نے اس طنز و مزاح کا بھر پور استعمال کیا ہے۔ مشاہدات ابن بطوطی، یہ عنوان ہی مضحکہ خیز ہے۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ کی تانیث ابن بطوطی کے عنوان سے کر کے انہوں نے اپنے سفر نامہ کی نوعیت صاف ظاہر کر دی ہے۔ ان کے سفر ناموں کے مجموعہ سیر کر دنیا کی غافل میں، اور دوسری کتاب میخانوں کا پتہ میں انہوں نے جا بجا حالات کوائف واقعات، ماحول، مناظر، کردار، اعمال، افعال، گفتگو زبان و بیان سبھی میں مزاح کے عناصر داخل کر کے انہیں باغ و بہار بنا دیا ہے۔ اردو میں مزاحیہ سفر نامہ نگاری کے بہترین نمونے تو کیپٹن شفیق الرحمٰن اور ابن انشاء نے پیش کئے ہیں۔ صغریٰ مہدی نے بھی اس طرح کی باتیں اپنے سفر ناموں میں داخل کر کے انہیں پر لطف بنایا ہے۔ ان کی مزاح نگاری کی تعریف یوسف ناظم جیسے مزاح نگار نے بھی کی ہے۔ صغریٰ مہدی کی خدمات سے اردو طنز و مزاح کا دامن بلاشبہہ وسیع ہوا۔

صالحہ عابد حسین۔ ایک سنجیدہ ادیبہ تھیں لیکن ہر انسان کی طرح وہ بھی جس مزاح، اظہار سے بے گانہ نہیں تھیں۔ انہوں نے بھی کہیں کہیں مزاح کا استعمال اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ صالحہ عابد حسین نے ریڈیو پر نشر کرنے کے لئے جو ہلکے پھلکے انداز کے مضامین لکھے ان میں ان کی مزاح نگاری کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں۔ ان میں شماتت ہمسایہ ایک پر لطف تحریر ہے۔ جس میں ہمسایہ موضوع مزاح ہے۔

عصمت چغتائی اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی ہر تحریر چاہے مضمون ہو، انشائیہ ہو، افسانہ ہو، ڈرامہ ہو، مزاح کا رنگ نظر آتا ہیں۔ حالانکہ عصمت نے مزاح نگاری کو اپنا اسلوب نہیں بنایا، لیکن مزاح کے عناصر کو اپنی فکشن میں ضرور داخل کیا۔ لیکن ان کا زیادہ رجحان طنز کی طرف رہا۔ ان کی تحریروں میں طنز مزاح کے مقابلے میں زیادہ استعمال ہو رہے ہے۔ ان کی طنز نگاری کا ادب میں جا بجا ذکر ہوا ہے۔ عصمت چغتائی کی مزاح نگاری کے بارے میں مشہور مزاح نگار خاتون ڈاکٹر شفیقہ فرحت نے لکھا ہے کہ ''افسانے ناول اور ڈراموں میں طنز و مزاح'' کو انتہائی موثر اور خوبصورت انداز میں جگہ دینے والی مصنفاؤں میں پہلا اور اہم نام عصمت چغتائی کا ہے۔ ان کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اتر پردیش کا متوسط طبقہ، اور وہاں کا مسلم معاشرہ، بمبئی کی کارہ باری اور فلمی دنیا، حیدر آباد کا دیمک زدہ جاگیردارانہ نظام، کہیں گھٹن ہے کہیں خوف کہیں مریضانہ نفسیات، عصمت کی گہرائیوں تک اتر جانے والی نظر تھی۔ حالات اور کردار کو سمجھنے والی عقل اور سڑتے ہوئے زخموں پر نشتر لگانے والی ہمت اور بے نا کی۔ ان خصوصیات کی بنا پر ان کا افسانوی ادب طنز و مزاح کا بھی ایک

اہم حصّہ بن جاتا ہے۔ان کا شاہکار ناول ٹیڑھی لکیر،اس کی اچھی مثال ہے۔ناولٹ،معصومہ اور بزدل میں بھی یہ رنگ حاوی ہے۔اور لاتعداد افسانوں میں بھی انہوں نے طنز کے تیر چلائے ہیں۔چند اچھے مزاحیہ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔اور خالص طنزیہ مضامین بھی۔ڈراموں میں ہلچل اور دلہن کیسی ہے کو بہت شہرت ملی،اور مضامین میں ایک شوہر کی خاطر کو،عصمت چغتائی اپنی تحریر کو خود،''بلی کے پنجے کے کھرونچوں سے تشبیہ دیا کرتی تھیں''۔(اردو ادب کو خواتین کی دین۔اردو اکیڈیمی دہلی۔۱۹۹۴ء ص ۲۶)

مشہور ادیبہ،ناول نگار اور افسانہ نویس قرۃ العین حیدر نے خالص مزاحیہ تحریریں تو یادگار نہیں چھوڑیں البتہ ان کے ناولوں اور افسانوں میں مزاح کے عناصر جا بجا ملتے ہیں۔انہوں نے واقعات، کرداروں اور گفتگو میں ان کا استعمال کیا ہے۔ان کا مزاح بلند،ستھرا،نکھرا ہے۔''کار جہاں دراز ہے''میں کئی واقعات انہوں نے مزاحیہ انداز میں لکھے ہیں۔مثلاً جلد اول میں فصل پنجم میں نمبرے پر حکیم الامت اور جھوائی ٹولے کا نسخہ میں انہوں نے لکھا۔

''علامہ اقبال کے لکھنؤ آنے، وہاں ایک دعوت میں مرغن کھانا کھایا،تو ان میں ان کی طبعیت خراب ہوگئی۔علی محمد خاں راجہ محمود آباد نے ان کی زبردست دعوت کی، وہاں خوب ڈٹ کر شاعر مشرق نے لکھنؤ کا مرغن ماحضر تناول فرمایا،رات کے گیارہ بجے ہلٹن ہوٹل واپس آئے،اپنے پلنگ پر سو رہے۔رات کے ڈھائی بجے جوان کے نالہ ہائے نیم شبی کا وقت تھا،افلاک سے جواب آنے کے بجائے پیٹ میں اٹھا زور کا درد۔شدت کی مروڑ،سرہانے حکیم عبدالوالی کی دوا کا قدح رکھا ہوا تھا آپ اس کی چوگئی خوراک پی گئے۔''اس سے آگے وہ کہتی ہیں کہ علامہ کی طبعیت کافی خراب ہو جاتی ہے۔ان کا ڈاکٹری علاج ہوتا ہے۔طبعیت سنبھل جاتی ہے۔یہ بیان کافی مضحکہ خیز ہے۔اس طرح چوروں کا کلب میں بھی مزاحیہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ان کے کئی افسانوں میں بھی مزاح کی چنگاریاں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔

اردو طنز و مزاح میں بانو سرتاج نے بھی دست آزمائی کر نہ صرف خواتین کی مزاح نگاری بلکہ مجموعی اردو طنزیہ و مزاحیہ ادب میں ایک منفرد و بلند مقام حاصل کیا۔ان کی مزاحیہ تحریریں،مضامین،انشائیے، خاکے،افسانے،ڈرامے،مقتدر رسائل خصوصاً شگوفہ وغیرہ میں برابر شائع ہوئے۔ان کے مزاحیہ تحریروں کے دو مجموعے شائع ہوئے جو کافی پسند کئے گئے۔نقادانِ فن کی رائے ہے کہ قدرت نے بانو سرتاج کو مزاح کا فطری ملکہ عطا کیا تھا۔وہ اپنے افسانوں ڈراموں تحقیقی و تنقیدی تحریروں وغیرہ میں جس طرح سنجیدہ نظر آتی ہیں۔اس کے برعکس اپنی مزاحیہ تحریروں میں وہ زعفران زار کھلاتی نظر آتی ہیں۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر وہ اور

کچھ نہ لکھتی صرف مزاحیہ ادب ہی تخلیق کرتی تب بھی ان کا شمار اردو کی اہم ادبی شخصیتوں میں ہوتا۔بانو سرتاج جیسی مزاح نگار پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ان کی مزاحیہ تصنیف (۱) ترامنون ہوں۔(نرالی دنیا پبلی کیشنز دہلی،۲۰۰۴ء) ڈاکٹر بانو سرتاج کے ان مزاحیہ مضامین و انشائیوں کا مجموعہ ہے۔جو رسالہ شگوفہ وغیرہ میں سن ۲۰۰۰ء تک شائع ہوتے رہے۔اس مجموعہ میں درج ذیل تحریریں شامل ہیں۔کنوئیں کا مینڈک، مونچھیں،بڑے بے آبرو ہو کر،دیکھن میں چھوٹے لگیں،کتے،نسخہ بلڈ پریشر کا،شکشک دن،چائے،بارے مسافر کا کچھ بیان ہو جائے،داستان ریفریشر کورس،کھانا،پاگل پران،لانا جوئے شہر کا،دیواریں ہم بھی فسانہ لو کی بھی کہانی،تو کیا نام نہ ہوگا؟،اف یہ بورڈ،آؤ پڑوسن جھگڑا کریں،نہ لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل،تندوری مردہ،بائی صاحب باتھ روم میں ہیں شامل ہیں۔(۲) ہوّا سفید رنگ کا۔ان میں کچھ تحریریں تو مزاحیہ مضمون کے زمرے میں آتی ہیں جب کہ کچھ انشائیوں کے زمرے میں اور کچھ افسانوی انداز میں لکھی گئی ہیں مثلاً'' کنوئیں کا مینڈک''میں اپنے بیٹے،سہیلی وغیرہ کے واقعات ہیں۔اپنے بیٹے کے ٹیچر بننے کی خواہش،سہیلی سے گفتگو،پھر ایک فلم بچوں کے ساتھ دیکھنے کا واقعہ،اسکول کالجوں میں طلبہ کی ہڑتالیں،آج کل کے بچوں کی آزاد خیالی اور والدین کو کنوئیں کا مینڈک بتانے کا واقعہ وغیرہ جیسے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہیں۔اسی طرح ''مونچھیں'' ان کا ایک انشائیہ ہے جس میں وسعت خیال کے ساتھ مونچھوں پر بیانات ملتے ہیں۔اس میں مونچھوں کی قسمیں،انکے بارے میں محاورات شامل ہیں۔''بڑے بے آبرو ہو کر''ان کا مزاحیہ افسانہ ہے۔ اسی طرح ''دیکھین میں چھوٹے لگے'' بھی افسانہ نما انشائیہ ہے۔جس میں افسروں کے رویوں پر طنز کیا گیا ہے۔ان کا ایک اور انشائیہ ''کتے'' ہے۔جو پطرس کے مشہور انشائیے ''کتے'' کی یاد دلاتا ہے۔اس میں بانو سرتاج نے وہی انداز اختیار کیا ہے جو پطرس کے یہاں ملتا ہیں۔اس انشائیے میں ''کتے'' کی اقسام، عادات وغیرہ کا عمدہ بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔بانو سرتاج کے یہ انشائیے طنز و مزاح کی تاریخ میں اہم اضافہ ہے ،ان انشائیوں کے مطالعہ سے ان کی گرفت قلم کا قائل ہونا پڑتا ہیں۔

عطیہ خان مراد آباد یوپی کے رہنے والے سید شاہد علی کی دختر ہیں۔۱۹۲۴ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے ایم ایڈ کیا۔وہ افسانہ نویس بھی ہیں بعد میں وہ ترک وطن کر کے پاکستان اور لندن چلی گئیں وہیں مقیم ہے۔ان کی مزاحیہ تحریریں رسالہ شگوفہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔''رونا''(شگوفہ۔نومبر ۲۰۰۲ء ص ۹) ایک انشائیہ ہے۔اس میں افسانوں کا ایک عام فعل رونا موضوع ہے۔مصنفہ نے اس میں رونا کا عمل،اس کے اثرات،اس سے متعلق تصورت،

محاورات وغیرہ کومزاحیہ زبان واسلوب میں پیش کیا ہے۔ پوراانشائیہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ’’چار پائی کا مرثیہ‘‘ (شگوفہ، مئی ۲۰۰۳ء) اس فکاہیہ کا موضوع چار پائی ہے۔ جوزندگی میں عام استعمال کی شئے ہے نیند، بیماری اور موت سب اس پر واقع ہوتے ہیں۔ غیرمما لک میں یہ شئے نایاب ہے۔ مصنفہ نے چار پائی اس سے متعلق باتیں، اس کا استعمال اس سے متعلق محاورات وغیرہ کو بڑے شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا انداز بیان نرالا ہوتا ہے۔

فاطمہ تاج حیدرآباد سے تعلق رکھنے والی شاعرہ بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ان کی مزاحیہ تحریریں رسالہ شگوفہ میں بکثرت شائع ہوئی ہیں۔ وہ مزاح کا فطری ملکہ رکھتی ہیں۔ ان کے موضوعات، واقعات، حالات، کوائف ماحول کردار، ان کی گفتگو وغیرہ اور زبان واسلوب سبھی میں مزاح شامل ہوتا ہے۔ انہوں نے مضامین، انشائیے اور افسانوی انداز کی تحریریں لکھی ہیں۔ ’’خزانہ میری تلاش میں‘‘ ہے۔ (شگوفہ، اکتوبر ۱۹۹۱ء ص ۳۹) افسانہ نما مضمون ہے۔ جس میں ایک خواب کا بیان ہے۔ مصنفہ خواب میں ایک جن کو دیکھتی ہیں۔ جوان پر عاشق ہوجاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے شوہر کو دیکھ کر جن کے خزانے کو اور اس کے عشق کو ٹھکرا دیتی ہیں۔ آنکھ کھل جاتی ہے۔ اس تحریر میں مزاح کے عناصر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ’’ہم اور ہمارے وہ‘‘ (شگوفہ، نومبر ۱۹۹۱ء ص ۳۹) مختصر سا انشائیہ ہے۔ جس میں اپنے شوہر کو موضوع بنا کر انہوں نے عائلی زندگی میں پیش آنے والی کئی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ شوہر کا سلوک، برتاؤ، عادات واطوار کو پیش کیا ہے۔ افسوس کہ اس تحریر میں بھی مزاح کے عناصر کہیں نظر نہیں آتے۔ یہ ایک بیانیہ ہے اور بس۔ ’’ہم اور ہمارے ڈاکٹر‘‘ (شگوفہ، جولائی ۱۹۹۲ء ص ۳۰) اس تحریر میں ڈاکٹر موضوع مزاح ہے۔ اس میں ڈاکٹروں کا مریضوں کے ساتھ سلوک، ان کے مشورے، مریضوں کے علاج کی جانب سے بے پروائی، ان کی فیس طلب، وغیرہ کو اچھے مزاحیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مشاعرہ یا......... (شگوفہ، اکتوبر ۱۹۹۷ء ص ۳۹) مشاعروں کی بوالعجبیاں، شعرا کی حالت، ان کے حلئے، ان کی تحرے، سامعین کی ہڑبونگ، ہوٹنگ، وغیرہ کو مزاحیہ، انداز مین پیش کیا گیا ہے۔ ’’خوشی کی تلاش میں‘‘ (شگوفہ، فروری ۲۰۰۴ء ص ۲۵) افسانہ نما تحریر ہے۔ اس میں انسان کی خوشی کی تلاش میں مختلف اشیاء حاصل کرنے، عید کے موقعے پر خریداری، دوکانداروں کی لوٹ وغیرہ کا پرلطف بیان ہے۔ ان کی زبان صاف ستھری اور انداز بیان پرکشش ہوتا ہے، طنز کے پیرائے میں مزاحیہ انداز میں سماج کی نمائندگی کرتی ان کی تصانیف اردو ادب کا اہم سرمایہ ہے۔

نجمہ شہریار (نجمہ محمود) کی مزاحیہ تحریریں نظر سے کم گزری ہیں۔ ان کا ایک انشائیہ ’’میں اپنی

مادری زبان میں کیوں لکھتی ہوں‘‘ (شاعرہ بمبئی، مارچ ۱۹۷۹ء ص ۸۸) نظر سے گزرا ہے۔ یہ انہوں نے محترمہ افسر قریشی (لکچرار۔ عبداللہ گرلز کالج علی گڑھ) کی ترغیب پر لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے مادری زبان کو موضوع ومرکز خیالات بنایا اور شگفتہ زبان واسلوب میں مادری زبان۔ اس کی اہمیت اس کی محبت، اس کے تئیں اپنے فرائض کو بیان کیا ہے۔

نسیمہ تراب الحسن حیدرآباد کی رہنے والی ہیں۔ ان کی مزاحیہ تحریریں رسالہ شگوفہ میں شائع ہوئی ہیں۔ ’’ہمارے پڑوسی‘‘ (شگوفہ، ستمبر ۱۹۸۹ء ص ۳۱)۔ اس انشائیہ میں نسیمہ نے پڑوسیوں کو نشانۂ مزاح بنایا ہے۔ پڑوسی سے سماجی زندگی میں نہیں لیکن ہر پڑوسی پسندیدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ پڑوسی سے محبت کی بزرگوں نے تلقین کی ہے۔ لیکن چانکیہ کی نیتی ہے کہ پڑوسی دشمن ہوتا ہے اور پڑوسی کا پڑوسی دوست، آج کل کی حکومتیں اس نیتی (پالیسی) پر عمل کرتی نظر آتی ہیں۔ نسیمہ نے پڑوسی، ان کی اقسام، ان کی عادات واطوار رویے وغیرہ کو پرلطف انداز میں بیان کیا ہے۔ ’’قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے‘‘ (شگوفہ، اکتوبر ۲۰۰۴ء ص ۱۳) چوہوں کی مصیبت پر پرلطف انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

نورالعین علی بنیادی طور پر ڈرامہ نویس ہیں۔ ان کے ڈراموں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ڈراموں میں زیادہ تر سنجیدہ اور المیہ موضوعات کو پیش کیا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ ’’بہو کی تلاش‘‘ (کتاب کار رام پور) ان کی مزاحیہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ ان کی ڈراموں میں انہوں نے واقعات حالات کوائف ماحول، کردار، ان کے اعمال افعال اور گفتگو کو شگفتہ انداز میں بیان کرکے مزاح پیدا کیا ہے۔ ان کی ڈرامہ نویسی کا جائزہ لیا جاچکا ہے۔

ہاجرہ پروین (گلبرگہ) گلبرگہ کرناٹک کی رہنے والی ہیں۔ ان کے کچھ انشائیے شگوفہ میں شائع ہوئے ہیں۔ ’’ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں‘‘ (شگوفہ، اگست ۲۰۰۲ء ص ۳۳) ایک افسانوی انداز کی تحریر ہے جس میں ایک ماں کے اپنے بیٹے کو کالج میں ایڈمیشن دلانے کے سلسلے میں پیش آنے والی دقتوں پریشانیوں کا پرلطف بیان ہے۔ آج کل بازیچۂ اطفال، کنڈرگارٹن، کانونٹ سے لے کر کالج لیول تک سوائے ڈونیشن کے طالب علموں کو داخلے نہیں ملتے۔ مصنفہ نے قوم کا مستقبل روشن کرنے کا دعوے داروں، تعلیم کو عام کرنے والوں، قومی خدمت کرنے والوں، تعلیمی ادارے چلانے والوں کی اچھی خبر لی ہے اور ان کے دعوؤں کی پول کھول کر رکھ دی ہے۔

خورشید جہاں بہار کی ادیبہ ہیں، مزاح نگاری ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ ان کا فکاہیہ ’’ٹائم بانڈ پرموشن‘‘ (رسالہ کتاب نما دہلی میں اپریل ۱۹۹۰ء ص ۷۶) شائع ہوا تھا، جس میں انہوں نے نوکری اور

پرموشن کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کو بیان کیا ہے۔موصوفہ ہزاری باغ کے کالج میں لکچرار ہیں۔ ان کی مزاحیہ تحریریں بھی لطف اندوز ہونے کے ساتھ سماجی حقائق کی بھی عکاس ہیں۔

شفیقہ فرحت عہد حاضر کی عظیم مزاح نگار ادیبہ جنہوں نے عمر بھر طنز ومزاح کو اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔تمام عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزار دی اور اپنی طنز ومزاح نگاری سے اردو مزاحیہ ادب کو مالا مال کر کے دنیا سے رخصت ہوگئیں۔شفیقہ فرحت نے نہ صرف ہندو پاک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بے پناہ شہرت حاصل کی۔ یہ ناگپور میں پیدا ہوئیں۔بھوپال میں عمر بسر کی اور اسی سرزمین میں پیوند خاک ہوئیں۔انہوں نے مضامین انشائیے، افسانے، ڈرامے سبھی کچھ لکھا لیکن جو لکھا مزاحیہ لکھا۔ان کے مجموعے لو آج ہم بھی، بلا عنوان، گول مال، رانگ نمبر، ٹیڑھا قلم شائع ہو چکے ہیں۔ ملک کے مقتدر رسائل میں ان کی تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ رسالہ شگوفہ میں ان کی بے شمار مزاحیہ تحریریں شائع ہوئی ہیں۔(۱) ''لو آج ہم بھی'' (مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی بھوپال۔۱۹۸۱ء) اس مجموعہ میں شفیقہ کی مزاحیہ تحریروں کا انتخاب شامل ہے اس میں درج ذیل ۱۶ مضامین شامل ہیں۔ جن میں مضامین انشائیے اور افسانہ نما تحریریں ہیں۔ میرے روم میٹ۔بچیں کہاں کہ، خط لکھیں گے، تماشائے اہل ادب، ہم بھی صاحب جائداد ہوگئے، آئے ہے بے کسی عشق پر رونا غالبؔ، اور لکھنا ناول کا، عہد نامہ جدید، ذرا دھوم سے نکلے، میں نے چاہا تھا کہ اندوہ مکاں سے ،کرسی، حضرت آلو، دعا دیتے ہیں رہزن کو، اور بنانا پروگرام کا، اندیشہ ہائے دور دراز، مقدمہ۔''میری روم میٹ'' افسانہ نما تحریر ہے۔ ہوسٹل کی زندگی کا بیان ہے۔''بچپن کہاں کہ'' کرکٹ کے کھیل کے کریز پر مبنی ہے،''خط لکھیں گے'' خط پر انشائیہ ہے۔''تماشائے اہل ادب'' میں ادیبوں شاعروں کی بوالعجبیاں اور حرکات پر مبنی ہیں۔''ہم بھی صاحب جائیداد ہوگئے'' میں ایک متوسط خاندان کی مالی کی مشکلات کا ذکر ہے۔''آئے ہے بے کسی عشق پر رونا غالبؔ'' انشائیہ پُر مزاح ہے''اور لکھنا ناول کا'' بھی مزاحیہ تحریر ہے۔ ناول نویسی کی مشکلات کا ذکر ہے۔عہد نامہ جدید ایک پیروڈی ہے۔جس میں دور حاضر کی خرابیاں موضوع ہیں۔ذرا دھوم سے نکلے میں غالب کے سلسلے میں ہونے والی تقریبات، مجالس، ادب وغیرہ کا مضحکہ خیز بیان ہے۔اسی طرح ''اندوہ مکاں'' میں مکانوں کی قلت کا ذکر ہے۔کرسی ایک انشائیہ ہے جس میں افسر شاہی اور سیاسی لیڈروں کے ہتھ کنڈے موضوع ہیں۔''حضرت آلو'' بھی ایک انشائیہ ہے۔دعا دیتے ہیں رہزن کو، اور بنا پروگرام کا، اندیشہ، مقدمہ بھی پر لطف انشائیے ہیں۔(۲) رانگ نمبر (نئی آواز دہلی ۱۹۸۸ء) درج ذیل مزاحیہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ ہوئے ہم جو لے کے رسوا، ہدایت نامہ جدید سیانے چوہے، ووٹ پکی

سیاہی کا، ملاقات بڑے لوگوں کی، بداور بدنام، گول مال، ڈھنڈورا، اس شکار سے اس شکار تک، بھولے بھلائیے وعدے، بستر گول، جیک اینڈ جل۔ان تمام تحریروں میں شفیقہ کا مزاح جولانیاں لیتا نظر آتا ہے۔وہ مختلف امور ومسائل پر خیالات کی توسیع کرتی جاتی ہیں اور بات میں بات پیدا کرتی جاتی ہیں۔کہیں بیانیہ مضمون کا انداز ہے تو کہیں خیالات کی اڑان انشائیہ کا اور کہیں افسانہ کا۔اس طرح انھوں نے اپنے انوکھے اسلوب اور انداز بیان اور مشاہدات سے طنز ومزاح میں اہم اضافہ کیا۔

خیر النساء مہدی (بمبئی) مشہور شاعر ونقاد باقر مہدی کی اہلیہ ہیں۔بمبئی میں استاد رہی ہیں۔کبھی کبھی مزاح کے میدان میں چہل قدمی کر لیتی تھی۔ان کے چند انشائیے کتاب نما، شاعر وغیرہ میں شائع ہوئے ان کا ایک قابل ذکر انشائیہ ''بازیچہء اطفال'' ہے۔جو کتاب نما جولائی ۱۹۸۵ء ص ۴۳ میں شائع ہوا۔ یہ ان کی نمایندہ مزاحیہ تحریر کہہ سکتے ہے۔اس میں ان کی تخیل کی پرواز، شعور کی لو، یادیں قابل دید ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات کو روانی کے ساتھ پیش کیا ہے۔زندگی کو انہوں نے جس انداز سے دیکھا ان کے ذہن کے پردے پر جو جو تصورات ابھرے انہوں نے اس کی توسیع کی ہے۔خورشید جہاں کی تحریریں یقیناً طنز ومزاح کے باب میں اہم اضافہ ہے۔

رئیسہ محمد حیدرآباد کی رہنے والی ہیں ان کے مزاحیہ انشائیے شگوفہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔(۱) میچنگ (شگوفہ دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۴۳) اس انشائیہ میں انہوں نے آج کل کے فیشن پرستوں میں میچنگ کے مرض کا ذکر کیا ہے۔خواتین میں یہ کریز عام ہے۔وہ سر سے پیر تک ہر شے ایک ہی رنگ کی یا ڈیزائن کی یا ایک طرز کی چاہتی ہیں۔سر کے بال، چہرے کا میک اپ، لباس، ساری، اوڑھنی بلاوز شلوار ،سینڈل، اور گلے، کان، ہاتھ، وغیرہ کے زیور موزے بھی میچنگ چاہتی ہیں۔مصنفہ نے اس رویہ پر بڑے تیکھے انداز میں اظہار خیال کیا ہے اپنی باتوں کی وضاحت واقعات کے ذریعے کی ہے۔ یہ ہندستانی معاشرے میں خواتین کا بڑا عام رجحان ہے جسے مصنفہ نے بڑے دلچسپ انداز میں رقم کیا ہے (۲) شباہت۔(شگوفہ مئی ۲۰۰۴ء ص ۴۹) میں انہوں نے خواتین اور مردوں میں اس کریز کا ذکر کیا ہے کہ وہ کسی نہ کسی مشہور شخصیت، ایکٹر، ایکٹریس یا ریڑ وغیرہ سے مشابہت پیدا کریں۔کوئی خود کو مدھو بالا، مینا کماری، نوتن، ہیما مالنی، نرگس، وغیرہ سمجھتی ہے تو نوجوان دلیپ کمار، اشوک کمار، راج کپور، شاہ رخ خان، سلمان خان کی مشابہت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔سلمان خان نے تیرے نام فلم میں جو بال رکھے تھے۔اس کی نقل بے شمار نوجوانوں نے کی، لباس کا بھی حال ہے مصنفہ نے اس کریز کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔(۳) چار بیگن ہرے ہرے۔(شگوفہ اپریل ۲۰۱۰ء) بیگن پر انشائیہ ہے۔اس طرح رئیسہ محمد نے

عام زندگی کی عام حرکات وسکنات جس کو دیکھتا تو ہر کوئی ہے اسے جیتا بھی ہے لیکن موضوع کم ہی بناتا ہے ۔مصنفہ کی یہ کاوش قابل تحسین ہے۔

حلیمہ فردوس بنگلور کی ادیبہ ہیں۔ان کی مزاحیہ تحریریں رسالہ شگوفہ وغیرہ میں مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔وہ پچھلے پندرہ بیس برس سے لکھ رہی ہیں۔ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ بعنوان ''ماشاءاللہ ''شگوفہ پبلی کیشنز حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے۔حلیمہ فردوس نے محض ہلکے پھلکے موضوعات پر ہی قلم نہیں اٹھایا بلکہ ایسے میدانوں کو بھی سر کیا ہے۔جن میں فکری عناصر شامل ہیں۔جو ایک بیدار ذہن اور گہرے مطالعے کی دین ہے۔ان کی تصنیفات میں (۱)''رنگوں کے انتخاب نے'' (شاعر بمبئی۔اگست ۱۹۸۲ء) ایک پر لطف انشائیہ ہے جس میں رنگ تخیلات کا مرکز ہے۔رنگ،رنگین مزاجی،رنگوں کا جادو،رنگوں کے محاورات،رنگوں کی کرامات سبھی پر فکاہیہ انداز میں اظہار خیال ہے۔اس انشائیہ میں رنگ کو بنیاد بنا کر بے شمار رنگوں کی روشنی میں سماجی مسائل کو منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ہیں۔(۲)''آنکھیں'' (شگوفہ۔جنوری ۱۹۸۷ء) میں آنکھ مرکز خیال ہے۔اس میں تخیلات وحقائق کو بڑے ہی پر اثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔آنکھوں کے کرشمے، محاورات وغیرہ کا پر لطف بیان دیکھنے کو ملتا ہے۔اس میں بھی آنکھوں کو مرکزی خیال کی روشنی میں سماج و معاشرے کی حقیقتوں پر طنز ومزاح کی روشنی میں منظر عام پر لانے کی پر زور کوشش کی گئی ہے۔(۳)''ہم نے منائی سالگرہ'' (شگوفہ سالنامہ۔جنوری ۱۹۸۸ء) افسانہ نما انشائیہ ہے۔جس میں سالگرہ منانے کا پر لطف بیان ہے۔(۴)''گائیڈ'' (شگوفہ۔نومبر ۱۹۸۹ء ص ۵۵) میں گائیڈ کو مرکز خیال بنایا گیا ہے۔گائیڈ کی مختلف قسمیں جیسے آثار قدیمہ کا گائیڈ، یونیورسٹی گائیڈ وغیرہ پر پُر لطف تبصرے کئے گئے ہیں۔(۵)''گل کاریاں کاتبوں کی''۔(شگوفہ سالنامہ۔۱۹۹۰ء ص ۷۹) میں کاتب نشانہ مزاح ہیں۔اس طرح حلیمہ فردوس نے نہ صرف اس صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے بلکہ بہترین اپنی بہترین تصانیف سے اردو طنز ومزاح کی تاریخ میں اہم اضافہ بھی کیا۔ان کا انداز بیان پر اثر ولطف اندوز ہونے کے ساتھ طنز کا نشتر بھی چلتا دکھائی دیتا ہے۔

اب تک کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ طنز ومزاح جیسی صنف سخن میں بے شمار خواتین نے انہ صرف اس صنف میں طبع آزمائی کی بلکہ انصاف بھی کیا،اور بے شمار تحاریر یا تخلیقی سرمائے سے اردو ادب کے دامن کو گرانبار کیا۔خواتین ہند کی مزاح نگاری آزادی تا حال یقیناً ایک وسیع موضوع ہے جسے چند صفحات میں سمیٹنا ممکن نہیں اس لیے میں نے اس مضمون میں خواتین تخلیق کاروں کی تخلیق کا لب ولباب،موضوع اور اس میں بیان کردہ بنادی مقصد کو اپنے زبان میں لکھا ہیں۔طوالت کی ڈر سے مثالوں سے پرہیز کیا گیا ہیں

۔لیکن میں نے مضمون میں ان تمام تخلیقات کی تفصیلات بتادی ہے،حواشی کا ذکر کر دیا گیا ہے تا کہ کوئی طالب علم یا قاری پڑھنا چاہے تو بہ آسانی ان کتابوں تک پہنچ سکے،میں اپنی باتوں کا اختتام علامہ اقبال کے اس شعر کے ساتھ ختم کرنا چاہونگی کہ

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

◄◄ ● ►►

﴿حواشی﴾

(1) ''رانگ نمبر''،شفیقہ فرحت مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔(2)''لو آج ہم بھی'' شفیقہ فرحت:مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی بھوپال۔۱۹۸۱ء۔(3) آدھ گھنٹے بزم ادب میں:انیس قدوائی،مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔(4) چہرے جانے انجانے،شفیقہ فرحت۔مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی،بھوپال۔(5) گول مال:شفیقہ فرحت،مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی بھوپال۔(6) نیم چڑھے:شفیقہ فرحت،مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی بھوپال۔(7) ٹیڑھا قلم:شفیقہ فرحت،مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی بھوپال۔(8) ہر فن مولا انیس سلطانہ شگوفہ سالنامہ جنوری ۱۹۸۸ء ص ۳۰۷۔(9) اے کاش،انیس سلطانہ کے عنوان سے ہے جو کتاب نما دہلی۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء ص ۵۷۔(10)'اردو رزمیہ کی تلاش،انیس سلطانہ (شگوفہ سالنامہ ۱۹۹۰ء ص ۸۹)۔

(11)''یاد''، جہاں بانو نقوی :مطبوعہ ایوان اردو حیدرآباد ، سالنامہ ۱۹۴۸ء۔(12) ہوائی جہاز کا سفر،ڈاکٹر حبیب ضیاء ،شگوفہ،سونیر،نومبر ۱۹۸۹ء۔ص ۵۱۔(13)''پرواز''،رشیدہ قاضی کوکن اردو رائٹر ز گلڈ کینیا ،۱۹۸۸ء۔۔(14) ''سلیقہ بھی ایک کلا ہے''سلمٰی صدیقی (دور حیات بمبئی ۔آزادی نمبر ۱۹۶۴ء۔ص ۲۳۔(15) ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے'' رضیہ صدیقی (شگوفہ اکتوبر ۱۹۸۸ء ص ۱۹)۔(16) میچنگ، رئیسہ محمد،شگوفہ دسمبر ۱۹۹۹ء ص ۴۳۔(17) بہروپیا۔ذکیہ انجم،شگوفہ،جولائی ۱۸۸۱ء ص ۲۹۔(18)''لو آج ہم بھی''شفیقہ فرحت (مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی بھوپال۔۱۹۸۱ء)۔

(19) انشائیہ''عمر رفتہ'' صادقہ ذکی (کتاب نما دہلی،نومبر ۱۹۸۸ء ص ۷۳)۔

(20) اردو ادب کو خواتین کی دین۔اردو اکیڈیمی دہلی۔۱۹۹۴ء ص ۲۶۔

◄◄ ● ►►

House no. 267/2B Ward 24
Mohalla Newada Ashok Nagar,Allahabad (U. P) Pin 211002
9899972265
Email- salehasiddiquin@gmail.com

● مضمون
● ڈاکٹر ممتحنہ اختر

موضوع اور مواد

ادب میں مواد اور ہیئت کی کوئی جداگانہ کوئی حیثیت نہیں۔دونوں ایک دوسرے سے اس قدر پیوستہ اور ہم رشتہ ہے کہ دونوں کا علیٰحدہ علیٰحدہ تصور ممکن نہیں اور نہ ہی ایک کو دوسرے پر فوقیت دی جاسکتی ہے ۔بلکہ خیال، موضوع، معانی یا مواد ہیئت سے علیٰحدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ ہی مواد و معنی کے بغیر کامل ہیئت متشکل ہوسکتی ہے۔ بلکہ مواد و معانی غیر مرئی یا غیر موجودگی کی صورت کے بعد تخلیق میں جب اپنا وجود پکڑ لیتے ہیں یا ہیئت اختیار کر لیتے ہیں تو مزید ہیئتوں میں ڈھلنے کے امکانات اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ ہر ہیئت اپنی انتہا میں مواد بنتی ہے اور ہر مواد اپنی ابتداء میں ایک ہیئت لیے سامنے آتا ہے بقول ڈیوڈ مورلی:

Form is content as arranged;
Content is form-as- deployed"(1)

ڈیوڈ مورلی(David Morley) کے اس خیال سے اگر مواد و موضوع کا تعین کیا جائے۔تو ہیئت سے علیٰحدہ اس کی کوئی اہمیت نہیں اور نہ ہی اس کی کوئی مجرد تعریف متعین ہوسکتی ہے۔حامدی کاشمیری نے بھی اس کے پیش نظر اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے :''ہیئت موضوع یا تجربے سے الگ کوئی شے نہیں، ہیئت ہی تجربہ ہے'' ۲

یعنی ادبی تخلیق میں الفاظ ہی معنی و موضوع یا تجربے کی قدر متعین کرتے ہیں۔الفاظ یا ہیئت ایک خاص سانچے میں ڈھل کر مواد و معنی کی باز آفرینی کرتے ہیں۔

تاہم ادبی تنقید میں جہاں تک مجرد معنی و مواد کے تصور کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں کئی آراء سامنے آتی رہی ہیں۔اس کو ادیب و شاعر کے تعقلی، تخیلی اور وجدانی عناصر سے بھی جوڑا گیا ہے اور جذباتی، نفسیاتی و روحانی پہلو سے بھی جوڑا گیا ہے چنانچہ ان خیالات کے پیش نظر یہ بحث غور طلب رہی ہے کہ جو تصورات و خیالات فنکار فنی تخلیق میں پیش کرتا ہے یا فنی تخلیق کی بنیاد جن تجربات و تصورات و خیالات پر رکھتا

ہے ان کی اصلیت و معنویت کیا ہے؟ وہ کن عناصر سے تشکیل پاتے ہے؟ ایسے کون سے محرکات ہوتے ہیں جن سے وہ پیدا ہوتے ہیں؟ نوعیت کے اعتبار سے وہ کیسے اور کیونکر مختلف ہوتے ہیں۔ادبی تنقید میں مواد و موضوع کی اصلیت و معنویت انہی تصورات کے پیش نظر سامنے آتی رہی ہے بلکہ ادب کی ماہیت کو لے کر جوں جوں مختلف ادوار میں مختلف نظریات سامنے آتے رہے ہیں توں توں ادب میں مواد و موضوع کی معنویت پر نئے زاویے سے روشنی پڑتی رہی ہے۔فن و ادب پر تنقید کرتے ہوئے باضابطہ طور پر سب سے پہلے ارسطو نے اپنے نظریہ نقل کو سامنے لاتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ فن کار یا شاعر جن خیالات و تصورات پر فن کی بنیاد رکھتا ہے یا جس موضوع و مواد کی بناء پر وہ فنی تخلیق کو معرض وجود میں لاتا ہے وہ اصل میں اسی مادی دنیا کی پیداوار ہوتے ہیں یا اسی مادی دنیا کی عکاسی یا نمائندگی کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ارسطو سے پہلے اگرچہ اصل میں افلاطون نے نظریہ نقل کی بنا پر اس بات کی طرف توجہ دلائی تھی کہ مادی دنیا ہی فن پارے کا موضوع بنتا ہے لیکن تصوراتی حقیقت کو مادی حقیقت سے علیٰحدہ کر کے اس کی فوقیت یا برتری کے پیش نظر انہوں نے فن کو یا فنی تصورات کو بے معنی اور غیر اہم قرار دے کر یہ تصور سامنے لایا کہ چونکہ شاعر مادی حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے یا شاعری میں پیش کیے گئے خیالات مادی دنیا کی پیداوار ہوتے ہیں اس لیے ان کی کوئی اہمیت نہیں، یہ محض نقل کی نقل ہے کیونکہ جن حواس اور محسوس کیے گئے (اشیا) پر ان کی بنیاد ہے ان کا علم اور ان کی اصل محض ظاہری اور سطحی ہے۔لیکن اس کے باوجود اپنے فکری و فلسفیانہ تصورات کے پیش نظر تنقیصی او رمنفی زاویہ نظر سے شعر و ادب کا جو تجزیہ افلاطون نے پیش کیا اور اس پر جو اصطلاحیں پیش کیں وہی تجزیہ اور اصطلاحات بعد میں مثبت تصریحات کے طور پر ادب و شاعری کی ماہیت پر کار آمد بنیاد ثابت ہوئیں او رموضوع و مواد کی اہمیت و معنویت کی تفہیم اور پرکھ کے نئے دریچے وا ہو گئے بقول جمیل جالبی:

''افلاطون نے اس بحث نظریہ نقل یا نظریہ (ادب) کے سلسلے میں جو اصطلاحیں استعمال کیں اور ان اصطلاحوں کے ذریعے ادب و شعر کے جن آفاقی اصولوں کو پیش کیا ان پر آج بھی اسی طرح بحث ہو رہی ہے.....انہی مسائل کو لے کر ارسطو نے سارے ادب و شعر کا جائزہ لیا اور اپنے منطقی ذہن سے ان گتھیوں کو سلجھا کر ادبی تنقید کا سنگ بنیاد رکھا'' ۳

فلاطون کے برعکس نظریہ نقل یا نظریہ ادب کے تعلق سے ارسطو کا تصور یہ تھا کہ فن کار یا شاعر جس خارجی کائنات یا مادی حقیقت کی نقل کرتا ہے یا اس کو اپنا موضوع بناتا ہے وہ تصوراتی حقیقت سے علیٰحدہ نہیں، بلکہ مادی حقیقت میں ہی تصوراتی حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے جس کو فن کار اپنے تصور اور تخیل سے آشکار کرتا ہے۔مواد کی موجودگی اس کی تغیر پذیری اس کا مسلسل او رنہ ختم ہونے والا سلسلہ اس کا مسلسل

ارتقاء upward progress ہی فنکار کے اندر ہیجانات پیدا کرتے ہیں اور فن کار اس مسلسل ارتقاء کی نقل کر کے اس کو نئی معنویت سے ہمکنار کرتا ہے یعنی ارسطو کے نزدیک شاعر واقعاتی دنیا سے ہی اپنے موضوع و مواد کی تلاش کرتا ہے اور موجود واقعات اور حقائق ہی اس کی تخلیق کی بنیاد بنتے ہیں۔''اس کے نزدیک حقیقت اس دنیا سے ماورا نہیں بلکہ یہ مادی عالم محسوسات ہی دراصل حقیقتوں کا جہاں ہے اور اس میں روح اور ماورائی ساری پنہایاں سمائی ہوئی ہیں'' اور شاعر اپنے تخلیقی عمل سے انہی ماورائی پنہایوں یا تصوراتی حقیقت کو فن میں آشکار کرتا ہے اور ارسطو کے نزدیک نقل، نقل محض نہیں جیسا کہ افلاطون کا خیال تھا یا یہ مصوری کی طرح کسی جامد شے کی تصویر کشی نہیں بلکہ کائنات کی تحرک پذیر وجودوں کا تخلیقی اظہار ہیں یعنی انسانی فطرت، ان کے اعمال و افعال، خیالات اور جذبات بلکہ پوری انسانی زندگی کا اظہار ہے چنانچہ اس کے پیش نظر انہوں نے لکھا ہے کہ ''فن فطرت کی تقلید ہے'' ۴

اور پھر ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ''تقلید (یا نقل) کے معروض عمل کرتے ہوئے انسان ہوتے ہیں'' ۵

فن میں چونکہ ارسطو مواد اور ہیئت دونوں کی وحدت کا قائل تھا اس لیے ان کے تصور نقل میں مواد کی ہیئت سے علیٰحدہ تفہیم ممکن نہیں قرار پاتی بلکہ اسی وحدت کے بنا پر ان کا تصور نقل افلاطون کے نظریہ نقل سے اپنی ایک الگ حیثیت اختیار کر لیتا ہے یا ان کا نظریہ نقل اسی وحدت کے بنا پر ہر جگہ ظاہر ہوتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے نظریہ نقل میں مواد و موضوع کی معنویت کے پیش نظر چونکہ ذہن انسانی کو خاص اہمیت حاصل رہی، خاص طور پر ارسطو کے نظریات میں ذہن انسانی کی غیر معمولی اہمیت ہے نے آگے چل کر مواد و موضوع کی معنویت کے پیش نظر یہ تصور سامنے لایا کہ عالم محسوسات یا حقیقی عالم یا فطرت اور فطری قوانین اور اس کی مختلف ہیئتیں عقل کو متاثر کرتی ہیں اور اس کے لیے معرض تقلید بنتی ہیں۔لیکن اٹھارویں صدی کے اواخر میں عقلیت پسندی اور نو کلاسیکی ضابطوں کی سخت گیری کے خلاف انسانی جذبات و احساسات کی اہمیت نے مواد و موضوع کو ایک نئی معنویت سے ہمکنار کیا۔اصل میں یہ ایک ردعمل تھا جو بعد میں رومانیت یا رومانوی تحریک کے نام سے سامنے آیا۔اس تحریک نے عقل کے برعکس، تخیل اور جذبات و احساسات کو اہمیت دی، یہاں ادب فطرت کی ''تقلید'' نہیں بلکہ ''اظہار'' قرار پایا۔انسانی جذبات و احساسات کا اظہار بلکہ انسانی فطرت اور کائنات کے غیر حتمی، تغیر پذیر، تخلیق پذیر اور مبدل عناصر کا اظہار جو محض

انسانی عقل کو نہیں بلکہ انسان کے بنیادی، امتیازی اور قابل قدر صلاحیتوں (جبلتوں، جذبات، تخیل) کو متاثر کرتے ہیں اور جن عناصر کو کولرج نے ''روح فطرت'' کا نام دے کر یہ لکھا تھا کہ ''فن کار کو اشیا کی تقلید کرنے کے بجائے ان اشیا میں کارفرما روح کی تقلید کرنی چاہیئے'' ۶ لیکن اس ''اظہار'' کا مبدا و محور خاص طور پر شاعر کی ذات اس لیے قرار پائی کہ وہ انسانی سطح پر فطرت اور اس کے قوانین سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ قوت اختراع Genius یا متخیلہ کا مالک ہوتا ہے۔وہ اپنے جذباتی امور کا بقول شلیگل ''تخیلی پیکر میں عکاسی کرتا ہے'' ۷ وہ بقول ورڈز ورتھ (Words Worth) قلب انسانی اور روح فطرت کی ہم آہنگی کو منکشف کرتا ہے اور اس ہم آہنگی کے اصولوں کو تصویروں اور لفظی پیکروں کی صورت میں پیش کرتا ہے'' ۸ اور بقول کولرج وہ پورے روح انسانی کو تحرک میں لاتا ہے۔ (4)

"Brings the whole soul of man into activity, with the subordination of its faculties to each other, according to their relative worth and dignity" (9)

اس لیے ادب میں ''اظہار'' ادیب و شاعر کے باطن، اس کے تخلیقی تصور کی تجسیم قرار پائی اور مواد و موضوع کی معنویت شاعر کی داخلی دنیا یعنی اس کے جذبات و احساسات کے متحرک ہونے کا نتیجہ قرار پایا اور یہ امور موضوع و مواد کی معنویت و اہمیت کے لحاظ سے یہ لازمی قرار پائے کہ ''ادیب موضوع کو تخلیق کے بطن سے دریافت کرتا ہے۔اساسی اہمیت تخلیقی لمس کو حاصل ہے اور یہی موضوع کو تازگی اور توانائی عطا کرتا ہے'' ۱۰ جذبے کا زیر و بم ہی ہیئت کی داخلی و خارجی عناصر کی تشکیل کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے چنانچہ کولرج نے ان الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا کہ ''شدید جذبہ کی زبان عام بول چال کی زبان سے زیادہ باوزن ہوتی ہے'' ۱۱ وہ صنائع بدائع کو جذبہ کی تخلیق سمجھتا ہے۔اس کے نزدیک اوزان و بحور خود جذبہ کی تخلیق ہوتے ہیں۔ادب کی اہم ترین صفت تخیل قرار پائی لیکن تخیل کے محرکات بھی جذبات ہی قرار پائے شاعری شاعر کے جذبات و احساسات اس کے نقطہ نگاہ کی تخیلی ترجمانی قرار پائی Imaginative rendering of poets vision چنانچہ ورڈز ورتھ نے ان الفاظ میں اس کی طرف توجہ دلائی کہ:

''شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ اشیا کو اس طرح استعمال نہ کرے جیسی وہ ہیں بلکہ اس طرح جیسی وہ دکھائی دیتی ہیں۔ اس طرح نہیں جیسا کہ ان کا حقیقی وجود ہے بلکہ اس طرح جیسے وہ احساسات اور جذبات کے سامنے خود کو پیش کرتی ہیں'' ۱۲؎

ادب پارہ یا نظم کو ایک جسم واحد یا نامیاتی کل ہونے کی بنا پر اس کے کل اجزاء کے پیش نظر مواد اور ہیئت کی وحدت کو لازمی قرار دیا گیا لیکن اولیت(Priority) اور امتیازی (Privilage) مواد و موضوع کو یہ کہہ کر دیا گیا کہ ''فن فطرت کے نامیاتی نظام کی تقلید کرتا ہے اور اس قوت کا انحصار موضوع کے نامیاتی خصائص پر ہوتا ہے'' ۱۳؎ اس لیے تخیل فن اور فطرت کو ہم آہنگ کرنے کے باوجود ''فن کو فطرت کے اور اسلوب کو مواد کے تابع رکھتا ہے'' ۱۴؎

رومانیت بغاوت تھی ان مسلمہ اقدار کے خلاف جو ادب کو محض ایک نہج پر دیکھنے کے حق میں تھی۔ یہ کسی اصول و قواعد کی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی ادب کی پرکھ کے پیش نظر اس نے اپنے کوئی مخصوص اصول وضع کیے۔ یہ محض شاعر میں تخیل کے خود مختارانہ عمل Free play to the imagination of the poet کی ہی قائل نہیں تھی بلکہ اس نے ادیب و شاعر کی ذات، اس کی شخصیت، اس کے تخلیقی و تخیلی پہلوؤں کو لے کر نئی فکر کے ہر دروازے پر دستک دی۔ اس نے متنوع پہلوؤں سے یہ باور کرایا کہ شاعر کا تخلیقی ذہن مختلف النوع(Multidimentional) خصوصیات کا حامل ہوتا ہے خود کولرج جس نے شاعر میں تخیلی خصوصیت کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے ان الفاظ میں اس کی طرف توجہ دلائی:

"Every man's language "varies according to the extent of his knowledge, the activities of his faculties, and the depth or quickness of his feelings"......No two men of the same class or of different classes speak alike, although both use words and phrases common to them all, because in the one case their nature are different and in the other their classes are different"(15)

رومانی تنقید کے اسی آزادانہ رویہ سے ہی جدید تنقید کا آغاز ہوا جس نے تاریخی، سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی اور تاثراتی طریقے سے ادیب کے تخلیقی ذہن پر روشنی ڈالی اور مواد و موضوع کی معنویت و اصلیت میں فنی توضیحات سامنے لائیں۔

ان کے نزدیک بنیادی مفروضہ وہی رہا جو رومانی تنقید کی دین تھی کہ ادب شاعر کے تخلیقی ذہن اور شخصیت کا ''اظہار'' ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ادیب و شاعر کے شخصی، معاشرتی، تہذیبی او رنفسیاتی پہلوؤں پر خاص طور پر توجہ دی اور ان امور کو مواد و موضوع کی اصلیت کے پیش نظر سامنے لایا کہ ادب پارہ چونکہ ادیب و شاعر کے خیالات اور شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اس لیے سائنسی اصولوں کے تحت شاعر کی سوانح عمری کا مخصوص طور پر جائزہ لیا جائے، شخصی پہلو کے ساتھ ساتھ چونکہ شاعر یا ادیب ''اپنے زمانے کے اثرات کے اندر سے نمودار ہوتا ہے ۱۶؎ اس لیے شاعر کے تخلیقی ذہن کو اس کے تہذیبی و معاشرتی تاریخ میں پرکھا جائے کیونکہ ادب ''ادیب کی زندگی کا عکس ہونے کے ساتھ قوم کی اجتماعی زندگی کی ایک قدرتی سرگرمی ہے۔(Tain)'' ۱۷؎ ساں بوا (Saint Beuve) اور تین(Tain) نے خاص طور پر ادیب و شاعر کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور باطنی عوامل کے ساتھ ساتھ خارجی عوامل سے ادب کا رشتہ جوڑا جس کو بعد میں مارکسی تصورات نے یہ کہہ کر فروغ دیا کہ ادیب چونکہ سماج کا ایک فرد ہوتا ہے اس لیے مادی عوامل یا معاشی حالات و کوائف ہی ادیب کے خیالات و افکار کی بنیاد قرار پاتے ہیں اس لیے اس کی تخلیق کی پرکھ اپنے دور کے معاشی و مادی حالات کے پس منظر میں کی جائے۔

اسی طرح رومانوی نفسیات کے بعد ادبی تنقید میں مواد و موضوع کو جدید نفسیاتی طریقۂ کار نے ایک الگ معنویت و اصلیت سے ہمکنار کرایا یہ اصل میں ایک مکتبۂ علم کے طور پر وجود میں آیا جس نے ذہن انسانی اور اس کے متعلقات پر نئی فکر اور نئے انداز سے روشنی ڈالی۔ اس نے تحلیل نفسی کے عمل سے لاشعور میں پوشیدہ تصورات اور دبی ہوئی خواہشات کو شعر و ادب کی بنیاد قرار دے کر ادب اور فن کے تخلیقی عمل کو زیادہ وضاحت اور نئے ذخیرۂ اصطلاحات سے بیان کیا خاص طور پر فرائیڈ، یونگ او راڈلر نے اپنے نظریات کی بنیاد لاشعوری عمل پر رکھ کر ان تصورات کو سامنے لایا کہ ''انسان کی داخلی تحریکات، ذہنی کشمکش اس کی شخصیت اور لاشعور کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے اور چونکہ ادب کو بھی دبی ہوئی خواہشات کا ذریعہ کہا گیا ہے۔ اس لیے اس کے محرکات اور ادیب کی کشمکشوں کو بھی اس طرح دیکھنے کی ضرورت ہے'' ۱۸؎ ان کے نزدیک ادب میں مواد و موضوع کی اصلیت ادیب و شاعر کی نفسیاتی الجھنیں، تشنگیاں اور ناکامیاں قرار پائیں۔ فرائیڈ کے یہاں انسانی جبلت میں جنسی قوت کی اہمیت نے جنسی تشنگیوں اور خواہشات کو ادب کا مواد و موضوع قرار ڈالا اور ادب اور فن کو انسان کی بنیادی جبلتوں کی رقص گاہ کہہ کر ہیئت کو دبی ہوئی

خواہشات کا ذریعہ قرار دیا۔ یونگ (Yung) نے اجتماعی یا نسلی لاشعور کو فنی تخلیقات کا سرچشمہ قرار دے کر انسان کے اس جذباتی رویہ کو اہم تصور کیا جسے وہ آباؤ واجداد سے ورثے میں حاصل کرتا ہے۔ اجتماعی لاشعور کو تخلیق کی بنیاد قرار دے کر مواد و موضوع اس کے نزدیک انسانی آرزوئیں پرانے نسلی میلانات بلکہ قدیم و جدید عہد کے وہ تصورات و خیالات قرار پائے جو انسانی شخصیت کے بننے میں لاشعوری طور پر بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اڈلر نے احساس کمتری کے پیش نظر مستقبل کی آرزوں، ناکامیوں، خواہشات اور اعصابی ادھورے پن سے پیدا شدہ تصورات کو مواد و موضوع کی اصلیت قرار دیا اور ادب و اظہار کو اس کی تلافی صورت قرار دیا۔

نفسیاتی تنقید کے اس نئے طریقہ کار نے آگے چل کر ادبی تخلیق اور تخلیقی عمل کی کئی گتھیوں کو سلجھانے میں اہم رول ادا کیا خاص طور پر یونگ کے اجتماعی لاشعور کے نظریے نے ادب میں مواد کے ساتھ ساتھ ہیئت اور اس کے متعلقات پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی۔

رومانوی اور نفسیاتی تنقید نے ادیب و شاعر کی داخلی دنیا کو زیادہ اہمیت دے کر شاعر کی ذات، اس کے احساسات و جذبات، اس کے تخلیقی و تخیلی و ذہنی عمل، اس کی فطری و جبلی خواہشات کو ہی ادبی تخلیق کی بنیاد قرار دیا۔ ان کے نزدیک باہر کی زندگی شاعر یا ادیب کے لئے محض ایک مہیج کی حیثیت قرار پائی۔ شاعری کی کائنات کو انہوں نے کسی خارجی عوامل سے نہیں بلکہ شاعر کے باطنی عوامل سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اُن کے نزدیک شاعر کے اعماق میں موجود محسوسات اور اس کے لاشعور میں دبی ہی خواہشات ہی ادب قرار پائی۔ اِس لئے مواد و موضوع کی اصلیت بھی اُن کے نزدیک انہی خیالات سے مشروط قرار پائی۔ نفسیاتی تنقید کے علاوہ حقیقت پسندی، سررئیلزم اور نیچرل ازم بھی رومانی تنقید کے اثرات سے ہی منظر عام پر آئے جن میں کلاسکیت سے لے کر جدید تنقید تک ملے جلے خیالات کی بازآفرینی نظر آتی ہے

اس طرح اگر مجموعی چیثیت سے دیکھا جائے تو مواد و موضوع کی معنویت کو دریافت کرنے میں یا اس تصور کے تعلق سے ہر مکتبہ فکر نے اپنے اپنے میلان و رجحان کے تحت اس کی قدر و قیمت متعین کی۔

◄◄ ● ►►

حواشی:

۱۔ introduction to creative writing -David Morley-www.muni.cz/.../contemporary art .

۲۔ تنقیدی مقالات (امکانات) حامدی کاشمیری، ادارہ ادب شالیمار، سرینگر۔ ص ۱۴۵

۳۔ ارسطو سے ایلیٹ تک، جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی۔ ص ۲۷۰

۴۔ مغرب کے تنقیدی اصول، باقر رضوی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ص ۵۳

۵۔ ایضا۔۔۔۔۔ص ۵۳

۶۔ مغرب کے تنقیدی اصول، سجاد باقر رضوی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ص ۲۲۷

۷۔ تنقیدی دبستان، سلیم اختر، (بک کارپوریشن، دہلی) ص ۸۸

۸۔ اشارات تنقید، سید عبداللہ، (بسمہ کتاب گھر دہلی) ص ۸۳

۹۔ Principles and History of Literary Criticism, Sc. Mundra, Sc. Agarwal - Prakash Book Depot. P-319.

۱۰۔ اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا ۱۹۷۵ء، انور سدید، کتابی دنیا دہلی۔ ص ۹۹

۱۱۔ مغرب کے تنقیدی اصول، سجاد باقر رضوی، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ص ۲۲۹

۱۲۔ ایضا.....ص ۲۱۰

۱۳۔ ایضا.....ص ۱۹۶

۱۴۔ ایضا.....ص ۲۲۷

۱۵۔ History and principales of literary criticism ,Raghukul Tilak'Rama Brother. P 221

۱۶۔ شارات تنقید، سید عبداللہ، بسمہ کتاب گھر دہلی۔ ص ۹۸

۱۷۔ ایضا.....ص ۹۸

۱۹۔ جدید اردو تنقید اصول و نظریات، شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی۔ ص ۱۸۹

C/O Mr. Mohammad shafi Banday
House no 35 Hamzah Colony Sector B
Bagati kanipora. Budgam
Pin cod. 190015
9906439542

● **مضمون**

● **ڈاکٹر عرش کاشمیری**

خدیجہ مستور کا افسانہ ''محاذ سے دور''......ایک جائزہ

خدیجہ مستور تانیثی ادب کی ایک فعال مصنفہ کا نام ہے۔جنھوں نے بے شمار افسانے اس نوعیت کے لکھے جن کی بنا پہ انہیں تانیثی ادب کی ٹولی میں سرفہرست رکھا جائے گا۔زیر نظر مقالہ میں ان کے اہم افسانہ ''محاذ سے دور'' کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے تخلیق کردہ اہم نسوائی کرداروں کی تانیثی اہمیت پر روشنی ڈالی جائے گی۔اس افسانے میں 'مائی' خدیجہ مستور کا مرکزی کردار ہے جو تانیثی ادب میں ایک لافانی کردار کے طور پر یاد کیا جائے گا۔اس کردار میں وہ سارے پہلو موجود ہیں جو تانیثیت کے بنیادی موضوعات ہیں۔

تانیثیت مابعد جدیدیت کی ایک اہم تھیوری ہے۔جس کا مقصد ادب میں نسوائی کردار کو اُجاگر کرنا ہے۔یہ تھیوری ادب میں فیمنزم کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔مغربی دنیا میں اس تھیوری کو عورتوں کا نظریہ،تحریک نسواں یا عورتوں کی حمایت کرنے کا نظریہ جیسے ناموں سے موسوم جاتا ہے۔معنوی اعتبار سے تانیثیت ایک ایسا رجحان،فکر یا نظریہ ہے جو سوسائٹی میں عورت کے مقام کا تعین کرے،عورت کو اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرے اور اس کے علاوہ مرد کی بالا دستی،مرکزیت،عورت کا ثانوی درجہ وغیرہ کو ہدف تنقید بنائے۔اس نظریہ کے دائرہ عمل میں دورِ حاضرہ میں عورت پر ہو رہے ظلم و جبر،جنسی استحصال،غیر مساوی حقوق جیسے مسائل پر بحث و مباحث کرنا اور اس کے خلاف تحریر و تقریر کرنا شامل ہے۔مابعد جدیدیت کے بانی کاروں اور نقادوں کا ماننا یہ بھی ہے کہ تانیثیت سے مراد خواتین قلم کاروں کو ادب میں حاشہ پر رکھنے کے بجائے مرد کے برابر مرکز میں جگہ دینا اور ان کی تحریرات کو ادب میں شامل کرنا بھی اس تحریک کے دائرہ میں آتا ہے۔اس طرح بات صاف ہو جاتی ہے کہ عورتوں کے سماجی،سیاسی،معاشی اور خارجی و داخلی مسائل کو ادب میں اجاگر کرنے کی عملی کوشش کو بھی اس تھیوری کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔تانیثی ادبی تحریر کی تعریف پروفیسر قدوس جاوید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''تانیثی ادبی تحریر وہ ہے جس میں سماجی و ثقافتی،آئینی و معاشی وغیرہ تمام انسانی سطحوں پر عورت کو حاشیہ پر رکھنے کی بجائے مرد کے برابر مرکز میں رکھا

> جائے۔چناچہ ایسی ادبی تحریر (شعر،نظم،افسانہ،ناول یا مقالہ) جس میں عورت کو مساوی حقوق،انصاف اور مقام و مرتبہ دینے کی وکالت کی گئی ہو۔اس سے غرض نہیں کہ لکھنے والا عورت ہے یا مرد۔طبقہ نسواں میں شعورِ ذات کی بیداری،عرفان نفس کا حصول اور زندگی کے تمام شعبوں میں عورت (طبقہ نسواں) کو مرد کے مساوی حقوق اور مواقع فراہم کرنا ہی تانیثیت کی تحریک،فکر یا تھیوری کے بنیادی خصائص ہیں۔''
>
> (متن معنی اور تھیوری: پروفیسر قدوس جاوید،ص۱۵۳۔۱۵۲)

خدیجہ مستور افسانہ نگاروں کی ایسی ٹولی میں شامل ہیں جنھوں نے اپنے قلم کو تانیثی ادب کے لئے وقف کیا ہے۔ان کے بے شمار افسانے معاشرتی حقائق اور سماجی موضوعات پر قلم بند ہیں۔انہوں نے عورت اور سماج کے مابین مسائل کو بنیاد بنا کر بے شمار کہانیاں لکھی۔ان کے خاص موضوعات بھوک،افلاس،نا انصافی،جنسی استحصال اور ظلم و جبر ہیں۔رشید جہاں اور عصمت چغتائی سے متاثر ہونے کی صورت میں ان کی کہانیوں میں عورت ذات کا منفرد لہجہ ملتا ہے۔جنسیات اور تانیثت پر انہوں نے جتنا بھی لکھا بے باک انداز میں لکھا ہے۔کھیل،ٹھنڈا میٹھا پانی،بوچھاڑ،برہنہ لاشیں،دادا،محاذ سے دور اور چپکے چپکے ان کی اس ہنر مندی کی بہترین مثالیں ہیں۔ان کی کہانیوں کے کردار فعال اور متحرک ہیں۔کرداروں کے افعال پر ان کی گرفت مضبوط رہتی ہے جس سے وہ کرداروں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ استعمال میں لا کر کہانی کو موثر بناتی ہے۔فکشن میں پلاٹ سے زیادہ کرداروں کو اہمیت حاصل ہے۔اردو ادب میں بہت سی کہانیاں ہیں جو ان کے مصنف سے نہیں بلکہ کرداروں سے مشہور ہیں۔کردار جتنا فعال اور متحرک ہوگا کہانی کا کلائمکس اتنا ہی پُرتاثیر ہوگا۔اس ضمن میں پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں۔

> ''مختصر افسانے میں پلاٹ سے زیادہ کردار کی اہمیت ہے......کردار جو حقیقی اور زندہ ہوتے ہیں وہ پڑھنے والے کے حافظے میں داخل ہو کر وہیں ٹھہر جاتے ہیں۔''
>
> تنقید اور عملی تنقید: احتشام حسین،ص۵۴)

افسانہ ''محاذ سے دور'' خدیجہ مستور کی ایک اہم تخلیق ہے۔اس افسانے میں انہوں نے عورت کے سماجی مسائل اس طرح بیان کئے ہیں کہ قاری کی ساری توجہ عورت ذات پر مرکوز ہوتی ہے۔افسانے میں کئی نسوائی کردار موجود ہے جو اپنی منفرد نفسیات کے ساتھ کہانی میں اُبھرتے ہیں۔ان سب کرداروں کے نسوانی مسائل ہیں۔کہانی کی ہر عورت سماجی ہاتھوں استحصال کا شکار ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ یہاں ایسے معاشری کی عکاسی کی گئی ہے جہاں عورت کا مقام ثانوی ہے۔افسانے میں عورت کی عظمت اور عفت کو یہاں پامال ہوتا ہوا قاری اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔قاری یہاں اس حقیقت سے بھی آگاہ ہوتا ہے کہ

عورت ہی ہر قسم کی آفت کا شمار ہو جاتی ہے۔جنگ ہو یا وبا دونوں صورتوں میں عورت کی عصمت و آبرو کی قربانی کو لازمی قرار دیا جاتا ہے۔افسانے کا کردار 'مائی' پہلی جنگ عظیم میں اپنے پتی سے ہاتھ دھو بیٹھی اور دوسری جنگ عظیم میں اپنے جوان بیٹے کی شہادت دیتی ہے۔غرض جنگ ہاری جائے یا جیتی جائے ایک عورت کے لئے دونوں صورتوں میں نقصان ہی ہوتا ہے۔قدرت نے ایک عورت میں جو محبت اور شفقت داخل کی ہے یہی دراصل اس کی سب سے بڑی فطری کمزوری ہے۔اسی وجہ سے وہ ہر بار داخلی طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔پہلی جنگ عظیم میں مائی کا پتی شہید ہوتا ہے۔اس کا گھر لٹ جاتا ہے۔افسانہ نگار نے بڑی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ اس کی منظر نگاری کی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پہلی جنگ عظیم...... جب اس کا شوہر اس کی جوان آغوش میں صرف ایک ننھی سی جان سونپ کر لڑائی پر چلا گیا تھا۔ وہ اس لئے گیا تھا کہ غریب کسان کی محنت کا پھل زمیندار کھاتا تھا۔ وہ اسے روک نہ سکی تھی۔اس کا حسن، اسکی جوانی اور معصوم بچے کی کلکاریاں اس کے پاؤں کی بیڑیاں نہ بن سکی تھی۔ وہ ننگا بھوکا رہتے تنگ آچکا تھا......لیکن وہ نہ آیا اس کی موت کی خبر آگئی اور اس کے انتظار نے بھی دم توڑ دیا۔'' (خواتین کے نمائندہ افسانے: محمد قاسم صدیقی 'مرتب' ص ۴۲۳۔۲۲۴)

مائی کے شوہر کو جنگ کھا گئی۔مائی نے اپنی جوانی کے سارے حسین پل تنہا گزارے تھے۔خدیجہ مستور نے مائی کی خستہ حالی کے علاوہ اس معاشرے کی تصویر کشی بھی کی ہے جہاں عورت ذات کو بیوہ ہونے پر بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے یعنی سماج میں بُرے لوگوں کا سامنا، بُری نظروں کا مقابلہ۔موجودہ سماج کے مرد ایسی عورتوں کو سہارا دینے کے بجائے ان کا استعمال کرنے کی چاہ رکھتے ہیں۔قاری افسانے میں ایک ایسے سماج کی سیر کرتا ہے۔جسے تانیثی تھیوری میں مرد اساس معاشرہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔یہاں عورت کو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور مرد عورت کو اپنا غلام یا خریدی ہوئی شے سمجھتا ہے۔اس ضمن میں پروفیسر قدوس جاوید رقمطراز ہیں:

> ''مذہبی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی سطحوں پر مرد اور عورت کے حقوق و فرائض کے درجے مختلف ہیں وہ کہیں داسی ہے، کہیں کنیز، کہیں کٹھ پتلی، تفریح کا ذریعہ، کہیں ملکیت گویا عورت ایک شے (commodity) یا طبقے کی طرح ٹائپ ہے اور تابعداری جس کی تقدیر۔'' (متن معنی اور تھیوری: پروفیسر قدوس جاوید، ص ۱۶۵)

افسانے کے سب سے اہم کردار 'مائی' کے سر پر بھی ایسے بادل منڈلا رہے تھے۔لیکن مائی نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنی گرفت میں رکھنے کی از حد کوشش کی ہے۔'مائی' کا کردار یہاں خدیجہ مستور نے کٹھ

پتلی کی طرح نہیں نچایا بلکہ اسے ایک وفادار اور شرم سار عورت کے روپ میں دیکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس کے کردار میں ہمت اور شجاعت شامل کر کے اسے لافانی کر دیا۔جب مائی بیوہ ہو جاتی ہے۔سماج کے کچھ بدضمیر لوگ اسے اپنے جال میں پھنسانا چاہتے تھے۔مگر مائی نے ہمت نہ ہاری۔ڈٹ کر اپنے کچے بوسیدہ مکان میں ایام مفلسی گزارتی رہی۔کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں کیا۔اس نے اپنا ضمیر نہیں بیچا۔ایک عورت ہونے کے باوجود بھی نفسانی خواہشات اور جنسی ضرورتوں سے خود کو محروم رکھا تاکہ سماج میں اُس کا وقار بلند رہے۔اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''وہ رات دن اپنے شوہر کا انتظار کرتی رہتی۔لیکن وہ نہ آیا اس کی موت کی خبر آگئی اور اس کے انتظار نے بھی دم توڑ دیا۔کچھ دن تک وہ ہر طرف غافل ہو کر روتی بلکتی رہی اور پھر اپنی محبت کے اچھے دنوں کی یادگار کو پروان چڑھانے میں خود کو گم کر دیا۔ان دنوں یہ بھی ہوا کہ جب لوگوں نے میدان صاف دیکھا تو ایک ذرا دوڑ لگانے کی کوشش کی مگر اس نے بھی ایسی ایسی پٹخنیاں دیں کہ اچھے اچھے ہمت کھو بیٹھے۔اس کی دنیا اس کا لال تھا۔وہ محنت اور مزدوری کر کے اپنے بچے کو پالنے لگی اور جب سرکار کی طرف سے زندگی کی قیمت ہر ماہ چند سکوں میں چکائی جانے والی تھی تو لوگوں نے دشمنی کر کے اس کا بھی خاتمہ کر دیا تاکہ وہ مصیبتوں سے تنگ آ کر خود کو بیچ دے۔''
>
> (خواتین کے نمائندہ افسانے: محمد قاسم صدیقی 'مرتب۔ص ۲۲۴)

درجہ بالا اقتباس میں خدیجہ مستور سماج کی اس تلخ حقیقت کو بے پردہ کرتی ہے جہاں ایک لاچار عورت کو سماج ہی غلط راہ پر چلنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔سماج ہی ایک شریف عورت کو قحبہ خانوں اور کوٹھوں پر بیٹھنے کے لئے اس کا مقام متعین کرتا ہے۔اور پھر اسی عورت کو یہی لوگ ہدف تنقید بناتے ہیں۔یہ عورت کی لاچارگی ہے جس کا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔اس طرح خدیجہ مستور نے بین المتن میں کئی طرح کی باتیں پوشیدہ کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کیا۔افسانے میں اس فقرے 'مصیبتوں سے تنگ آ کر خود کو بیچ دے' میں ایک پوری کہانی چھپی ہوئی ہے۔اس طرح افسانہ نگار مرد اساس معاشرے پر کئی طرح کے سوالات کھڑا کرتی ہے۔سماج میں رہنے والے مرد اس مظلوم عورت کی مدد بھی کر سکتے تھے۔اس کا سہارا بھی بن سکتے تھے لیکن اس طرح کی سوچ سے سارا سماج خالی نظر آتا ہے۔

مائی سماج کی بُرائیوں کا مقابلہ ہمت سے کرتی ہے یہاں تک ہمت نہیں ہارتی جب تک کہ اس کا بیٹا جوان ہو جاتا ہے۔محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے بیٹے کو پڑھایا لکھایا اور اس قابل بنایا کہ اب وہ شہر جا کر کوئی اچھا سا کام دھندا کر سکے۔یہاں مصنفہ کے ذریعے ایسی باہمت عورت کی تصویر کشی کی جا رہی ہے جو شوہر کی

موت کے بعد مرد بن جاتی ہے اور خود ہر مشکل کا حل ڈھونڈ نکالنے کی ممکن کوشش کرتی ہے۔ اس کا جوان بیٹا شہر جا کر نوکری نہ ملنے سے مایوس ہو جاتا۔ اس کا اثر بوڑھی ماں پر پڑتا ہے۔ وہ اس رات بہت روتی ہے جب اس کے بیٹے کا خط آتا ہے جس میں وہ اصرار کرتا ہے کہ وہ ساتھ سمندر پار جا کر جنگ میں حصہ لینے کے لئے تیاری کرتا ہے۔ مائی کو بیٹے کی اس طرح مایوسی کی توقع نہ تھی۔ اس نے ایک باپ کی طرح اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اس قابل بنایا تھا کہ وہ محنت کر کے ماں اور اپنا پیٹ پال سکتا تھا۔ لیکن وہ بھی اپنے باپ کی طرح حالات سے لڑتے لڑتے تھک کر ہار چکا تھا۔ خدیجہ مستور نے ماں کی نفسیاتی کیفیت کو یہاں جس انداز میں ظاہر کیا وہ ایک حساس قاری کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ ماں پر گزری ہوئی اس صورت حال کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''وہ روتی رہی اور سوچتی رہی کہ اس کا بیٹا جاہل کیسے ہے۔ اس نے اُسے مڈل تک پڑھایا ہے یہاں کتنے مڈل پاس ملازم ہیں۔ اسکول ماسٹر تک مڈل پاس ہیں اور پھر اس نے اپنے بیٹے کو خط لکھوایا کہ وہ آ جائے وہ پھر اسی طرح محنت مزدوری کر کے سب کا پیٹ بھرے گی۔ اب اس میں کام کی طاقت آ گئی ہے۔ اور اب وہ بیکار بیٹھے بیٹھے بھی اُکتا گئی ہے۔ وہ گھر ضرور آ جائے دُلہن اداسی رہتی ہے، اور اس کی گود ہری ہونے والی ہے، مگر وہ نہیں آیا۔''

(ایضا۔ ص ۲۲۵۔ ۲۴۶)

خدیجہ مستور نے اس افسانے میں عورت کے بیشتر مسائل اُبھارے۔ دنیا کی ہر تکلیف مائی کے کردار میں شامل کی۔ مائی کا کردار اس طرح پوری عورت ذات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس نے شوہر کی موت کے بعد خود کمر باندھ کر محنت کی۔ سماج سے کسی قسم کی کوئی مدد نہ ملی۔ اس کے بعد بھی محنت مزدوری کر کے اپنے بیٹے کو جوان کیا۔ بیٹا بھی جب باپ کی طرح جنگ میں مارا گیا تب تک مائی کے کالے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ ایک عورت سے بوڑھی بن چکی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت ختم ہو چکی تھی۔ اس کی کمر ٹیڑھی ہو چکی تھی اور اسی حالت میں اس کی بہو نے اسے دھوکا دیا اور موقع پا کر مائی کے گھر سے فرار ہو گئی۔ ایک بار پھر مائی سماج کے آگے کٹھ پتلی بن کر رہ گئی، اس وقت مائی کو حقیقتاً اس سماج کی اشد ضرورت تھی۔ آخر کار یہ سماج اس ماں کا احسان فراموش کیسے ہو سکتا ہے؟ اسی سماج اور انہیں لوگوں کے لئے اس نے پہلے اپنا خاوند اور پھر اپنا جوان بیٹا کھو دیا تھا، لیکن بدلے میں مائی کو در در کی ٹھوکریں کھانی پڑی۔ ایک مظلوم بے سہارا عورت کی منظر نگاری خدیجہ مستور اس طرح کرتی ہے:

''رو دھو چکنے کے بعد اب صرف ایک سوال بھوت کی طرح اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اب اپنا پیٹ کیسے بھرے گی۔ اب اس سے محنت مزدوری نہ ہو سکتی تھی

۔ اس کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ محلے والوں نے دو چار دن ترس کھا کر اسے دو وقت کھانا کھلا دیا تھا مگر کوئی یوں کب تک کھلاتا...... گھر میں پڑی چپ چاپ رویا کرتی جب کئی کئی وقت خالی پیٹ گزر جاتے تو پھر بلبلا کے گھر سے نکل پڑتی۔ اِدھر اُدھر گھروں میں جا بیٹھتی، کبھی بے مانگے تو کبھی مانگنے کے بعد آدھی ٹکڑا روٹی سے زیادہ ملتی جس سے پیٹ کی آگ تو تھوڑی بہت بُجھ جاتی مگر دل کی آگ زیادہ ہو جاتی جسے آنسوؤں سے بُجھانے کی کوشش کرتی۔'' (ایضاً۔ ص ۲۳۴)

کردار نگاری کے اعتبار سے افسانہ ''محاذ سے دور'' قابل تعریف ہے۔ مائی کے علاوہ افسانے میں بہو اور زمیندار کی بیٹی کا کردار بھی اہم ہے۔ مائی کے بعد سب سے فعال کردار بہو کے روپ میں نظر آتا ہے۔ جب اس کا شوہر مر جاتا ہے وہ بے ہوش گر جاتی ہے۔ چیخ و پکار کرتی ہے۔ آخر وہ بیوہ ہو گی۔ ایک ہندوستانی وفادار عورت کے سارے گُن قاری اس میں پاتا ہے۔ وہ وفا شعاری کی ایک مثال بن جاتی ہے۔ اس رات پتی کے موت کی خبر سنتے ہی اس نے رو رو کر خود کا بُرا حال کیا۔ محلے بھر کی عورتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ سمجھاتی، بہلاتی ہیں مگر بہو پریشان ہو کر اپنے بستے ہوئے گھر کو اُجڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ اس کی دُنیا لٹ چکی تھی۔ ان کا شوہر ان کی گود میں ایک معصوم چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا جاتا ہے۔ اس کی گود میں پلتا معصوم دُنیا کے نشیب و فراز سے بالکل بے گانہ تھا۔ اس طرح خدیجہ مستور نے موت سے ہونے والے منظر کو بڑی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ پیش کیا۔ جب وہ صدمے سے سنبھل جاتی ہے تو ساس کی خدمت میں جُٹ جاتی ہے۔ آخر کار وہ ایک عورت تھی جوان عورت جس کی نفسانی ضرورت تھی۔ وہ ایک جوان عورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی تھی۔ اس کے لئے تنہائی کی راتیں گزارنا بہت مشکل تھا۔ خدیجہ مستور یہاں بہو کے جذبات اور نفسانی زندگی کا احاطہ اشاراتی انداز میں کرتی ہے۔ مائی کی زبان سے بہو کی نفسیاتی الجھن بیان کی گئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ دیکھتی کہ بہو کس طرح کونوں کھدروں میں منھ چھپا چھپا کر رویا کرتی ہے۔ اس کی راتیں کروٹیں بدل بدل کر گزر جاتی ہیں۔ اس کے کپڑے میلے چیکٹ رہتے ہیں۔ وہ سر میں تیل نہیں ڈالتی۔ وہ کنگی نہیں کرتی، اس کے بال بیا کا جھونجھ ہو رہے ہیں اور اسے دنیا کا ہوش نہیں۔'' (ایضاً۔ ص ۲۳۰)

اس طرح یہاں خدیجہ مستور نے اس عبارت سے سماج پر سوالیہ نشان کھڑا کیا ہے۔ یہ وہ سماج ہے جہاں ایک بیوہ کی دوسری شادی کو عزت کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا ہے۔ مرد اس سماج میں ایسی عورتوں کو کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بس اگر مفت ہاتھ آ جاتی تو ٹھیک ورنہ عزت کے ساتھ بیاہ کر لے جانے کے لئے کوئی تیار نہیں تھا۔ یہاں بہو کی کسمپرسی، ذہنی تناؤ اور نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا گیا۔ بہو

نے پہلے پہل ہمت سے کام لیا تھا۔ بہت کوششوں کے بعد وہ ایسا کرنے سے ناکام ہوئی۔ وہ ایک جوان عورت تھی اسے سہارے کے علاوہ اور بھی بہت سی ضروریات تھیں۔ ایسے ماحول میں وہ اکیلی کیسے رہ سکتی تھی جہاں مدد کے لئے کوئی موجود ہی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بہو کے کردار میں تضاد پایا جاتا ہے۔ بالآخر وہ ہمت کھو دیتی ہے اور غیر رسمی طور پر اپنا گھر بار چھوڑ کر منشی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک دن صبح سب کو معلوم ہوا کہ بہو اپنا سب کچھ چھوڑ کر اور صرف اپنے بچے کو لے کر راتوں رات منشی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔''

(ایضاً۔ص ۲۳۶)

''مائی'' کا کردار بہو کے کردار سے بھی فعال نظر آتا ہے۔ سارا افسانہ اُسے کے اِردگرد گھومتا ہے۔ کہانی میں مائی کی زندگی کے کئی گوشے دیکھائے گئے ہیں۔ مائی کی جوانی سے لے کر بڑھاپے تک کے سارے دورناک حادثات و واقعات کو کہانی کار نے افسانے میں اُجاگر کیے ہیں۔ کبھی خاوند کے مرنے کا غم، کبھی جوان بیٹے کے مرنے کا الم تو کبھی بہو کی بدمزاجی کا شکار ۔ زندگی کے نشیب و فراز کا زیادہ اثر مائی پر پڑتا ہے۔ ان حادثات میں اُس کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ خدیجہ مستور نے مائی کے کردار کو دُکھ درد، پریشانی اور مایوسی سے مالا مال کر دیا۔ مائی نہ بیوی رہی، نہ ماں اور ساس بن کر بھی ساس بن نہ سکی۔ وہ دُکھ اور پریشانیوں کے تھپیڑے کھاتی رہی۔ قاری کا ذہن افسانہ پڑھتے ہی مائی کی طرف فوراً مائل ہوجاتا ہے۔ دیکھا جائے تو مائی کا کردار دوسرے اہم افسانوں کے نسوانی کرداروں سے کم تر نہیں ہے۔ آخری کوشش (حیات اللہ انصاری) کی ماں اور کفن (پریم چند) کی بدھیا بھی اسی نوعیت کے کردار ہیں۔ عورت ذات پر ظلم و جبر کے علاوہ جتنے بھی سماجی تکالیف ہیں وہ سارے مائی پر برس جاتے ہیں۔ اس طرح یہ افسانہ تانیثیت کے اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ افسانے میں عورت ذات کے بنیادی مسائل پر کھل کر لکھا گیا۔ خدیجہ مستور ایک نسوائی افسانہ لکھنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Lecturer Dept'of Urdu,Kashmir University(South Campus)Anantnag(Kashmir)-192211
9797214572

- **مضمون**
- **ڈاکٹر مہناز کوثر**

بانو قدسیہ اور معاصر خواتین افسانہ نگار

بانو قدسیہ نے جب افسانے کی دنیا میں قدم رکھا اور لکھنا شروع کیا تو اس وقت اردو افسانہ اپنی کئی منزلیں اور جہتیں مکمل کر چکا تھا۔ پریم چند، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد علی، سید رفیق حسین خواجہ احمد عباس اور کئی دوسرے اردو افسانے کو اپنی افسانوی تخلیقات سے ثروت مند کر چکے تھے۔ وہ اردو افسانے کا شاندار اور کامیاب دور تھا۔ حقیقت نگاری، رومانوی انداز، ترقی پسندانہ انداز اور حلقہ ارباب ذوق کے لکھاریوں کا انداز افسانے کا حصہ بن چکا تھا۔ اس متنوع اور کامیاب افسانے کے دور کو مولانا صلاالدین احمد نے اردو افسانے کا ذریں دور قرار دیا ہے۔

''اردو افسانے کے اس قدر روشن آسمان میں کس نئے ستارے کی آمد بظاہر اس کے مطلع ادب پر طلوع ہونے کی خبر بھی نہ دیتا، لیکن ۱۹۳۰ء میں بانو قدسیہ کا افسانہ ''واماندگی شوق'' ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' میں شائع ہوا تو انہوں نے ایک نئے قطبی ستارے کی افسانے کے آسمان پر طلوع ہونے کی خبر بھی دی۔ اس افسانے نے قارئین کی غیر معمولی توجہ کھینچی تو اس کی ایک وجہ شائد یہ بھی تھی کہ اسے ایک لڑکی نے لکھا تھا۔ جو ایم۔اے اردو کی طالبہ تھی۔ لیکن یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس وقت تک عصمت چغتائی نے خواتین افسانہ نگاروں کے لیے اس فن کے راستے کے بہت سے کانٹے چن لیے اور انھیں قلم آزمائی کے لیے ایک کشادہ میدان فراہم کر دیا تھا اردو افسانے کی تاریخ یہ حقیقت بڑی دلچسپ ہے کہ پچاس کی دہائی میں تسنیم، سلیم چھتاری، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، الطاف فاطمہ، پروین سرور، شکیلہ اختر، جمیلہ ہاشمی اور بانو قدسیہ کچھ اس بلند بانگ انداز میں وارد ہوئی کہ ان کے سامنے بہت سے مرد افسانہ نگار بھی پسپا ہوتے نظر آئے۔ اہم بات یہ ہے کہ کہ متذکرہ خواتین اعلیٰ تعلیم سے سرفراز تھیں۔ چناچہ انھیں عصمت کے بعد تمام اصنافِ افسانہ، ناولٹ ناول، اور ڈرامہ پر قدرت رکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کے تخلیقی عمل کا زمانی دورانیہ بھی ۱۹۵۵ء تا ۲۰۰۸ء بہت سی خواتین افسانہ نگاروں سے زیادہ ہے۔ وہ اب تک فن کی تخلیق میں سرگرم عمل ہیں اور اب پوری ادبی دنیا کی ''بانو'' آپا ہیں۔''

بانو قدسیہ ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء کو متحدہ پنجاب کے شہر فروز پور میں پیدا ہوئیں۔ ان کا تعلق جاٹ خاندان کی چٹھہ شاخ سے ہے۔ جس کے بیشتر ارکان کا تعلق کھیتی باڑی اور زمینداری کے پیشے سے تھا۔ والدہ نے ان کا نام قدسیہ بانو رکھا تھا لیکن وہ ادب میں بانو قدسیہ کے نام سے معروف ہوئیں ان کا پہلا افسانہ اس نام سے چھپا تھا۔ ان کے والد کا نام بدرالزماں تھا۔ ایگری کلچرل یعنی زراعت کے شعبے میں بی ایس سی کی ڈگری لینے کے بعد انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی اور متحدہ پنجاب کے ضلع میں ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ بدرالزماں کو گوڑسواری کا شوق تھا۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہیں کی۔۔ قدسیہ بانو اوائل عمری کے چھوتھے سال سے گزر رہیں تھیں کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ پسمندگان میں ان کی والدہ مسز ذاکرہ چٹھہ، بڑا بھائی پرویز چٹھہ اور خود قدسیہ بانو شامل تھیں۔ اس وقت ان کے بھائی کی عمر تقریباً پانچ برس تھی۔ بانو قدسیہ کی والدہ کی اس وقت عمر محض ۲۷ برس تھی جب بانو قدسیہ کے والد نے وفات پائی، ان کی والدہ نے اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنی تعلیم مکمل کی اور انھیں ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹرس کی نوکری مل گئی۔۔ اس وقت بانو قدسیہ اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ضلع کانگڑہ کے خوبصورت شہر شہر دھرم شالہ میں منتقل ہو گئیں۔ یہ شہر اس لحاظ سے اہم تھا کہ فوجی چھاونی پر مشتمل تھا۔ یہ شہر بانو قدسیہ کی یادداشتوں میں ہمیشہ ایک خوبصورت شہر کی مانند موجود رہا۔ وہ اپنے بچپن کے شہر کو جہاں ان کی زندگی کے حسین اور یادگار دن گزرے یوں بیان کرتی ہیں۔ بقولِ انور سدید:۔

''یہ ۱۹۳۷ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں دھرم شالہ کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ لیکن اس تھوڑے سے معمورے کے لیے بجلی، پکی سڑکیں، سول ہسپتال، سینما گھر لڑکے اور لڑکیوں کے لیے دسویں تک سکول بمعہ ایک عدد انگریز ہیڈ ماسٹر کے موجود تھا۔ ایک ایسا کلب بھی تھا جس میں فیشن ایبل افسران ٹنس برج اور بیڈ منٹن کھیلتے تھے۔ کلب مخطوط تھا اور اس میں کچھ آزاد خیال پڑھی لکھی اور امیر خواتین بھی برابر کی ممبر تھیں۔ پانچ ہزار کی آبادی کے لیے تہذیبی طور پر تو حکومت نے بہت سی عنایات کر رکھی تھیں، لیکن ان پہاڑی علاقوں کی شامیں پھر بھی اداس رہا کرتی تھیں۔ پہاڑوں میں عموماً شام پڑتے ہی شہر سنسان ہونے لگا ہے اور پہاڑی لوگ اپنے اپنے گھروں پر لوٹنے پر پہاڑوں کو اندھیروں میں ڈوبنا پسند کرتے ہیں''

بانو قدسیہ نے لکھنے کی ابتداء ۱۹۴۷ء کے بعد کی۔ ان کے ذہن پر گرداسپور سے پاکستان تک کی ہجرت کے اثرات زیادہ تھے۔ بی اے تک تعلیم یافتہ اس لڑکی کی سوچ معاشرے کے مسائل اور انسانوں کے دکھ سکھ کا تجزیہ کرتی تو اس کے ذہن میں ایک کہانی صورت پزیر ہونے لگتی جسے وہ کاغذ پر بھی اتارلیتی تھی۔ اشفاق احمد سے کالج کی زندگی کے دوران تعارف ہوا تو وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی آزاد فضا اور مخطوط تعلیم سے اعتماد کی دولت سے سرفراز ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر انوار سدید نے بانو قدسیہ کو اپنی کتاب ''اردو افسانہ

ایک صدی کا قصہ'' میں رابعہ بصری کہا ہے اپنے اس مضمون میں انہوں نے بانو قدسیہ کے بارے میں بہت اہم خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''ابتدا میں بانو قدسیہ کو اس حوالے سے پہچاننے کی کوشش کی گئی کہ وہ اشفاق احمد کی بیوی ہیں، لیکن بہت جلد انہوں نے اپنی انفرادیت کو منوالیا اور ساتھ ہی اپنے تخلیق کار اور نظریہ ساز شریکِ سفر کا ساتھ بھی احساس تفاخر سے دیا۔ ان کے افسانوں میں معاشرتی شعور کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بصیرت اور متصوفانہ رنگ کی جھلک بھی ہے۔ کہیں کہیں ان کے ہاں بے باک دہقانیت بھی ملتی ہے جو عریانی کو نخش نہیں ہونے دیتیں۔ بانو نے اشیاء اور محسوسات وافکار کے بطن میں جانک کر اپنے عہد کے معنی دریافت کرنے کی کوشش کی اور یہ جھانکنا فطرت کا تقاضا تو ہوگا ہی مگر انھوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ تجسس اور اضطراب ایک دردمند اور باشعور شخص کا ہے۔''

بانو قدسیہ کی شہرت کا آغاز ان کے مشہور افسانہ 'کلو، سے ہوا اور تب سے اب تک ان کے افسانوں میں مرد اور عورت کی معاشرتی روحانی اور جسمانی روابط نت نئی کروٹیں لیتے نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے عورت کی آدھی دنیا کو جس طرح اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے یہ انھیں کا حق ہے۔ بانوں قدسیہ کے افسانوں میں نئی اور پرانی اقدار کا تصادم اور رسم ورواج کی جکڑ بندیاں، ازدواجی زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط اور منسلک ہیں کہ انھیں الگ الگ خانوں میں بانٹ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ بانو قدسیہ کے افسانوں کی عورت پڑھی لکھی ہے اور وہ مردوں کے معاشرے میں ان کے ساتھ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے فرائض نبھاتے ہوئے پائی جاتی ہے۔ اور اس کے اندر وہ نسوانی قوت بھی جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''پہلے پہل جب وہ شیریں سے ملا اور اس کے زوردار قہقہے سے چونکا تو اس کا یہی خیال تھا کہ وہ ہرنی کی طرح آزاد قدم، بندر کی طرح بے قرار اور کھٹ بڑی جیسی بے قرار ہے۔۔ ان دنوں شیری ایک ڈیلی اخبار میں ملازم تھی۔ وہ جمعہ کے روز رنگین صفحوں میں شہر کے پریشر گروپ میں سے چیدہ چیدہ لوگوں کے انٹرویو چھاپا کرتی تھی۔ اس ہی سلسلے میں اس کی ملاقات افتخار کے دفتر میں نیلی آنکھوں والی دراز قد شہزاد داخل ہوئی تھی۔ تو افتخار نے کافی دیر کے بعد اسے یوں دیکھا جیسے وہ کسی چیلنج سے بھرپور پروجیکٹ کی فیزیبلٹی رپورٹ دیکھا کرتا تھا۔''

بانو قدسیہ کے افسانوں کی عورت اپنے بچوں سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ وہ ممتا کے خالص جذبے سے معمور ہے۔ وہ بچوں سے اس انداز سے محبت اور شفقت کرتی ہے کہ اس کا شریکِ حیات اپنی بیوی کے نقشِ قدم پر چل کر بچوں سے والہانہ محبت کرنے لگتا ہے اور بچوں کے ساتھ بیوی کا دیوانہ بن جاتا ہے۔

''ابھی محبت کا سورج نصف النہار پر تھا کہ تینوں آ گئے۔ چونکہ سکندرہ کے محبوب بچے تھے اور سکندرہ تک پہنچنے کا واحد راستہ بچے ہی تھے اس گھر آتے زاہد بھی کسی کو دودھ پلاتے کسی کا نیپکین بدلتا۔ پہلے

چند سالوں میں ہی ان تینوں کو اپنی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا چونکہ زاہد کو سکندرہ سے عشق تھا اور سکندرہ بچوں کی دیوانی تھی۔ اس لیے زاہد کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کب اور کیسے وہ محبوب کے محبوب کا غلام ہو گیا۔ بچوں کو لمبیڈ راؤ پر لے جانا، پارک میں گھنٹوں کھلانا، باجے بجا بجا کر بچوں کو بہلانا ہر طرح کے گانے سنانا کندھے سے لگا لگا کر تھپکنا اور سلانا زاہد کے محبوب مشاغل تھے۔''

بانو قدسیہ کا سماجی زندگی کا بہت گہرا مطالعہ ہے، وہ گھروں میں روزمرہ کے واقعات کے بیان کا بہت گہرا شعور رکھتی ہیں۔ بانو قدسیہ سماجی زندگی کے ہر پہلو کا بخوبی مطالعہ اور مشاہدہ رکھتی ہیں۔ وہ اپنے اس افسانے میں ایک ایسی کیفیت کو بیان کرتی ہیں جو ایک ماں کی اپنی ان بیٹیوں سے متعلق ہے جو ماں کو بھری بستی میں بدنام کر جاتی ہیں۔ بانوں قدسیہ نے جس انداز سے اس ماں کی تصویر کشی کی ہے، وہ اس بات کا اشارہ ہے یہ بانوں قدسیہ اپنے نسوانی کرداروں میں ڈوب کر لکھتی ہیں۔

'' کچی بستی کے لوگ سمجھتے ہیں کہ صوباں کا باغ ہل گیا ہے۔ وہ کبھی نہیں پوچھتی کہ رجو اور روبینہ کس کے ساتھ بھاگی تھیں۔ وہ یہ بھی نہیں جاننا چاہتی ہیں کہ انہیں اغوا کرنے یا ورغلانے والا کون تھا۔ وہ کبھی ٹیوب ویل والے بڈھے سائیں کے پاس جا بیٹھتی ہے۔ کبھی جمیلہ سے جا پوچھتی ہے کبھی چاچا غفور کی سائیکل روک کر کہتی ہے۔ چاچا تیرا کیا حال ہے وہ اس وقت گئی تھی جب ٹرانسفارمر جلا ہے وہ اس وقت بھاگی ہیں جب بڈھے سائیں کا کتا بھونکنے سے بند ہوا۔ کبھی وہ تھانے دار کے پاس بیٹھ کے بڑے دکھ سے کہتی ہیں، لو بھلا میں کب پوچھتی ہوں کہ مجھے یہ بتاؤ کس کے ساتھ گئی تھیں۔ میں تو بس اتنا جاننا چاہتی ہوں کہ رات کا پہلا پہر تھا کہ پچھلا؟ تھانیدار صاحب آپ مجھے اتنا نہیں بتا سکتے۔ میں کوئی انصاف تھوڑی مانگتی ہوں۔''

بانو قدسیہ کی معاصر افسانہ نگار خواتین میں نیلم احمد بشیر، نیلوفر اقبال اور زاہدہ حنا وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ نیلم احمد بشیر کے ہاں ہمیں جس عورت کا خاکہ ملتا ہے وہ امریکہ پلٹ یا امریکی معاشرے کی تقلید میں پروان چڑھنے والی عورت کا ہے۔ نیلم کے ہاں عورت کا دکھ اس کی گھر داری کے خاتمے کا ہے یا پھر اس کا معاشرے میں آزادانہ جنسی روابط کے فروغ کا ہے۔ نیلم چونکہ امریکہ میں چودہ سال قیام کر کے وطن لوٹی تھی اور پھر وطن عزیز میں وہی امریکہ کی ثقافت کی یلغار دیکھی تھی۔ جس کا بیان انھوں نے عورت کو مرکزی موضوع بناتے ہوئے کیا تھا لیکن بانوں کے یہاں معاملہ مختلف ہے۔ بانوں کے ہاں مشرق کی رومان انگیز فضا موجود رہی ہے۔ بانو کے تمام افسانے مشرق کی دھرتی سے پھوٹتے ہیں یعنی بانو اپنے افسانوں کا خمیر مشرق میں ہی تیار کرتی ہے۔ زاہدہ حنا کے ہاں ہمیں جس عورت کا تصور ملتا ہے وہ قدرے بیباک ہے اور مذہب پر بھی کڑی تنقید کرتی ہے۔ لیکن بانو کا معاملہ مختلف ہے۔ بانو کہ ہاں مذہب کی تقدیس قائم رہی ہے اور ان کے افسانوں پر تصوف کے بادل بھی سایہ کیے رہتے ہیں بانوں نے عورت کی زندگی کے معاشرتی

مسائل کو اس کے رومانی مسائل اور جنسی مسائل کے ساتھ ملا کر لکھا ہے اور کچھ ایسا ہی ہمیں نیلوفر اقبال کے ہاں بھی نظر آتا ہے۔

بانو کے افسانوں میں ابھرنے والی عورت کئی اشکال میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ بانو کی عورت اپنی جنسی طاقت سے آگاہ ہے اور اسی قوت کا استعمال کرنا بھی جانتی ہے۔ اس کے لیے عورت کا حسین ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ خود آگاہ ہونا ضروری ہے۔ بانوں کی عورت نے وہ منزل پالی ہے جس کی بیسویں صدی کے ابتدائی افسانہ نگاروں نے آرزو کی تھی۔ بھانوں کے افسانوں میں ابھرنے والی خواتین کے کرداروں کا جائزہ درج ذیل ہے۔ بانوں کے پہلے افسانے ''واماندگی شوق'' کی پولی ایک ایسی لڑکی ہے جس کے جسم میں بلاغت کی لہر بیدار ہو چکی ہے وہی کالج کی لڑکی ہے۔ بانو پولی سے ہمارا تعارف یوں کرواتی ہیں۔

'پولی درمیانے قد کی دبلی سی لڑکی تھی۔ صاف کھلتا ہوا گندمی رنگ، اور صابن کی طرح ملائم جلد، اسے چٹی گوری، کشمیری لڑکیوں میں بھی ایک امتیازی حیثیت بخشتی تھی لیکن پولی کے پاس سب سے خوبصورت چیز اس کی آنکھیں تھیں، جس کی طرف ایک آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی، وہی اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ پھر بھی مجھے تعجب ہے کہ کوئی لڑکا اس کے پیچھے دیوانہ نہ ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے اکیلی سائیکل پر کالج آتی اور ویسے ہی چلی جاتی۔ اس کی یہی شربتی آنکھیں عموماً غم ناک رہا کرتی تھیں۔''

بانو کا یہ کردار دوسرے کرداروں سے انفرادیت کی بدولت افسانے کی راوی لڑکی کے دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔ بانو کا یہ کردار جنسی کھلونہ بننے کا آرزومند بالکل نہیں ہے۔ جس طرح کے تجربات بانو کی ہمعصر افسانہ نگار خواتین کر رہی تھیں۔ بانو کا رویہ ان سے قدرے مختلف ہے۔ زاہدہ حنا کے ہاں ابھرنے والے خواتین کردار معاشرتی پابندیوں کی توڑ کر کھل کھیلنے آرزومند ہیں۔ مگر بانو کا یہ کردار جو ایک عام سی قبول صورت لڑکی کا ہے، رومان کے دور میں بھی مقصود سے ایک فاصلے پر دکھائی دیتا ہے۔ مقصود جب پولی کو لاہور چلنے کی دعوت دیتا ہے تو پولی اس کی یہ آفر یہ کہہ کر ٹھکرا دیتی ہے۔

''آخر تم نے ایسی بات کہی ہی کیوں؟''

''جی چاہا بس.....!''

''مجھے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ جانتے ہو میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ میں کوئی کھلونا ہوں؟''

بانو کے نسائی کرداروں میں ہر قماش کی خواتین کے کردار مل جاتے ہیں۔ ان میں کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں بھی ہیں۔ معاشرے کی ٹھکرائی ہوئی خواتین بھی ہیں اور نوجوان بیاہتا عورت بھی ہے۔ غرض ان کے افسانے ہر طرح کی عورت کی نمائندگی کرتے ہیں ''موجِ مخیط آب'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو شادی کے خوابوں کی تعبیر اپنی بہنوں کی شادیوں کی پہلی رات کی تعبیر سے بنتی ہے۔ لیکن جب اس کی شادی ہوتی ہے تو

پہلی رات ہی سارا خواب چکنا چور ہو جاتا ہے۔ یہ مینا کی کہانی ہے جو شب زفاف سے اٹھی تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے زبردستی اسے کھاری بوتل میں ریت ملا کر پلا دی۔ اس کا سارا جسم کسی ایسے پہلوان کی طرح جھوٹا پڑ گیا تھا جو اوپر تلے ایک ہی دنگل میں تین چار بار پچھاڑیں کھا کر گرا ہو۔ اس نے اپنی شادی کے لیے زیور اپنے شوق سے تیار کروایا تھا۔ مینا کے کردار میں بانو نے مشرقی لڑکی کی سائیکی کو اچھی طرح بیان کیا ہے۔ مینا جو ایک مشرقی عورت کا کردار ہے شوہر کی شدید تکلیف دینے والی باتیں سن کر بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ بانو قدسیہ کے افسانوں میں عورت اور مرد کے معاشرتی روحانی اور جسمانی ایک نئے انداز سے محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے عورت کے معاملات اور مسائل کو جس طرح اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے، وہ انہی کا خاصہ ہے۔

بانو کی معاصر خواتین افسانہ نگاروں میں زاہدہ حنا نے اپنے افسانوں میں مشرقی تہذیب کے سائے میں پروان چڑھنے والی عورت کو موضوع بنایا ہے۔ مشرق میں مرد کی برتری میں کوئی شک نہیں لیکن اس کے ساتھ ایک اور ظلم نام نہاد مذہبی ملاؤں کی طرف سے بھی عورت پر وار کھا جاتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی 'بہشتی زیور' میں جس طرح عورت کی تعلیم و تربیت کا درس دیا گیا ہے وہ ایک عورت کی زندگی خاک بنانے کے لیے کافی ہے اس طرح نہ جانے اور کتنی کتابیں ہیں جو عورت کو مقید کرنے اور کم تر درجے کی شے ثابت کرتی ہیں۔ زاہدہ حنا کے ہمیں جو فکر کارفرما ملتی ہے وہ ایک لبرل اور ترقی پسند سوچ ہے۔ اس لیے ان کے افسانوں میں جس عورت کے نقوش ملتے ہیں وہ بھی لبرل اور ترقی پسند ہے۔ وہ مشرق کی شوہر پرستی کو برداشت نہیں کرتی اور نہ ہی چادر میں لپٹی لپٹی مشرقی عورت کو جسے عزت کے نام پر چادروں میں لپیٹ دیا گیا ہے۔ عورت کو مرد کی کھیتی تصور کرنے والوں کے سامنے وہ نہایت جرات مندانہ طریقے سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ان کا ایک افسانہ 'جل ہے سارا جال' ان کی جرات و بے باکی کا عمدہ نمونہ ہے اس افسانے میں ایک عورت کو پیش کیا جاتا ہے جو مرد کی کھیتی ہے اور مرد اسے اپنا نفع حاصل کرنے کے لیے مقدس عربوں کے ہاتھ دے دیتا ہے۔ اس تناظر میں افسانے کی چند سطور ملاحظہ فرمائیں۔

''ارم کو شادی کے بعد اندازہ ہوا کہ کسی عرب شاہزادے کی بیوی ہونا کوئی ہنسی ٹھٹھول نہیں۔ وہ اس کی منکوحہ تھی اور عرب شاہزادے کے بقول وہ اس کی کھیتی تھی اور کھیتی اس بات کی مجاز نہیں کہ وہ ہل چلانے والے کو اس بات پر ٹوکے کہ ہل کھیتی کے آغاز پر چلایا جائے یا اختتام سے۔''

عصرِ حاضر میں زاہدہ حنا معاشرے میں خواتین کے ساتھ ہونے والے مظالم کی ایک توانا آواز بن کر ابھری ہیں۔ ان کے افسانوں میں ہمیں ان سب خواتین کا ذکر ملتا ہے جو مشرق میں ظلم و جبر کا شکار ہوئی ہیں۔ ان کی آواز میں اتنی قوت و طاقت ہے کہ اس کے سامنے ظلم کرنے والے بونے معلوم ہوتے ہیں۔ زاہدہ حنا کے ہاں جو عورت نظر آتی ہے وہ ایک ذہین اور پڑھی لکھی، باشعور عورت ہے وہ نہ صرف حال

اور روح عصر کا شعور رکھتی ہے بلکہ، ماضی اور مستقبل کا بھی گہرا شعور اور اس کی بصیرت رکھتی ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانوں کی خواندگی احساس دلاتی ہے کہ وہ ایک رومانی طرز کی لکھنے والی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے ہاں جو عورت ہے وہ اپنے جسم اور اپنی روح پر سینکڑوں پابندیوں اور ناانصافیوں کے زخم رکھتی ہے۔ اس کے جسم اور روح زخم اور معاشرے کے دیے ہوئے ہیں ایسے معاشرے کے جو عورت کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے عاری ہے۔ جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ زاہدہ حنا کے افسانوں کی عورت ایک پڑھی لکھی عورت ہے یوں اس کا المیہ بھی اسی نوعیت کا اور شدید انداز کا ہے۔ زاہدہ حنا کے افسانوں کی عورت کیوں پڑھی لکھی ہے ؟ دراصل زاہدہ حنا عورت کی تعلیم کی جنگ لڑتی ہیں اور اس بات کی حامی ہیں کہ عورتوں کی تعلیم کے بغیر معاشرہ اور سوسائٹی ترقی نہیں کر سکتی ۔

نیلوفر اقبال نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۸۰ء میں کیا۔ خواتین افسانہ نگاروں میں انہوں نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیت اور فنی ریاضت کی بدولت اپنا مقام بنا لیا۔ نیلوفر کا تعلق قیامِ پاکستان کے بعد وجود میں آنے والی خواتین افسانہ نگاروں کی کھیپ سے ہے۔ نیلوفر اقبال کے افسانوں میں نہ تو ہجرت کا دکھ ہے اور نہ ہی فسادات کی تلخیاں ہیں۔ ان کی کہانیاں سماجی رشتوں پر تعمیر ہوتی رہتی ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر تعلیم یافتہ عورت کی زندگی کے مختلف مراحل پر لکھا ہے۔ چاہے شادی سے پہلے زمانہ طالب علمی کے مسائل ہوں یا ہاسٹل لائف میں رومان انگیز واقعات کا بیان ہو یا پھر شادی کے بعد کی زندگی ہو جہاں شوہروں کی ابالی طبعیت سے بیویوں کے دل ملول ہوتے رہتے ہیں۔ نیلوفر کے افسانوں میں صرف یہ مسائل ہی جگہ نہیں پاتے بلکہ ان کے افسانے مکمل زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

نیلوفر اقبال کے افسانوں میں نسائیت کا عنصر قدرے زیادہ ہے۔ ان کے افسانوں میں نظر آنے والی عورت محض بے جان عورت نہیں بلکہ وہ ایک ایسے کردار کی حامل ہے جو اپنی جگہ مثالی عورت کے روپ میں ڈھل جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم ان کا افسانہ ''گھنٹی'' پیش کر سکتے ہیں۔ جس میں معمودہ کا کردار ایک مثالی کردار ہے۔ معمودہ اپنے شوہر رشید کے صاحب فراش والد کی دل و جان سے خدمت کرتی دکھائی دیتی ہے اور اس معذوری کے سبب انہیں گھنٹی لے کر دینے کی آرزو دل میں رکھتی ہے تا کہ انہیں کوئی پریشانی یا مشکل ہو تو وہ گھنٹی بجا کر معمودہ کو بلا سکیں۔ مگر ان کا یہ کردار ایسا بھی نہیں جو خدمت میں عظمت تلاش کرے۔ بلکہ یہ ایک ایسا کردار ہے جو ساس اور سسر پر گھر کا دروازہ بند کر دے اور نہ ہی ایسا کردار ہے جو مثالیت کی حدیں عبور کر کے اپنے سسر کی خدمت میں اپنی زندگی کو ضم کر دے۔

'ورکنگ وومن ہاسٹل' میں ایک متعلقہ خاتون رضیہ کا کردار بڑی مہارت سے وضع کیا گیا ہے۔ وہ اپنے بدن پر جو ریاضت کرتی ہے، نیلوفر نے اسے رفتہ رفتہ اس کی ذہنی و جذباتی ابتلا اور اپنے بدن پر ہی

نہیں بلکہ روح پر بھی بہت کچھ سہنے کی ہمت کے ساتھ جوڑ کر غیر معمولی کردار بنا دیا ہے۔ روضہ کا کردار بلا شبہ ایک جاندار کردار ہے کیونکہ یہ کردار معاشرے کی ہر اونچ نیچ پر سوچ بچار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ نیلوفر کے فکر وفن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں۔ ''نیلوفر اقبال کے پاس ممتا کا تخلیقی تجربہ ہے جو ٹوٹے ہوئے گھروں بکھرے ہوئے رشتوں یا سعادت پسند والدین کی عادتوں کے ملبے پر بیٹھے ہوئے بچوں کے دکھوں کو ریزہ ریزہ چننے کی آرزو سے منسلک ہے۔''

زمانہ آج کا ہو یا صدیوں پہلے کا ہر دور میں عورت کے مسائل رہے ہیں۔ کہیں سے جنسی پستی کا سامنا رہا تو کہیں مرد کی برتری کا، کہیں وہ ساس ہے تو کہیں بیوی، مسائل گھر داری کے ہوں یا روزی روٹی کے جنس کے ہوں یا عورت کی شناخت کا مسلہ ہو، نیلا فر اقبال نے اپنے افسانوں میں جزئیات کے ساتھ ان سب مسائل کو پیش کیا ہے، یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان کے افسانے صرف مسائل کا بیانیہ ہی نہیں ہوتے بلکہ آنے والی معاشرتی تبدیلیوں، جن کا شکار عورت رہی ہے، کی گواہی بھی دیتے ہیں۔

◄◄ ● ►►

C/O Tajinder Singh Sunjawan Road
Nawabad Jammu - 180011
7006839303

سہ ماہی

ہندوستانی زبان

مدیر اعلیٰ: سنجیو نگم نائب مدیر: احرار اعظمی

ملنے کا پتہ

۷ رنیتا جی سبھاش روڈ، ممبئی۔۴۰۰۰۰۲ (انڈیا)

● مضمون

● ڈاکٹر افشاں بانو

ظفر کمالی کے تحقیقی تبصرے

''تحقیقی تبصرے'' ظفر کمالی کے اُن تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جنھیں وقتاً فوقتاً ۱۹۸۸ء سے لے کر ۲۰۱۶ء تک انھوں نے لکھے ہیں۔ اس کتاب میں کُل گیارہ مضامین ہیں جن کی صنفی حیثیت تحقیقی ہے۔ اِن میں تین تبصرے ان کتابوں پر کیے گئے ہیں: رشید حسن خاں کی ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ''، حنیف نقوی کی ''تحقیق وتدوین: مسائل ومباحث'' اور ابوالبرکات کربلائی کی ''قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ''۔ ان تبصروں سے ظفر کمالی کے تربیت یافتہ تحقیقی ذہن کو سمجھا جا سکتا ہے۔ تحقیق کیسی ہونی چاہیے، کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے کن باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے؛ ایسے چند نکات ان میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

☆ تحقیق کے اصولوں میں سب سے پہلا اور بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ جس زبان میں تحقیق کرنا چاہتے ہیں، اسے اچھی طرح جانتے ہوں۔ [ص:۱۵۳]

☆ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے کی اساسی شرط یہ ہے کہ مصنف اس پر پوری دسترس رکھتا ہو۔ موضوع اگر شعری ادب سے متعلق ہو تو اس کی ذمے داریوں میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے مثلاً وہ موزوں طبع ہو، اوزان وبحور اور شاعری کی مبادیات سے واقف ہو اور مثالیں پیش کرتے وقت صحّتِ متن کا پورا خیال رکھ سکتا ہو۔ [ص۱۳۲]

☆ تحقیق کا بنیادی اصول ہے کہ اس کی ابتدا شک سے ہوتی ہے۔ اس میدان میں خوش عقیدگی کی کوئی جگہ نہیں۔ [ص:۱۳۰]

☆ صداقت بیانی تحقیق کی بنیادی شرط ہے۔ [ص:۹]

☆ تحقیق کی دنیا میں محسن کشی اور احسان فراموشی کوئی قدرِ مشترک کا درجہ نہیں رکھتیں بلکہ محقق کا براہِ راست تعلق حقائق سے ہوتا ہے خواہ اس کی زد میں اس کا محسن ہی کیوں نہ آتا ہو۔ [ص:۷۲]

یہ تو تھے خود ظفر کمالی کے الفاظ، ساتھ ہی انھوں نے خود بھی کچھ ایسے نکات اپنی تحریر میں شامل کیے ہیں جو ہمارے معتبر محققین کے قلم سے نکلے ہیں۔ دو نکات پیش ہیں:

☆ جس تخریب کے بطن سے تعمیر کی کوئی صورت نمایاں ہو، وہ تخریب نہیں، اصلِ تعمیر ہے [رشید حسن خاں][ص:۵۷]

☆ اغلاط کی نشاندہی میں کسی بڑے نام سے مرعوب نہ ہوئیے۔ بڑوں کی غلطی کی تصحیح اور زیادہ ضروری ہے کیوں کہ ان کے نام اور مقام کی وجہ سے قاری ان پر جلد ایمان لے آتا ہے۔ اس غلط اعتقادی کا سدِ باب ہونا چاہیئے''۔[گیان چندجین][ص:۱۱]

رشید حسن خاں اور گیان چیدجین کے یہ جملے اس کتاب کے لیے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ ظفر کمالی نے اپنی اس کتاب میں چار تبصرے ایسے شامل کیے ہیں جو بالواسطہ کتابوں پر نہیں بلکہ کتابوں کے تبصروں پر یا پھر مضامین پر تبصرہ ہیں۔ اس میں سب سے پرانا مضمون ''قاضی عبدالودود اور گیان چندجین'' ہے جو کہ اکتوبر ۱۹۹۵ء میں زبان وادب، پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ گیان چندجین کے مضمون ''قاضی عبدالودود اور میں'' پر یہاں تبصرہ کیا گیا ہے۔ گیان چندجین نے اپنے اس مضمون میں قاضی عبدالودود کے متعلق کئی اعتراضات کیے ہیں۔ ظفر کمالی نے اپنے اس تبصرے میں اُن تمام اعتراضات کے مدلل جوابات تحقیق کی روشنی میں پیش کر دیے ہیں۔ اسی طرح فروری ۱۹۹۷ء میں 'شاعر' ممبئی میں اُن کا تبصرہ ''غلطی ہائے مضامین: ایک تبصرے پر تبصرہ'' شایع ہوا تھا۔ ''غلطی ہائے مضامین'' سید شاہ عطاء الرحمان عطا کاکوی کی کتاب ہے۔ اس کتاب پر گیان چندجین کا تبصرہ 'شاعر' بمبئی میں ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ظفر کمالی نے گیان چندجین کے اسی تبصرے پر تبصرہ کیا ہے۔ عطاء الرحمان عطا کاکوی نے اپنی اس کتاب میں اُن اغلاط اور تسامحات کی نشاندہی کی ہے جو انھیں دورانِ مطالعہ کتابوں اور رسائل میں نظر آتے گئے تھے۔ گیان چندجین نے اس کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے یہ اعتراض کیا ہے کہ ''محض خوبیوں پر اکتفا کرنا بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا محض غلطیاں گنانا''۔ ساتھ ہی انھوں نے عطاء الرحمان عطا کاکوی کی اس کتاب میں غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اُن کی تصحیح کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ جب کہ ظفر کمالی نے تحقیق سے روشنی مستعار لیتے ہوئے ایسی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اُن کی تصحیح بھی کی ہے جسے گیان چندجین نے عطاء الرحمان کاکوی کی غلطی بتایا ہے یا پھر جین صاحب کو خود ہی سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ یہاں ظفر کمالی کے یہ جملے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

☆ اُن کا یہ کہنا درست ہے کہ کسی کتاب یا مقالے پر تبصرہ لکھنا ہو تو اس کے دونوں پہلو پیش کیے جائیں لیکن تحقیق میں کسی نے صرف غلطیوں کی نشاندہی پر اکتفا کیا تو اس وجہ سے اس کی تحریر پر معترض ہونا بھی ٹھیک نہیں۔[ص:۱۲]

☆ جین صاحب کا یہ خیال بھی مناسب نہیں کہ کسی موضوع پر لکھتے وقت ہی اس موضوع سے متعلق تحریروں میں جو تسامحات نظر آئیں، ان کی اصلاح کرنی چاہیے۔ عبدالقادر سروری نے صبا کو آتش

کے بدلے ناسخ کا شاگرد لکھا، سید شمس اللہ قادری نے اشتیاق نامی شخص کو ولی اللہ محدث دہلوی سمجھ کر بے سروپا باتیں لکھیں، ''خوش معرکۂ زیبا'' میں ناصر نے شرف الدین پیام کو مصحفی کا شاگرد قرار دیا حالاں کہ جب پیام کا انتقال ہوا، اس وقت مصحفی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ آصف الدولہ کو کوئی اولاد نہیں تھی۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ وہ باپ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے، اس کے باوجود امداد صابری نے آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں کو اُن کا بیٹا بتایا۔ ابنِ فرید نے 'برہانِ قاطع' کا مصنف مرزا قتیل کو ٹھہرایا، گیان چندجین نے بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر رسید محمود کو سرسید کا بیٹا لکھ دیا، حکم چند نیّر نے سودا کے ایک مخمس کو قصیدہ سمجھ کر ''انتخابِ قصائد'' میں شامل کرلیا؛ ان تمام اغلاط کی تصحیح عطا کاکوی نے ''غلطی ہائے مضامین'' میں کی۔ اگر وہ جین صاحب کے ہم خیال ہوتے تو جب تک ان موضوعات پر باقاعدہ مضمون نہ لکھتے، غلطیوں پر خاموش ہی رہتے اور گمراہیوں کا دروازہ یوں ہی کھلا چھوڑ دیتے''۔[ص:۱۵-۱۴]

ظفر کمالی کا دوسرا تبصرہ بہ عنوان ''قاضی عبدالودود کا خودنوشت سوانحی خاکہ اور ڈاکٹر محمد محسن'' اکتوبر نومبر ۱۹۹۸ء میں 'عہد نامہ' رانچی میں شائع ہوا تھا۔ ظفر کمالی نے اپنے اس تبصرے میں بظاہر تو ڈاکٹر محمد محسن کے مضمون 'قاضی عبدالودود کا خودنوشت سوانحی خاکہ' کا جائزہ لیا ہے لیکن ساتھ ہی محمد محسن ہی کے دو اور مضمون ''شخصیت کی تشکیل میں حافظے کی کرشمہ سازی'' [آج کل، دہلی، جون ۸۸-۱۹۷ء] اور ''عملِ تحقیق کی قاضی عبدالودودی روایت'' [زبان وادب، پٹنہ، جنوری-اپریل ۱۹۹۲ء] کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر محمد محسن نے بھی قاضی عبدالودود کے متعلق چند سوالات اٹھائے ہیں اور ظفر کمالی کے لفظوں میں: ''نفسیاتی موشگافیوں سے کام لیتے ہوئے غیر متعلق مباحث چھیڑ کر قاضی صاحب کی شخصیت کو مطعون کیا ہے''۔ محمد محسن کے اس مضمون کا جواب بھی ظفر کمالی نے دلائل کے ساتھ اپنے تبصرے میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی بات اس طرح پیش کرتے ہیں: ''محسن صاحب کو یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ وہ نفسیات کے بڑے عالم ہیں اور یہ کوئی معمولی شرف کی بات نہیں ہے۔ اس میدان میں قاضی صاحب اور کلیم صاحب کی کوئی حیثیت نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اردو ادب کے میدان میں قاضی اور کلیم صاحبان کا مقابلہ ان کی تحریریں کبھی نہیں کرسکتیں۔ اردو ادب میں ان کے مقابلے میں سکہ تو انھیں دونوں حضرات کا چلا ہے اور چلتا رہے گا''۔

اپریل جولائی ۱۹۹۸ء میں 'اسلام اور عصرِ جدید' نئی دہلی میں ''گلستاں کا بابِ پنجم'' عنوان سے کبیر احمد جائسی کا مضمون شائع ہوا ہے۔ ظفر کمالی نے اسی مضمون پر ''گلستاں کا بابِ پنجم اور پروفیسر کبیر احمد جائسی'' عنوان سے تبصرہ کیا ہے جو رسالہ ''آمد'' جنوری تا مارچ ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا ہے۔ پروفیسر کبیر احمد جائسی کے مطابق ''گلستاں'' کا جو بابِ پنجم ہے، اسے اس کتاب میں نہیں ہونا چاہیے۔ ظفر کمالی نے اپنے اس تبصرے میں اس باب میں شامل تمام حکایتوں کا بہ غور جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے:

''انگارے نے اردو فکشن کو ایک نئی حقیقت نگاری سے آشنا کیا جس کے اردو ادب پر گہرے اثرات پڑے۔ شیخ سعدی اردو کے ترقی پسندوں سے کئی سو سال پہلے اپنے عہد کے سب سے بڑے ترقی پسند ادیب و شاعر تھے۔''

ظفر کمالی کے سب سے پرانے دو تبصرے ''ضحاک کا ماخذ'' اور ''بزمِ فرّخ ناٹک'' ہے۔ یہ دونوں تحقیقی مضامین ہیں۔ ضحاک کا ماخذ'' میں محمد حسن کے ڈرامے 'ضحاک' کا اصل ماخذ کیا ہے، کیا یہ ترکی ادیب سامی بے کے ڈرامے کے اردو ترجمے سے ماخوذ ہے جس کا ترجمہ اختر شیرانی نے کیا تھا یا پھر رجب علی بیگ سرور کی ''سرورِ سلطانی'' سے یا فردوسی کے ''شاہنامے'' سے۔ دلائل کے ساتھ انھوں نے اس کی تفتیش کی ہے۔ اسی طرح ''بزمِ فرّخ ناٹک معروف بہ فرّخ سبھا حافظ'' عنوان سے ظفر کمالی نے حافظ محمد عبداللہ متوفی کے ڈرامے کی تفصیلات بتائی ہیں۔ انھوں نے ''ڈراما اور اسٹیج'' کے عنوان سے ایک مضمون شاملِ کتاب کیا ہے جس میں دورِ رواں میں معدوم ہوتے ہوئے اسٹیج کے پیشِ نظر کیا ڈرامے کے لیے اسٹیج ضروری ہے، اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے اردو میں یک بابی اور ریڈیو ڈراموں کے روشن امکانات دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔

''مدرس، تدریس اور تحقیق'' ایک بہت ہی مفصل اور جامع تحقیقی مقالہ ہے۔ آج جس قدر تعلیم پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے، اسی قدر تعلیم کا معیار گرتا جارہا ہے اور تعلیم کے شعبے میں فروگذاشتیں عام ہوتی جارہی ہیں۔ ظفر کمالی نے اپنے اس مقالے میں نصابی کتابوں کے گرتے معیار کا جائزہ لیا ہے۔ ظفر کمالی اِن درسی کتابوں کے متن کو لے کر بے حد فکر مند ہیں۔ ہندستان میں مرکزی سطح پر این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی۔ کے کاموں سے تو وہ کچھ حد تک مطمئن بھی ہیں لیکن صوبائی سطح پر جو درسی کتابیں تیار ہو رہی ہیں، اُنھیں دیکھ کر وہ اردو کے مستقبل کے لیے بے حد فکر مند اور پریشان ہیں۔ اسی مسئلے کو انھوں نے اپنے اس مقالے میں اجاگر کیا ہے اور صوبۂ بہار کے بہار ٹیکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن لمیٹڈ سے شائع شدہ اردو کی نصابی کتابوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب، اردو کی نئی کتاب برائے درجہ ہشتم، اردو کی نئی کتاب حصہ ۹، درخشاں حصہ اول و دوم؛ یعنی کہ پہلی جماعت سے لے کر میٹرک تک کی کئی نصابی کتابوں کا جائزہ لے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ کس طرح اِن نصابی کتابوں کے ذریعہ ہی اردو کا مستقبل تاریک ہو رہا ہے۔ اِن کتابوں میں اس قدر فروگذاشتیں اور تسامحات جگہ پا گئی ہیں کہ اِن کتابوں کو پڑھنے کے بعد طالب علم کا کیا ہوگا، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

کتابوں کی غلطیوں کو کاتب کے سر منڈھنے کا چلن تو پرانا ہے لیکن ظفر کمالی نے بعض جگہوں پر ایسی نشاندہی کر دی ہے جس سے یہ گناہ کاتب کا نہیں بلکہ نصاب تیار کرنے والے ماہرین اور مرتبین کے سر ثابت ہو جاتا ہے۔ اور یہ حال صرف اسکول کی کتابوں کا ہی نہیں بلکہ انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن میں بھی جو کتابیں شاملِ نصاب ہیں، وہاں بھی حالات جدا نہیں ہیں۔ ظفر کمالی نے انٹرمیڈیٹ کے طلبا کے لیے ایک کتاب

'انوارِ ادب' ۲۰۰۵ء اور بی۔ آر۔ امبیڈکر یونیورسٹی، مظفر پور کے بی اے میں شاملِ نصاب کتاب 'انتخابِ قصائدِ ذوق' ۱۹۹۰ء کا بھی جائزہ لے کر صورتِ حال سے واقف کرا دیا ہے۔ جہاں ایک طرف ابتدائی درجات کی کتابوں میں املا، تذکیر و تانیث کی غلطیاں ہیں وہیں اعلا درجات کی کتابوں میں اِن کے ساتھ ساتھ متن کی بھی بے شمار غلطیاں راہ پا گئیں ہیں۔ اختصار کے ساتھ ہی سہی لیکن ظفر کمالی نے یونی ورسٹیوں میں بھی تعلیم کے گرتے معیار کی طرف اپنے اس مقالے میں توجہ دلائی ہے۔ یونی ورسٹیوں کے نصاب کے تعلق سے اُن کا یہ جملہ ملاحظہ کریں: ''جے پرکاش یونی ورسٹی، چھپرہ کے ایم۔ اے۔ کے نصاب۔۔۔۔ حوالے کی کتابوں میں ایک کتاب ''تحقیق کا فن'' بھی ہے جس کا مصنف کلیم الدین احمد کو بتایا گیا ہے''۔ [ص: ۱۶۵]۔ جب نصاب اور نصابی کتابوں کا یہ حال ہے تو پھر تعلیم کا معیار کیا ہو سکتا ہے۔ باوجود اس کے ظفر کمالی مایوس نہیں ہوتے اور اس امید کے ساتھ یہ سوال اٹھاتے ہیں:

> ''کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اگر ضمیر کی آواز پر توجہ دیں، اعزاز و اکرام کی بھاگ دوڑ اور مختلف منفعت بخش کمیٹیوں میں شمولیت کا چکر چھوڑ کر اپنے پیشے کے تئیں ایماندار ہو جائیں تو یہ ہاری ہوئی بازی بھی جیتی جا سکتی ہے۔ زمانہ زندہ قوموں سے ہر لمحۂ گریزاں کا جواب طلب کرتا ہے۔ آخر ہم درس و تدریس اور تحقیق و تنقید کے سلگتے ہوئے سوالوں کو دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے تماشائی بن کر کب تک دیکھتے رہیں گے؟''

آج اردو کے ادبی منظر نامے پر لکھنے والوں کی بہت بھیڑ ہے مگر گہرے تحقیقی انہماک اور وسعتِ علمی کے ساتھ غور و فکر اور علمی معیار کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھنے والے بہت کم تعداد میں ہیں۔ سرسری انداز کی تنقید و تحقیق کی بھیڑ میں ایسے مضامین ملاحظہ کر کے اس بات کا اطمینان ہوتا ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں میں علمی تحقیق کا کاروبار اب بھی بھولا ہوا سبق نہیں۔ اردو فارسی کے اساتذہ میں کچھ تو ہیں جو بزرگوں کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ ظفر کمالی کی یہ کتاب اندھیرے میں ایک علمی شمع ہے، جس کی روشنی سے ہماری زبان کا علمی وجود مزید روشن اور تابناک معلوم ہوتا ہے۔ ایسی تحریروں پر داد نہ دینا بے انصافی ہے اور جو طلبا اور شائقینِ ادب اس کتاب کے مضامین کو ذرا ٹھہر کر اپنے مطالعے کا حصہ بنائیں گے، انھیں اس بات کی خوشی ہوگی کہ اب بھی ٹھوک بجا کر معیار کا خیال رکھتے ہوئے علمی مضامین لکھنے کا سلسلہ قائم ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Assistant Professor (Guest), Department of Urdu,
Mohanpur, Samastipur, LNMU, (Darbhanga)
WhatsApp : 9308282361Email : afshanid12@gmail.com

● مضمون

● ڈاکٹر ارشد جمیل

جاں نثار کے ''گھر آنگن'' کی عورت

اردو شاعری کا مزاج ابتدا سے ہی کچھ ایسا رہا ہے کہ یہ تصورات اور تخیلات کی آسمانوں پر اڑانیں بھرتی رہی، زمین سے اس کے قدم اکھڑے اکھڑے سے رہے۔ ایک عرصے تک عورت کو صرف جنسی تعلقات کی نظر سے ہی دیکھا جاتا رہا، اس پر بے وفائی کا الزام لگانے والے مرد شعراء نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ درحقیقت بے وفائی تو خود انھوں نے عورت ذات سے کی ہے، صرف بیوفائی ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی تک کی ہے۔ مجموعی طور پر اردو غزل کی عورت کا جو تصور عام قاری کے ذہن پر ابھرتا ہے وہ یہ کہ عورت ایک انتہائی خوبصورت شئے ہے جسے اپنے حسن پر غرور کی حد تک ناز ہے، اس کے عشق میں ہزاروں لوگ تڑپ رہے ہیں، اس کی ایک ایک ادا پر جان نچھاور کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ عورت صرف بازاری عورت ہے جس کے بارے میں آپ جو چاہے کہیئے، جیسے جذبات کا اظہار آپ کو پسند ہو کیجئے، اس پر دل پھینکئے، اس سے لپٹ جانے کی جسارت کیجئے، اس پر دل و جان سے قربان ہو جایئے، جیتے جی مر جایئے یا مرنے کی تمنا میں زندہ رہ جایئے۔ جب کہ اس کے برعکس ریختی شاعری میں جس عورت کا تصور موجود ہے وہ عورت بازاری عورت نہیں ہے لیکن ریختی شاعری کی یہ عورت بیوی بھی نہیں ہے۔ ریختی شاعری میں عورت کی زبان، عورتوں کا روزمرہ، عورتوں کی چھیڑ چھاڑ، عورتوں کا دھول دھپہ تو موجود ہے لیکن اس کی ازدواجی زندگی یہاں بھی ناپید ہے۔ اردو مرثیے میں پہلی بار عورت مرد کی بھوکی نگاہوں سے نکل کر اس کے خون کے رشتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، اردو شاعری کو پہلی بار بیوی، ماں اور بہن کا تصور صنف مرثیہ نے ہی عطا کیا۔ لیکن یہ عورتیں بھی تاریخی عورتیں ہیں جن کو ہم عقیدت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، محبت کی نظر سے نہیں۔ یہ عورتیں یا عورت کا یہ روپ ہمارے لیے احترام کے قابل ہے پیار کے قابل نہیں۔ جاں نثار اختر نے پہلی بار اردو شاعری کو گھر آنگن میں اتارا ہے اور یہ گھر آنگن جس عورت کا ہے اس کا کوئی مذہب نہیں ہے وہ بیوی ہے صرف ایک بیوی جو کسی ہندو کی بھی ہو سکتی ہے یا کسی مسلمان کی بھی، اس کا گھر ہی اس کے لیے جنت ہے اور اس کے شوہر کی محبت ہی اس کے لیے سب سے بڑی دولت ہے۔

جاں نثار اختر نے یہاں روایت سے انحراف کیا ہے بلکہ انہوں نے ایک نئی روایت کو جنم دیا

ہے۔ اردو شاعری میں گھر آنگن کی شاعری بہت کم رہی ہے عجیب بات ہے کہ شاعر اپنی محبوبہ کو جنگل جنگل صحرا صحرا تلاش تو کرتا رہا مگر کبھی وہ اس کو تلاش کرنے وہاں نہیں گیا جہاں وہ پائی جاتی ہے یعنی اپنے گھر آنگن میں۔ اردو شاعری میں اس موضوع سے بے رخی برتنے کی ایک عادت سی رہی ہے۔ ریختی کو میں گھر آنگن کی شاعری نہیں کہوں گا کیوں کہ اس میں زیادہ زور عورت کی زبان کے چٹخارے پن پر ہے، نظر جنسی مسائل پر ہے جنھیں بالعموم نچلی سطح سے دیکھا گیا ہے اس لیے مجھے ریختی میں عورت کی عظمت کے بجائے اس کی رکاکت کا احساس ہوتا ہے۔ عام طور پر شاعروں اور ادیبوں نے بیوی اور محبوب کو الگ الگ حیثیت دی ہے بلکہ بیوی کو تو ایک سرے سے ہی قابل قدر نہیں گردانا ہے۔ ناول نگار بھی اپنا ناول وہاں ختم کر دیتے ہیں جہاں پر محبوبہ بیوی بن جاتی ہے۔ جاں نثار اختر نے ''گھر آنگن'' میں اس بات کو وہیں سے شروع کیا ہے جہاں اکثر ناول نگار اور افسانہ نگار اپنا افسانہ یا ناول ختم کر دیتے ہیں۔ لیکن جاں نثار اختر کے لیے وہی ابتدا ہے ازدواجی زندگی کے سکھ دکھ، باہمی رفاقت، پیار اور محبت کا گہرا گداز جس سے اس دنیا کے کروڑوں گھر ایک خوبصورت زندگی سے جگمگاتے ہیں، جنھیں اکثر شاعر و ادیب خاطر میں نہیں لاتے اور نہ ہی اسے اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ یہی اصل میں جاں نثار اختر کے گھر آنگن کا موضوع ہے جہاں میاں اور بیوی ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹ کر جیتے ہیں۔ عورت رہتی تو گھر آنگن میں ہے لیکن اس کی وفا، ایثار اور خدمت کا نور کائنات کا ہالہ کیے رہتا ہے، ایسا کرنے میں عورت کے کسی جذبے یا سوچے سمجھے پلان کا دخل نہیں ہوتا کیوں کہ اس کا گھر ہی اس کا وطن ہوتا ہے، اس کا شوہر اس کا عقیدہ ہوتا ہے، اس کے بچے اس کا کارنامہ ہوتے ہیں اور اس طرح عورت کی چھوٹی سی زندگی اپنے محدود دائرے میں ایسی بے پناہ خوشیاں محفوظ رکھتی ہے جس کا مرد کبھی اعتراف نہیں کرتا، حالانکہ گھر آنگن کا سکھ صرف گھر آنگن میں ہی میسر ہوتا ہے۔ درج ذیل بند ملاحظہ فرمائیں۔

میں ان کا سکھی ہات بٹا سکتی ہوں حالات کو ہموار بنا سکتی ہوں
وہ بوجھ اٹھائیں گے اکیلے کب تک میں خود بھی تو کچھ بوجھ اٹھا سکتی ہوں

گھریلو عورت سوسائٹی گرل کی طرح صرف مصنوعی مسکراہٹ ہی نہیں بکھیرتی وہ تو ہنستے ہنستے جھگڑنے لگتی ہے، روتے روتے مسکرانے لگتی ہے، غصے میں بپھر جاتی ہے، پیار میں مٹ جاتی ہے، دو دو پیسے کے لیے کبھی سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتی ہے اور کبھی بڑی سے بڑی رقم کو بھی خاطر میں نہیں لاتی ایسی عورت کا پیار حاصل کرنے کے لیے مرد کو کسی ہوٹل میں کمرہ نہیں بک کرانا پڑتا۔ بلکہ جاں نثار اختر کے گھر آنگن کی عورت تو منھ اندھیرے کپڑے سمیٹتے اٹھتی ہے بلکہ اسے اپنے میک اپ سے پہلے چولہا جلانا ہوتا ہے اور اپنے شوہر کے کپڑوں پر استری کرنا ہوتا ہے، وہ مشین پر کپڑے سینے بیٹھتی ہے اور جب شوہر سے گھر کے خرچ پر جھگڑتی ہے تو گھریلو زندگی کی داستان میں ایک نئے باب کا آغاز کرتی ہے، یہ سب وہ صرف اس لیے کرتی ہے کہ آرام کی زندگی بسر کرنے میں

مالی مجبوریاں حائل ہوتی ہیں۔وہ کسی سے کچھ مانگتی نہیں ہے صرف اپنی خدمت اور ہنرمندی کا نور بانٹتی ہے اور اسی میں سکون پاتی ہے، اپنے گھر آنگن کو محفوظ کرنے کے لیے عورت کیا کچھ کر نہیں گزرتی یہ نیک بخت بیوی شوہر کے قرب کی خوشبو کو زلفوں میں سمیٹ کر صبح سویرے اٹھ کر نہاتی ہے، دن بھر گھر گرہستی کے کاموں میں مصروف رہتی ہے، سینا پرونا کرتی ہے، ہانڈی روٹی کا اہتمام کرتی ہے، شوہر کی راتوں کو سپردگی سے جگمگاتی ہے، اس کے ہاتھوں گدگدایا جانا چاہتی ہے، اس کے لمس کو بے قرار ہوتی ہے۔ یہ ہندوستانی عورت مرد کو صرف اپنا مانتی ہے اور خالص اسی کی ہو کر رہنا چاہتی ہے، جس گھر میں اس کی ڈولی آتی ہے وہاں سے ہی وہ اپنا جنازہ نکلنے کی تمنا کرتی ہے، شوہر کے اداس لمحوں کو اپنی مسکراہٹوں سے سجانے سنوارنے والی اس پر جان چھڑکتی ہوئی آسمان جیسا بڑا دل لیے ہوئے یہ عورت مرد کے جسم کو صرف ایک بیوی ہی نہیں عطا کرتی بلکہ اس کے اندر کی چنچلتا کو ماں کا پیار بھی عطا کرتی ہے۔ درج بالا ان تمام خوبیوں کا حسین امتزاج مندرجہ ذیل بند میں ملاحظہ کریں۔

ہر ایک مصیبت سے بچانے کو تمھیں ہر طرح کی بات خود پے لے سکتی ہوں
کہتی ہے کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے میں ماں کا پیار بھی تمھیں دے سکتی ہوں

عورت کی ان تمام خوبیوں کے باوجود ہمارے شعراء کی توجہ کبھی اس جانب نہیں گئی کہ عورت کا یہ روپ بھی اس قدر خوبصورت ہوسکتا ہے جو بیوی کا روپ کہلاتا ہے۔ اردو شاعری کی اس کمی کو گھر آنگن نے پورا کیا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کی دنیا صرف گھر آنگن تک محدود ہے لیکن یہ آنگن محبت اور وفا کی خوشبوؤں سے مہکا ہوا ہے اس میں عورت کا وہ روپ سامنے آتا ہے جو آرام اور تصنع سے بے نیاز پیار اور وفا کا مجسمہ ہے۔ گھر آنگن کی عورت ایک جانب تو وفا اور ایثار کی دیوی کا دوسرا روپ ہے جو آگ کے شعلوں سے گزر کر موت سے بھی اپنا سہاگ چھیننے کا عزم رکھتی ہے جو حالات کو ہموار بنانے اور اپنے جیون ساتھی کا بوجھ اٹھانے کا حوصلہ رکھتی ہے اور اس کی محبت حاصل کرنے کے لیے ہر تپسیا اور تیاگ کو تیار رہتی ہے اس کا ایک خوبصورت نمونہ درج ذیل شعر میں ملاحظہ فرمائیں۔

جیسے بھی ہوا گذر بسر کر لوں گی تم میرے ہو یہ کم نہیں میری تسکین
نیچا نہ کروں گی خود کو سب کے آگے اس میں نظر آتی ہے تمھاری توہین

بیوی کی محبت میں بھی کئی طرح کے رنگ شامل ہوتے ہیں وہ شوہر کی ذہنی، فکری اور جسمانی رفاقت بھی کرتی ہے اور اسے ایک ماں یا بہن کی بے لوث محبت کی طرح کا پیار بھی دے سکتی ہے خاص طور پر ماں کا پیا رجو دنیا میں اپنی مثال آپ ہے جس میں کوئی لالچ یا صلہ نہیں ہوتا۔ زیر لب میں صفیہ اپنے پریشان حال شوہر کو تسلی دیتے ہوئے اپنے بے لوث پیار کا اظہار بار بار کچھ اس طرح سے کرتی ہے درج ذیل شعر ملاحظہ کریں۔

میں ہی نہ بٹاؤں گی اگر غم ان کا غم ان کا بھلا کون بٹائے گا سکھی

میں ہی نہ اگر انھیں بڑھاوا دوں گی ہے کون جو ان کا دل بڑھائے گا سکھی

گھر آنگن کی رباعیوں میں ہندوستانی عورت کا وہ روپ نظر آتا ہے جسے اپنے گھر کا ہر کام کرنے میں روحانی مسرت اور تسکین ملتی ہے۔ صفیہ نے جاں نثار کو نہ صرف ذہنی رفاقت دی بلکہ انھیں ذہنی طور پر متاثر بھی کیا بلکہ جاں نثر اختر کو جینے اور مرنے کا سلیقہ صفیہ ہی نے سکھایا کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ کچھ ہم ہنس کے سیکھے ہیں، نہ کچھ ہم رو کے سیکھے ہیں جو کچھ تھوڑا سا سیکھے ہیں، تمھارے ہو کے سیکھے ہیں

گھر آنگن کی رباعیوں میں سوانح عمری کا انداز موجود ہے اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شاعر کے اپنے دل کی آواز اور اس کی اپنی زندگی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے جس میں خاص طور سے صفیہ اختر کے وہ خطوط ہیں جو "زیر لب" کے نام سے چھپ چکے ہیں جن میں جاں نثار اختر اور صفیہ اختر کی شخصیت، ان کا ذہن و فکر ان کی جان لیوا بیماری، جاں نثار اختر سے اٹوٹ محبت اور عقیدت، ہجر و فراق کے تذکرے زندگی کے سلسلے کو برقرار رکھنے کے لیے ذریعہ معاش کی پریشانیاں، حالات کی ستم ظریفیاں اور زمانے کی شکایات کے ساتھ انسانی ہمدردی اور لگاؤ کا تذکرہ یہ تمام باتیں زیر لب میں موجود ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام باتوں کی بنیاد پر کئی رباعیاں جاں نثار اختر نے نظم کی ہیں۔ صفیہ کے ساتھ خدیجہ اختر جنھیں جاں نثار اختر صفیہ کا دوسرا روپ کہتے ہیں ان رباعیوں کی فضا میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہیں خاص طور سے صفیہ اختر کے احساسات اور جذبات کی آواز بار بار اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔

گھریلو زندگی کی ہر آن بدلتی ہوئی ایسی سینکڑوں تصویریں ہیں جو آپ کو جاں نثار اختر کی شاعری کے دامن میں جھلملاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جاں نثار اختر لائق تحسین و توصیف ہیں کہ انہوں نے ہندوستانی دماغ کو ایک نئی فکر عطا کی اور ہندوستانی عورت کو ایک نیا رتبہ اور مقام عطا کیا، ان کا یہ نیا تجربہ، اچھوتا مضمون اور دلچسپ انداز بیان اردو شاعری اور تفکر کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی اتباع اور پیروی کی سخت ضرورت ہے تاکہ اردو ادب اس نئے مضمون سے مالا مال ہو سکے اور شادی شدہ حضرات کو بے کیف زندگی میں کیف کا سامان نصیب ہو سکے۔ جی چاہتا ہے آپ کو کچھ اور رباعیات سناؤں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سی رباعی پیش کروں اور کون سی چھوڑ دوں شاید ہی کوئی رباعی ایسی ہوگی جو دامن پکڑ کر نہیں کھڑی ہو جاتی اور یہ نہ کہتی ہو کہ پہلے مجھ سے انصاف کر لو پھر آگے بڑھ جانا بہر کیف مضمون کی طوالت کی خوف سے میں اکتفا کرتا ہوں۔ آپ خود ہی گھر آنگن کا مطالعہ کیجیے اور پھر دل پر ہاتھ رکھ کر خود ہی فیصلہ کیجیے کہ میرے بیان میں کہیں مبالغہ سے تو کام نہیں لیا گیا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

(DIET Lecturer , Maharajganj)
District institute of Education Training , Maharajganj
Dhanewa Dhanei, Near Police Line District Maharajganj
(Uttar Pradesh) Pin code 273303 Mob no 7985449717

● مضمون

● ڈاکٹر نکہت پروین

زاہدہ زیدی کی شاعری کے چند امتیازی پہلو

خاندانِ حالی سے صفِ اوّل کے متعدد مصنّفین اُبھر کر سامنے آئے۔فکشن میں خواجہ احمد عباس، صالحہ عابد حسین،تنقید اور تعلیم کے شعبے میں خواجہ غلام اسیدین اور شاعری میں ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی کی واضح شناخت قائم ہوئی۔اِن میں سے ہر کوئی مورثِ اعلا حالی کی طرح ہی مختلف اصناف میں خدمات انجام دیتا رہا ہے۔خواجہ احمد عباس نے افسانے ناول تو لکھے ہی، صحافت کے شعبے میں بھی اپنا واضح نقش چھوڑا۔انگریزی زبان میں تصنیف وتالیف اور فلم ساز کی حیثیت سے اُن کی پہچان اس سے علاحدہ ہے۔صالحہ عابد حسین بھی افسانے،ناول،سفر نامہ،خودنوشت،اور تنقید کے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔زاہدہ زیدی اپنے خاندان کی اسی رِوایت میں پلی بڑھیں۔انھوں نے تنقید،ڈرامہ،تراجم جیسے شعبوں میں بہت سارے کام کیے لیکن سچی بات یہ ہے کہ اُن کی بنیادی شناخت ایک شاعرہ کی حیثیت سے ہی متعیّن ہوئی اور اردو کے ادبی منظر نامے پر اُنھیں اسی حیثیت سے قبولِ عام کا درجہ حاصل ہوا۔اسی وجہ سے اِن سطور میں اُن کی شاعرانہ حیثیت کے تعیّن کی کوشش کی جارہی ہے۔

اگست ۱۹۷۰ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''زہرِ حیات''منظرِ عام پر آیا۔اگست ۱۹۷۵ء میں اُن کا دوسرا مجموعہ ''دھرتی کا لمس'' شائع ہوا۔تیسرا شعری مجموعہ ''سنگِ جاں'' کے عنوان سے ایک طویل وقفے کے بعد ۱۹۸۹ء میں مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع ہوا۔جنوری ۲۰۰۰ء میں اُن کا چوتھا شعری مجموعہ ''شُعلۂ جاں'' چھپا۔تمام مجموعوں میں غزل کی حیثیت باکل ضمنی ہے۔اسی طرح صرف چند نظمیں پابند یا معرّا ہیں ۔باقی تمام آزاد نظم کے دائرے میں آتی ہیں۔شاعری سے الگ اُن کے ڈراموں کے طبع زاد اور ترجمہ شدہ چھ مجموعے شائع ہوئے اور تنقید وتحقیق کی بھی تین کتابیں سامنے آئیں۔انھوں نے ناول نگاری کی طرف بھی توجہ کی اور اس میدان میں بھی اُن کے نمونے خراجِ تحسین ادا کرنے میں کامیاب رہے۔

زاہدہ زیدی اردو شاعرات کی اُس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جس نے ترقی پسند تحریک کے آغاز سے پہلے آنکھیں کھولیں اور ان کی حقیقی تربیت جدید ادب کے فنکاروں کے ساتھ ہوئی۔شفیق فاطمہ شعریٰ

اور ادا جعفری سے نکل کر اردو کی نئی خاتون شاعرات جن نئے کوچوں میں پہنچی،اُن میں زیدی بہنوں کی اوّلیت سب کو معلوم ہے۔ساجدہ زیدی اور زاہدہ زیدی نے اردو شاعرات کی موضوعاتی،علمی اور فکری تربیت نہ کی ہوتی تو شاید ہی یہ ممکن ہوتا کہ اُن کے ٹھیک بعد کی نسل میں فہمیدہ ریاض،کشور ناہید،زہرہ نگاہ،پروین شاکر،رفیعہ شبنم عابدی،اور شہناز نبی وغیرہ کی نسل سامنے آتی۔اس اعتبار سے زاہدہ زیدی کو اردو شاعرات کی نئی نسل کی تربیت کرنے والی فنکارہ کی حیثیت پہچانا جانا چاہیے۔

زاہدہ زیدی نے اپنی شاعری کے دو خاص زاویے مقرر کیے۔عورتوں کی نفسیاتی کیفیات پر جتنا اُن کے یہاں ارتکاز ہے،اُس سے بڑھ کر انھوں نے عصرِ حاضر کے عمومی مسائل سے اپنے شعری موضوعات کو لیس کیا ہے۔اس اعتبار سے اُن کی شاعری کو صرف نسائی حِصار میں رکھ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔وہ ٹھیک اسی طرح سے خواتین میں دانشوارانہ حیثیت اور توجہ کی طرف لپکتی ہوئی نظر آتی ہیں جیسے اُن کے بزرگوں میں قرۃ العین حیدر کی شناخت قائم ہوئی تھی۔وہ نہ صرف یہ کہ انگریزی اور عالمی شاعری کی طالب علم تھیں بلکہ اُن کے ادبی موضوعات اور شعری ونثری تراجم بھی اس بات کی غمّازی کرتے ہیں کہ وہ عالمی طور پر غور وفکر کرتی ہیں اور اپنی شاعری کے دامن کو اس نئی دنیا سے مالا مال کرتی ہیں۔اس لیے اردو کی نسائی شاعری کی روایتوں سے انحراف بھی کرتی ہیں اور اُسی مرحلے میں وہ نئی نسائی شاعری کی بنیادِ نو بھی ڈالتی ہیں۔عالمِ انسانیت کو درپیش مسائل پر وہ غور کرتی ہیں اور اُن کے تدارک کے لیے اپنی شاعری میں فکرمندی کے جذبات ظاہر کرتی ہیں۔

زاہدہ زیدی بنیادی طور پر آزاد نظم کی شاعرہ ہیں۔ابتدائی دور سے لے کر آخری زمانے تک چار دہائیوں سے زیادہ عہد میں پھیلے اُن کے ادبی سرمائے پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ زبان کی سطح پر ان کا رشتہ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعرا سے مل جاتا ہے۔اختر الایمان اور ن۔م۔راشد کے شعری ڈِکشن سے ان کے یہاں ایک خاص قسم کی ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔فارسی تراکیب کا لُبھاونا طَور اُن کے یہاں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔اُن کے دیگر ہم عصروں میں یہ بات بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔اختر الایمان اور راشد کے شعری حصار میں وہ قید نہیں ہوتیں۔وہ اپنا لسانی نظام اس طور پر قائم کرتی ہیں کہ اکثر اُن کے مصرعے مختصر اور کبھی کبھی ایک دو لفظوں میں سمٹ جاتے ہیں۔شاید یہ جدیدیت کے بعض نظم نگاروں بالخصوص محمد علوی کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔لیکن محمد علوی کے یہاں فارسی تراکیب کا وہ رچاؤ سرے سے ناپید ہے۔زاہدہ زیدی اس سے اپنی زبان کا ایک اشاراتی نظام قائم کرتی ہیں۔لفظوں کے بیچ اور مصرعوں کے وقفوں میں کہنے کی کئی باتیں ڈال دیتی ہیں جس سے ایک نیا شعری سلیقہ سامنے آتا ہے۔

اُن کی آزاد نظموں کی بحریں اتنی شگفتہ اور رواں ہیں جس کے سبب اُن کی نظموں کا مطالعہ موسیقی

کے پَروں سے اُڑنے جیسا ہے۔اسلوبیاتی اعتبار سے یہ رواں دواں کیفیت اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اپنے بزرگوں بالخصوص اقبال اور فیض کی روانی اور موسیقیت اُنھوں نے کسبِ فیض کیا ہے۔

زاہدہ زیدی عصر حاضر کے گوناگوں مسئلوں کے آئینے میں زندگی کو دیکھتی ہیں تو تاریخ کا جبر اور کائناتی مسئلوں سے خود کو متعلق پاتی ہیں۔اس لیے اُن کی شاعری میں اپنے زمانے کی خوشی اور غم دونوں کے واضح رنگ موجود ہیں۔''سنگِ جاں'' مجموعے کی ایک نظم ''ہو.....اے ہوا'' پر غور کرتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کو اور اُس کی بدلتی صورتوں کو بڑے سلیقے سے اس نظم کے دائرے میں شامل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ہوا یہاں قدرت کا پیام بر بن کر ہمارے سامنے آتی ہے اور ایک مکمل صورتِ حال کا یہاں اظہار ہوتا ہے۔کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کالی داس نے بادلوں کو پیام بر بنا کر اپنے محبوب کی تلاش کا عمل شروع کیا تھا،اسی طرح زاہدہ زیدی ہواؤں سے زندگی کے بنیادی سوالات دریافت کرتی ہیں۔نظم کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں.....

ہوا.....اے ہوا
سنسناتی ہوا
کچھ بتا.....
کس طرح
تو نے ہر تارِ جاں
مرتعش کر دیا
کیا تری بے قراری میں ہے
کوئی پیغامِ الفت نیا
یا کہ نوحہ کناں
کوئی بیتے دنوں کی صدا
اے ہو.....
کیا مرے بحرِ جاں کا تلاطُم ہے تو
یا کہ صدیوں کے ساحل پہ بھٹکی ہوئی
کوئی مبہم نوا
خشک پتّوں سے ہے
میرا آنگن بھرا

کون سی شاخ سے ٹوٹ کر یہ گرے ہیں
بتا.....
کس شجر کا لہو تھا
کہ ان کی رگ خشک میں
جم گیا...

زاہدہ زیدی نے اپنے آخری مجموعۂ کلام ''شعلہ جاں'' کا تفصیلی پیش لفظ لکھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری کے اسباب اور محرکات پر روشنی ڈالی ہے بلکہ اردو کی تانیثی شاعری کے سلسلے سے بھی اپنے تاثرات ظاہر کیے ہیں۔اُن کی رائے جاننا اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم دوسری شاعرات کے فکر و عمل سے اُن کے ادبی کارناموں کو آسانی سے الگ کر سکیں۔انھوں نے لکھا ہے:

> ''عورتوں کی شاعری کے بارے میں جو سطحی، محدود اور عامیانہ قسم کے مفروضے قائم کر لئے گے ہیں، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔عورتوں کی شاعری کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ عورتوں کے مخصوص جنسی مسائل اور بچوں کی پیدائش وغیرہ کے تجربات پر تفصیل سے روشنی ڈالیں یا عورتوں کے مسائل پر آنسو بہائیں یا نعرے لگائیں۔شاعری خواہ عورتوں کی ہو یا مردوں کی، جو خصوصیات اور خوبیاں اسے عظیم شاعری بناتی ہیں، وہ دونوں میں مشترک ہیں۔''

اس اقتباس سے زاہدہ زیدی کے شعری مزاج اور فکری نقطۂ نظر کو سمجھا جا سکتا ہے۔وہ عالمی شاعری کی پارکھی ہیں اور انھوں نے بڑی سنجیدگی سے اپنی شاعری کا ایک عالمی تناظر طے کیا۔اس سے اُن کی شاعری میں ایک دانشورانہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔'بیتی صدیوں کے تلاطم'، 'درد کی سرحدوں سے پرے'، 'دھرتی کا لمس'، 'سنگِ جاں'، 'یہ لمحہ'، 'یہ جنگ سفاک سازشوں کا کوئی ثمر ہے'، 'فردوسِ گم شدہ'، 'کربلا'، 'ویرانہ'، 'ادھورا نگر'، 'بادل' اور 'تجربہ' نظموں کو بغور پڑھنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ زاہدہ زیدی نے موضوعاتی اعتبار سے ایک زبردست فکری فضا قائم کی ہے۔وہ نسائی رقت آمیزی کی شاعرہ نہیں بلکہ زندگی کو جبر و قدر کا ایک ایسا محور سمجھتی ہیں جس کے پیچھے بڑی بڑی قوتوں کا ہاتھ ہے۔اس طرح سادگیِ نظر سے اُسے دیکھنا اور سمجھنا مناسب نہیں۔

زاہدہ زیدی نے چند نثری نظمیں بھی لکھی ہیں۔''سنگ جاں'' مجموعے میں اُنھوں نے چار نثری نظمیں شامل کی ہیں۔''اے تُند رفتار ہوا''، ''اے سرکش تمنّا''، ''جوالا مکھی'' اور ''کبھی دیکھو'' نظمیں یہاں شامل ہیں۔زاہدہ زیدی کے یہاں عام طور سے بحر کی پابندی اور ایک مخصوص نغمگی ملتی ہے۔اُن کے

تراجم بھی اکثر و بیشتر آزاد نظم کی شکل میں ہیں۔ ایسے میں یہ تعجب کی بات کہ انھوں نثری نظم کی طرف کیوں کر توجّہ کی۔ وہ عالمی ادب کے تقاضوں سے لیس فنکار تھیں، اس لیے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنے اظہار کے لیے اس نئے پیرہن کو کس طرح آزمائیں۔ زاہدہ زیدی کی نثری نظموں میں ایک خاص شعری آہنگ لازمی طور پر ملتا ہے۔ اس لیے اُن کی اِن منظومات کو نثرِ عاری نہیں کہا جا سکتا یعنی یہ وہ نثر ہے جس میں کسی پردے میں شعریت پوشیدہ ہے۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

اے تند رفتار ہوا
تو کہ صدیوں کے ساحل سے آئی ہے
اتنی تیزی سے نہ گزر
میری نس نس میں سما جا
اور میری ہستی کو
لامحدود کر دے (اے تند رفتار ہوا)

"اے سرکشی تمنّا"، نظم ایک پُر اثر منظر نامے کی عکّاسی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے اِسے ہجر و وصال کے حوالے سے پہچانا جا سکتا ہے اور عشق کا مرغوب مضمون یہاں مکمل انسانی سوز کے ساتھ نظر آتا ہے۔ زاہدہ زیدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے انسانی خواہش کے متوازی ایک منظر نامہ مرتب کیا ہے۔ یہ منظر اپنے آپ میں اُداس اور انسانی سوز سے غمگین ہے۔ نظم کی خوبی یہ ہے کہ ابتدائی چار سطروں میں ہی ماحول کی پیش کش سے ایک ایسی صورتِ حال سامنے آ جاتی ہے۔ جو اپنے آپ میں اس بات کا اعلانیہ ہے کہ زندگی اب نئی اُمید سے دور ہو چُکی ہے۔ نظم کے آغاز کی چار سطریں ملاحظہ ہوں جہاں نثر کی صراحت کے ساتھ شاعرانہ اظہار اور نپا تُلا بیان اس بات کا جواز فراہم کرتا ہے کہ نثری نظموں کی ضرورت ہر دور میں قائم رہے گی۔ مصرعے کچھ اس طرح سے ہیں:

شام نڈھال ہے
اُداس پھولوں نے سر جھکا لیا ہے
اُن کی انتظار بھری آنکھیں
بند ہونے لگی ہیں (اے سرکش تمنّا)

'جوالامکھی' اور 'کبھی دیکھو' عنوانات کی نثری نظمیں زاہدہ زیدی کے اندر پوشیدہ باغیانہ طبیعت کا بر ملا اظہار ہیں۔ زندگی تعمیر اور اِنہدام کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے اور قدرت کا نظام اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ تعمیر و تخریب دور کے دو واقعات نہیں ہیں بلکہ ان کی کڑیاں ایک دوسرے سے پورے طور پر جڑی ہوئی

ہیں۔ 'جوالامکھی' میں ایک طنزیہ کیفیت شامل کرنے کی کوشش کی گی ہے۔ کیوں کہ پُرانا شاہی معمار اُن ریزوں سے نئی تعمیر کے لئے آگے بڑھتا ہے۔ 'کبھی دیکھو' نظم میں بھی روشنی اور تاریکی، اُندھیرے اور اُجالے کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ نظم موجودہ دور سے پچھلے جنم تک پہنچتی ہے اور اس بات کا اشارہ فراہم کرتی ہے کہ زندگی کے واقعات میں کوئی سلسلۂ خیال بہر طور ہوتا ہے۔ اور گذشتہ اور آئندہ میں ایک گہرا ربطہ قائم رہتا ہے۔ انسانی زندگی کو سمجھنے کا یہ ایک انوکھا پیمانہ ہے۔ نظم کا اختتام کچھ اس طرح سے ہوتا ہے۔

خاموشی کا جسم ٹٹولو
شاید اس کے بطن میں
کچھ ایسے نغمے خوابیدہ ہوں
جن کا تخم تم نے
پچھلے جنم میں بویا تھا (کبھی دیکھو)

زاہدہ زیدی کی ایک بنیادی پہچان مترجم کی بھی ہے اور انھوں نے نثر کے علاوہ بعض شعری ترجمے بھی کیے ہیں اطالوی شاعر یوجینیو مونتالے جنھیں ۱۹۷۵ کا نوبل انعام حاصل ہوا تھا اُن کی سلسلہ وار نظموں کو "بحرِ روم" کے عنوان سے زاہدہ زیدی نے ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے شاعر کا تعارف پیش کرتے ہوئے اپنے نظریہ ترجمہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ترجمہ کے دوران لفظی ترجمہ کے حصار میں خود کو انھوں قید نہیں کیا بلکہ آزاد اُسلوب اختیار کیا۔ اُن کے لیے یہ بات مناسب تھی کیوں کہ وہ شاعر کی حسّیت اور تجربے کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا اِرادہ رکھتی تھیں۔ ان پانچ نظموں کے علاحدہ عنوانات مقرر ہیں۔ 'ہم نہیں جانتے' عنوان کی نظم 'بحرِ روم' سے مخاطبت میں اس بات کا اِشاریہ ہے کہ انسان کا وجود بہت گہرائی تک اِن سمندروں سے وبستہ ہے۔ یہاں انسان کے ازلی سلسلے سے سمندروں کی رفاقت قائم ہے۔ سمندر اور انسان کا رشتہ زاہدہ زیدی نے نئے ماحولیاتی توازن اور تسلسل کے ساتھ بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ترجمہ کرتے ہوئے انھوں نے شاعر کے خیال اور اپنی زبان کے اسلوبیاتی طلسم کو کچھ اس طرح سے شیر و شکر کر دیا ہے جیسے یہ نظمیں ہمارے ہی ماحول کی زائیدہ ہیں۔ دو نظموں کے مختصر اقتباسات پیشِ خدمت ہیں جن سے ہمارے خیال کی سداقت واضح ہو سکتی ہے:

تو نے ہی یہ راز مجھ پہ کھولا
پنہاں جو شر رہے میرے دل میں
پرتَوہ تری ہی ذات کا ہے
امکان وجود وہشت میرا

تیرا ہی مزاج پُر خطر ہے (بحرِ روم)
میں نے تب بھی کبھی سطحِ ساحل پہ
موجوں کا نغمہ سُن .....
مضطرب ہو گیا
جیسے کوئی غریب الوطن
چونک کر اپنا گھر یاد کرنے کی کوشش کرے (ہاں مجھے بھول جا)

ختمِ کلام کے طور پر زاہدہ زیدی کے شعری اسلوب کے سلسلے سے چند باتیں گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔انھوں نے نہ صرف یہ کہ ڈرامے لکھے اور اُس کے تراجم بھی پیش کئے بلکہ ڈرامائی کیفیات کو اپنی شاعری کا بہترین حصّہ عطا کیا۔اقبال اور اختر الایمان کی نظموں میں موجود ڈرامائیت کی خصوصیات پر اکثر نقادوں نے توجہ کی ہے۔اس اعتبار سے زاہدہ زیدی کی شاعری پر غور نہیں کیا گیا۔شاید ہی کسی آزاد نظم لکھنے والے شاعر کے لسانی نظام کا تفصیل سے ہمارے نقادوں نے جائزہ لیا ہو۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ زاہدہ زیدی کے شعری اسلوب کا ایک بنیادی وصف لہجے کی وہ ڈرامائیت ہے جس سے وہ دوسروں سے الگ طور پر پہچانی جاتی ہیں۔اس وجہ سے اُن کی نظمیں یک رنگی اور بوجھل پن میں گرفتار نہیں ہوتیں بلکہ اس ڈرامائیت سے اُن کی نظموں کا آہنگ نہایت موثر اور جداگانہ ہو گیا ہے۔اُن کی زبان میں موسیقیت کی کیفیت بھی بہت کچھ اسی ڈرامائی لہجے سے اپنا توازن قائم کرتی ہے۔اس طرح زاہدہ زیدی کی شاعری کے مواد اور اسلوب کا جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارے عہد کی وہ ممتاز شاعرہ تھیں لیکن اُن کے فکر و فن پر ابھی مزید گفتگو کی ضرورت ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Sangi Masjid, Milkiyana Mohallah, Phulwari Shareef, Patna(Bihar)
Email: nikhat142@gmail.com
Mob: 8210718930

● مضمون
● ڈاکٹر قسیم اختر

شکیلہ اختر کی افسانہ نگاری

شکیلہ اختر بہار کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں لیکن ان کی شناخت اس صنف میں اولیت کا سہرا حاصل کرنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک جینوئن فن کار ہیں جن کی فن کاری کا کم و بیش ہر ناقد کو اعتراف ہے۔معروف ناقد پروفیسر وہاب اشرفی ان کی افسانوی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اردو افسانہ کے مجموعی ارتقا کے لحاظ سے بھی اور بہار میں اردو افسانے کی بتدریج ترقی کے نقطہ نظر سے بھی شکیلہ اختر کے افسانے غیر معمولی امتیازات کے حامل ہیں۔وہ ہندوستان کی تین عظیم ترین خواتین افسانہ نگار میں سے ایک ہیں۔ دوسری خواتین افسانہ نگار عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر ہیں۔''

(بہار میں اردو افسانہ نگاری۔وہاب اشرفی۔ص۔۲۰)

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ شکیلہ اختر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ہم پلہ ہیں یا نہیں کیوں کہ یہ اہلِ نقد و نظر کا کام ہے۔دوسرے یہ کہ ہمارا یہ موضوع بھی نہیں ہے البتہ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شکیلہ اختر کو جب بھی پڑھا ہے دل نے اثرات قبول کئے ہیں۔اور بار بار یہ بات محسوس ہوئی ہے کہ ہم کسی فن کار کو پڑھ رہے ہیں۔یہ ایک بڑے فن کار کی علامت ہے۔شکیلہ اختر کے افسانوی مجموعے ''درپن''، ''آنکھ مچولی''، ''ڈائن''، ''آگ اور پتھر'' اور ''لہو کے مول'' میں شامل افسانوں سے جہاں ان کا انداز بیان متعین ہوتا ہے وہیں ان کی فنی خوبیوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔شکیلہ اختر کی تخلیقی کاوش نے انہیں اس مقام پر پہنچایا ہے جہاں وہ کسی تعارف کا محتاج نظر نہیں آتیں بلکہ یہ کہنا کسی طرح بھی غلط نہ ہوگا کہ بہار سے تعلق رکھنے والی خاتون افسانہ نگاروں میں وہ سب سے سربلند نظر آتی ہیں۔ان کے یہاں عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کی طرح وسیع پیمانے پر تخلیقیت تو نہیں ہے مگر ان عظیم افسانہ نگاروں کے آگے وہ سرنگوں بھی نظر نہیں آتی ہیں۔ان کا اپنا فن ہے اور وہ اس بنیاد پر منفرد معلوم ہوتی ہیں۔شکیلہ اختر کے اندر کہانی بُننے کی صلاحیت بچپن ہی موجود سے تھی اور کم عمری سے ہی انہوں نے افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے۔حالانکہ اس بات میں اختلاف ہے

کہ ان کی پہلی کہانی کب شائع ہوئی۔ کچھ بیانات میں مبالغے کا اشتباہ بھی ہوتا ہے تاہم یہ بات قرین قیاس ہے کہ انہوں نے سترہ سے بیس سال کی عمر سے افسانے لکھنے شروع کردیے تھے۔ شکیلہ اختر پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آج بھی لکھا جارہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فکرو فن کی سطح پر ان کے افسانوں کو پرکھنے کے عمل کے دوران ہر ناقد یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک جینوئن فنکار ہیں۔ ان کے موضوعات سماجی سروکار رکھتے ہیں۔ روز مرہ اور گھریلو زندگی کو وہ اپنا موضوع بناتی ہیں۔ خصوصاً خواتین کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کا عہد بھی وہی ہے جو عصمت چغتائی کا ہے لیکن وہ عصمت کی طرح ناگفتنی کو گفتنی بنا کر تنازعات کا شکار نہیں ہوتیں۔ حالانکہ یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ شکیلہ اختر جنسی موضوع پر خاموش رہتی ہیں۔ ان کے کچھ افسانوں میں جنس کو موضوع بنایا گیا ہے جیسے ''پیاسی نگاہیں'' اور ''بند تتلی'' وغیرہ۔ لیکن ان کے یہاں زیادہ تر داخلیت ہے، وہ عموماً متوسط گھرانوں کی عورتوں کے دکھ درد کو اپنے افسانوں میں سمیٹتی ہیں، ان کی مظلومیت کو اپنا موضوع بناتی ہیں مگر شوروغوغا کے لیے مواد فراہم نہیں کرتیں۔ عصمت چغتائی سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

''......ان دونوں بڑی افسانہ گاروں کے مابین خارجیت اور داخلیت کی دیوار حائل ہے۔ عصمت چغتائی اڑوس پڑوس کی کھڑکیوں میں جھانکتی ہیں تو شکیلہ اختر دلوں کو ٹٹولنا چاہتی ہیں...... پھر عصمت چغتائی ایک ترقی پسند موقف کے ہالے میں اسیر ہیں جب کہ شکیلہ کے پاؤں میں کوئی بیڑی نہیں، وہ ہرن کی طرح چوکڑیاں بھر سکتی ہیں۔'' (بہار میں اردو افسانہ نگاری۔ وہاب اشرفی۔ ص۔۲۱)

شکیلہ اختر کے یہاں ایک اور خوبی ہے اور وہ ہے اپنی ذات کے کرب کو ہمہ گیر بنا دینا۔ وہاب اشرفی نے اس باب میں ان کی صلاحیت کو ہمہ گیر بتایا ہے۔ اس کے لیے ان کی عالمگیر شہرت کی حامل کتاب ''تاریخ ادب اردو جلد سوم'' کو دیکھا جاسکتا ہے۔ گویا شکیلہ اختر کے یہاں متوسط مسلم گھرانوں کی عورتوں کا حال زار بھی ملتا ہے اور ذات کا کرب بھی۔ وہ عورتوں کی نفسیات کی بڑی کامیاب عکاسی کرتی ہیں۔ اس پر ان کا انداز بیان انہیں دلچسپ بناتا ہے۔ شکیلہ اختر جس طبقے کی کہانی لکھتی ہیں اس طبقے کی زبان استعمال کرنے میں مہارت رکھتی ہیں۔ خصوصاً عورتوں کی گھریلو زبان استعمال کرنے میں انہیں درک حاصل ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے احمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

''ان کے بیشتر افسانے عورتوں کی نفسیات کے آئینہ دار ہیں......ان کے افسانوں میں بہار کے متوسط مسلم گھرانوں کی ایسی تصویریں ملتی ہیں جن کے چہروں پر مسرت کے مٹے مٹے آثار نظر آتے ہیں۔ قصہ پن کی دلچسپی کے ساتھ، ان کی

کہانیوں کے پلاٹ سیدھے سادے، کردار جانے پہچانے اور مکالمے سلیس ہوتے ہیں۔'' (نقد آزاد۔ احمد حسین آزاد۔ ص۔۱۳۱)

احمد حسین آزاد نے شکیلہ اختر کے موضوعات اور ان کے فن کا ان مختصر لفظوں میں تقریباً پورے طور پر احاطہ کردیا ہے۔ یہاں پر ہم عبدالمغنی کے اس خیال سے اتفاق کرسکتے ہیں کہ ''شکیلہ اختر پورے معنی میں ایک گھریلو افسانہ نگار ہیں (نقطہ نظر۔ ص۔۲۴۲) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ناقدین نے شکیلہ اختر کو ایک بلند پایہ فنکار اور کہانی کار کے طور پر پیش کیا ہے۔ ہم اس سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں رکھتے تاہم یہ ضرور دیکھنا ہوگا کہ ان کی تخلیقی جہت کیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں ان کے افسانوں پر ایک نظر ڈالنی ہوگی۔ ہمیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ سیمیناروں میں وقت کی پابندی کے سبب زیادہ تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں ہوتا تاہم ایک دو مثالیں ناگزیر ہیں۔ شکیلہ اختر کا افسانہ ''ڈائن'' ایک ایسی عورت کو پیش کرتا ہے جو غربت میں بھی شان بے نیازی رکھتی ہے۔ اور افسانہ کے اختتام پر قاری کے دل پر چھا جاتی ہے۔ شکیلہ اختر نے اپنے افسانوں میں نہایت ہی نچلے طبقے کی خواتین کو کم ہی موضوع بنایا ہے مگر ''ڈائن'' کی عورت دیکھنے میں اگرچہ ایک بدصورت، کریہہ اور ڈراؤنی ہے جسے دیکھ کر بچے ڈر جائیں لیکن اس کے اندر کی دنیا جب سامنے آتی ہے تو قاری چونک جاتا ہے۔ یہ بدشکل عورت جسے ایک خوش حال گھرانے کی عورتیں ڈائن سمجھتی ہیں، ایک مچھلی بیچنے والی ہے جو بقایا پیسہ مانگنے اپنی مالکن کے گھر جاتی ہے جسے دیکھ کر بچے رونے لگتے ہیں۔ گھر کی عورتیں دستر خوان پر لگے کھانے کو چھوڑ کر اسے ٹالنے کی کوشش میں لگ جاتی ہیں لیکن وہ کسی طرح نہیں ٹلتی۔ کسی کو یاد نہیں کہ اس کے ہاتھ کا پیسہ باقی ہے۔ آخر کار وہ بتاتی ہے کہ اس کے دیور کی بیوی نے اسے بتایا ہے کہ سوا روپے باقی ہیں۔ اس کی دیورانی کو بلایا جاتا ہے۔ بڑی بحث وتکرار کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ مالکن کے ہاتھ کا پیسہ باقی ہے جن کا انتقال چند ماہ پہلے ہوچکا ہے۔ پیسہ بقایا ہونے کی تصدیق گھر کی ایک نوکرانی بھی کردیتی ہے۔ یہ جاننے کے بعد کہ مرحومہ مالکن کے ہاتھ کا پیسہ باقی ہے، مچھلی بیچنے والی فاقہ زدہ بڑھیا کے جو تاثرات ہوتے ہیں وہ اسے عظیم تر بنا دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کے لفظوں میں بڑھیا کی نیک نیتی دیکھیں:

''........... بڑھیا کا وہی بھیانک منہ ایک بار پھر کھل گیا۔ کا؟ مالکنی کے ہاتھ کے باکی؟ اس نے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے روشی کے پلنگ پر بڑے احترام سے پیسہ رکھ دیا۔ نا بٹی نا۔ ہائے اب دوسر کے ہاتھ سے ان کر باکی پیسہ نا تو لیب او رنا لیوے دیب۔ ہائے ہمر مالکنی تو ہمر مائی باپ رہے لا'' بڑھیا کا منہ بے کسانہ طور پر پھٹ گیا اور اسکے سیاہ چہرے کی جھریوں میں چپ چپاتے ہوئے آنسو پھیل گئے۔ بڑھیا نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور کر اپنی دیورانی کی حریص نظروں کو دیکھا جو

ایک ٹک سے پلنگ پر دھرے ہوئے پیسوں کو تک رہی تھی۔ ''ای سوا گورو پیہ سے دن ناکٹ جائی۔'' اس نے اپنی دیورانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ گھر کے لوگوں نے ہزار جتن کئے کہ وہ کسی طرح سے پیسے لے لے۔ مگر بڑھیا کسی طرح سے بھی پیسہ چھونے کی روادار نہ ہوئی اور جس طرح سے وہ ڈگمگاتی ہوئی خالی ہاتھ آئی تھی اسی طرح سے بائیں پہلو پر جھکی لاٹھی کے سہارے چلتی ہوئی وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ گھر کے سارے لوگ اس کو حیرت سے دیکھتے رہے۔ ''پگلی ہے سالی پگلی'' فیضو نے قہقہہ لگایا مگر جوہیا اس کے جاتے ہی کھل کر ذرا زور سے بولی۔ ڈائن تھی جی اللہ قسم۔ پکی ڈائن' اور روشی نے اپنی گود کی بچی کو چمکارتے ہوئے سوچا۔ کیا وہ سچ مچ ڈائن تھی۔ ڈائن؟''

اس اقتباس میں اس زبان کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے جو گھریلو اور ساتھ ہی نچلے طبقے کی عورتوں کی زبان ہوتی ہے اور شکیلہ اختر نے جس کی کامیابی آئینہ داری کی ہے۔ ساتھ ہی شکیلہ اختر کی فن پر گرفت کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شکیلہ اختر معمولی واقعات کے سہارے افسانے کو ایک نہج دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے قلم میں اتنا زور ہے کہ معمولی واقعات بھی غیر معمولی بن جاتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا ہے اور وہ دوررس نظر رکھتی ہیں۔ افسانہ نگاری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہے۔ شکیلہ اختر اس سطح پر بھی کامیاب نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات پر گہری نظر رکھتی ہیں اور مظلوم و مقہور طبقے کا بھی بخوبی مشاہدہ کرتی نظر آتی ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ شکیلہ اختر آخر اس طبقے کو اپنا موضوع کیوں بناتی ہیں؟ کیا یہ محض افسانہ طرازی ہے؟ یا اس طبقے سے انہیں ہمدردی اور لگاؤ بھی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ فن میں خون جگر کے بغیر رنگ نہیں آتا۔ ایسے میں ہم یہ کہہ کر شکیلہ اختر کی اس خوبی کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ محض افسانہ طرازی کی خاطر وہ مظلوم طبقے کی خواتین کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتی ہیں۔ ان کی کہانیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ ان میں خون جگر شامل ہے۔ وہ اپنی تخلیقی قوت سے خوبصورت پلاٹ تیار کرتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شکیلہ اختر ایک دردمند دل رکھتی ہیں۔ اور ''آنکھ مچولی'' جیسے افسانوں میں جہاں ذات کا کرب بیان ہوا ہے، افسانہ نگار کے کرب کے ساتھ زمانے کا درد بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شکیلہ اختر کہیں ذات کے کرب کو ہمہ گیر بناتی ہیں تو کہیں مظلوم و مقہور طبقے کے دکھ کو سب کو محسوس کراتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی کہانیاں محض افسانہ طرازی نہیں ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں حقیقی زندگی کی آئینہ سامانی کرتی ہیں۔ اور قاری کو متوجہ کرنے میں کامیاب بھی نظر آتی ہیں۔ شکیلہ اختر کے ابتدائی افسانوں میں جہاں رومانیت نظر آتی ہے اور عاشقانہ جذبات کی بوقلمونی ہے وہیں بعد کے افسانوں میں ان کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اور سماجی و معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھرپور عکاسی دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کے افسانوں میں احتجاج کی دھیمی لے بھی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے افسانوں میں خاص

طور سے نسوانی جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ ان عورتوں میں بھی خاص طور سے مسلم گھرانے کی عورتوں کا وہ طبقہ شامل ہے جسے متوسط طبقہ کہا جاتا ہے۔ ش۔ اختر ہمارے اس خیال کو تقویت فراہم کرتے نظر آتے ہیں کہ

''ان کے یہاں مسلم گھرانوں کے بے رنگ افراد اپنی تمام تر افسردگی کے ساتھ ابھرتے ہیں..... مقامی رنگوں، مکالموں اور ماحول کی پیش کش میں بھی شکیلہ اختر سے چوک نہیں ہوئی ہے۔'' (مشمولہ: ''عصری ادب'' خواتین نمبر)

حقیقت ہے کہ یہی طبقہ زیادہ تر مسائل سے گھرا ہوا نظر آتا ہے اور اس طبقے کی خواتین کی گوناگوں الجھنیں ہوتی ہیں۔ انہی الجھنوں اور مسائل کے درمیان ایک عورت سسکتی اور گھلتی رہتی ہے۔ وہ کھل کر ہنس نہیں پاتی۔ خوشگوار لمحات اس کی زندگی میں کم آتے ہیں۔ شکیلہ اختر اسی طبقے کی نمائندگی بڑی فنکاری کے ساتھ کرتی ہیں۔ ان کے اسلوب میں لطافت، دلکشی اور سادگی ہے۔ وہ بامحاورہ زبان استعمال کرتی ہیں اور قاری کے دل میں گھر بناتی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جس کی حیثیت مسلم ہے۔ اس کے باوجود مجھے یہ بھی کہنے دیجئے کہ ملک گیر سطح پر انہیں وہ پذیرائی نہیں ملی جس کی وہ حقدار ہیں۔ ہمارے ناقدین کو اس جانب بھی توجہ دینی چاہئے۔

◂◂ ● ▸▸

Assistant Professor Purnea University Purnea(Bihar- Pin 854301
Mob: 9470120116
E-mail: qaseemakhtar786@gmail.com

ہم عصر اردو افسانہ

انتخاب و تجزیہ (جلد اول)

ڈاکٹر اختر آزاد

ناشر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دھلی۔ ۲

● **مضمون**

● **ڈاکٹر ریاض توحیدی**

ڈاکٹرافشاں ملک کا افسانہ ’’سمندر، جہاز اور میں‘‘

افسانہ’’سمندر‘جہاز اور میں‘‘ڈاکٹرافشاں ملک کی تخلیق ہے۔یہ افسانہ ان کی تصنیف’’اضطرب‘‘ میں شامل ہے‘ جو۲۰۱۷ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔افسانہ’’سمندر‘جہاز اور میں‘‘ ایک علامتی افسانہ ہے جس کا متن تخلیقی طور پر شعور(Consciousness) اور منشائیتIntentionality) کے دلچسپ تخیلی بیانیہ پر تشکیل ہوا ہے.اگر پہلے عنوان ہی پر فوکس کریں تو ’سمندر‘اور’جہاز‘شعور کا تخیلی استعارہ بن کر سامنے آتا ہے اور’میں‘منشائیت یعنی ارادہ کا مظہر ہے۔اس کے بعد اس عنوان یا ان اصطلاحات کے تناظر میں متن پر ارتکاز کریں تو پورا متن شعور اور منشائیت کے تخیلی اظہار کا تخلیقی بیانیہ بن جاتا ہے۔افسانے کی تحیر خیز کہانی پڑھ کر سارتر(Sartar) کا درجہ ذیل قول یاد آتا ہے

"All Consciousness is consciousness of somerhing"

’’ہر شعور کسی چیز کا شعور ہوتا ہے۔‘‘

اب یہاں پر شعور‘لاشعور اور تحتِ شعور کی بحث بھی ابھر سکتی ہے (جس کا یہاں پر موقع نہیں ہے) تو تخلیق میں شعور کسی اور شعور یعنی لاشعور اور تحتِ شعور کی بھی کبھی کبھی نمائندگی کرتا رہتا ہے۔جیسا کہ اس افسانے میں مرکزی کردار کے سفر(حال‘شعور)اور دادی اماں کی کہانی(ماضی‘لاشعور یا تحتِ شعور) کی موجودگی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ایک طرح سے کہانی کے درمیان شعور کی رو(Stream of consciousness) کی تکنیک کا بھی دخل ہے جو کہ کہانی کے دوران بیچ بیچ میں جہاز اور بادشادہ کی فلیش کہانی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔افسانہ شعوری طور پر صیغہ واحد متکلم’میں‘ کے بیان سے شروع ہوتا ہے جو ایک سفر پر جانے کی تیاری کی اطلاع دے رہا ہے:

’’ابھی شام تھی اور ہم سفر پر جانے کی تیاری میں مشغول تھے۔‘‘

تو پہلا ہی جملہ قاری کی سوچ پر استفہامی کیفیت طاری کر دیتا ہے کہ افسانہ کس قسم کے سفر پر جانے کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟اور پھر قرأت کے دوران سفر کا انکشاف ہوتا ہے کہ یہ کسی جاب یا سیر وتفریح وغیرہ پر نکلنے کا سفر نہیں ہے بلکہ یہ سفر اس خواب کی تعبیر پانے کا سفر ہوتا ہے جو جنت کی پُر آسائش جیسی زندگی

گزارنے کے لئے ہوتا ہے جو کہ با اثر لوگوں کی تحریک پر شروع کیا جاتا ہے۔تو یہ خواب دکھانے والے کون لوگ ہوتے ہیں‘اس کی طرف اگرچہ افسانے میں بالواسطہ ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن بین المتن (Inter text) کہانی سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ یہ اصل میں خوابوں کے وہ سوداگر ہوتے ہیں جنہیں سیاست دان کہا جاتا ہے۔اب یہاں پر یہ سوال بھی کھڑا ہو سکتا ہے کہ یہاں پر کیوں سیاست دانوں کے مصنوعی وعدوں کی طرف ہی اشارہ ملتا ہے تو افسانہ آگے خود ہی کوڑے کے ڈھیر پر سوئر کے ساتھ ساتھ میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑتے پہنے ہوئے انسانی مخلوق کے منظر سے ظاہر کر دیتا ہے کہ ان لوگوں کو خواب کے سوداگر اپنے مقاصد کے لئے جنت کے خواب دکھاتے رہتے ہیں لیکن پھر وہ اپنی ہی جنت بنانے میں لگ جاتے ہیں اور جن کے سپورٹ سے وہ لائف انجوائے کرتے ہیں‘ان کے حصے میں کوڑے داں کے سوا کچھ بھی نہیں آتا ہے:

’’میں نے گھر سے باہر سے باہر نکل کر دیکھا تو ہمیشہ کی طرح آج بھی میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے چھوٹے چھوٹے بچے کوڑے کے ڈھیر میں سے لوہے اور ٹین کے ٹکڑے چننے میں مصروف تھے۔ان کے دائیں بائیں کچھ سور تھے جو کوڑے کے ڈھیر میں اپنی تھوتھنیاں گاڑے گندگی سے اپنے پیٹ بھر رہے تھے۔‘‘

اس کے بعد افسانے میں ایک ڈرامائی موڑ اس وقت آتا ہے جب مرکزی کردار دروازے پر ایک بوڑھے درویش کی دل آویز صدا سنتا ہے اور لپک کر دہلیز تک جا کر اس کی طرف چند سکے بڑھاتا ہے لیکن درویش سکے لئے بغیر صرف ایک سوال پوچھتا ہے کہ:

’’تم جانتے ہو کہ مرنے کے بعد تمہارا کیا حشر ہوگا؟‘‘

مرکزی کردار جب نفی میں جواب دیکر درویش کی زبان سے ہی سننا چاہتا ہے تو درویش نرم لہجے میں پہیلی نما جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:

’’مرنے کے بعد تمہارا وہی حشر ہوگا جو تم سے پہلے والوں کا ہوا۔‘‘

یہ پہیلی نما جواب سن کر مرکزی کردار تھوڑا بہت الجھن میں پڑ جاتا ہے.وہ اصل میں سمجھ نہیں پاتا کہ یہ درویش کیا کہنا چاہتا ہے تو وہ دوبارہ پوچھتا ہے کہ اگلوں کا کیا حشر ہوا؟یہ سنتے ہی درویش کا جواب آتا ہے:

’’ویسا ہی جیسے یا جن الفاظ میں تم انہیں یاد کرتے ہو......جیسا تم کر کے رخصت ہوگے‘ویسا ہی تم کو یاد کیا جائیگا۔‘‘

درویش کے کہنے کا مقصد سمجھ کر مرکزی کردار واپس آ کر اپنی بیوی کے سراپے کا جائزہ لیتا ہے اور اسے سفر کی تیاری کرنے کے لئے کہتا ہے.مرکزی کردار کی بیوی’’ثمینہ‘‘ایک نیک سیرت خاتون ہوتی ہے ۔ثمینہ کا کردار افسانے کی سحر انگیز فضا میں متاثر کن رول ادا کرتا ہے‘ کیونکہ جب سبھی لوگ سفر کی تیاری میں

مصروف ہوتے ہیں تو وہ نفسیاتی طور پر رات کے وقت سفر کرنے میں الجھن کی شکار نظر آتی ہے اور اسے بچپن میں دادی کی زبان سے سنی ہوئی جہاز والی کہانی یاد آجاتی ہے کہ صدیوں پہلے بھی اسی طرح ایک بادشاہ رعیت کے ساتھ سمندری سفر پر جنت کا خواب لئے نکلا تھا لیکن انجام کار جب جہاز سمندر کے درمیان اچانک رک جاتا ہے تو بادشاہ کے حکم سے ایک مسافر کو اپنے بزرگوں کی نشانی سمت سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے۔

افسانے میں دادی کی اساطیری کہانی کا فنکارانہ تصرف (Artistic adaptation) بیانیہ پن (Narrativity) پر کوئی منفی اثر نہیں ڈال رہا ہے بلکہ افسانے کے مجموعی تاثر کو فسوں خیز بنا رہا ہے. افسانے کا یہ اساطیری اسلوب کہانی میں داستانی فضا پیدا کرتا ہے' جو کہ قرأت کی لطافت کے لئے بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ ویسے بھی کسی بھی افسانے کی افسانویت میں داستانی یا اساطیری اسلوب سحر بھر دیتا ہے۔ یہ اسلوب دنیا کے ہر ادب کا حصہ رہا ہے اور اس کی اہمیت سے انکار ناممکن سا دکھائی دیتا ہے' کیونکہ ہر سماج کی ثقافت پر اساطیر کا زبردست اثر ہوتا ہے اور ان کے ادب میں بھی اس کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس تعلق سے مشہور انگریزی ناقد نارتھروپ فرائی (Northrop Frye) اپنی تنقیدی کتاب The Theoretical Imagination میں لکھتا ہے:

"Every human society possesses a mythology which is inherited transmitted and diversified by literature."

''ہر انسانی معاشرے میں کچھ ایسے مورثی اسطورے ہوتے ہیں جو ادبیات کے زیر اثر تغیر و تبدل اور تنوع کے مراحل سے ہمکنار ہوتے رہتے ہیں۔''

دادی کی کہانی سنتے سنتے مرکزی کردار خوفزدہ ہو کر ثمینہ کو کہانی ادھوری چھوڑنے کے لئے کہتا ہے کہ ''سفر سے پہلے ایسی نامبارک باتیں منہ سے مت نکالو کیونکہ سفر درپیش ہو تو ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئے جو حوصلے کو توڑتی ہوں۔'' اس کے بعد سفر کی تیاری شروع ہو جاتی ہے اور اس تیاری کے دوران یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ کہانی کے کردار بھی اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو صدیوں سے خواب کے سوداگروں کے بہکاوے میں آتے رہے ہیں:

''.....رات آدھی آئی تو سبھی لوگ جہاز پر جانے کے لئے گھروں سے نکلے۔ ہم نے بھی رخت سفر باندھا اور اپنے
بچوں کو نیند سے بیدار کیا اور خورد و نوش کا ضروری سامان لے کر اپنے ٹوٹے پھوٹے اور خستہ حال گھروں سے رخصت ہو گئے۔''

اب سفر شروع ہو جاتا ہے اور جہاز سمندر کا سینہ چیر کر منزل مقصود کی طرف چل پڑتا ہے' لیکن

ابھی جہاز کچھ ہی دور تک جا پہنچا ہوتا ہے کہ سمندر کی تیز لہروں کی وجہ سے جہاز اصلی راستے سے بھٹک جاتا ہے اور جب لوگ احتجاج کرنے پر اتر آتے ہیں تو ملاح بدل دئے جاتے ہیں' اور لوگ اطمینان کی سانس لیکر خاموش ہو جاتے ہیں' لیکن پھر وہی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ خوفزدہ ہو کر صحیح سلامت منزل پر پہنچنے کی دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد کہانی میں فلیش بیک ٹریٹمنٹ آجاتا ہے' کیونکہ اس جہاز کی حالت وہی ہو جاتی ہے جو دادی اماں کی اساطیری والے جہاز کی کہانی کی ہوئی تھی:

''اچانک ایسا ہوا کہ ہچکولے کھاتا ہوا جہاز سمندر کے بیچوں بیچ پہنچ کر ایک جگہ رک گیا. ملاحوں نے ہر چند کوشش کی لیکن جہاز ذرا بھی آگے نہیں بڑھا۔ کسی نے پھر وہی کہا جو دادی کے جہاز والے نے کہا تھا....''جہاز میں ضرور کوئی ایسا شخص یا جنس ہے جس کی وجہ سے جہاز آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔''

یہ صورتحال دیکھ کر جب جہاز میں دوبارہ تشویش کی لہر دوڑ گئی تو مسافروں میں سے کچھ مخصوص لباس پہنے سرخ آنکھوں والے مسافروں نے ایک کونے میں سر جھکائے بیٹھے لمبے بالوں اور لمبی داڑھی والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''یہی ہے وہ جس کی وجہ سے جہاز آگے نہیں بڑھ رہا ہے' اس کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دو۔''

اب یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ سرخ آنکھوں والے کون تھے اور انہوں نے کیوں اسی شخص کی منحوسیت کو جہاز کے اچانک ٹھہرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ یہاں پر افسانہ علامتی برتاؤ کی عکاسی کر رہا ہے کہ یہ سرخ آنکھوں والے تو تاریخ کے وہ علامتی کردار ہیں' (چاہئے وہ سیاسی کردار ہوں یا معاشرے میں کسی اور طریقے سے اپنی پوزیشن مستحکم کرنے والے کردار ہوں) جو اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے گمراہ ہو چکے ہوتے ہیں اور جب انہیں اپنے مفادات یا مقاصد حاصل کرنے کے دوران سچے اور پارسا لوگوں کی طرف سے کوئی رکاوٹ پیش آتی ہیں تو وہ انہیں کسی نہ کسی بہانے راستے سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح جب لمبے بال والے بزرگ کے کردار پر فوکس کریں تو اسے اسی بناء پر نامبارک سمجھتے ہوئے سمندر کی گہرائی میں پھینک دیا جاتا ہے کہ وہ حق پرستی اور سچائی کی علامت ہوتا ہے۔ اسے جب سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے تو اس کے بھیانک قہقہے کی آواز سن کر مرکزی کردار کے کانوں میں دوبارہ گھر والے درویش کی آواز گونجتی ہے:

''تمہارا حشر بھی مرنے کے بعد وہی ہوگا جو تم سے پہلے والوں کا ہوا۔''

ان ہی بھیانک حالات میں افسانہ اختتام کو پہنچتا ہے اور مرکزی کردار درویش کی صدا سے متاثر ہو کر اپنی بیوی کا ہاتھ تھام کر خود احتسابی کے احساس کے زیر اثر اپنے ان اعمال کا حساب کرنے لگتا ہے جن کی وجہ سے حشر میں فیصلہ صادر ہوگا۔ افسانے کا اخری جملہ پوری کہانی کا تھیم ثابت ہو رہا ہے کیونکہ اب یہ جہاز علامتی روپ میں سامنے آتا ہے کہ یہ خواب کے سوداگروں کا وہ جہاز ہے جس پر برسوں سے معصوم و محکوم اور مفلس لوگ

سفر کرتے آئے ہیں لیکن یہ ہمیشہ صرف سفر میں ہی رہتا ہے اور لوگ دھوکہ کھاتے رہتے ہیں کہ وہ منزل مقصود کی جانب بڑھنے کا سفر کر رہے ہیں۔اسی لئے مرکزی کردار ساکن جہاز کا مسافر ہو کر مایوس لہجے میں کہتا ہے:

''یہ جہاز آگے کب چلے گا میں نہیں جانتا۔''

اب اگر افسانے کی کہانی پر ردتشکیل (Deconstruction) تھیوری کے اطلاقی امکانات کے تحت ارتکاز کریں تو افسانے کا موضوع جدید دور کے ایک المناک پہلو یعنی ہجرت یا مہاجرت (Immigration) کے سیاسی و ثقافتی مسائل ومشکلات پر بھی فوکس کرتا نظر آتا ہے۔یہ جہاز ان سینکڑوں مجبور ومحکوم لوگوں کے مسائل ومشکلات کی تمثیل بن جاتا ہے جنہیں حالات کی ستم ظریفی اپنے وطن اور گھر بار کو چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے اور جو آنکھوں میں نئے خواب سجائے ایک ایسے جہاز کے مسافر بن جاتے ہیں جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی ہے۔بہرحال'افسانے کا تمثیلی اسلوب' کرافٹ اور موضوعاتی ٹریٹمنٹ کہانی میں سحر بھر دیتا ہے اور قاری کہانی کی پُراسرار فضا سے محظوظ ہو کر افسانے کی منطقی تفہیم پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔بقول پروفیسر نجمہ محمود:

''افسانہ علامت اور استعاروں سے مزین ہے....تخئیل کی کارفرمائی' فطری مناظر کی عکاسی' داستانوی انداز اس افسانے میں دلکشی کا باعث ہیں۔افشاں کو زبان اور بیان پر قدرت حاصل ہے۔عصری حسیت بدرجہ اتم موجود ہے۔''

(اضطراب۔ص:۱۵۵)

◄◄ ● ►►

Wadipora, Handwara ,Kashmir 193221
email. drreyaztawheedi777@yahoo.com cell 7006544358

● **مضمون**

● **ڈاکٹر توصیف مجید لون**

''چوتھی کا جوڑا''.....اور غریب طبقے کی عکاسی

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمین پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے
(بشیر بدر)

ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں اس معاشرے میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں ایک کا شمار امیر طبقے میں ہوتا ہے اور اس طبقے سے وابستہ انسان اپنی زندگی کے شب و روز اپنی خواہشات کے مطابق گزارتے ہیں۔جبکہ دوسرے طبقے کے لوگ اپنی خواہشات تو پورا کرنا تو درکنار بلکہ اپنی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم رہتے ہیں۔عرف عام میں اس طبقے کو غریب طبقہ کا نام دیا جاتا ہے۔اردو میں لفظ غریب کا بنیادی ماخذ عربی لفظ غرب ''غ۔ر۔ب'' ہے جس کے معنی اجنبی کے ہیں۔وسیع تر معنی میں معاشرہ یا انسان کی مادی یا بنیادی ضرورت کی کمی کو عموماً غریب کی اصطلاح سے جانا جاتا ہے۔یہ طبقہ ہر دور میں انسان کے ظلم و استبداد کا شکار رہا۔ادیب' شاعر' محقق دور بینی نگاہ رکھتے ہیں اور وہ معاشرے میں پنپ رہی ہر برائی کا بہ نظر غائر مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ان کا کلام' ان کی تحریریں نہ صرف سخنوروں کے شعری اور ادبی ذوق کی تسکین ہوتی ہے بلکہ ادب معاشرے کے لئے ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔بقول محمد حسن۔

''ادیب زندگی کی عکاسی کر کے اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو جاتا۔اس کی اصل ذمہ داری ایسے ادب کی تخلیق ہے جو تلخ حقیقتوں کی دنیا میں ایک نئی زندگی کی تعمیر کرے۔اگر ادب ذہنوں کو بیدار نہیں کرتا تو وہ ناکردہ و بے وقعت ہے۔''

(مضامین ادبی تنقید.....از محمد حسن)

ابتداً ادب وقت گزاری اور صرف دل بہلانے کے لئے ہوا کرتا تھا لیکن عصر حاضر میں ادب زندگی کا ترجمان و عکاس ہے اور انسانی زندگی کے مسائل کا لازمی جزو بن گیا ہے' یعنی ادیبوں' شاعروں اور محققوں نے غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر ہو رہے مظالم' یا ان کے مسائل کو صرف نظر نہیں کیا ہے بلکہ اخلاقی' اصلاحی مقاصد کی غرض سے سماج میں پھیلے برے رسم و رواج' کوتاہیوں' خامیوں کو ضبط تحریر

میں لاکران پرروشنی ڈال کرمفلوک الحال' جاگیردار'اوردوسرے مسائل کواپنا موضوع بنایا۔

اردو کے بیشتر قلمکاروں نے سماج کے اس طبقے کواپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے افسانوی ادب سے منسلک جن ادیبوں نے اس طبقے کے دردوکرب کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے ان میں پریم چند' کرشن چندر' راجندرسنگھ بیدی' سعادت حسن منٹو' وغیرہ کے نام قابل فخر ہے۔افسانوی ادب کے اس کاروان میں مردادیبوں کی طرح اہل قلم خواتین نے بھی یکساں طور پرغربت زدہ طبقے کے موضوعات کونہایت بے باکی اوردردمندی کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمویا ہے۔خواتین قلم کاروں کے اس کاروان کی ایک افسانہ نگار عصمت چغتائی اپنے بے باک لب ولہجہ' طنزآمیززبان اورسماج کی حقیقتوں کی عکاسی کے باعث اردوافسانہ نگاروں میں ممتاز ومنفرد حیثیت رکھتی ہے۔عصمت نے اپنے افسانوں میں سماج کے اندرپھیلی برائیوں پر سخت چوٹیں کی ہیں۔سماج کے اندرتاریک پہلوؤں کوجس پرعام آدمیوں کی نظرنہیں پڑتی 'ان کوعوام کے سامنے پیش کرنے کی عصمت نے کامیاب کوشش کی۔انہیں معاشرے کے اندرجوخامیاں اورلوگوں میں جو نفسیاتی پیچیدگیاں نظرآئیں بڑی چابکدستی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔

اردوفکشن کی یہ بے تاج بادشاہ عصمت خانم چغتائی عرف چنی بیگم ادبی حلقے میں عصمت چغتائی کے نام سے معروف ہوئیں۔۲۱/اگست ۱۹۱۵ءکوبدایوں میں پیدا ہوئیں۔ان کا خاندان تعلیم یافتہ تھا۔ان کے والدمرزاقسیم بیگ بی اے کرنے کے بعد پہلے ڈپٹی کلکٹر ہوگئے اوربعدکوجج کی حیثیت سے ریٹائیر ہوگئے ۔وہ نہ صرف تعلیم یافتہ تھے بلکہ ایک روشن خیال انسان بھی تھے کثیرالعیال ہونے کے باوجودانہوں نے اپنے تمام بچوں کو انگریزی تعلیم بھی دلوائی۔یہی وجہ ہے کہ عصمت کو مطالعے کا شوق ورثے میں ملا ۔روسی'فرانسی'انگریزی ادب کوذوق وشوق سے پڑھتی تھیں۔والدکی چہیتی یہ بیٹی پڑھنے میں بچپن سے ہی دلچپسی رکھتی تھی۔تعلیم کے دوران ہی وہ رسائل کیلئے افسانہ لکھنے لگی۔ابتداء میں انہوں نے ایسی رومانی کہانیاں لکھیں جس میں عشق ومحبت اورچومنے چاٹنے کی باتیں ہواکرتی تھیں۔عصمت کے اس اندازبیان نے ان کی تحریروں کوبحث کا موضوع بنادیالہذاابتدائی کہانیوں کو انہوں نے چھپوایانہیں بلکہ ضائع کردیا۔

فنی اعتبارسے عصمت کا پہلاطبع زادافسانہ''کافر'' ہے جوماہنامہ ساقی دہلی اپریل ۱۹۳۸ءمیں چھپا جسے ادبی حلقے میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ کلیاں ۱۹۴۱ءمیں شائع ہوا۔چوٹیں'ایک بات' چھوئی موئی' دوہاتھ'بدن کی خوشبو'امربیل ان کے افسانوی مجموعے ہیں ۔مختصراً عصمت چغتائی نے تخلیقات کا انبارلگاکراردوادب کی تجوری بھردی ہے۔عصمت کے افسانوں نے اردوکو بہت کچھ دیا ہے۔ان کے منفرداسلوب'اورطرزنگارش نے ان کے افسانوں میں خوبصورتی پیداکردی ہے۔

انہوں نے متوسط گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی ذہنی اورنفسیاتی الجھنوں کواوران سے جنم لینے

والے مسائل کو بڑے سلیقے سے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اس قسم کے افسانوں میں''چوتھی کا جوڑا'' ان کا مشہورومعروف افسانہ ہے۔اس معرکتہ الاراافسانے میں عصمت نے غریب ولاچارطبقے کی عکاسی کی ہے۔اس افسانے میں ایک دردبھری داستان بیان کی گئی ہے۔یہ کہانی ہے ایک بےبس ولاچار ماں کی' جو اپنی جوان بیٹی کی شادی کے ارمان کودل میں لئے ہوئے اپنے شوہرکوعلاج سے محروم رکھ کرخود سے اپنا سہاگ اجڑکر بیوہ ہوجاتی ہے۔بقول شاعر

اپنی غربت کی کہانی ہم سنائیں کس طرح　　رات پھر بچہ ہمارا روتے روتے سو گیا

(عبرت مچھلی شہری)

اس کہانی میں چارکردارہیں۔بیوہ جوبی اماں کے کردار'میں اوراس کی دوبیٹیاں کبریٰ ایک جوان بیٹی جس کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اورحمیدہ چھوٹی بیٹی جس کی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے کے کردارمیں'اورایک مفادپرست انسان راحت کے کردارمیں۔

کہانی میں''چوتھی کا جوڑا'' علامت کے طورپراستعمال کیا گیا ہے۔یہ ان لڑکیوں کا المیہ ہے جن کے والدین غریبی اورجہیزکی لعنت کی وجہ سے اپنی جوان لڑکیوں کی شادی کرنے سے قاصررہتے ہیں۔اوریہ بے چاری جوان لڑکیاں کنواری اپنے گھروں میں پڑتی رہتی ہیں۔دراصل عصمت نے ان کرداروں سے اس معاشرے کوآئینہ دکھایا ہے جہاں لوگ اپنی عیش پرستی کیلئے پیسوں کی ریل پیل لگاکردولت کا اصراف کرتے ہیں اوران غریبوں کی لاچاری اوربےبسی کی طرف عدم توجہی برت لیتے ہیں۔کاش وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ معاشرے کے اس طبقے پرخرچ کرلیتے تو کبریٰ جیسی کردارہمیں دیکھنے کونہیں ملتی۔اس افسانے میں بڑادردوکرب نمایاں ہے۔سماج کے اس غربت زدہ طبقے میں غریب ماں باپ کے لئے سب سے بڑامسلئہ جوان ہوتی ہوئی لڑکیوں کی شادی کا ہے۔غریب ماں باپ شادی کی فکرمیں اس قدرپریشان رہتے ہیں کہ وقت سے پہلے ہی بوڑھے نظرآنے لگتے ہیں۔بسااوقات بعض تواسی غم میں دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور لڑکیاں جب اپنے ارمانوں کا خون ہوتے دیکھتی ہیں اورخیال ہی خیال میں دلہن بننے کا خواب سجائے ہوئے زندگی کے ایام گزاردیتی ہیں ان کی زندگی تباہ وبربادہوجاتی ہیں کبریٰ کا تعلق بھی ایسے ہی گھرانے سے ہے جس کا باپ غریبی کی وجہ سے اپنے بیمارشدہ جسم کوعلاج سے محروم رکھ کرآخرکارزندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔باپ کے مرنے کے بعدگھرکی مالی حالت اوربھی بگڑجاتی ہے۔کبریٰ کی ماں حالات تھک ہارنہیں مانتی بلکہ اس کا سامنہ حوصلہ سے کرتی۔کبریٰ کی ماں محنتی اورجفاکش ہونے کے ساتھ ساتھ شریف اورحوصلہ مندعورت کی صورت میں نمودارہوتی ہے۔

کبریٰ کی ماں کا ذریعہ معاش سلائی ہے اوراسی سے شکم کی آگ بجھالیتی ہے کترن اورناپ تول

کے فن میں بی اماں بہت زیادہ ماہر تھی۔ محلے یا گاؤں میں جب کسی گھر میں خوشی ہوتی یا غم اس کے لئے چوتھی کا جوڑا بنانا یا کفن سینا ہو یہ کام کبریٰ کی ماں سے لیا جاتا تھا اگر کبھی کپڑا کم بھی پڑ جاتا تو بی اماں نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ محلے کی عورتوں کی یہ پریشانی دور کر دیتی تھی۔ اور اگر کبھی کپڑا تھوڑا زیادہ نکل آیا تو اپنی جوان بیٹی کبریٰ کے لئے چھوٹا موٹا جوڑا بنا کر رکھ لیتی تا کہ اگر کبھی کبریٰ کی شادی کی بات بن پڑی تو اس وقت زیادہ دباؤ نہ پڑ جائے۔ عصمت نے یہاں بی اماں کے ایمان پر سوال نہیں اٹھایا ہے بلکہ بی اماں کی مہارت کو عصمت نے دلی خواہش کے طور پیش کیا ہے۔ اپنی بیٹی کی شادی کی خواہش دل میں لئے ہوئے بار بار چوتھی کا جوڑا بناتی اور پرانا ہونے پر اسے ادھیڑ کر پھر سے نیا کر دیتی۔ اس صورتحال کو عصمت نے یوں پیش کیا ہے۔

''دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بی اماں ایک بڑا صندوق کھول کر بیٹھ جاتی ہے جس میں رنگ برنگے ڈوپٹے شادی کے لیے اور چوتھی کے جوڑے ہوتے ہیں۔ اسے دیکھ کر وہ کبریٰ کی شادی کے بارے میں سوچتی' محلّہ کی کتنی دلہوں کے لئے جوڑا تیار کرنے والی بی اماں اپنی بڑی بیٹی کبریٰ کے لئے جوڑا تیار کرتی اور جب وہ پرانا ہو جاتا تو اسے ادھیڑ دیتی اور پھر سے نیا جوڑا بناتی۔''

بیوہ بی اماں بیٹی کی شادی کی فکر میں پریشان اور گھم سن رہتی تھی۔ ایسے میں کبریٰ کے ماموں کا تار آتا ہے کہ راحت پولیس ٹریننگ کے سلسلے میں ان کے پاس آرہا ہے جیسے کہ راحت ان سب کے لئے مسرت اور راحت بن کے آتا ہے۔ جیسے ہی یہ خبر بی اماں کو ملتی ہے پھولے نہیں سماتی۔ انھیں اپنی نا امیدی میں امید کی کرن نظر آنے لگی اور راحت انہیں ہونے والا داماد دکھائی دینے لگا۔ حمیدہ کی خوشیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں۔ وہ اپنی بہن کے درد وغم کو بحسن وخوبی محسوس کرتی ہے اور ہمیشہ دعا گو رہتی تھی کہ بڑی بہن کے ہاتھوں پر مہندی لگائی جائے۔ وہ دعا مانگتی ہے۔

''اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔
میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری بارگاہ میں پڑھوں گی''

راحت آتا ہے اور بی اماں کے گھر ٹھہرا۔ آنے پر خوب آؤ بھگت ہوئی۔ بیٹی کی قسمت سنورانے کے لئے بیوہ بی اماں نے اپنے بچے کچے زیور گروی رکھ کر راحت کی خاطر مدارت کے لئے انتظام کیا۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر راحت کیلئے لذیذ کھانوں کا اہتمام کرتی ہے۔ کبھی پراٹھے تلے جاتے تھے کبھی کوفتہ اور کبھی بریانی کھلائی جاتی۔ ان کی اس غربت کے حالات کی عکاسی عصمت نے اس طرح کی ہے اقتباس۔

''جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور ہاتھوں کی دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے

پر دی تھی۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لیے پراٹھے تلے جاتے 'کوفتے' بھنا پلاو مہکتے۔ خود روکھا سوکھا سانوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔''

بیوہ بی اماں کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح راحت کبریٰ کو پسند کرے۔ کہانی میں ایک اہم موڑ اس وقت آتا ہے جب کبریٰ راحت کے لئے اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی سوئیٹر حمیدہ کے ہاتھ بھجواتی ہے راحت اس کے ساتھ نہ صرف بدتمیزی کرتا ہے بلکہ اس کی عصمت پر بھی حملہ کر کے اس کے پاک دامن کو تار کر کے چلا جاتا ہے لیکن حمیدہ حرف شکایت اپنی زبان پر نہیں لاتی وہ اس لئے خاموش نہیں رہتی کہ وہ بدچلن ہے بلکہ اس لئے کہ اسے اپنی آپا کی شادی کا خیال بار بار آتا تھا۔ لیکن ایک دن راحت کی حرکتوں سے تنگ آ کر بی اماں اور آپا کے سامنے یہ راز کھول دیتی ہے اور من وعن اس کی چھیر کے متعلق بتاتی ہے۔ لیکن ماں یہ کہہ ٹال دیتی ہے کہ یہ معاملہ بہنوئی اور سالی کے درمیان کا ہے اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ بقول شاعر

بیچ سڑک اک لاش پڑی تھی اور یہ لکھا تھا بھوک میں زہریلی روٹی بھی میٹھی لگتی ہے
(بیکل اتساہی)

راحت کی واپسی کے بعد گھر کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے لمحے بھر کے لئے جو خوشی اس گھر کو نصیب ہوئی تھی وہ یکلخت تباہ وبرباد ہو گئی۔ ماں کے زیورات' حمیدہ کی عصمت' کبریٰ شادی کی حسرت دل میں لئے ہوئے اس دنیا سے چل بستی ہے۔' یہاں تک کہ راحت کی رخصتی نے بی اماں کی تمناؤں کا بھی خون کر دیا۔ اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے تلے گئے نہ پراٹھے اور نہ ہی سوئیٹر بنے گئے۔ اقتباس۔

''صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔
اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔ اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ بن سکے اور سوئیٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آرہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔''

کبریٰ بظاہر تو اس دنیا سے چل بسی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ مرگ مسلسل سے آزاد ہو گئی۔ تمام عمر غموں اور دکھوں سے دوچار رہی اس نے کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھا ہوگا۔ نہ کبھی زور سے قہقہہ لگایا ہوگا نہ ہی شوق سنگار کیا۔ وہ قسمت کی ماری بے چاری غریب ماں باپ کی اولاد تھی جو غریبی کے باعث اس کا گھر نہ بسا سکے۔ اور اس کی ڈولی اٹھنے کے بجائے اس کا جنازہ نکلتا ہے۔ کہانی کا المیہ یہ بھی ہے کہ بی اماں جو کپڑوں کی کتر بیونت میں مہارت رکھتی تھی۔ کہانی کے اختتام میں اس کا کفن اسے اپنی ہی بیٹی کے کام آیا۔ وہ

شادی کا جوڑا یا چوتھی کا جوڑا سینے کے بجائے اپنی بیٹی کے لئے اپنے ہی ہاتھوں سے کفن سی لیتی ہے وہ بھی اس سکون واطمنان کے ساتھ کہ جو جوڑا سلا جا رہا ہے وہ اس کا آخری جوڑا یعنی کفن تھا۔

غریب شہر تو فاقے سے مر گیا عارف امیر شہر نے ہیرے سے خودکشی کرلی
عارف شفیق

افسانے کے بین السطور سے یہ واضع ہوجاتا ہے کہ افسانہ نگار نے جہیز کے مسئلہ اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کو نمایاں انداز میں پیش کر کے قاری کے ذہن کو نہ صرف جھنجوڑا ہے بلکہ افسانے میں مسئلہ جہیز کے موضوع کی بدترین شکل پیش کر کے لوگوں کو اس مسئلہ پر غور وتدبر کرنے کی دعوت دی ہے اور ساتھ ہی ساتھ موقع پرست، خودغرض، لالچی لوگوں پر اعتماد نہ کرنے کی اپیل بھی کی ہے جو سماج کو صحت منداور خوشگوار بنانے میں رکاوٹ کے باعث بن جاتے ہیں۔ افسانہ کا اختتام درد وغم سے لبریز تعجب خیز اور فکرانگیز ہے۔

◂◂ ● ▸▸

S/O Abdul Majeed Lone
R/O Nanil near Jamia Masjid Padderpora
Teh.Mattan District Anantnag Pin code:192125
Phone no.7006402616 ،9596353673
onetawseef.majeed@gmail.com

اسلم جمشیدپوری

اردو افسانے کی ایک منفرد آواز

ڈاکٹر صالحہ رشید

ناشر

عرشیہ پبلیکیشنز دھلی

● **مضمون**

● **ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی**

تنہائیوں، حیرانیوں کی ترجمان.....حمیرا رحمٰن

عصر جدید میں جن شاعرات نے اپنے انفرادی رنگ کو قائم رکھا ہے ان میں ایک معتبر نام حمیرا رحمان ہے، جنہوں نے ۱۹ برس کی عمر میں کراچی سے لیبیا ہجرت کی، پھر وہاں سے لندن کے لئے رخت سفر باندھا، جہاں چند برسوں تک مقیم رہ کر امریکہ کو اپنا وطن ثانی بنایا، جہاں ان کو یہ احساس رہا کہ اپنی زبان اور تہذیب کے چھوٹنے سے دل پر جو خراش پڑتی ہے اس کی چبھن انسان کو زندگی بھر صدمے سے دوچار رکھتی ہے۔ اس لیے موصوفہ نے اپنی زبان اور تہذیب کو سینے سے لگائے رکھا۔ لہذا دیار غیر میں انہوں نے اردو شاعری کی قندیل کو روشن کر رکھا ہے۔ اس قندیل کے اجالے رفتہ رفتہ سرحدوں کو عبور کرتے ہوئے برصغیر کے گلشن ادب پر مثل چاندنی برس رہے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام ''اندمال'' ہے۔ اس مجموعے کو ادبی دنیا میں اچھی خاصی شہرت ملی ہے۔ اصل فنکار وہی ہے جو کسی بات کو اچھوتے لب ولہجہ میں بیان کرے اور ایسا بیان کرے کہ دل صرف عش عش ہی نہیں کر اٹھے بلکہ مانند خوشبو باطن کو مضطرب کر کے قاری کی جمالیاتی حس کو تسکین پہنچائے۔ حمیرا رحمان کے اشعار پڑھ کر دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس سے قاری کے من کی انگنائی میں شہنائی بج اٹھتی ہے اور قاری سرور سے شرابور ہوجاتا ہے۔

قیامتیں گزر گئیں روایتوں کی سوچ میں خلش جو تھی وہی رہی محبتوں کی سوچ میں
سب کو سطح آب پر کھلتے کنول اچھے لگے کس نے دیکھی ہے حمیرا جھیل کی گہرائیاں

کوئی ادیب یا شاعر کسی دوسرے کے غم کو انگیز کرتا ہے اور ردعمل کے طور پر اپنے افکار کو لفظوں کا پیرہن عطا کرتا ہے۔ اس طرح وہ قرطاس ادب پر ایک شعری پیکر کو تراشتا ہے۔ حمیرا رحمان نے قرطاس ادب پر جس پیکر کو تراشا ہے وہ کومل دل کی مالکہ ہے۔ اس کو اپنے محبوب کے دردِ جدائی کا احساس ہے۔ وہ بھی ہجر کے لمحے میں تڑپ اٹھتی ہے۔ لیکن پروین شاکر کے برعکس حمیرا رحمان کے تراشیدہ شعری پیکر میں نسائیت زخمی ہو کر اس جذبے کا اظہار کرتی ہے۔

تیری وادی میں تو بکھرے ہیں نوحے اس کے گل پاش جزیرے میں بھی ماتم دیکھوں

حمیرا کبھی کبھی ان جوان امنگوں کا بھی ترجمان بنتی ہیں۔لہذا خواب کی دھوپ ،سوچ کا بادل،آنکھوں کا معدوم سا کاجل اور جذبات کی ساری ہلچل اپنے محبوب کے نام کرنے والی پیکر کے اڈے جذبات کا احاطہ یوں کرتی ہے۔

جسم کے اندر دھڑکن کا ہوگا نیلام　　　اور وہ پہلی بولی دینے آئے گا
بے چاری مینا نے پنجرے سے اڑنا چاہا　　　دل بھر آیا آنسو اڈے بندھن بول اٹھے

اردو شاعری میں ایک تلازمہ جدائی کا کرب بہت مقبول رہا ہے۔آغاز سے آج تک بہت کم ایسے شعراء اس میدان میں آئے جنھوں نے اس تلازمہ کو نہ برتا ہو خصوصاً شاعرات نے اس موضوع کو زیادہ اپنایا ہے۔ پروین شاکر نے نسائی لب ولہجہ کو ایک وقار بخشا جس کا مثبت اثر یہ ہو کہ ان کے بعد آنے والی شاعرات کی شاعری پر مذکورہ لب و لہجے کی پرورش و پرداخت زور شور سے ہوئی۔ مذکورہ تلازمہ کی ملکہ اعظم پروین شاکر نے بھی زندگی کے اس کرب انگیز لمحے کو ادبی فن پارہ بنایا ہے۔حمیرا رحمان نے اس وراثت کی علمبرداری کی ہے۔

تم نے کیوں دوست نہ آنے کا عہد کر ڈالا　　　لوگ پردیس تو پہلے بھی گئے تھے اتنے

جدائی کا موسم، چاندنی رات اور تنہائی کی بانہوں میں یادوں کی خوشبو برق رفتاری سے بکھرتی ہے۔ان لمحوں میں درد جدائی اور یادوں کی پروائی جب بے لگام ہوتی ہے تو جسم نہیں روح کے انگ انگ میں میٹھا میٹھا درد سا اٹھتا ہے۔کانوں میں ماضی کے سنہرے لمحوں کی سرگوشیاں سیٹی بجاتی ہیں۔اور خاموش یادوں کا سمندر مضطرب ہو اٹھتا ہے۔ان بے چین تموج کو دل کے نہاں خانوں میں دبا کر جینے کا شعور، انسان کو زندگی کی پر پیچ پگڈنڈی پر آٹھوں پہر ملول رکھتا ہے۔خصوصا وہ یادیں جو دل پر زخم کے پھول اگاتی ہوں۔حمیرا رحمان کے یہاں ان پھولوں کی نازک پنکھڑیوں کو حفاظت کے ساتھ دل کے اوراق میں یہ سوچ کر رکھا جاتا ہے کہ:

یہ اپنا اپنا مقدر ہے کس نے کیا پایا　　　کسی کو پھول، کسی کو چمن سے خار ملے

وصل کی حسرت لئے پورے چاند کی رات میں محبوب کے انتظار کا لمحہ، بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ان لمحوں میں ہر آہٹ اور سرسراہٹ محبوب کے قدموں کی چاپ معلوم پڑتی ہے۔لاشعوری طور پر بے چین دل اور منتظر نگاہیں اس جانب اٹھ جاتی ہیں۔ان طرب انگیز لمحوں میں ایک تحیر ہوتا ہے جو اعصاب کے ہر تار میں جھنکار پیدا کرتا ہے۔حمیرا رحمان ان دونوں لمحوں کی شدت کو انگیز کرتی ہیں۔

چارہ گر آئے تو پہلی سی مروت ہی نہ تھی　　　کیا اسی دن کے لیے زخم ہرے تھے اتنے
میں نے تجھ پر آنکھیں موندے کر لیا تھا اعتماد　　　شیشہ یہ ٹوٹا تو ہر سو کرچیاں بکھرا گیا

یاد اپنے دامن میں حسن اور رعنائی لے کر جلوہ افروز ہوتی ہے۔جس کی نرم نرم چھاؤں میں دلبستگی کا وسیلہ پیدا ہوتا ہے۔حمیرا رحمان کے یہاں یہ یادیں جب واپس لوٹتی ہیں اس وقت دل کے آبگینے میں خراش لمحوں کی کرچیاں پیوست ہو جاتی ہیں۔

آج بھی مانوس سی ان خوشبوؤں کی یاد میں　　　میری پلکوں پر اتر آتی ہیں کچھ حیرانیاں
کتنی رعنائی تھی کتنا حسن تھا اس یاد میں　　　رفتہ رفتہ ذہن جس کو منتشر کرتا گیا
مجھ کو اس کے ٹوٹتے لہجوں میں دو چیزیں ملیں　　　چند لمحوں کا سکوں اور عمر کی تنہائیاں

آخری الذکر شعر قاری کے ذہن کو تھوڑی دیر کے لیے الجھاؤ کے گرداب میں غوطہ زن کرتا ہے۔ایسا اس لیے کہ پہلے مصرعے میں ٹوٹتے لہجے سے جو فضا پیدا ہوئی ہے اس کی مناسبت سے مصرعہ ثانی میں عمر کی تنہائیاں ملی ہیں، لیکن چند لمحوں کا سکون خالق شعر کو کیوں ملا؟ بالفرض اگر سکون ملا تو پھر تنہائیوں کا ذکر سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے۔اس سے تذبذب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن یہ تذبذب بار گراں محسوس نہیں ہوتا بلکہ یہ تذبذب چھٹی حس کو بیدار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ بہر حال فکری وسعت ،عصری حسیات اور مشاہدے کا عمیق پن مجموعی طور پر ان کی شاعری کو انفرادیت کے حامل بنانے میں معاون ہیں کہ شاعری شدت احساس، غنایت اور تغزل کی چاشنی سے لبریز ہے، جس کو پڑھ کر قتیل شفائی کا یہ شعر ایوان حافظہ میں گونج اٹھتا ہے۔

یوں تصور پہ برستی ہیں پرانی یادیں　　　جیسے برسات میں رم جھم کا سماں ہوتا ہے

◀◀ ● ▶▶

HNO:1-A,BL No:23.Kela Bagan.Jagatdal,
North 24 Pargana,(W.B)-743152
933932732

● مضمون

● ڈاکٹر محمد سلیمان

کشمیری اردو ناولوں میں جنسی استحصال کی عکاسی

وجودِ زن سے اگر تصویرِ کائنات میں رنگ و رونق، خوبصورتی اور چہل پہل قائم ہے۔عورت چراغ بن کر بزمِ کائنات کو روشن کرتی ہے لیکن پھر بھی چراغ کی روشنی سے مستفید ہونے والے ہی چراغ پر وار کر کے اسے بجھا دیتے ہیں۔عورت ہر دور اور ہر حال میں مرد کا ساتھ دینے کے باوجود بھی طرح طرح کے مسائل اور مصائب سے دوچار ہے اور مرد عورت کا رازداں ہو کر بھی اس کو پامال اور رسوائے زمانہ کرنے کے لئے آمادہ ہے ۔انسان کے تہذیبی پسِ منظر کو اگر غور سے دیکھا جائے تو عورت صدیوں سے سماجی ظلم و ستم اور جبر و استحصال کا شکار رہی ہے۔دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ماں کے بطن سے ہی عورت کے مسائل شروع ہو جاتے ہیں عصرِ حاضر میں مادہ پرستی کا دور دورہ ہے، انسان اشرف المخلوق کے درجہ سے گر کر نہایت خود غرض اور مکار بن گیا ہے۔ ان حالات میں ایک عورت میں احساسِ کمتری، عدم تحفظ اور غیر یقینیت کا ایک احساس پیدا ہوا ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں خواتین کے مسائل کو لے کر مغرب میں تانیثیت کی تحریک (Feminism) چلی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں بھی تانیثیت کی تحریک کا آغاز ہوا اور خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا گیا۔ ہندوستان میں آزادی کے بعد عورتوں کی سماجی، قانونی، سیاسی اور تعلیمی حیثیت میں غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی ۔لیکن آج بھی ان کے لئے حالات حوصلہ افزا نہیں ہیں ۔اگر چہ آئین میں خواتین کے لئے برابری کے حقوق اور مواقع کا ذکر کیا گیا ہے۔لیکن بعض حقوق محض رسمی اور کاغذی ہو کر رہ گئے ہیں اور ہر سطح پر خواتین کے ساتھ ناانصافی، حق تلفی، نابرابری اور استحصال جاری ہے۔

کسی بھی سماج میں سماجی حیثیت کے تعین میں معاشی کردار اہم رول ادا کرتا ہے۔ہمارے سماج میں بھی عورتوں کے پچھڑے پن اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کی سب سے اہم وجہ معاشی پسماندگی ہے۔اور ان کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا جاتا ہے کہ ان کا دائرہ عمل گھر اور اس کی چہار دیواری ہے۔روزگار میں لگی عورتوں کی حالت بھی زیادہ بہتر نہیں ہے۔اول تو روزگار کے میدان میں صرف چودہ فیصد عورتوں کو ہی روزگار حاصل ہے۔ان میں سے بھی بیشتر غیر منظم سیکٹر میں کام کرتی ہیں۔ جہاں انھیں کم تنخواہ پر بدترین حالات میں کام کرنا پڑتا ہے۔

اردو ناول کے آغاز سے لے کر آج تک لکھے گئے ناولوں کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات روزِ

روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو ناول کا ایک خاص موضوع عورت کی سماجی حیثیت اور اس سے منسوب کئی طرح کے مسائل کو ناولوں میں اجاگر کیا گیا ہے۔ڈپٹی نذیر احمد کے پہلے ہی ناول 'مراۃ العروس' کا مقصد عورتوں کی تعلیم کے مواد کو فراہم کرنا تھا اور مجموعی طور پر عورت کو ہی موضوع بنایا۔اس ناول میں انھوں نے خاندان میں عورتوں کی اہمیت پر زور دیا ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اچھی تعلیم و تربیت یافتہ لڑکی اپنے چاروں طرف کے ماحول کے لئے کس حد تک فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے ۔ جب کہ اس کے برعکس جاہل، پھوہڑ اور بُری تربیت یافتہ لڑکی کس طرح زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔عبدالحلیم شرر نے زیادہ تاریخی ناول لکھے ہیں اور ان میں عورتوں کے فعال کردار پیش کئے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے جو معاشرتی ناول لکھے ہیں ان میں بھی جگہ جگہ عورتوں کے مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔جیسے پردہ، بے جوڑ شادی یا بغیر مرضی شادی، کثیر ازدواجی کے مضر اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس کے بعد ناول نگاروں کی ایک بڑی تعداد نے عورت کے مقام (Status) کو ہندوستان کی سماجی حالت کے تناظر میں اپنے اپنے انداز میں خاص اہمیت دے دی۔مرزا ہادی رسوا، سجاد حسین وغیرہ نے طوائف کی زندگی کو ایک نئے زاویے کے ساتھ پیش کیا اور یہ دکھایا کہ ایک عورت پیدائشی طور پر طوائف نہیں ہوتی بلکہ سماج کے ستم ظریفانہ حالات ہی اُسے اس دلدل میں پھنسا دیتے ہیں بعد میں سماج بھی اس کے ساتھ نفرت کرتا ہے۔عورتوں کے مصور غم راشد الخیری نے سماج کی دبی کچلی عورتوں کی حالت زار کا نقشہ اپنے ناولوں میں کھینچا اور عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور پیش آنے والے ناخوشگوار واقعات و مسائل کو بڑے دردناک انداز میں بیان کیا ہے۔ پریم چند نے ہندوستانی عورت کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو کو اپنے ناولوں میں بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا۔انھوں نے بیوہ، بے جوڑ شادی، طوائف، تعلیمِ نسواں اور آزادیٔ نسواں جیسے اہم مسائل کو ضبطِ تحریر میں لایا۔اسی طرح بعد میں بہت سے فکشن نگاروں نے جیسے عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ اور پاکستان کی کئی خواتین فکشن نگار نے بھی اپنی تخلیقات میں خواتین کے مسائل کو موضوع بنایا، کہ کس طرح ہندوستانی اور پاکستانی تہذیب میں خواتین کو طرح طرح کے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پسماندگی کا شکار ہوتی ہیں۔اردو ناولوں میں عورتوں کے مسائل کی عکاسی کے بارے میں صغرا مہدی رقمطراز ہیں۔

> ''عورت سے متعلق جرائم کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔آج کی عورت کا مسئلہ اس کا تشخص اور اس کی شناخت ہے۔اس کے باوجود کہ قانوناً ان کو ہر طرح کی آزادی ہے۔مگر ان کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات ہیں کیونکہ قانون اور سوشل ریلیٹی میں بہت فرق ہے ان مسئلوں کو اردو ناول نگار آج بہت اچھی طرح

پیش کر رہے ہیں۔'' (اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت، ص۱۴۳)

مجموعی طور پر جس طرح اردو ناول کے تناظر میں عورت کی سماجی حیثیت کو پیش کیا گیا بالکل اسی طرح سے یہاں جموں و کشمیر میں لکھے گئے بہت سے اردو ناولوں میں بھی خواتین کے مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے اور چند ایک ناول تو مکمل طور پر عورتوں کے مسائل پر ہی محیط ہیں۔ جیسے نعیمہ مہجور کا ناول 'دہشت زادی' اور جوتیشور پتھک کا ناول 'میلی عورت'۔ نعیمہ مہجور کا ناول ایک نیم تاریخی اور سوانحی ناول ہے۔ جس کے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

> '' اس میں رسم و رواج میں جکڑی پا بہ زنجیر عورت کا درد بھی ہے...... مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو فقط ایک نیم سوانحی ناول کے طور پر نہیں بلکہ عورت کی پسماندگی کے خلاف ایک پُرسوز احتجاجی دستاویز اور وادی کی انسانیت پسند روحانی میراث 'ریشیت' کی درد میں ڈوبی فریاد کے طور پر بھی پڑھا جائے گا۔''
>
> (دہشت زادی، ص۳)

آج کل عورت کا گھر سے باہر نکلنا بہت زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔ عورت کی عزت و عصمت کہیں بھی محفوظ نہیں ہے۔ تقریباً ہر دن کا آغاز اخبار میں چھپی سرخیوں کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ کسی علاقے میں کسی عورت کے ساتھ جنسی تشدد یا اجتماعی عصمت دری کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا۔ آج کل مبینہ طور پر یا ڈرا دھمکا کر بسوں، ریل گاڑیوں، ہوٹلوں، دفاتر یا کھیتوں میں عورتوں کو جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے۔ پھر یہی عورت جس کی کوئی بھی قصور نہیں ہوتا ہے، گھر سے باہر نکل نہیں پاتی، سماج میں اس کو طرح طرح کے طعنے سُننے پڑتے ہیں غرض جتنے منہ اُتنی باتیں ہوتی ہیں۔ پھر جب سماج میں ان عورتوں کا چلنا پھرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے تو کبھی کبھی یہی خواتین تنگ آ کر خودکشی کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہیں۔

حامدی کاشمیری کے ناول 'بلندیوں کے خواب' میں دو تین واقعات ایسے ہیں جن میں عورتوں کے ساتھ جنسی استحصال کی عکاسی کی گئی ہے۔ جس میں سرینگر جموں شاہراہ پر شدید برف باری اور سڑک رابطہ ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے درماندہ مسافروں کا ایک بڑا قافلہ بٹوت کے مقام پر رات گزارنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی کسی کے ساتھ اپنی بیوی اور بچے بھی تھے۔ مگر ان گردشِ ایام میں بھی چند بدمعاش اور بدکردار ان کی بیویوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں اور ان کی عزت و عصمت پر دھاوا بولنا چاہتے ہیں۔ جیسے پریم کمار اور اس کی بیوی اپنی سہیلی کے پاس رات کوُر کنے کے لئے گئے تو وہاں اس کی سہیلی کے شوہر نے پریم کمار کی بیوی کے ساتھ جنسی زیادتی کرنے کی کوشش کی اور وہ وہاں سے بمشکل اپنی عزت کو بچانے میں کامیاب ہوئی۔ اسی طرح نامدار کی بیوی کے ساتھ بھی کچھ بدمعاش منچلوں نے بہت بدتمیزی کی

اور جب وہ نامدار کی بیوی کو جنسی طور پر ہراساں کر رہے تھے تو کچھ لوگوں نے اس کو بچا لیا۔ ایسے ہی غلام محمد کی بیوی پر بھی ان شرابی اور بدمعاشوں کی نظر پڑی۔ پیش ہے یہ اقتباس:

> '' شام کو (غلام محمد) اپنے لئے اور بیوی کے لئے کھانا لانے کے لئے بازار گیا تھا اور کسی دوکان پر بیٹھا گپ بازی کر رہا تھا، ادھر اس کی بیوی کے کمرے میں دو آدمی داخل ہوئے شراب کے نشے میں دھت، اور لگے اس سے زبردستی کرنے، اس نے شور مچایا تو ایک آدمی نے بڑھ کر اس کے منہ میں کپڑا اٹھونسنا چاہا، عورت نے اسے کاٹ لیا۔۔۔ کچھ لوگ بعد میں کہہ رہے تھے کہ انھوں نے جبراً عورت کی عصمت لوٹ لی ہے، عورت کے چہرے پر کئی دھبے پڑ گئے تھے۔''
>
> (بلندیوں کے خواب، ص۱۳۰)

عمر مجید نے بھی اپنے ناول ''یہ بستی یہ لوگ'' میں اس طرح کی کئی مثالیں پیش کی ہے۔ جس میں اکبر اپنے محلے کی معصوم لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھنسا کر پھر اُن کا جنسی استحصال کرتا تھا۔ اکبر ان معصوم لڑکیوں کو جسم فروشی کے دھندے میں استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح اکبر نے اپنے دوست نذیر کی بہن کو بھی محبت کا جھانسا دے کر، اُس کی عزت و عصمت کا سودا جبار خان کے بیٹے نعیم کے ساتھ ایک ہزار روپئے میں طے کیا۔ پیش ہے اسی ناول سے یہ اقتباس:

> ''نعیم صاحب آمنہ کے لیے ایک ہزار بھی کم ہے۔ چک دادا کے گلاب خان نے مجھے اس کے لیے دو ہزار دئے تھے۔ تم میرے دوست ہو اسی لئے تم سے اتنا کم مانگ رہا ہوں ...... اچھا جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن مجھے کب تک انتظار کرنا ہوگا۔ بس۔ اگلی اتوار کی رات کو آمنہ تمہارے کمرے میں پہنچ جائے گی۔''
>
> (یہ بستی یہ لوگ، ص۱۳۶)

وادی کشمیر میں عسکریت پسند تحریک کے دوران عورت سب سے زیادہ ظلم و زیادتی کا شکار ہوئی۔ عورت گھر کے اندر بھی اور باہر بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتی تھی ۱۹۹۰ء عسکریت پسند تحریک کے دوران آزادی کی لڑائی لڑنے والوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے بندوق کا غلط استعمال کر کے 'تحریک آزادی' کا ناجائز فائدہ اٹھا کر گھناؤنی حرکتیں کرنا شروع کر دیں، لاچار اور بے بس معصوم لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا گیا، کسی نے لڑکی کو اغوا کر کے اس کے ساتھ شادی رچا لی، اسی طرح بھارتی سیکورٹی فورسز کے حمایت یافتہ حکومت نواز بندوق برداروں کی جانب سے کشمیر میں لوٹ مار، اغوا کاری، ہراساں کرنے اور روپے مانگنے کے سینکڑوں واقعات پیش آئے۔ انھوں نے بھی کسی لڑکی کے گھر والوں کو تنگ کر کے، ان کی لڑکی کے ساتھ زبردستی شادی کر لی۔ جیسے ناول

'دہشت زادی' میں ایک اخوانی نے حمیدہ کی زندگی برباد کر کے اس کو چھوڑ دیا، فائزہ کو اخوانیوں کے ایک سرغنہ کے ڈر کی وجہ سے جموں بھیجا گیا کیونکہ وہ بار باران کو تنگ کر رہا تھا ۔اسی طرح ۱۶ سالہ ایک معصوم جواں سال لڑکی پاشا جو اسد کے گھر میں کام کرتی اور گھر کے ہر فرد کا خیال رکھتی تھی، صبح سے لے کر شام تک ان کی خدمت کیا کرتی تھی ۔اس گھر میں لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا، اس گھر میں عسکریت پسند بھی اکثر آتے جاتے تھے اور ان میں سے کسی نے پاشا کی عصمت کو تار تار کر دیا اور اسد اس برے فعل پر پردہ ڈالنا چاہتا تھا۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ بقول ناول نگار جس گھر میں عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے پر پابندی عائد کی جاتی تھی اسی گھر میں اتنا بڑا گناہ ہو گیا کہ رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ناول نگار اس دل دوز واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے:

''کتنا تضاد ہے ہمارے قول و فعل میں جس گھر میں لڑکیوں کو حصولِ تعلیم سے روکا جاتا رہا ہے اسی گھر میں سولہ برس کی غریب اور لاچار لڑکی پیٹ میں کسی کا بچہ پال رہی ہے اور گھر والے کہتے ہیں کہ زور زبردستی کرنے والے کا پتہ نہیں.....''

(دہشت زادی، ص ۱۹۹)

جان محمد آزد نے بھی اپنے ناولوں میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتیوں کے واقعات پیش کی عکاسی کی ہے۔جیسے آپ کے ناول 'کشمیر جاگ اٹھا' میں جاگیردارانہ دور کے زمیندار کے کارندہ 'حشمت خان' کو ایک وحشی کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو ایک درندہ صفت انسان ہے، ماہتاب کو یک و تنہا اور لاچار و بے بس پا کر اس کا جنسی استحصال کرتا رہا۔حشمت خان نے اسے موسلا دھار بارش میں ایک حیوان کی طرح دبوچ لیا، اس کا بچہ روتا رہا، ماہتاب بھی آہ و زاری کرتی رہی لیکن حشمت خان سارے ماحول سے بے خبر ماہتاب کی عصمت کو تار تار کرنے میں مصروف رہا۔پیش ہے اسی ناول سے یہ اقتباس:

''حشمت خان نے اسے بانہوں میں کس لیا۔گردن، گال، آنکھیں ،ناک، ہونٹ ہر اعضاء پر بوسوں کی بارش کی۔ماہتاب فریاد کرتی رہی.....'مجھے مار ڈالو۔لیکن مجھے اس طرح تباہ نہ کرو.....!'' لیکن حشمت خان پاگل بنا ہوا تھا۔یہ ساری باتیں تو اس کا معمول تھیں۔اس نے بے قابو ہو کر بے دردی سے اس کا گریباں کھینچا۔پھرن پھٹ گیا اور سنگ مرمر سے تراشا ہوا بُت اس کے سامنے عریاں ہو گیا۔اس نے اسے اپنی مضبوط بانہوں میں اٹھا لیا اور ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر لٹا دیا!''

(کشمیر جاگ اٹھا، ص ۵۲)

جموں کشمیر میں لکھے گئے ناولوں میں اس طرح کے اور بھی کئی واقعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔جیسے 'وادیاں بُلا رہی ہیں'، 'کشمیر جاگ اٹھا'، 'یہ بستی یہ لوگ'، 'اجنبی راستے'، 'بلندیوں کے خواب'، 'میلی عورت' 'مورتی' وغیرہ ناولوں

میں بعض ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی ہے۔

ترنم ریاض نے ناولٹ 'مورتی' میں بھی عورتوں کے جنسی استحصال کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ایک بار جب فیصل زنانہ پاگل خانہ کے جیل میں قیدیوں کو کچھ کھانا لے کر گیا تو اس نے وہاں عجیب طرح کا ماحول دیکھا۔اس نے محسوس کیا کہ جیل میں پڑی عورتیں یہاں پر تعینات خدمت گاروں اور سپاہیوں کے ظلم و جبر اور ہوس کا نشانہ بنتی رہی ہیں۔یہاں تک کہ جیل کے محافظ بھی ان عورتوں کے ساتھ جنسی استحصال کرتے ہیں۔ایک عورت کے ساتھ وہیں تعینات ایک خدمت گار نے جنسی زیادتی کر کے اس کی آبروریزی کی۔جس کی وجہ سے اب اُس کے پیٹ میں اسی خدمت گار کا ناجائز بچہ پل رہا تھا۔وہ چلا چلا کر سب کو کہتی تھی کہ یہ اسی خدمت گار کا بچہ ہے لیکن اس کی کوئی نہیں سُنتا تھا کیونکہ اُسے پاگل قرار دے دیا گیا تھا۔جبکہ اس عورت کی دماغی حالت ٹھیک تھی، اس کو اپنے چچا نے زبردستی پاگل خانے میں بھرتی کروایا تھا۔اسی لئے وہ خدمت گار اپنی کرتوت چھپانے کے لئے فیصل سے کہتا تھا کہ وہ پاگل عورت ہے جو بکواس کرتی ہے۔پیش ہے یہ اقتباس:

''وہ دیکھئے.....یہ بھی ایک نمونہ ہے۔'' خدمت گار نے ایک جواں سال لڑکی کی طرف اشارہ کیا جو اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کا وزن سنبھالنے کی کوشش کرتی پاؤں دُور دُور رکھتی قریب آ رہی تھی۔''اوے.....حرام جادے.....دو جنوں کا کھانا دے نا مجھے.....نہیں تو یہ تیرا بچہ جو اٹھائے پھرتی ہوں.....مر جائے گا۔'' اُس نے پاس پہنچ کر زمین پر تھوک دیا۔

'جھوٹ بولتی ہے۔.....بے شرم جانے کس کا ہے.....اور.....''

'کس کا.....کس کا ہے یہ بچہ.....شام کو بجلی بجھانے کے بعد تو ہی تو آیا تھا میرے پاس.....

(مورتی، ص ۲۷۱)

جوتیشور پتھک کے ناول 'میلی عورت' میں ناول نگار نے ایک دیہات کی سیدھی سادی لڑکی (چندن) کی کہانی پیش کی ہے کہ کس طرح وہ ایک معصوم لڑکی سے طوائف بن جاتی ہے۔اس ناول میں انھوں نے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ ہر طوائف پیدائشی طور پر طوائف نہیں ہوتی۔سماج کے ستم ظریفانہ حالات بھی ان کو طوائف بننے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔ان میں سے کچھ تو طوائف کی نسل سے ہوتی ہیں اور کچھ ایسی بدنصیب اور بے سہارا لڑکیاں بھی ہوتی ہیں جو اپنی اور اپنے خاندان کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے لئے یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔چندن بھی ان ہی لڑکیوں میں سے ایک ہے، جسے ایک مصور (راجن) نے سہارا دینے کا وعدہ کیا۔وہ مصور چندن کو اپنے ساتھ دہلی لے کے جاتا ہے لیکن مصور کے والدین نے اس لڑکی کو

خوبصورت پا کر اسے طوائف سے بھی بدتر بنا دیا اور اسے پیسے کمانے کا ایک ذریعہ بنا کر اس کے جذبات ،احساسات اور خواہشات کو کچل ڈالا۔اسے مصور (راجن) سے محبت تھی، عشق تھا اور وہ اس کی باعزت بیوی بن کے رہنا چاہتی تھی۔اس نے ایک باعزت اور خوشحال گھر میں دلہن بن کر جانے کا خواب دیکھا تھا لیکن اسکے سسرال والوں اور شوہر نے تو اسے بازار کی زینت بنا دیا تھا۔چندن اس گناہوں کے دلدل سے راہِ فرار حاصل کرنے کی پیہم کوشش کرتی رہی۔جس کے لئے اُس نے راجن سے بھی مدد مانگی تھی اور رو رو کر اُسے فریاد کر رہی تھی کہ مجھے اس دلدل سے کسی طرح نکال دو۔جیسا کہ اس اقتباس سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

''راجن مجھے اس گہرے کنویں سے نکال دو۔میں دلدل میں پھنس چکی ہوں۔میں تمہاری بیوی بن کر رہنا چاہتی ہوں مجھے ننگا نہ کرو، بھگوان کے لیے مجھے ننگا نہ کرو۔'' (میلی عورت، ص ۵۷)

چونکہ جموں کشمیر کے سیاسی ،سماجی اور تاریخی حالات و مسائل ملک کی دیگر ریاستوں سے تھوڑے بہت مختلف ہیں اس لئے یہاں عورتوں کے مسائل بھی تھوڑے مختلف ہیں۔نعیمہ احمد مہجور نے اپنے ناول میں وادی کشمیر میں عسکری تحریک کے دوران عورتوں کی پسماندگی ، بے کسی اور لاچارگی کو بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔کہ کس طرح یہاں کی عورت غلاموں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہے، کس طرح ان کے حقوق پامال کئے جاتے ہیں اور ہر قدم پر مردوں سے اجازت لینی پڑتی ہے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنی پڑتی ہے۔پدرانہ سماج میں مردوں کی بالا دستی سے عورت احساسِ کمتری کا شکار ہوئی ہے اور اس کی حیثیت ،عزت اور وقار کھو گیا ہے۔اس مضمون کا خاتمہ میں نعیمہ مہجور کے ناول کے اس اقتباس پر کرنا چاہتا ہوں۔:

''وادی میں خواتین کی شرح خواندگی پینسٹھ فی صد سے زائد ہونے کے سرکاری دعویٰ کے باوجود معاشرے میں مرد اور خاتون میں بڑی تفریق موجود ہے عورت مرد کی ذاتی جائیداد تصور کی جاتی ہے وہ کسی جائیداد کی مالک ہے نہ کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز ہے اگر کوئی فیصلہ کر بھی لے تو اس میں پہلے خاندان کے مردوں کی رضامندی لازمی ہے۔اُس کا مالک مرد ہے وہ چاہے والد ہو، بھائی ہو یا اُس کا شوہر میں نے اپنی ساری زندگی کچھ ایسا ہی محسوس کیا۔'' (دہشت زادی، ص ۱۶)

◂◂ ● ▸▸

Govt.Degree College,Mahanpur,Kathua(Kashmir)
9149580173
msuliman933@gmail.com

● **مضمون**

● **شبیر احمد ڈار**

ادا جعفری کی ابتدائی دس غزلوں کا عروضی جائزہ

(''غزالاں تم تو واقف ہو'' کے حوالے سے)

آدا جعفری کا شمار اردو کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔ان کی پیدائش 1924ء میں بدایوں میں ہوئی، اسی لیے پہلے پہل اپنے تخلص کے ساتھ بدایونی استعمال کرتی تھیں۔انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز تیرہ برس کی عمر میں اس وقت کیا جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔انہوں نے اپنی شاعری کو ترقی پسند تحریک کے اصولوں سے ہم آہنگ کر کے سماجی جبر اور استحصال کو شعری زبان عطا کی۔اس طرح سے انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ترقی پسند تحریک اور تقسیم ہند کے اثرات ان کی شاعری میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔غزلوں کے علاوہ نظمیں اور ہائیکو بھی لکھے ہیں لیکن وہ اپنی شاعری خصوصاً اپنی غزلوں میں ترقی پسندی کے عناصر کو فن پر زیادہ حاوی ہونے بھی نہیں دیتیں۔وہ خیال کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات پر بھی اپنی نظر رکھتی ہیں۔حالاں کہ وہ اس چیز کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ ترقی پسند ادب نے انھیں ایک شعور بخشا، زندگی کو نئے انداز اور نئے زاویے سے دیکھنے کے لیے مجبور کیا، انسانی قدروں کی پاسداری اور انسانیت کے تئیں ایک دردمندانہ دل رکھنے پر مجبور کیا۔اس حوالے سے وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

''زندگی کے میلے میں شرکت کا احساس مجھے ترقی پسند ادب نے عطا کیا''1

ان کی شاعری میں نسائی حسیت سے متعلق بعض ایسے کوائف بھی ملتے ہیں جن کا اظہار مرد شعراء کے لیے جوئے شیر کے مترادف ہے۔لیکن یہ بات بھی صد فیصد سچ ہے کہ ان کی شاعری کے موضوعات کسی ایک محدود دائرے تک محیط نہیں ہیں۔ان کی شاعری کا کینوس وسیع ہے جس میں زندگی کی رنگینی بھی جلوہ گر ہے جس کا اصل محور تہذیب و تمدن ، سیاست یا مذہب ہی نہیں بلکہ حسن و عشق اور فطرت انسانی بھی ہے۔انھوں نے ابتداء سے ہی اپنی ایک الگ راہ نکالنے کی کوشش کی، جس کی وضاحت وہ اپنے ایک شعری مجموعے ''سازِ سخن بہانہ ہے'' کے دیباچے ''چند باتیں'' میں کچھ یوں کرتی ہیں:۔

''یہ حقیقت ہے کہ آج سے تقریباً چالیس سال پہلے راہروانِ شوق کا ایک کارواں

جدید شاعری کا پرچم ہاتھوں میں لے کر چلا تھا۔اور ایک لڑکی تھی جو بڑے اعتماد اور
حوصلے کے ساتھ اس کارواں میں شریک ہوئی تھی۔ مجھے اپنی روایات جتنی عزیز ہے
روایتوں سے بغاوت بھی اتنی ہی عزیز رہی ہے۔۔۔۔''2

ادا جعفری سے پہلے شاید ہی کسی خواتین شاعرہ کو ادبی حلقوں میں اتنی پزیرائی اور مقبولیت حاصل ہوئی جتنی ان کو ہوئی ہے۔اسی حوالے سے کچھ محققینِ ادب نے انھیں اردو کی پہلی خواتین شاعرہ بھی کہا ہے۔حالاں کہ وہ اتنی صاف گو اور بے باک تھیں کہ انھوں نے خود اس بات کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اردو کی پہلی خواتین شاعرہ وہ نہیں بلکہ ماہ لقا چندا ہے۔ادا جعفری کی شاعری میں بے ساختگی اور روانی دیکھنے کو ملتی ہے۔موزوں الفاظ اور موثر انداز بیان نے ان کی شاعری میں غنائیت کے عنصر کو مزید بڑھا دیا ہے۔ان کا اپنا ایک الگ ڈکشن اور حسن ادا ہے۔ان کے لکھنے کا انداز بھی باقی خواتین شعرا سے مختلف ہے۔اور یہ ان کا اسلوب ہی ہے جو ان کو باقی شعراء سے الگ کرتا ہے۔انھیں فن پر عبور حاصل ہے۔خاموشی سے موثر الفاظ کے ذریعے نشتر چبھونا جانتی ہیں۔مشہور ماہر عروضی وشاعر اثر لکھنوی سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔اسی لیے عروضی نقطۂ نظر سے بھی ان کی شاعری جاندار نظر آتی ہے۔یہاں ''غزالاں تم تو واقف ہو'' جو 1982ء میں منصۂ شہود پر آیا، کی ابتدائی دس غزلوں کا عروضی جائزہ پیش کیا جائے گا۔انھوں نے اس مجموعے کا نام بھی راجہ رام نرائن موزوں کے مشہور شعر پر رکھا۔شعر یوں ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

راقم نے ان تمام غزلوں میں پہلے مصرع کو بنیاد بنا کر وزن متعین کیا ہے۔اس مجموعے کی پہلی غزل ''آگے حریمِ غم سے کوئی راستہ نہ تھا'' صفحہ نمبر 25 پر موجود ہے۔

بحر مضارع مثمن	آگے ح	ری م غم س	ک ئی راس	تا نہ تا
اخرب مکفوف محذوف	مفعول	فاعلات	مفاعیل	فاعلن

شعر نمبر 1,2,3,5,6,8,9 کا وزن بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) ہے۔شعر نمبر 4 اور 7 کے مصرعۂ اولیٰ کا وزن اخرب مکفوف مقصور (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات) ہے جب کہ ان کے ثانی مصرعوں کا وزن اخرب مکفوف محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن)۔یاد رہے عروض وضرب میں محذوف کی جگہ مقصور لانا جائز ہے۔

''مطلوب زندگی کو ابھی امتحاں نہیں'' مجموعے کی دوسری غزل ہے جو صفحہ نمبر 32 پر موجود ہے۔اس کا وزن دیکھیں:۔

بحر مضارع مثمن اخرب	مطلوب	زندگی ک	ابی ام ت	حا نہی
مکفوف محذوف	مفعول	فاعلات	مفاعیل	فاعلن

نون غنہ کو تقطیع میں ہمیشہ گرا دیا جاتا ہے لیکن عروضیوں نے مصرعے کے آخر پر آنے والے نون غنہ کو مستقل حرف مانا ہے اور اسے تقطیع میں شمار بھی کیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مقصور کی جگہ محذوب یعنی ایک الف تک بڑھانے کی عروضی اجازت بھی ہے جس سے آہنگ میں کسی قسم کی خلش پیدا نہیں ہوتی۔لیکن تقطیع میں اس نون غنہ کو ساقط کیا گیا ہے اور اس کے ساقط کرنے سے بھی غزل کا بنیادی وزن اثر انداز نہیں ہوتا۔شعر نمبر 1,2,3,4,5,6,7,8 کا وزن بھی مذکورہ بالا ہی ہے اس میں کوئی عروضی تبدیلی عمل میں نہیں آئی ہے۔

اس مجموعے کی تیسری غزل ''پھول صحراؤں میں کھلتے ہوں گے'' صفحہ نمبر 34 پر موجود ہیں۔اس میں کل چھے اشعار ہیں۔اس کا وزن بحر رمل مسدس مخبون محذوف مسکن فاعلاتن فعِلاتن فعلن ہے۔مقطع کے مصرعۂ اولیٰ کا وزن فاعلاتن فعِلاتن فعِلن (بہ حرکت عین) ہے یعنی دوسرے اشعار کی طرح اس کے آخر پر تسکین کا عمل وارد نہیں ہوا ہے۔

شعری مجموعے ''غزالاں تم تو واقف ہو'' کی چوتھی غزل ''مزاج و مرتبۂ چشم نم کو پہچانے'' ہے جو صفحہ نمبر 36 پر موجود ہے اور اس غزل کو ادا جعفری نے 1968 میں لکھا ہے۔غزل بحر مجتث کے ایک خوب صورت آہنگ میں ڈوبتی ہے۔

مجتث مثمن مخبون	مزاج مر	تبۂ چش	م نم ک پہ	چانے
محذوف مسکن	مفاعلن	فعِلاتن	مفاعلن	فعلن

غزل کا تیسرے اور پانچویں شعر میں کوئی عروضی تبدیلی وارد نہیں ہوئی لیکن دوسرے اور تیسرے شعر میں عروض کے رکن پر فعلن (مجتث محذوف مسکن) کی جگہ فعِلن (مجتث محذوف بہ حرکت عین) لایا گیا ہے جس کی عروضی اجازت بھی ہے۔

مجموعے کی پانچویں غزل ''وہ اعتماد خوئے ستم بھی بہانہ ساز'' ہے جو صفحہ نمبر 41 پر موجود ہے۔غزل کی بحر دیکھیں:۔

بحر مضارع مثمن	وہ اعت	ماد خوء	ستم بی ب	ہان ساز
اخرب مکفوف مقصور	مفعول	فاعلات	مفاعیل	فاعلان

تیسرے شعر کے دونوں مصرعے اسی وزن میں ڈوبتے ہیں جب کہ شعر نمبر 2,4,5,6 کے مصرعۂ اولیٰ میں ہلکی سی تبدیلی وارد ہوئی ہے اور مقصور کے بجائے محذوف کو لایا ہے گیا جو درست بھی ہے۔

''کہتے ہیں کہ اب ہم سے خطا کار بہت ہے'' مجموعے کی چھٹی غزل ہے اور صفحہ نمبر 43 پر واقع ہے۔مطلع کے مصرعۂ اولیٰ کا وزن درج ذیل تقطیع میں دیکھیں:۔

ہزج مثمن اخرب کہتے ہ کہ اب ہم س خطا کار بہت ہیں
مکفوف مقصور مفعول مفاعیل مفاعیل فعولان

یاد رہے کہ آخر کے نون غنہ کو یہاں شامل تقطیع رکھا گیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ عروضیوں نے عروض وضرب وعجز کے آخر پر آنے والے نون غنہ کو بطور ایک مستقل حرف مانا ہے۔اس کے گرانے سے بھی وزن میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتی ہے۔جس کی مثال پہلے ہی آچکی ہے کہ عروض وضرب میں ایک حرف تک بڑھانے کی اجازت ہے یعنی محذوف کے بجائے مقصور لایا جاسکتا ہے۔یاد رہے اسے اخرب مکفوف مقصور کے بجائے اخرم مکفوف مقصور بھی کہا جاسکتا ہے۔غزل کے مقطع کو چھوڑ کر باقی تمام اشعار یعنی دوسرے، تیسرے اور چوتھے شعر میں اس قاعدے سے فائدہ اٹھا کر شاعرہ نے ان اشعار کا مصرعۂ اولیٰ محذوف اور مصرعۂ ثانی مقصور لایا ہے۔

غزل نمبر سات ''جی نہ چاہا اسے بھلانے کو'' صفحہ نمبر 53 پر موجود ہے۔یہ بحر خفیف کا ایک خوب صورت آہنگ ہے۔میر سے لے کر آج تک اردو کے لگ بھگ تمام شعرا نے اس وزن اپنی غزلیں لکھی ہیں۔اس وزن کے خوب صورت آہنگ ہیں اور اس کے وزن میں کئی رعایتیں کئی گئی ہیں۔صدر وابتدا یعنی فاعلاتن کی جگہ اس کی مخبون شکل فعِلاتن بھی لایا جاسکتا ہے۔اسی طرح عروض وضرب میں فعلن (بہ سکون عین) کی جگہ فعِلن (بہ حرکت عین) یا فعلان (بہ سکون عین) یا فعِلان (بہ حرکت عین) لایا جاسکتا ہے۔یہ فہرست کچھ اس طرح ہے:۔

فاعلاتن مفاعلن فعلن (بہ سکون عین)
فعِلاتن مفاعلن فعلن
فاعلاتن مفاعلن فعِلن (بہ حرکت عین)
فعِلاتن مفاعلن فعِلن
فاعلاتن مفاعلن فعلان (بہ سکون عین)
فعِلاتن مفاعلن فعلان
فاعلاتن مفاعلن فعِلان (عین کے کسرہ یعنی بہ حرکت عین کے ساتھ)
فعِلاتن مفاعلن فعِلان

خفیف مسدس مخبون جی نہ چاہا اسے ب لا نے کو
محذوف مسکن فاعلاتن مفاعلن فعلن

شعر نمبر 1,2,3, اسی آہنگ میں ہیں۔جبکہ چوتھے اور چانچویں مصرعے میں آخر کے نون غنہ کو

تقطیع میں شامل سمجھا گیا ہے۔مصرعے دیکھیں ع

ریزہ ریزہ بکھر گیا انساں آنسوؤں کو ترس گئیں آنکھیں
فاعلاتن مفاعلن فعلان

اسی طرح مقطع کے رکن عروض میں فعِلن (بہ سکون عین) لایا گیا ہے۔ع

سانس کی بات ہو کہ آس ادا ساس کی با / ت ہو ک آ / س ادا
فاعلاتن مفاعلن فعِلن

لفظ سانس میں نون کی آواز کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ آدا جعفری فن عروض کے اسرار ورموز سے اچھی طرح واقف تھیں۔

متذکرہ بالا شعری مجموعے کی آٹھویں غزل ''گفتار میں بے ساختہ پن اب بھی وہی ہے'' صفحہ نمبر 81 پر ہے:۔

ہزج مثمن اخرب گفتار م بے ساخ ت پن اب ب وہی ہے
مکفوف محذوف مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن

اس غزل کے شعر نمبر 1,3,4,5,7 اور 8 کا وزن ہزج مثمن اخرب مکفوف مقصور ہے اور شعر نمبر 2 اور 6 کے مصرعۂ اولیٰ کا وزن ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف ہے۔کیوں کہ یہاں بھی آخری نون غنہ کو شامل تقطیع رکھا گیا ہے، حالاں کہ اس کے رکھنے یا گرانے سے اس کے بنیادی وزن وآہنگ میں کوئی تبدیلی وارد نہیں ہوگی۔

غزل ''یہ حکم ہے تری رایوں میں دوسرا نہ چلے'' بحر خفیف میں ڈوبتی ہے۔اس کی تقطیع یوں ہوگی:۔

مجتث مثمن یہ حکم ہے ت رراہو م دوسرا ن ملے
مخبون محذوف مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعِلن

شعر نمبر 1,24, اور 5 میں کوئی زائد زحاف کا استعمال نہیں کیا گیا ہے اور وزن متذکرہ بالا تقطیع کا ہی ہے جب کہ شعر نمبر 3,6, اور 7 (مقطع) کے مصرعۂ اولیٰ کے آخری رکن پر تسکین کے عمل سے فعِلن (بہ حرکت عین) کے بجائے فعلن (بہ سکون عین) لایا گیا ہے۔مصرعے کچھ یوں ہیں ع

جمالِ شب مرے خوابوں کی روشنی تک ہے گئے دنوں کے حوالے سے تم کو پہچانا
کدھر سے سنگ چلا تھا ادا کہاں پہنچا مفاعلن فعِلاتن مفاعلن فعلن

اس مجموعے کی دسویں غزل ''اوروں سے داستانِ بہار وصبا کہیں'' ہے۔یہاں پر بھی آخر کے نون غنہ کو تقطیع میں شمار کیا گیا ہے جس سے اس کا وزن مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن۔اس نون غنہ کو ساقط

کرنے کا جواز تو نظر نہیں آتا لیکن اگر اسے ساقط بھی سمجھا جائے تب بھی اس کا بنیادی وزن متاثر نہیں ہوگا۔

مضارع مثمن	اوروس	داستان	بہاروص	باکہیں
اخرب مکفوف مقصور	مفعول	فاعلات	مفاعیل	فاعلان

تقطیع کے آخر پر فاعلات کی جگہ فاعلان اس لیے لکھا گیا ہے تاکہ پہچان رہے کہ آخر کا نون متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے کیوں کہ اردو شاعری میں مصرعے کا حرف آخر متحرک نہیں بلکہ ہمیشہ ساکن آتا ہے۔شعر نمبر ایک کے علاوہ غزل کے باقی چھے اشعار کے مصرعۂ اولیٰ کو مقصور کے بجائے محذوف لایا گیا ہے۔اسی لیے بہتر ہے کہ تقطیع میں بھی عروض وضرب میں نون غنہ کو ساقط ہی سمجھا جائے۔

القصہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادا جعفری کو فن عروض پر بھی ملکہ حاصل ہے۔اپنے خیال کو اوزان کے دائرے میں رہ کر بیان کرنے کا سلیقہ انھیں خوب آتا ہے۔وہ خیال کے ساتھ ساتھ فن کے اندرونی لوازمات اور محاسن کا خاص خیال رکھتی ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

حوالہ جات:۔

(1):۔رسالہ نقوش، مدیر جاوید طفیل، شمارہ نمبر 139، ص 674، اردو بازار لاہور

(2):۔ساز سخن بہانہ ہے، ادا جعفری، ص 10، اشاعت مئی 1982،

ناشر: غالب پبلشرز پوسٹ بکس نمبر 4079، لاہور

Department of Urdu ,Universitry of Hyderabad
pincode: 500046
cell: 7006921912
email: rayeesdar245@gmail.com

● **مضمون**

● **حارث حمزہ لون**

پروین شیر.....ایک نئی نسائی آواز

پروین شیر ان معدودے چند فنکاروں میں ہیں جن کے فنی و تخلیقی امتیازات کا دائرہ بیک وقت شاعری، مصوری اور موسیقی تک پھیلا ہوا ہے۔شاعری، موسیقی و مصوری فنون لطیفہ کے تین خوبصورت رنگ ہیں۔کہا جاتا ہے کہ شاعری اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔موجودہ عہد میں موسیقی کے سازوں کی لے کچھ زیادہ تیز ہوگئی ہے۔ ہمارا موجودہ عہد ناہموار راستوں کا سفر ہے، جہاں وقت کے ساتھ بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، وہیں اُردو شاعری کا کینوس بھی وسیع نظر آتا ہے۔کلاسیکی رنگ شاعری کی جگہ نئی فکر کے نئے در وا ہوئے ہیں۔روایت پسندی سے قطع نظر نئے فکری رویے اور فنی برتاؤ نے جگہ بنانا شروع کی۔ انسانی ضرورت اور وقت کے نئے تقاضوں نے اُردو شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ہجر و وصال سے عبارت اردو شاعری عصری تقاضوں اور پیچیدگیوں سے دوچار نظر آتی ہے۔

اُردو کی نسائی شاعری کے حوالے سے مختلف رنگ اُردو شاعری کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتے نظر آتے ہیں۔ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر جہاں اُردو شاعری کے نگار خانے کو سجانے سنوارنے میں پیش پیش نظر آتی ہیں، وہیں اُردو شاعری کے حوالے سے خوبصورت رنگوں کی ملکہ پروین شیر بھی ہیں۔دوسری شاعرات نے جہاں قلم کی نوک سے اُردو شاعری کی نوک پلک درست کی ہے، وہیں پروین شیر نے قلم کی جگہ بُرش کا استعمال کیا ہے۔ان کے یہاں مختلف رنگ اپنی روشنی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔بقول وہاب اشرفی:

> ''پروین شیر اُردو کی واحد شاعرہ ہیں جن کا تعلق بیک وقت مصوری اور موسیقی سے بھی ہے۔وہ اپنے فن مصوری کا مسلسل مظاہرہ کرتی رہتی ہیں، جس کی پذیرائی بین الاقوامی سطح پر ہوتی رہتی ہے۔''
>
> (بحوالہ: رسالہ ''مباحثہ''، مضمون۔وہاب اشرفی)

پروین شیر کی ذات میں فنون لطیفہ کی تین شاخیں ایک ساتھ جمع ہوگئی ہیں۔وہ بیک وقت شاعرہ، مصورہ اور اچھی موسیقار ہیں۔پروین شیر ہندوستان کے شہر پٹنہ میں پیدا ہوئیں۔انھوں نے سولہ سال کی عمر

میں شاعری اور مصوری شروع کر دی تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ کینڈا چلی آئیں اور پھر یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ پروین نے مصوری کی باقاعدہ تعلیم مانیٹوبا یونیورسٹی (کینڈا) سے حاصل کی۔ ان کی تصاویر کی اب تک لاتعداد نمائشیں امریکا، کینڈا، برطانیہ، فرانس اور انڈیا میں ہو چکی ہیں۔ وہ مصوری کے شعبے میں لاتعداد ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں پروین شیر کی ادبی اور ثقافتی خدمات کے اعتراف میں اُن کو ۲۰۰۴ء میں کینڈا کے شہر وینی پگ میں "Women of Distiction Award" سے نوازا گیا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایک سے زیادہ میدانوں میں کامیاب ہو کر دکھاتے ہیں۔ بقول پروین انھوں نے جن تین دوستوں کو اپنا مستقل ساتھی بنا رکھا ہے وہ قلم، موئے قلم اور مضراب یعنی بیک وقت وہ شاعرہ، مصورہ اور موسیقار تینوں ہیں۔ بحیثیت مصورہ بھی انھیں آئل پینٹنگ میڈیا آرٹ میں ایک بڑی حیثیت حاصل ہے۔ پینسل اسکیچ بھی ان کے منہ سے بولتے ہیں۔ انہوں نے کینڈا کی مینی ٹوبا یونیورسٹی کے فائن آرٹس میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور اب تک وہ پانچ سو کے قریب تصویریں معرض وجود میں لا چکی ہیں۔ کئی ممالک کی آرٹ گیلریوں میں ان کی تصاویر کی نمائش ہو چکی ہے۔ مصوری میں آٹھ ایوارڈ کینڈا میں او ایک ہندوستان کے National and Provincial Competition میں حاصل کر چکی ہیں۔ اہم مراکز اور اجتماع کے اڈوں پر جگہ جگہ ان کی پینٹنگ دیواروں پر آویزاں نظر آتی ہیں۔

پروین شیر دراصل انسانیت کی علمبردار ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کی خواہاں ہیں۔ ان کے سینے میں ایک دردمند دل ہے جو کبھی جنگ کی ہولناکیوں پر خون کے آنسو روتا ہے، کبھی نسلی عصبیت کا شکار ہوئے لوگوں پر ماتم کناں نظر آتا ہے، کہیں طبقاتی کشمکش کے خلاف، کبھی گمراہ حکمرانوں کی ڈکٹیٹر شپ کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ ان کی شاعری اور مصوری دونوں عالم امن کے لئے فضا تیار کرتی ہیں، جگہ جگہ احتجاجی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ انسانیت کے حق میں ان کا یہی مثبت رویہ ان کی شاعری کو آفاقیت بخشتا ہے۔ بقول احمد فراز ''پروین شیر کا دل شاعرانہ، آنکھیں ایک مصورہ کی اور ہاتھ ایک موسیقار کے ہیں''۔

پروین شیر نے اپنے اندر کی تمام خشک سالیوں کو انجمن آرائیوں کے حوالے کر دیا۔ ان کی شاعری کا کینوس اس وقت اور خوبصورت نظر آتا ہے جب وہ بے زبان مظلوم و نادر انسانوں کے احوال کے لئے پیلے اور زرد رنگوں کو اظہار کا ذریعہ بناتی ہیں اور الفاظ کے انتخاب میں بڑی ذہانت سے کام لیتی ہیں۔ استحصالی سماج کی تصویریں ان کے یہاں مختلف زاویوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ ظلم کے خلاف کھل کر آواز اٹھائی ہے۔

پروین شیر کا مجموعہ ''کرچیاں'' رنگ برنگے پھولوں کا گلدستہ ہے جس کا ہر پھول اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ کرچیاں Fragments ۲۰۰۵ء میں کراچی سے سید معراج جامی نے اپنے ادارے سے

شائع کیا تھا، جس میں پروین شیر کی شاعری اور ان کا انگریزی ترجمہ مع پروین شیر کی اعلیٰ درجے کی رنگین مصوری سے مزین ہے۔ مجموعہ ''کرچیاں'' کی نظموں میں کٹھن سوال، قتل، تابوت، تجربہ گاہ، فصلِ گریہ، ہم زاد، قدآوری کا دکھ، اُس رات وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام نظمیں نسائی شاعری کا بھرپور احاطہ کرتی ہیں۔ نظم ''تجربہ گاہ'' بھی عہد حاضر کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے، ہمارے موجودہ عہد میں کچھ نہ ہو، تجربہ گاہوں میں روز ہی نت نئے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی نئے تلاش میں سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ انسان جہاں تباہ کاری کے نئے اسلحے ایجاد کر رہا ہے، وہیں اپنے بچاؤ میں بھی پیش پیش ہے۔

پروین شیر نے اپنی اس نظم میں دنیا کو ایک تجربہ پسند حسّیت اور بصیرت کے ساتھ دیکھا ہے جسے ایک دن تباہ ہونا ہے۔ مٹی کے کھنکتے برتنوں کی طرح کھنکتے اور چمکتے ہوئے شاداب چہروں کو ایک دن مٹی ہو جانا ہے۔ چند مثال درج ذیل ہیں۔

یہ دہرا ایک لیب (Lab) ہے
سبھی بشر لگے ہوئے ہیں تجربوں کی دوڑ میں
حیات کے شروع سے
سفر آخرت تک
یہ تجربے نئے نئے بہت بلائے جان ہیں

پروین شیر کی ایک مختصر نظم ''کھٹن سوال'' ہے۔ یہ نظم جتنی مختصر ہے اتنی ہی جامع اور پُر اثر ہے۔ اس نظم سے معاشرے کی دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ دی ہیں۔ جہاں انسانی رشتوں کی ناقدری اور پامالی پر نظم ایک ضرب کاری کہی جائے گی۔ نظم ''کٹھن سوال'' واقعی اپنے آپ میں ایک سوال ہے۔ نظم کے چند بند ملاحظہ ہو۔

جب یہ کسی نے مجھ سے پوچھا
دنیا میں کون تمہارا
سب سے سچا، سب سے اچھا دوست بتاؤ
یہ سنتے ہی عقل کے دریا میں میرے ادراک کی کشتی
چکر کھانے لگی بھنور
کوئی جواب نہ پا کر اس کا
سوچ سوچ کر ہوئی نڈھال
عمر میں پہلی بار کسی نے

پوچھا تھا یہ کھٹن سوال !

نظم ''تلاش گمشدہ''، یہ نظم بھی زندگی کی ناہمواریوں سے تعبیر کی جائے گی، خموشی کی ہلکی سی کرن ہی بہت ہوتی ہے، جس کے سہارے انسان غموں کو بھول جاتا ہے۔ اس نظم میں کچھ ایسی ہی صورت نظر آتی ہے جہاں فطرت کے پس منظر میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

مگر اس بار تو جانے کہاں غائب ہوئی ہے وہ
بہت اس کو پکارا، گھر کے ہر کونے میں دیکھا پر
خدا جانے کہاں اس نے بسیرا کر لیا ہے، چھوڑ کر مجھ کو
بہت آزردہ خاطر ہوں، بہت رنجور بیٹھی ہوں
کہیں ایسا نہ ہو وہ راستہ ہی بھول بیٹھی ہو مرے گھر کا
کہاں ڈھونڈوں خوشی تم کو؟

پروین شیر کی نظموں میں جگہ جگہ سوالیہ صورت ابھرتی ہے، وہ عہد حاضر کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے یہاں معاشرے میں پیش آنے والے بڑے سے بڑے چھوٹے سے چھوٹے واقعات و حادثات پورے طور پر جگہ پاتے ہیں۔ نظم ''قتل'' بھی اپنے اندر بڑی گہرائی اور گیرائی رکھتی ہے۔ انھوں نے انسانی دکھوں کی حنا کے پتوں کے ذریعے وضاحت فرمائی ہے۔ ضرورت زندگی نے انسانی قدروں کو سوکھے پتوں کی طرح ہوا کے رحم وکرم پر چھوڑ رکھا ہے، اب وہ پاؤں کے نیچے آئیں یا پتھر کے نیچے، سب کا مقدر ایک جیسا نہیں ہوتا۔ نظم ''قتل'' علامتی نظم ہے، جس میں تخریبی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حنا کے پتے موجودہ دور کی عورت کی طرح ہیں، مردوں کے استحصالی سماج سے روز ہی اس کا سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہو ۔

حنا کے پتے یہ کہہ رہے ہیں
ہمیں ہمارے گھروں سے تم نے جدا کیا ہے
گھروں سے بے گھر بنا کے تم نے
ہمارے نازک سے جسم کو پتھر میں پیسا
یہ جرم کر کے، یہ قتل کر کے
تمہارے ہاتھ اب، رنگے ہوئے ہیں ہمارے خون سے

نظم ''ہم زاد'' سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ واقعی پروین شیر نے اپنی طبع زاد فکر و تخیل کے رنگوں سے لفظوں کو مختلف تخلیقی شیڈس عطا کئے ہیں، مصوری اور پروین شیر آپس میں لازم و ملزوم کی

حیثیت رکھتے ہیں جس کا اعتراف انھوں نے خود ہی کیا ہے ۔

مرا ہم زاد ہے یہ کینوس میرا
میرے سبھی دکھ درد کا ساجھی رہا ہے عمر بھر میری
یہ خود مٹ کر مری پہچان بنتا ہے
مرے دل کے سبھی افسانے اس پر رقم ہیں جیسے
مرا ہم زاد ہو یعنی
مرا ہی دوسرا رخ ہو!

پروین شیر کے یہاں بین الاقوامی مسائل بھی بخوبی جگہ پاتے ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ ترقی یافتہ ممالک کے واقعات بھی رقم کئے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی اپنے معاشرے کی چشم دید گواہ ہیں۔ مغربی ممالک میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات پر ان کی گہری نظر ہے، تبھی تو ان کے یہاں ''دارالضعفاء'' (House for the old) ایسی نظمیں وجود میں آتی ہیں۔ پروین شیر نے مغرب میں خونی رشتوں کو پامال ہوتے دیکھا ہے، جہاں بوڑھے ماں باپ کو بیکار، بے مصرف سمجھ کر ان کی اپنی اولادیں کرب و تنہائی کی قبر میں زندہ دفن کر کے چلی جاتی ہیں، جن کا کوئی پرسان حال نہیں اور جن کی دیکھ بھال کرائے کے نوکروں کے ذمے رہتی ہے۔ مغرب کی تہذیب یافتہ قوموں کا اپنے بوڑھے ماں باپ کے تئیں ایسا سلوک پروین کو خون کے آنسو رلاتا ہے جس کا ثبوت ''الضعفاء'' نظم میں جا بجا نظر آتا ہے ۔

یہ لوگ اس جگہ ہیں جس جگہ
دلوں کو جوڑنے کی کوئی رسم ہی نہیں
وجود ان کے خم ہیں اب اکیلے پن کے بوجھ سے
سسکتی آنکھیں، ڈھونڈتی ہیں، دائیں بائیں
ان سبھی کو جو جہاں کے شور و غل میں کھو گئے
کہ ان کے تھرتھراتے، خستہ حال، خشک ہاتھ بھی
ترس رہے ہیں اب کسی جوان لمس کو

پروین شیر کی یہ نظم ''دارالضعفاء'' کے مطالعہ سے اپنے آنے والے کل کے لئے سوچ کر کانپ ضرور جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قید تنہائی کاٹ رہے ہیں، جنھوں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا ہوگا۔ نظم ''آخری اسٹیشن''، ''ریٹائرمنٹ'' یہ نظمیں بھی ''دارالضعفاء'' کے بطن سے ہی جنم لیتی

ہیں جہاں ٹوٹتے بکھیرتے رشتوں کی پامالی قدم قدم پر دامن گیر نظر آتی ہے جہاں انسانی زندگیاں ریٹائرمنٹ کے بعد عمر کے آخری سفر پر آخری اسٹیشن کے انتظار میں سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔

آخری اسٹیشن آتا ہے
خالی ڈبہ رہ جاتا ہے
تنہائی میں بھیگی آنکھیں
ڈبے کی ہر کھڑکی میں سے جھانک جھانک کر
وقت کی گہری دھند میں کھوئے
سب رشتوں کو
دور سے تکنے کی کوشش کرتی رہتی ہے

پروین شیر نے اپنی نظموں میں اتنا درد سمو دیا ہے، کہ پڑھنے والا ان سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں درد ضرور ہے لیکن مایوسی نہیں۔ ایسے ہی ان کی نظموں کو پڑھنے سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ انھیں انسانی نفسیات پر مہارت حاصل ہے، وہ جس کے متعلق نظم لکھتی ہیں اس کی نفسیات کو مدنظر رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظموں میں عجب تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ اس میں ان کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کے مشاہدے اور اظہار بیان پر قدرت کو دخل ہے۔ پروین کی نظمیں تابوت، دارالضعفاء، اب کے برس، بے بسی، اندھیرا، شہر خموشاں، سبھی رشتے معطل ہیں، بے چارگی اور چبھن، شکست خوردگی....!

پروین شیر کا شاعری اور مصوری پر مشتمل مجموعہ ''کرچیاں'' اپنی مثال آپ ہے۔ پروین شیر شعر بھی خوبصورت کہتی ہیں، موسیقی سے لگاؤ بھی رکھتی ہیں، مصوری کی جادوگری میں بھی اور نہ معلوم حرف و رنگ وصورت کی کیا کیا دنیائیں بناتی رہتی ہیں۔ وہ شاعر کا دل، مصور کی آنکھ اور مطربہ کے ہاتھ رکھتی ہیں، ان سب میں شعر کہنا جان جوکھم کا کام ہے۔ ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں سب میں ان کا اپنا انداز اپنا اسٹائل نمایاں ہے۔ وہ کسی کی پیروی کے بجائے تخلیقی مہارت سے کام لیتی ہیں، اپنے شعور و آگہی سے کام لیتی ہیں نقالی نہیں کرتیں۔ یہی ان کا سب سے بڑا کمال ہے۔

پروین شیر کی مخصوص و منفرد شناخت جہاں ان کے تخلیق کردہ شعری پیکر سے ہوتی ہے، وہیں اس کی بھرپور شعری رونمائی ان کے تخلیقی مصورانہ مزاج کا حصہ کہا جائے گا۔ وہ اپنی حسین و زریں آرزوؤں اور تمناؤں کو جذبات اور احساسات کے رنگوں میں ڈھالنے کا ہنر جانتی ہیں۔ انھوں نے جہاں نظمیں کہی ہیں، وہیں غزل کے دیار میں بھی اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیتوں کو عیاں و نہاں کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

حالانکہ غزلوں کی بنسبت وہ نظموں کی طرف زیادہ مائل نظر آتی ہیں۔ اپنی شاعری میں انھوں نے اشارے کنائے کے ذریعہ معاشرے کی بگڑتی بنتی صورت حال کا بخوبی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے انتہا پسندی سے قدم قدم پر اجتناب برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری سلگتی تپتی دھوپ سے ٹھنڈی اور خوشنما چاندنی کا سفر محسوس ہوتی ہے۔ پروین کہتی ہیں۔

قسمت کے پھیر میں کچھ اپنی خطا بھی تھی — کس منہ سے اب سوال کریں زندگی سے ہم
زمین پیروں تلے ہو یہ اب گماں بھی نہیں — جو سر اٹھایا تو دیکھا کہ آسماں بھی نہیں
زندگی کی گتھیوں کا کچھ پتہ چلتا نہیں — اک الجھی دوڑ ہے جس کا سرا ملتا نہیں
میں دوں صبر کے امتحاں اور کتنے — مرے سر پہ ہیں آسماں اور کتنے

بچوں سے ہمدردی، بچوں سے محبت اور بچوں کا دکھ درد دیکھ کر ان کا دل کانپ کانپ اٹھتا ہے۔ اپنی نظموں میں بچوں کی طرف ان کا غیر معمولی جھکاؤ اور بچوں کی مالی اعانت کے لئے UNICEF کے تحت ان کا سی.ڈی بنانا اور اپنے شعری مجموعے کی ساری آمدنی بچوں کے لئے وقف کر دینا ثابت کرتا ہے کہ وہ دنیائے شعر و سخن کی مدر ٹریسا ہیں، جو بچوں کے لئے اپنے دل میں ایک گاڈ مدر اور قومی ماں کے جذبات رکھتی ہیں۔ ان کی نظم ''سب سے بڑا دکھ'' کے آخری حصہ کی ایک جھلک ہی ثابت کر دیتی ہے کہ کبھی انسانیت کی مسیحا اور خاص طور پر بچوں کی تو آپ واقعتاً ہی مدر ٹریسا ہیں۔

یہ سب دکھ ہیں
ایک سے بڑھ کر ایک....مگر جو
سب سے گہرا دکھ
پروین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے
وہ ہے
ایک بھکارن بچی کے اس پھول سے تازہ چہرے پر
ٹھنڈی سی، بجھی بجھی سی، بوڑھی آنکھیں!

لہذا کہا جا سکتا ہے کہ پروین شیر ایک فطری فنکارہ ہیں۔ وہ بہت اچھی شاعرہ، بہترین مصورہ اور کامل موسیقار ہیں، یہ گوناگوں صفت یقیناً خدا کی دین ہے۔ وہ اپنے سینے میں ایک درد دل مند رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دوسروں کا دکھ درد اور اذیت دیکھ کر وہ تڑپ جاتی ہیں، جہاں جہاں بھی ظلم ہوتا ہے اس کا ردعمل پروین شیر کی آنکھوں سے ٹپکتے اشکوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہی اشک کبھی کبھی کسی شعر میں ڈھل کر ان کے قلم

سے نمودار ہوتے ہیں اور کبھی کبھی کسی رنگ میں ڈھل کر ان کے برش کی زبان سے بولنے لگتے ہیں۔

پروین شیر کے نئے شعری اور مصوری کے مجموعے ''بے کرانیاں'' شامل ہے۔ سال ۲۰۰۸ء نئی دہلی میں جشن ریختہ کی جانب سے ان کی نئی کتاب کی رسم اجرا کا اہتمام کیا گیا اور اس کی رونمائی اردو ادب کے صف اول کے نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ صاحب نے فرمائی۔ نارنگ صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں ''بے کرانیاں'' پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ستاروں اور سیاروں کے علاوہ کیا ہے Space میں، دوسرے Satellite نہیں ہیں؟ بالکل ہیں، اور سب بے کراں ہیں۔ اس کے بعد نارنگ صاحب نے پروین شیر کی نظموں کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے ان کی نظم ''بے کراں'' سامعین کو سنائی۔ انہوں نے فرمایا کہ موجود اور نامور کو پروین شیر نے اپنی نظم ''بے کراں'' میں برتا ہے۔ یہاں پوری نظم کے بجائے اس کے کچھ اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:

زندگی سے پرے/زندگی گامزن ہے کہاں
یہ تسلسل کہیں/ختم ہوتا نہیں
ایک پل بھی ٹھہرتا نہیں
ہانپتی زندگی
دوڑتی ہی چلی جارہی ہے یہاں
پاؤں چھلنی ہوئے ہیں مگر/دور تک
بے کرانی میں ڈوبا ہوا
کتنے نقش قدم اوڑھ کر/جارہا ہے نہ جانے کہاں راستہ

الغرض پروین شیر نے جس طرح اپنے نسائی افکار سے ہماری شاعری میں جگہ بنائی، وہ ایک مثال ہے۔ ہر چند دونوں فن بظاہر ایک دوسرے سے گہرے تعلق کے حامل ہیں، شاعری تصور اور فکر و خیال کو الفاظ میں منتقل کرنے کا فن ہے، تو مصوری اپنے خیال و فکر یا تصور کو تصویر کرنے کا ہنر۔ مگر دونوں کا کام ہرگز آسان نہیں کہ صرف لفظوں کو کسی وزن میں جوڑ دینا شاعری نہیں، اسی طرح برش سے رنگوں کے ذریعے کچھ بنا دینے کا نام مصوری نہیں۔ یہ تو چیز دیگر است والا فن ہے۔

R/O: RehmatAbad Rafiabad Baramulla‹Kashmir
Post Office: Chatloora
Pin Code: 193301, Contact: 7889382310

● **مضمون**
● **عاتکہ ماہین**

متن کی قرأت کے عناصر

قوموں کی ترقی کا انحصار ان کی زبان پر ہوتا ہے اور زبان چونکہ ایک زندہ شئے ہے، ردّ و قبول کی صلاحیت رکھتی ہے لہٰذا اس میں جدّت واقع ہونا ناگزیر ہے۔ تمام زبانوں کے کچھ اصول و قواعد مقرر ہوتے ہیں لیکن محض قواعد کی بنا پر زبانیں ارتقاء پذیر نہیں ہوتیں بلکہ عوام کے ذریعہ بولے جانے والے کچھ الفاظ جو چلن میں آجاتے ہیں زبان کو وسعت دینے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کسی بھی زبان میں تغیر و تبدیلی کا عمل اس زبان کے بولنے والوں کی وجہ سے واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا زبان کے رکھوالوں پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ اپنی زبان کو لکھنے، پڑھنے کا صحیح طریقہ اختیار کریں۔

متن کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحریری شکل میں موجود ہو۔ متن خواہ شعر ہو یا نثر اس کی اہمیت تبھی ہوگی جب کہ اس کو پڑھا جائے۔ متن کی صحیح قرأت کی ضرورت اس لئے ہے کہ انسان کا تعلق پہلے آواز سے قائم ہوتا ہے۔ تحریر کا مرحلہ اس کے بعد کا ہے۔ ایک عمدہ لکھی ہوئی تحریر میں گرچہ تحریر کی تمام خوبیاں موجود ہوں مواد اچھا ہو، خوش خط بھی ہو۔ لیکن اگر اس کو کسی محفل میں پڑھنے کی ضرورت پیش آگئی اور متن کو صحیح طریقے سے نہیں پڑھا گیا تذکیر و تانیث کا خیال نہیں رکھا گیا، لہجے کے اتار چڑھاؤ پر توجّہ نہ دی گئی اور تلفظ کی ادائیگی درست نہ ہوسکی تو تحریر کی تمام خوبیاں پیش کش کی خامیوں کی وجہ سے پس منظر میں چلی جائیں گی۔ اسی طرح قاری کسی عبارت سے صحیح معنوں میں اسی وقت لطف اندوز ہوسکتا ہے جب کہ وہ عبارت کو صحیح ڈھنگ سے پڑھنے پر قادر ہو۔ درج ذیل عناصر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہتر طریقے سے متن کی قرأت کی جاسکتی ہے۔

آواز، لہجہ، تلفّظ، روزمرّہ اور محاورہ سے واقفیت، رموز و اوقاف اور غیر ضروری الفاظ سے اجتناب۔:

اردو کے حروف تہجّی میں ہر حرف کی ایک مخصوص آواز ہے اور متن کی صحیح قرأت کے لئے ان آوازوں کی پہچان رکھنا بہت ضروری ہے۔ مثلاً ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ خالص اردو کے حروف ہیں۔ عربی کے حروف تہجّی میں یہ حروف شامل نہیں ہیں۔ لہٰذا عربی والے ان آوازوں کو ادا نہیں کر سکتے لیکن اردو پڑھنے والا اگر ''جو دل ہی ٹوٹ گیا، کیا ہوں شعر تر پیدا'' اس مصرعے کو اس طرح ادا کرے ''جو دل ہی توت گیا، کیا ہوں شعر تر پیدا'' تو یہ مناسب نہیں۔ بعض علاقائی بولی بولنے والے ''ش'' اور ''س'' میں ''ز'' اور ''ج'' میں فرق نہیں کر پاتے اور ان حروف کو یکساں پڑھتے

ہیں۔آواز کے سلسلے میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر متن کی بلند خوانی درکار ہے تو ایسی صورت میں قاری کی آواز بھی صاف اور بلند ہونی چاہیے۔آواز کی لڑکھڑاہٹ یا دھیمے پن سے گفتگو کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

لفظ کی ادائیگی کرتے ہوئے اس کے حروف کے مخارج اور اعراب کا شعور ہونا بھی ضروری ہے کہ کون سا حرف ساکن ہے کون سا متحرک ہے اور اگر متحرک ہے تو زبر، زیر، یا پیش ہے۔اس کے علاوہ کس لکھے ہوئے حرف کی حیثیت غیر ملفوظی ہے اور کس غیر مکتوب حرف کی حیثیت ملفوظی ہے۔یعنی حروف کے حذف و اضافہ کا کیا مقام ہے نیز لفظ کا لہجہ کیا ہے اس کی کیفیت کیا ہے۔مثال کے طور پر فانی بدایونی کا شعر ہے۔

اک معمّا ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا زندگی کاہے کو ہے؟ خواب ہے دیوانے کا

(کلیات فانی؛ فانی بدایونی، ص ۴۵)

مذکورہ مثال میں لفظ خواب میں ''واؤ'' کی حیثیت غیر ملفوظی ہے۔لفظ کی کیفیت کے سلسلے میں میر تقی میر کا یہ شعر ہے۔

عشق ہمارا آہ نہ پوچھو کیا کیا رنگ بدلتا ہے خون ہوا، دل داغ ہوا، پھر درد ہوا، پھر غم ہے اب

(کلیات میر، جلد اول، دیوان پنجم: میر تقی میر، ص ۷۵۱)

مذکورہ مثال میں خون ہونا، دل داغ ہونا، درد اور غم تمام الفاظ تکلیف کے اظہار کے لئے مستعمل ہیں۔لیکن ان کی کیفیات مختلف ہیں۔جیسے جیسے تکلیف کی شدت میں کمی آرہی ہے لفظوں کی شدت میں بھی بالترتیب ایک ایک درجے کمی واقع ہو رہی ہے۔لہذا لہجہ میں زیر و بم پیدا کرنے کے لئے لفظ کی کیفیت کا شعور رکھنا بھی ضروری ہے۔

تمام حروف کے مخارج بھی یکساں نہیں ہوتے۔لفظ مخرج اسم ظرف ہے جس کے معنی ہے نکلنے کی جگہ۔مختلف حروف کی ہجّے منہ کے مختلف حصوں سے ہوتی ہے۔مثلاً زبان، تالو، حلق، لب، ناک، وغیرہ سے حروف کی آواز نکلتی ہے۔حلق سے نکلنے والے حروف ''ح''، ''ع''، وغیرہ حروف حلقی کہلاتے ہیں۔متن کو بہتر طریقے سے پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ مخارج کی درست ادائیگی کا دھیان رکھا جائے۔بعض حروف ایسے ہیں جن کا مخرج عربی زبان میں کچھ اور ہے لیکن اردو زبان نے اس کے اصل مخرج کو قبول نہیں کیا۔مثال کے طور پر ''ث''، ''ص''، ''ض''، وغیرہ۔''ث'' کی ادائیگی اہل عرب زبان کو دانت سے ملا کر کرتے ہیں۔جبکہ اردو میں ''ث'' کے لئے بھی ''س'' کی آواز مستعمل ہے۔اگر اردو کی عبارت پڑھتے ہوئے ''ث'' کی ادائیگی عربوں کے انداز میں کی جائے تو غیر فصیح ہوگا۔مثال:

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیّارا

(بانگ درا؛ علامہ اقبال، ص ۱۹۸)

تلفظ کا ایک اہم جز لفظ کا اعراب ہے۔بعض الفاظ غلط اعراب کے ساتھ زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں اور اہل زبان نے ان کو مستند قرار دیتے ہوئے اسی طرح پڑھنے کی اجازت دی ہے۔جیسے کہ لفظ نشتر ہے یہ نیشتر کا مخفف ہے۔اس کا درست اعراب ''ن'' کے کسرہ کے ساتھ نشتر ہونا چاہئے تھا لیکن اس کو ''ن'' کے فتحہ کے ساتھ ہی پڑھنے کی رخصت ہے۔بعض الفاظ غلط اعراب کے ساتھ صرف عوام میں رائج ہیں۔اہل زبان نے ان کو مستند قرار نہیں دیا ہے۔مثلاً صبح ''ص'' کے ضمہ اور ''ب'' ساکن کے ساتھ درست ہے لیکن بیشتر لوگ صبح ''ص'' کے ضمہ اور ''ب'' کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے۔اسی طرح لفظ نشاط کو نِشاط پڑھا جاتا ہے۔لہذا متن کی قرأت کے سلسلے میں اس طرح کے الفاظ کی تحقیق کر لینی چاہیے۔

اردو زبان مختلف زبانوں کے میل سے بنی ہے۔عربی، فارسی اور انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں داخل ہو کر اس کا حصہ ہو گئے ہیں۔لیکن ان کی قرأت کے وقت ضروری نہیں ہے کہ انھیں زبانوں کے اصول و قواعد کا انطباق کیا جائے، وہی لہجہ اور وہی تلفظ اختیار کیا جائے جو ان کی اپنی زبان کے ہیں بلکہ اردو کا اپنا مزاج ہے۔دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپناتے ہوئے ان کو اپنے مزاج کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔اردو زبان میں شامل غیر زبان کے بعض لفظوں کی جمع بناتے ہوئے بھی ان زبانوں کے قواعد کا خیال نہیں رکھا جاتا۔جیسے کہ لفظ موبائل کثرت استعمال کی وجہ سے اردو زبان کا مستقل حصہ ہو چکا ہے۔اس کی جمع اردو میں انگریزی قاعدے کے مطابق موبائلس نہ استعمال کر کے ''ی'' اور ''ن''، ''یا'' و'' اور ''ن'' کے اضافہ کے ساتھ استعمال کیا جائے گا۔مثلاً اگر جملہ اس طرح ادا کیا جائے۔

''ایک کمرے میں چار لوگ تھے اور چاروں اپنے اپنے موبائلس میں مصروف تھے'' تو یہ جملہ غیر فصیح ہوگا۔

اردو میں بیشتر الفاظ ایسے بھی ہیں جن کے لکھنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔لیکن ان کے معنی مختلف ہیں۔سِرّ بمعنی راز، سَر بمعنی کسی چیز کا بالائی حصہ، سر بمعنی آواز۔اسی طرح ملک، مَلَک، مِلک تینوں الفاظ کے معنی مختلف ہیں۔چونکہ اردو میں اعراب واضح کر کے نہیں لکھا جاتا ایسی صورت میں قاری کو سیاق و سباق سے اندازہ لگانا ہوگا۔

متن پڑھتے وقت لب ولہجہ کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔آواز کے زیر و بم سے لہجے کی تشکیل ہوتی ہے نیز آوازوں کے مناسب اتار چڑھاؤ سے خوبصورت آہنگ پیدا ہوتا ہے۔لہجے کے سپاٹ پن سے متن کی خوش آہنگی مجروح ہوتی ہے۔علاوہ ازیں ایک ہی جملے کو اگر لہجہ بدل کر پڑھا جائے تو اس سے معنی میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔یعنی مختلف لہجوں کے استعمال سے ایک ہی متن سے مختلف معنی برآمد کئے جا سکتے ہیں۔ایک جملہ ہے۔

''بازار جانا ہے''۔اس کو اگر سیدھے سادے انداز میں پڑھا جائے تو گویا بازار جانے کی اطلاع دی جا رہی ہے۔دوسری صورت اس کی یہ ہے کہ۔

''بازار جانا ہے۔''لفظ بازار پر زور دے کر پڑھا جائے تو سرزنش کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

''بازار جانا ہے؟''اگر استفہامیہ انداز میں پڑھا جائے تو گویا سوال کیا جا رہا ہے۔

لہجے کے تغیرات سے متن میں موجود حیرت و استعجاب، غصہ، خوشی و غم کی کیفیات کو آسانی سے سمجھا سکتا ہے۔بعض الفاظ زیادہ زور دے کر پڑھے جانے کا تقاضہ کرتے ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن پہ زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

شعر یا نثر کی قرأت کرتے وقت اس کے فقروں کے درمیان غیر ضروری فصل پیدا کر دیا جائے تو اس سے بھی معنی کی تفہیم میں دشواری پیدا ہوتی ہے اور قرأت کا حسن بھی برقرار نہیں رہتا۔مثال:

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

(بانگ درا؛ علامہ اقبال، ص ۳۲۱)

مذکورہ شعر کی قرأت کرتے وقت''جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی''کے بعد فاصلہ درکار ہے اور اگر اس کو ملا کر پڑھ دیا جائے تو شعر کا حسن غارت ہو جائے گا۔اسی طرح اگر دو الفاظ کے درمیان زیادہ فصل درکار ہے اور کم فاصلہ کر کے پڑھا گیا تو بھی متن کی قرأت درست نہ ہوگی اور صحیح مفہوم تک رسائی بھی نہیں ہو سکے گی۔مثال:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام آفاق کی اس کار گہ شیشہ گری کا

(کلیات میر؛ میر تقی میر، ص ۱۷)

مذکورہ شعر میں لے اور سانس دو الگ الگ الفاظ ہیں اور دونوں کے درمیاں فاصلہ کا محل ہے۔لیکن اگر لے اور کر پڑھ دیا جائے''لے سا''تو یہ ایک نئے لفظ کی صورت میں سامنے آئے گا جو کہ مہمل ہے۔متن کی صحیح قرأت کے لئے ضروری ہے کہ قاری کو اپنی زبان میں رائج روز مرّہ و محاورہ سے بھی واقفیت حاصل ہو۔روز مرہ بیان کے اس طریقے کو کہتے ہیں جو اہل زبان کے نزدیک مستند ہو۔مثلاً آنکھ میں درد ہے، اگر اس کو اس طرح پڑھا جائے چشم میں درد ہے تو یہ روز مرّہ کے خلاف ہوگا۔محاورہ اس کلام کو کہتے ہیں جس سے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی مراد لئے جائیں، مثلاً کان کھڑے کرنا بمعنی ہوشیار ہونا، چوکنّا ہونا۔محاوروں کا استعمال ان کی اصل شکل میں ہی ہوتا ہے اگر اس میں تحریف کر دی جائے تو یہ زبان کا عیب ہوگا۔

بعض اوقات جملے بہت طویل ہوتے ہیں ایسی صورت میں یہ قید ہرگز نہیں ہے کہ ایک طویل جملے کو ایک ہی سانس میں ادا کیا جائے۔بلکہ ٹھہر ٹھہر کر آہستہ پڑھنے سے جملے کی ادائیگی کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔اس کے لئے مختلف رموز اوقاف رائج ہیں۔جن کے استعمال سے عبارت کو پڑھنا اور سمجھنا قدرے آسان ہو جاتا ہے۔رموز، رمز کی جمع ہے بمعنی علامت اور اوقاف، وقف کی جمع ہے بمعنی ٹھہرنا، ان ٹھہرنے کی علامات کا استعمال بھی الگ الگ ہے۔

سکتہ	comma	،
وقفہ	semi colon	؛
رابطہ	colon	:
ختمہ	full stop	۔
سوالیہ	sign of introgation	؟
ندائیہ، فجائیہ	sign of exclamation	!
قوسین	Brackets	()
واوین	Inverted commas	'''''

متن کی قرأت میں غیر ضروری لفظوں کا استعمال بھی عبارت کو بوجھل بنا دیتا ہے اور سادہ سے متن میں پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔مثلاً وہی کے بجائے وہ ہی اور سبھی کے بجائے سب ہی کا استعمال زبان پر گراں گزرتا ہے۔اس لئے قاری کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ زائد لفظوں کے استعمال سے گریز کرے مثلاً ایک جملہ ہے۔

''وہ اگر چہ مصروف نہیں تھے، مگر وہ میرے پاس نہیں بیٹھے۔''

اس جملے کو اگر اس طرح پڑھا جائے کہ''وہ مصروف نہیں تھے مگر میرے پاس نہیں بیٹھے''تو بہتر ہوگا۔اس طرح زائد الفاظ کے نکال دینے سے زبان میں روانی پیدا ہو جاتی ہے لڑکھڑاہٹ یا گرانی محسوس نہیں ہوتی اور قرأت میں تکرار کا عیب بھی باقی نہیں رہتا۔

غرض یہ کہ ادب کا مطالعہ انسانی ذہن کو تازگی عطا کرتا ہے اور اس کے علم میں اضافے کا باعث بھی ہوتا ہے۔لیکن ان فوائد کا حصول اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ادبی متون کے تمام معانی و مفاہیم قاری پر روشن ہوں۔متن کی درست قرأت کے بغیر اس کے معانی و مفاہیم تک رسائی ناممکن ہے۔لہذا متن کی قرأت کے سلسلے میں مذکورہ نکات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہت حد تک قرأت کی دشواریوں سے نبرد آزما ہوا جا سکتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Resaearch Scholar,Dept.of Urdu,AMU(India)
Phn no. 9457900853

معاون کتب:۔۱۔اردو کیسے لکھیں (صحیح املا)؛ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی ۱۹۷۵
۲۔انشا اور تلفظ؛ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۱،
۳۔حسن تلفظ: ممتاز احمد عباسی، عباسی لیتھو آرٹ پریس، کراچی، بار اول ۱۹۷۲،
۴۔اصلاح تلفظ و املا: طالب الہاشمی، لاہور

● مضمون
● محمد ریحان

پروین شاکر کی غزلیہ شاعری: ایک مختصر جائزہ

پروین شاکر پاکستان کے شہر کراچی میں نومبر ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئیں۔ان کے والد کا نام سید شاکر حسن تھا۔ان کا خانوادہ صاحبان علم وادب کا خانوادہ تھا۔ان کے خاندان میں کئی نامور شعرا اور ادباء پیدا ہوئے۔جن میں بہار حسین آبادی کی شخصیت نہایت بلند ہے۔آپ کے نانا حسن عسکری ایک اچھا ادبی ذوق رکھنے والے انسان تھے۔انہوں نے بچپن میں پروین شاکر کو کئی شعرا کے کلام سے روشنا کروایا۔پروین شاکر ایک ذہین طالبہ تھیں۔ دوران تعلیم وہ اردو کے ادبی مباحثوں میں حصہ لیتی رہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو پاکستان کے مختلف ادبی وعلمی پروگراموں میں شرکت کرتی رہیں۔انگریزی زبان وادب میں گریجویشن کیا۔اور بعد میں جامعہ کراچی سے ایم۔ اے۔(انگریزی) کی ڈگری حاصل کی۔وہ استاد کی حیثیت سے نو سال تک درس وتدریس کے شعبہ سے وابستہ رہیں۔اور پھر بعد میں آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔۱۹۸۶ء کو کسٹم ڈیپارٹمنٹ، سی. بی. آر. اسلام آباد میں سکریٹری دوم کے طور پر اپنی خدمات انجام دینے لگیں۔۱۹۹۰ء میں ٹرینٹی کالج جو امریکہ سے منسلک تھا سے تعلیم حاصل کی۔۱۹۹۱ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے پبلک ایڈمنسٹریشن میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی۔ پروین شاکر کی شادی ڈاکٹر نصیر علی سے ہوئی جن سے بعد میں طلاق واقع ہوگئی۔

پروین شاکر نے اردو شاعری کو ایک منفرد لب ولہجہ اور احساس عطا کیا۔ان کی شاعری اپنے عہد کی خوبصورت آئینہ اور ماضی کی روایت کا تسلسل ہے۔ پروین شاکر کی شاعری کا سب سے اہم حوالہ محبت اور نسوانی جذبات واحساسات کی عکاسی ہے۔ وہ اپنی شاعری میں ایک مکمل نسائی حیثیت کی تشکیل کرتی نظر آتی ہیں۔ نسائیت صرف یہ نہیں ہے کہ گھر، آنگن، اور سنگھار کی بات کی جائے بلکہ نسوانی جذبات کی مکمل تصویر کشی، خوشبو، رنگ لمس، موسموں کی رنگینی اور رشتوں کے ذائقوں کا بیان ہے۔اور پروین شاکر کی شاعری ان نسوانی کیفیات کا باکمال اظہار ہے، پروین شاکر بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ ہیں۔ان کی غزلیں بڑی شگفتہ اور بے ساختہ ہوتی ہیں۔ پروین شاکر کے یہاں روایتی شاعری کا تتبع بھی ہے مگر زیادہ تر اپنی ذاتی محرومیوں اور مایوسیوں کا بیان ہے۔لیکن ان محرومیوں کی بدولت ان کے یہاں بیزاری کا رویہ نہیں ملتا بلکہ وہ زندگی کے مختلف تجربات سے زندگی کے نئے سلیقے اور انداز اخذ کرتی ہیں۔انہوں نے ذاتی غم کے علاوہ روح عصر کے حالات اور غم کو بھی اپنی

شاعری میں پیش کیا ہے۔وہ معاشرے میں عورت کے کرب کی صحیح نمائندگی کرنے والی شاعرہ ہیں۔ بلکہ پروین شاکر اپنی شاعری میں حقوق نسواں کی سچی علم بردار اور صنف نازک کے جذبات واحساسات کی خوبصورت ترجمان ہیں۔غزل میں ان کی انفرادیت کا سبب ان کی موضوعاتی جدت ہے۔انہوں نے نسوانی جذبات و احساسات کو حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے یہاں چاہت، رفاقت، ملاقات، جدائی، فراق، جذبے اور احساسات نئے انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔انہوں نے بھرپور طریقے سے نسوانی احساسات کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے عشق جسمانی اور محسوساتی کیفیت کا بیان بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پر جب ہاتھ رکھا — روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی
ہم تو سمجھے تھے کہ ایک زخم ہے بھر جائیگا — کیا خبر تھی کہ رگ جاں میں اتر جائیگا
جس طرح خواب میرے ہوگئے ریزہ ریزہ — اس طرح سے نہ ٹوٹ کر بکھرے کوئی
میں سوچتی ہوں کہ مجھ میں کمی تھی کس شئے کی — کہ سب کا ہو کے رہا وہ، بس ایک مرا نہ ہوا

درد اور تکلیف کی شدت محبوب کی قربت کی بدولت کم ہو جاتی ہے۔ پروین شاکر ایک ایسی عورت کو اپنی شاعری میں پیش کرتی ہیں جس کی تمام تھکن اور درد محبت کے پھاہے کا طلبگار ہے۔جس طرح دوا مریض پر اثر کرتی ہے۔مریض عشق کے لیے محبت کا حصول اور اس کا قرب مسیحائی کا سبب بنتا ہے۔ پروین شاکر کے لیے یہ جذبہ اس لیے بھی شدید رہا کہ وہ اپنی محبت کے حصول سے محروم رہیں، لیکن اپنی شاعری میں وہ اس کا شدید اظہار تصوراتی لمس کی صورت میں کرتی ہیں۔ پروین شاکر کی شاعری میں کربناک موڑ اس وقت آتا ہے جب ان کے شوہر نصیر علی خان سے ان کی علاحدگی ہو جاتی ہے۔اور جب وہ اس موضوع پر اظہار خیال کرتی ہیں تو ان کے بیان میں بہت تلخی آجاتی ہے اور اس علاحدگی کا دکھ بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔

کمال ضبط سے خود کو بھی آزماؤنگی — میں اپنے ہاتھ سے اس کی دلہن سجاؤنگی
سپرد کر کے اسے روشنی کے ہاتھوں میں — میں اپنے گھر کے اندھیروں میں لوٹ آؤنگی
بدن کے کرب کو وہ بھی نہ سمجھ پائیگا — میں دل میں روؤنگی آنکھوں میں مسکراؤنگی
وہ کیا گیا کہ رفاقت کے سارے لطف گئے — میں کس سے روٹھوں گی اور کس کو مناؤنگی
وہ ایک رشتہ ہے نام بھی نہیں لیکن — میں اب بھی اس کے اشارہ پر سر جھکاؤنگی
جواز ڈھونڈھ رہا تھا وہ نئی محبت کا — وہ کہہ رہا تھا میں اس کو بھول جاؤنگی

درج بالا اشعار میں پروین شاکر حسن کے حسی اور لمسی کیفیات کا بیان کرتے ہوئے اردو شاعری کی روایت سے انحراف کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔ محبت میں گذرے ہوئے لمحے اور محبوب کے وجود کا احساس، حسن کا بیان، اور عشقیہ جذبات کی پیش کش بھی روایتی انداز سے مختلف ہے، محبت میں معاملہ بندی کا

بیان کچھ اس انداز سے کرتی ہیں۔ جس میں ایک عورت کے گہرے جذبے اور تاثرات جھلکتے ہیں۔ یہاں بھی محبوب سے فریب میں گذرے ہوئے لمحوں کی عکاسی چلتی پھرتی تصویر کے مانند سامنے آتی ہے، جس میں اداسیوں اور تنہائیوں کے نوحے بھی ہیں اور امید رجائیت کی کرنیں بھی۔ پروین شاکر کی شاعری میں ان کا وسیع مطالعہ، ان کے ذاتی تجربات، شدت جذبات اور مشاہدے کی گہرائی جھلکتی ہے۔

وہ بے خوف شاعرہ ہیں، انہوں نے اپنے کومل جذبات کا برملا اظہار کیا ہے لیکن محبت میں پیش آنے والے وہ معاملات جن میں محبوب کی بے وفائی کا ذکر ہوا اور جس میں جسمانی لذت کا اظہار بے باک انداز میں کیا گیا ہو وہ بھی ان کی اہم خصوصیت ہے، پروین شاکر نے شاعری میں اپنی حقیقی ذات کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے وہی سب کچھ لکھا ہے جو ان کی ذات ان سے لکھوا رہی ہے۔

کو بہ کو پھیل گئی بات شناسائی کی — اس نے خوشبو کی طرح میری پذیرائی کی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے — بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا — بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی
اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے — جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہشیں انگڑائی کی

پروین شاکر کے لفظوں کی آواز خوشبو اور ذائقہ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو گداز دل رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں عورت کے احساسات کو نہ صرف جمالیاتی حسن سے نوازا بلکہ ان کے لیے ادب میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے راہ بھی ہموار کی۔ جو شاعری پروین شاکر نے کی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان سے پہلے اردو ادب میں خواتین شاعرات نے یہ لب ولہجہ کبھی نہیں اپنایا تھا۔ ''صد برگ'' تک پہنچتے پہنچتے پروین شاکر کی محبت روایتی تصویر کو چھوڑ کر حقیقت کے قالب میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ سماجی شعور، عصری تجربات اور ذاتی غم ان کی غزل کا پیکر پیش کرتے ہیں۔ یہاں نسائی جذبات خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی زندگی سے آنکھ ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں، قرب محبوب کے دلنواز لمحوں کی خواہش اور آرزو ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے۔ لیکن ہجر کی بدولت ان کی شاعری میں ایک تڑپ اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ ہجر و فراق کی بدولت وہ درد میں تڑپتی ہیں اور غم جاناں و غم دوراں کی بدولت ان کی آنکھوں سے آنسو کی قطاریں بھی رواں ہوتی نظر آتی ہیں۔ آنسو بہانا بھی نسوانی جذبات کی عکاسی ہے کہ ان کی آنکھ سے ڈھلکے ہوئے آنسو ان کی نسوانی بصیرت اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، وہ قلبی واردات کا اظہار کرنے میں ذرا بھی تکلف سے کام نہیں لیتی ہیں۔ وہ محبت میں وارفتگی اور شدت کی خواہاں ہیں۔ اس لیے وہ کہتی ہیں:

میں اس کی کھوج میں دیوانہ وار پھرتی رہی — اسی لگن سے کبھی مجھ کو ڈھونڈھتا وہ بھی
گلی کے موڑ پہ دیکھا اسے تو کیسی خوشی — کسی کے واسطے ہوگا رکا ہوا وہ بھی

شاعری کے ذریعہ اگرچہ پروین شاکر نے اظہار ذات کو ممکن بنایا مگر اپنے خیالات کا اظہار کرتے کرتے ماحول اور آس پاس بکھرے ہوئے زمانے کے درد کو بھی شعروں میں پیش کیا اور اپنی ذات میں چھپے درد و غم کو بھی صفحہ قرطاس پر بکھیرا اور ان خوابوں کا بھی ذکر کیا جن کی کبھی تعبیر نہ ملی۔ انہوں نے اپنے حسین جذبوں اور اچھوتے خیالوں کو بڑے نرم و نازک لفظوں میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح انسانی احساسات و جذبات کی عکاسی بھی بڑے نفاست سے کرتی نظر آتی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ عورت کے جذبات و احساسات کی خوبصورت مصوری کرتی ہیں اور ان کی شاعری میں جذبوں کی ایسی تصویر کشی ہے جو چلتی پھرتی اور حرکت کرتی محبت کی شدت میں سانس لیتی نظر آتی ہے

پروین شاکر کے یہاں ایک نوجوان لڑکی کے جذبات سے لیکر ایک شادی شدہ عورت اور پھر ایک ماں کی نسائی کیفیت کا بھرپور اظہار نہایت ہنرمندی سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے یہاں جس عورت کا کردار سامنے آتا ہے وہ مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ ایک کم عمر لڑکی جو گھر میں ازدواجی زندگی کے خواب بنتی ہے، محبت میں ناکامیابی کے بعد مشرقی اقدار کے لیے اپنے والدین کی مرضی سے شادی کرتی ہے مگر شادی کا انجام ناکامی پر ہوتا ہے۔ اپنے بیٹے کو اپنی خوشیوں کا محور بناتی ہے اور زمانے کی گردشوں کو برداشت کرتی ہے۔ یوں ان کی شاعری میں عورت کے حوالے سے ہر رنگ ملتا ہے جو فطری بھی ہے اور پرتاثیر بھی۔ غرض یہ کہ پروین شاکر نسائی کیفیات کے محاکات نگاری بھرپور انداز میں شاعری میں پیش کرتی ہیں۔ پروین شاکر نے اپنی کیفیات کا اظہار ''صد برگ'' کے دیباچے میں بعنوان ''رزق ہوا'' میں کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

> ''لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نمبر منسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خداری، دینار عزت نفس، کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں، وہاں نیکی کی نصرت کو کون آئے؟ وہاں کی سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں..... اور میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں ایسی سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے، مگر قبیلے والوں سے بھول یہ ہوئی کہ انہوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا (اور اب مجھے دیوار میں چن دینا ان کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا۔) مگر وہ اپنی بھول سے بے خبر نہیں، سو اب میں ہوں اور ہونے کی مجبوری کا یہ اندھا کنواں جس کے گرد گھومتے گھومتے میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہیں اور آنکھیں پانی کی..... کیونکہ میں نے اور لڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ اور انکار کرنے کا انجام اچھا نہیں ہوا۔''

پروین شاکر کی شاعری کے اس مختصر سے جائزے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی

غزلوں میں اپنے نازک احساسات پر اپنے شاعرانہ خلوص اور انتہائی متاثر کن لہجے میں شیریں تغزل اور دلکش ترنم میں پیش کر دینے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ان کے شاعری پڑھنے کا انداز بھی بہت دلکش اور نرالا ہے۔ان کی شاعری اعلیٰ اسلوب اور عمدہ خیالات کا حسین امتزاج ہے۔ان کے احساسات کی نیرنگی نے ان کے خیالات میں واقعیت پیدا کر دیتے ہیں۔انہوں نے قدیم اشاروں میں بھی نئے گوشے پیدا کر دیے ہیں۔جس نے ان کی غزل کو روایتی ہونے سے بچالیا۔ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شروع سے ہی ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ شاعری میں ان کی عوامی شناخت کے ساتھ ساتھ ان کی انفرادیت بھی قائم رہے۔ چوبیس (۲۴) سال کی عمر میں کوئی ادب کی دنیا میں داخل ہو اور چوالیس (۴۴) سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر جائے اور ادب کی دنیا پر ایسی گہری چھاپ چھوڑ جائے کہ آنے والے شاعروں کے لیے نئے راستے کھل جائیں۔ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ پروین شاکر ادب کی دنیا کا ایک ایسا معتبر نام ہے جنہوں نے نہ صرف مستقبل میں آنے والی شاعرات پر اپنا اثر ڈالا بلکہ ہم عصر شاعرات کو بھی وہ مضمون چننے پر مجبور کر دیا جو اردو شاعری میں ممنوع نہیں شاعری کی دسترس سے باہر سمجھے جاتے تھے۔

◂◂ ● ▸▸

B-608/1, G.T.B. Nagar, Kareli, Prayagraj - 211016
Mob: 9794844647
E-mail: mohammad.rehan48@gmail.com

- **مضمون**
- **صدف اقبال**

مولانا آزاد اور مسلمان عورت

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی انتہائی مصروف ترین زندگی رہی۔انہوں نے عملی سیاست میں حصہ لیا۔ پر جوش صحافت کی اور جنگ آزادی کے سپہ سالار رہے۔اپنی زندگی کے آخری دس برسوں میں وہ ملک کے وزیر تعلیم رہے اور ہندوستان کے تعلیمی نظام کو ایک مستحکم بھی کیا اور اسے زمانے کے لحاظ سے بہترین بھی بنایا۔ان سب کے باوجود خواتین کے تعلق سے مولانا آزاد کی کوئی نہ تو کوئی مستقل کتاب نظر آتی ہے اور نہ ہی انہوں نے اپنے خطبات میں خواتین کے حوالے سے بطور خاص کوئی گفتگو کی ہے۔ترجمان القرآن کی تفسیر کی پہلی جلد میں انہوں نے احکام الٰہی کی روشنی میں خواتین کے زمانی مقام کے تعیئن پر کچھ گفتگو کی ہے جو بہت حد تک تشنہ ہے اور جدید عورت کے مسائل سے ان کا بہت گہرا تعلق نظر نہیں آتا۔مجموعی طور پر مولانا آزاد کی بعض گفتگو اور تحریروں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمان عورت کے بارے میں وہ ایک متوازن رائے رکھتے تھے لیکن یورپین تحریک نسواں سے متفق نہ تھے۔اس ضمن میں مولانا آزاد کی ایک ترجمہ شدہ کتاب کافی اہم ہے۔یہ کتاب مصری عالم فرید وجدی نے عربی میں ''مراۃ المسلمہ'' کے عنوان سے لکھی جس کا مولانا آزاد نے ''مسلمان عورت'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔مولانا نے عورتوں کے مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کتاب کا انتخاب کیا، یہ اس بات کا اظہار ہے کہ مسلمان عورتوں کے لیے اس کتاب میں پیش کردہ نظریات سے مولانا آزاد بہت حد تک اتفاق رکھتے تھے۔اس عربی کتاب کا ترجمہ بقول ناشر بہت حد تک آزاد ترجمہ ہے اور اس میں مولانا نے بعض مقامات پر اپنے خیالات کی شمولیت اس کتاب کی قدر و قیمت میں بہت حد تک اضافہ کر دیا ہے۔اس کتاب کی تمہید میں اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں؛

> ''عورتوں کی آزادی کا مسئلہ دراصل ایک معرکتہ الآرا مسئلہ ہے۔ یورپ کا طرز عمل گرچہ اس کی تائید میں ہے لیکن جمہور کی آواز نہایت سختی سے اس کی مخالف ہے۔ایک بڑی باریک بین جماعت موجود ہے جو اس آزادی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس خطرناک زمانہ کی یقین کے ساتھ منتظر ہے جو اس آزادی کا لازمی نتیجہ یعنی تمدن اور معاشرت کی بنیادیں متزلزل کر دے گا۔''

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی معاشرے میں ایسے باریک بین لوگ، ایسی

جماعت موجود ہیں جو باریک بینی اور دور اندیشی سے عورتوں کی آزادی کی انتہا پسندی کو دیکھ رہا ہے اور ان جماعتوں کے تجزیے کے مطابق جو آزادی عورتوں کو یورپ میں دی جارہی ہے وہ تمدنی اداروں اور سماجی استحکام کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ ایسی آزادی سماجی ڈھانچے اور مذہبی نظام کو متزلزل کرسکتی ہے اور یہ نہ سماج کے حق میں ہے اور نہ ہی عورتوں کے حق میں۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مولانا کے زمانہ میں یورپ میں عورتوں کو کیا آزادی حاصل تھی، یا اس عہد میں یورپ میں عورتوں کی آزادی کو سماج کا ایک بڑا طبقہ واقعی مشتبہ نظر سے دیکھتا تھا؟ اگر ایسا ہوتا تو بعض ایسے واقعات بھی بطور مثال پیش کیے جاتے جو آج بھی ہندوستانی معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہورہے ہیں۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ۱۹۳۳ء میں ہی ورجینیا وولف نے اپنے کمرے کی تنہائی کا ذکر کرکے تانیثیت کی بحث کو ادب اور فکر کی مرکزی بحث میں شامل کردیا تھا۔

مولانا آزاد نے چوں کہ عورتوں کے تعلق سے براہ راست کوئی نظریہ پیش نہیں کیا اور ایک کتاب کے ترجمہ سے اپنے خیالات کی ترجمانی کی ہے اس لیے ہم حق بجانب ہیں کہ مولانا کی فکر کے اس پہلو کو جس کا تعلق عورتوں کے سماجی، سیاسی اور اخلاقی پہلو سے ہے اسی کتاب کی روشنی میں دیکھیں۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل حصوں میں منقسم ہے اور ان ہی ذیلی موضوعات سے بحث کرتی ہے۔

عورت کیا ہے؟ عورت کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟ کیا مرد اور عورت جسمانی طاقت میں مساوی ہیں؟ کیا عورتیں عملی دنیا میں مردوں کے ساتھ شریک ہوسکتیں ہیں؟ کیا عورت کو مردوں سے پردہ کرنا چاہئے؟ کیا پردہ عورتوں کے لیے غلامی کی علامت اور آزادی کے منافی ہے؟ کیا پردہ عورتوں کی ترقی اور کمال میں مانع ہے؟ کیا پردہ کا عالمی اثر زائل ہوسکتا ہے؟ کیا موجودہ مادی مدنیت کی عورتیں کامل عورتیں ہیں؟ مسلمان عورت کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے؟

درج بالا دس سوالات پر غور کریں تو ظاہر ہوگا کہ ان ایک تو عورت کی جسمانی قوت کے تعلق سے سوالات ہیں، دوسرے اس کے ذہنی استعداد کا جائزہ لیا گیا ہے اور تیسرے پردہ کے تعلق سے مختلف صورت حال میں اس کی اہمیت یا غیر اہم ہونے پر غور کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ سوال بھی موجود ہے جس میں مسلمان عورت کی تعلیم پر خاص توجہ دی گئی ہے، یعنی عورت اور مسلمان عورت میں تفریق موجود ہے۔ ان سوالات کے دائرے مولانا آزاد کے عہد کے مزاج کے عین مطابق ہیں۔ اس وقت ہندوستانی سماج، خاص طور سے ہندوستانی مسلم سماج بہت حد تک دقیانوسیت کا حامل تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ایک ایلیٹ کلاس اپنی زندگی ان قسم کے سوالات کے دائرے سے باہر جی رہا تھا لیکن عام مسلمان گھروں میں عورت کے تعلق سے اس قسم کے سوالات ہی موجود نہیں تھے۔ اس دور میں اگر کسی عام مسلمان سے یہ سوال کرتا کہ بھائی ذرا یہ بتانا کیا عورتیں مردوں کے ساتھ آفس میں کام کرسکتی ہیں؟ تو وہ شخص یا تو مسکرا کر آگے بڑھ جاتا یا انتہائی غضبناک ہوکر سوال کرنے والے کو دیکھنے لگتا کہ یہ پاگل کیا پوچھ رہا ہے عورت جو کہ پردے کی بو بو

ہے وہ بھلا مرد کے ساتھ آفس میں کام کرے گی۔ یہ ایک حقیقت ہے آج بھی گاؤں دیہاتوں میں عورتوں کو ناقص العقل ہی سمجھا جاتا ہے جسے صرف پردے کی گٹھری میں باندھ کر گھر کی چار دیواری میں قید رکھنا عین ثواب ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو مولانا کے زمانے میں ایسے سوالات قائم کرنا ہی اپنے آپ میں ایک انقلابی قدم ہے۔

اب آیئے اس سوال کا جواب مذکورہ کتاب میں تلاش کرتے ہیں کہ عورت کیا ہے؟ اور عورت کے قدرتی فرائض کیا ہیں؟

کتاب میں اس کا جواب کچھ یوں دیا گیا ہے:

> ''عورت کو قدرت نے جس غرض کے لیے مخلوق کیا ہے وہ غرض نوع انسانی کی تکثیر اور اس کی حفاظت و تربیت ہے۔ پس اس حقیقت سے اس کا قدرتی فرض یہ ہے کہ اس اہم فرض کی انجام دہی کے لیے کوشش کرتی رہے۔''

اس اقتباس سے اس میں موجود ایک خاص قسم کی راسخ العقیدگی کا اندازہ تو ہوجاتا ہے جس میں عورت کو تولید نسل کی ایک مشین سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ نوع انسانی کی تکثیر کے لیے مرد کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی عورت کی۔ اور نوع انسانی کی حفاظت کی تربیت میں مرد کا بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہئے جتنا عورت کا۔ اور اس مقصد کے برآوری کے لیے جدوجہد اور کوشش مرد پر بھی فرض ہے، صرف عورت پر نہیں۔ اسلامی تعلیمات میں عورت پر ہی یک ذمہ داری نہیں دی گئی ہے لیکن یہاں صاف نظر آتا ہے کہ مولانا بہت حد تک عہد وسطی کے نظریات کے قائل نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے مولانا آزاد اس نظریے کے قائل نہ ہوں اور بطور ٹسٹ رن انہوں نے اس کتاب کے ذریعہ عورت کے متعلق قائم کردہ پرانے نظریات پر سماج کو از سر نو غور و فکر کی دعوت دی ہو کیوں کہ اس عہد میں عورت فکری مکالمے سے پوری طرح باہر تھی۔ اس لیے میں حسن ظن کو قائم رکھتے ہوئے مولانا کی اس کاوش کو مثبت نظر سے دیکھوں گی۔ پہلے سوال کے جواب میں عورت کی فطرت کے تعین کے سلسلے میں عورت کے حاملہ ہونے، وضع حمل اور بچے کے تربیت کے زمانے کو شامل کیا گیا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان ادوار میں عورت دنیاوی یا مردوں کی طرح باہری کاموں کے لائق نہیں رہتی۔ ظاہر اگر آج کے تناظر میں اس استدلال کو دیکھیں تو بے معنی نظر آئیں گے۔ ایک کارپوریٹ قانون نے حاملہ عورت اور وضع حمل کے لیے عورت کے لیے بہت سی آسانی پیدا کردی ہے اور بچوں کی پرورش اور پرداخت صرف عورت کی ذمہ داری نہیں رہ گئی ہے۔ اس لیے اس قسم کی منطق کی بنیاد پر عورت کو گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔

ایک سوال یہ بھی قائم کیا گیا ہے کہ کیا عورت اور مرد جسمانی اور دماغی طور پر برابر ہیں؟ کتاب میں مختلف حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت جسمانی طور پر مرد سے کمزور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کو کن بنیادوں پر پرکھا جائے گا۔ مثلاً ''اگر لیلی علی باکسر اور محلے کے غنڈے حنیف بھائی کو بھڑا دیا جائے تو

ظاہر ہے حنیف بھائی لیلیٰ علی ایک گھونسے سے گھنٹوں اٹھ نہیں پائیں گے۔جسمانی کمزوری کوئی یونیورسل حقیقت نہیں۔جسم کو لڑنے کے لائق بنانا پڑتا ہے۔مرد ہمارے معاشرے میں جسمانی کام کرتا ہے۔باہر جاتا ہے۔ورزش کرتا ہے اس لیے وہ کسی حد تک عورت کے مقابلے پھرتیلا ہو جاتا ہے۔اگر کوئی عورت ورزش معمول بنالے۔کراٹے سیکھ لے،تو اس کی تیزی کے آگے بہت سے مرد دم توڑ دیں گے اسی طرح دماغی سطح پر اس کتاب میں عورت کو کمزور ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ظاہر یہ بات بھی غلط ہے اور انسانی دماغ کا وزن مرد اور عورت کے مقابلے میں کم یا زیادہ نہیں بلکہ یکساں ہی ہے۔اصل چیز یہ ہے کہ اس دماغ سے کتنا کام لیا جارہا ہے۔جہاں کام لیا جاتا ہے وہاں عورتیں نوبل انعام بھی حاصل کرتی ہیں۔بہترین مصنف،عمدہ ڈاکٹر،لاجواب مصور،بے مثال سائنسداں عورتیں بھی ہوئی ہیں۔سوال یہ ہے کہ مولانا آزاد جو نہ صرف یہ کہ اپنے عہد کے بدلتے مزاج سے باخبر تھے بلکہ اپنے خیالات میں پروگریسیو بھی تھے۔ان کے ترجمان القران سے کئی راسخ العقیدہ مولویوں نے اختلاف کیا کیوں کہ آزاد نے قرآن کی تفسیر جدید عہد کے تقاضوں کے مطابق کی۔ان سب کے باوجود مولانا آزاد نے ترجمے کے لیے ایک ایسی کتاب کا انتخاب کیوں کیا جس میں زیادہ تر خیالات راسخ العقیدہ مولوی کی خوشنودی کے لیے ہیں۔

ساری کتاب محض عورت کے روایتی تصور کے اردگرد گھومتی ہوا ایسا بھی نہیں ہے۔اس کتاب میں عورت کی محدود آزادی،علم حاصل کرنے اور پردے کا ایک خاص طریقہ کار اختیار کرنے کی سفارش موجود ہے۔لیکن ساری کتاب اوپر پیش کردہ سوالات کے اردگرد گھومتی ہے جس میں زیادہ تر جوابات آج کی عورت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے۔چوں کہ مولانا آزاد کا مخصوص مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے،پرورش پائی اور اسلام کے ایک مخصوص نظریے سے وابستہ رہے اس لیے عورت کے تعلق سے ان کے خیالات میں ایک قسم کی دقیانوسیت پائی جاتی ہے۔ایک طرف وہ عورتوں کے تعلیمی معیار کی بلندی کے حق میں ہیں دوسری طرف وہ عورت کو تولیدنسل کی مشین بھی سمجھتے ہیں اور عورت کی تعلیم کا سب سے عمدہ مصرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بال بچوں کی تربیت گھر پر کرتی رہے۔ان کے خیالات سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ عورت کے پردہ کی پابندی ضروری ہے۔حالانکہ ترجمان القران کی تفسیر میں وہ بعض آئتوں کی تفسیر کے بیان میں انقلابی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔خاص طور سے سیاسی اور معاشی تفسیر ان سے بہتر شاید ہی کوئی کر پایا ہو۔اسی جگہ جب وہ عورت کی معاشی جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں تو باہر سے زیادہ انہیں گھر میں عورت کا مقام زیادہ معتبر نظر آتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Post - Bhadeya/ Barachatti,Via - Dobhi ,Dist - Gaya (Bihar)824220
8294707026

- **مضمون**
- **شاذیہ تمکین**

خواتین کے افسانوں میں احتجاجی صدائیں

بدلتے ہوئے متحرک مشرقی معاشرے کے ایک بڑے اور حسّاس طبقے نے جدیدیت کے طوفانی سمندر میں غوطے لگا کر نایاب موتیوں کی تلاش تو ضرور کر لی ہے مگر اس آلودہ سمندر کی زہریلی عناصر سے بھی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پایا۔جس کی بدولت اس بڑے گروپ کا متاثر کن بڑا طبقہ انتہا پسند ذہنیت کا شکار نظر آتا ہے۔علاوہ ازایں ایک بڑا گروہ ایسا بھی موجود ہے جس نے اپنی حسّاسیت کے بل بوتے غالب اور مغلوب طبقے کے مابین توازن برقرار رکھتے ہوئے آلودہ معاشرے کے blocked نبض کی شناخت کر لی ہے۔اس blockage کے وجوہات کا بھی علم رکھتے ہیں اور اسے سرے سے ختم کرنے کی مہم میں سرگردانِ عمل ہیں۔ایسی حسّاس طبیعت رکھنے والے لوگ دیگر سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ صنفی ناہمواری کا بھی شدید احساس رکھتے ہیں۔اس ناہمواری کی معدومیت کے لیے بھی کوساں نظر آتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انتہا پسند طبقہ چند ایسی بیجا مطالبات کا متقاضی ہے جس سے سماجی نظام کی اصل خوبصورتی کے زائل ہونے کا خدسہ پیدا ہوتا ہے۔اس طرح کی چند ایک منفی تصورات کی وجہ سے ہم پورے نظامِ جدیدیت کی روسیاہی نہیں کر سکتے۔کیوں کہ وسیع دائرے میں پھیلے ہوئے جدید درخت کے سائے تلے حیاتِ انسانی کا ہر مظلوم طبقہ اپنے وجودی تحفظ کے تئیں مطمئن نظر آتا ہے۔ایسی کمزور زندگیوں کی آواز بننے اور انھیں مظلومیت کے کھندک سے آزاد کرانے کی مہم میں قلم کے غازی پیش پیش رہے ہیں۔انہوں نے اپنے قلم کے ذریعہ مظلومیت کی روداد ایسی سنائی ہے کہ آج دنیا کے کونے کونے میں ہر انسان اپنے رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے احتجاجی رنگ کو محسوس کر سکتا ہے۔ہر زبان کے ادب میں اس احتجاجی سُرخی کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔اردو زبان میں بھی ایسے موضوعات کی بھرمار ہے۔دیگر لکھاریوں کی طرح خواتین افسانہ نگاروں نے بھی اپنے افسانوں میں ایسے موضوعات پر قلم چلا کر اپنی ہی مظلوم ہم جنسی آہوں کو احتجاجی زبان عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ان میں مذہب سے جُڑے ہوئے متنوع موضوعات خاصی اہمیت کے حامل ہیں جنہیں خواتین افسانہ نگاروں نے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ان میں سے چند ایک موضوعات پر مبنی افسانوں کا تجزیہ کر کے رُخِ معاشرہ پر آویزاں پردے کو نوچ کر کراہیت آمیز شبیہ کا نظارہ کرنے کی کوشش

کریں گے۔

آج کا روشن خیال حال اس سچائی کا بہتر شعور رکھتا ہے کہ مرد اساس سماج نے اپنی سہولت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مذہبی قوانین میں تصرّف پیدا کر دیا ہے۔ باندیوں کے متعلق بھی قرآنی احکامات اپنے مفاد کے حساب سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لونڈیوں کے بارے میں قرآن میں کئی ایک جگہ وضاحت کی گئی ہے:

''اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو ان خواتین سے نکاح کرو جو تمہارے لیے پسندیدہ اور حلال ہوں ۔ دو دو اور تین تین اور چار چار پھر اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کرسکو گے تو صرف ایک ہی خاتون سے یا وہ کنیزیں ج وتمہاری ملکیت میں آئی ہوں۔''

(النساء،۴:۳)

''اور تم میں سے جو کوئی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کر سکے تو اُن مسلمان کنیزوں سے نکاح کر لے جو تمہاری ملکیت میں ہیں۔''

(النساء،۴:۲۵)

اللہ نے قرآن کریم میں اجازت تو دے رکھی ہے کہ جس طرح تمہیں اپنی بیوی کے پاس جانے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی اسی طرح شرعاً تمہاری ملکیت میں آنے والی لونڈی پر تمہارا پورا حق ہے، اس سے لذت اٹھانے میں تمہیں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ مگر یہاں باندی کے معنی اور اس سے مالک کے لذت اندوز ہونے کی شرطوں کو سمجھ لینا ضروری ہے، لونڈی، غلام، اسلام کے دورِ اوّل میں یا تو وہ لوگ تھے جو معاشرے میں صدیوں سے غالب طبقے کی مغلوبیت میں غلامی کی زندگی جیتے آرہے تھے، جن کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک ہوا کرتا تھا، جن کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا، نہ ہی وہ اپنی پسندیدہ زندگی جی سکتے تھے، بازار میں ان کی بولی لگائی جاتی تھی، ان کو خریدنے والے ان کے مالک ومختار آقا بن جاتے تھے جو انہیں ہر طرح سے استعمال میں لاتے تھے، اس طرح لونڈی و غلام کا ایک الگ نچلا طبقہ معاشرے میں موجود تھا جو اپنے غالب طبقے کے ذریعہ اتنا دبایا کچلا گیا تھا کہ سماج میں اس کی حیثیت نہ کے برابر رہ گئی تھی، اس غلامی کی لعنت کو اسلام نے ختم کیا اور کسی آزاد کو زرخرید غلام بنانا گناہِ کبیرہ قرار دیا۔ اس طرح سے اسلام نے ایسی غلامی کا خاتمہ کیا۔

ایک اور طرح کی لونڈی اور غلام کا بھی رواج تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے مسلمانوں نے جہاد کی شکل میں جنگیں لڑیں اور فتح حاصل کیں۔ ان میں جنگی قیدی کا مسئلہ بھی سامنے آیا۔ قیدیوں کا تبادلہ نہیں کیا جاسکتا تھا کیوں کہ مسلمانوں میں کوئی بھی کافروں کے قیدی نہیں ہوئے تھے۔ یہاں قرآن پھر ایک حکم

صادر کرتا ہے۔

''جب ان کو اچھی طرح کچل ڈالو تو اب خوب مضبوط قید و بند سے گرفتار کرو (پھر اختیار ہے) کہ خواہ احسان رکھ کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر۔''

(سورۃ محمد، ۴۷:۵)

مگر کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ ان غلاموں کے پاس بطور فدیہ دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اور دوسری صورت کہ ان پر احسان کر کے چھوڑ دینا بھی کبھی کبھی نقصان دہ ثابت ہوتا کہ وہی لوگ آزاد ہو کر پھر ترقی اسلام میں راہ کی رُکاوٹ بن جاتے۔ ان غلاموں میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے تھے جو واپس جانے سے انکار کرتے تھے۔ ایسی حالت میں انہیں قتل کرنے کا بھی کوئی حکم نہیں تھا کہ انہیں اسلام کی طرف سے امان مل چکا تھا۔ اب انہیں جان و مال، عزت و مذہب کا تحفظ دینا مسلمانوں کا فرضِ عین تھا۔ ایک طریقہ یہ ہوسکتا تھا کہ انہیں لونڈی یا غلام بنا کر سر چھپانے کے لیے گھر، عزت ڈھانکنے کے لیے کپڑا اور بھوک مٹانے کے لیے کھانا فراہم کیا جائے۔ ان سے صرف نوکروں جیسا کام لے سکتے ہیں۔ اور جو خواتین، بیوہ، کنواری بالغ لڑکیاں ہیں ان سے وہ شخص جو ان کا شرعاً مالک ہے، متمتع ہوسکتا ہے اور چاہے تو موقع ومحل کی مناسبت سے انہیں آزاد کر کے ثوابِ دارین حاصل کرسکتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں اصل مقصد ان کا تحفظ ہی ہے۔ ایسے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اسد ضروری قرار دیا گیا تھا۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''بیشک تمہارے بھائی تمہارے خدمت گار ہیں جن کو اللہ نے تمہارا زیردست کر دیا، سو جس کا بھائی اس کا زیر دست (ماتحت) ہو تو اس کو وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے اور وہی لباس پہنائے جیسے خود پہنتا ہے اور ان کی طاقت سے زیادہ کی تکلیف نہ دو پھر اگر ان کو ان کی طاقت سے زیادہ کی تکلیف دو تو خود بھی ان کی مدد کرو۔'' (صحیح بخاری، ۱:۳۴۶)

آپ ﷺ کی ان باتوں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے ساتھ اسلام نے کس طرح کا سلوک روا رکھنے کا حکم دیا ہے۔ نہ آج ایسا غلامانہ طبقہ موجود ہے اور نہ ہی اس طرح کی جنگیں لڑی جاتی ہیں، تو پھر آج کے معاشرے میں ایسے غلاموں کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لونڈی و باندی کے حق میں قرآن کی ان آیتوں کو اپنے جنسی بھوک مٹانے کی صورت میں استعمال کرنا گناہِ عظیم ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے کئی افسانوں میں باندیوں کے ساتھ نوابوں کے so called جائز حقوق پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ایک افسانہ ''باندی'' اس نوابی طریقے کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح لونڈیوں کے ساتھ ناجائز رشتوں کو مذہب کا سہارا لے کر جائز قرار دیا جاتا تھا اور بڑے ہی حاکمانہ اور غالبانہ انداز اپناتے ہوئے باندیوں

کا جنسی استحصال کیا جاتا تھا اور اس وحشیانہ عمل میں خاندان کی بزرگ خواتین بھی پیش پیش رہتی تھیں، نئی نئی لڑکیوں کو ان کے مفلس و نادار والدین سے خرید کر تراش خراش کر کے اپنے شوہروں اور بیٹوں کی شہوانی خواہشات کی تکمیلیت کے عمل کو تازگی بخشنا اپنا فرض عین سمجھتی تھیں۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ایسی خواتین کے فرائض کی وضاحت کرتا ہے:

''محل کی پالیٹکس میں مردوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ پیاری مائیں جب مناسب سمجھتی ہیں چاق و چوبند باندیاں پیر دبانے کو مہیا کر دیتی ہیں جب اسے صحت کے لیے مضر و بے کار سمجھتی ہیں دوسرے کاٹھ کباڑ کی طرح مرمت کے لیے بھجوا دیتی ہیں۔ عوض پر دوسری آجاتی ہیں۔ باندیوں سے جسم کا رشتہ ہوتا ہے شریف آدمی دل کا سودا نہیں کر بیٹھتے۔''

(''عصمت چغتائی کے افسانے'' افسانہ ''باندی'' ص۔۱۴۲)

ایک خاتون کو دوسری خاتون پر اس قدر ظلم ڈھاتے ہوئے انہیں ذرّہ برابر بھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی، کیوں کہ اس طرح کے اعمال کا ایک طویل زمانہ شاہد بن چکا تھا۔ اب یہ سب ان کے لیے ضروری اور اہم رواج میں شامل ہو گیا تھا، بس اب انہیں اہم کردار نبھاتے ہوئے اس رسمی تکمیلیت کی دوڑ میں شامل ہو جانا تھا۔ اس افسانے میں دیگر لونڈیوں کی طرح لونڈی حلیمہ کے ساتھ بھی باوجود سید ہونے کے وہی سب کیا گیا کیوں کہ اس کی ماں نے جھولی بھرانا ج کی خاطر اسے دُلہن بیگم کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ دُلہن بیگم حلیمہ کو اپنے چھوٹے بیٹے چھمن میاں کے لیے تیار کرتی ہیں۔ مگر اس افسانے میں چھمن میاں کا کردار روایتی نوابانا کردار کی تضاد کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اُسے بہتیرا یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ شادی سے پہلے لونڈیوں سے جنسی لذت فراہم کرنا گناہ نہیں ہے، ہمارا مذہب ہمیں اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنی لونڈیوں سے متمتع کر سکتے ہیں۔ بڑے بھائی افضل میاں کو جب پتہ چلتا ہے کہ چھمن میاں لونڈیوں کے نام سے ہی لعن طعن بکنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ انہیں مذہب کا حوالہ دے کر سمجھانے آتے ہیں۔ افضل میاں اور چھمن میاں کی درمیانی گفتگو ملاحظہ کیجیے:

''بکواس مت کیجیے ایسی کوئی بات نہیں اصل میں مجھے ایسی باتیں پسند نہیں، میرا مطلب ہے بغیر نکاح ناجائز ہے۔''

''مگر سرکار باندی تو جائز ہے۔''

''بالکل جائز نہیں۔''

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ ہمارے جدامجد سب کے سب حرام

کار تھے۔ ایک آپ پیدا ہوئے ہیں متقی پرہیز گار۔''

''میرا خیال ہے کہ.....''

''آپ کا خیال سالا کچھ نہیں، کبھی ارکانِ دین کا مطالعہ فرمایا ہے؟''

''نہیں تو مگر..... یہ بات عقل میں نہیں آتی۔''

''پتھر پڑ گئے ہیں آپ کی عقل مبارک پر۔''

''مگر قانوناً جرم ہے۔''

''ہم یہ کافروں کے قانون کو نہیں مانتے، ہم خداذوالجلال والکرام کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ تمہاری مرضی تم کو جگ ہنسائی کا شوق ہے تو کون روک سکتا ہے۔''

''جہالت سب جہالت کی باتیں ہیں۔''

''ہمارے قبلہ و کعبہ جاہل تھے؟''

''ہوں گے مجھے کیا پتہ۔''

''ابے کیوں گھاس کھا گئے ہو..... بزرگوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی رواج بنایا اب تک ہمارے خاندانوں میں اسی پر عمل ہوتا چلا آیا ہے جوان لڑکے بے راہ نہیں ہوتے بری لتوں سے بچتے ہیں صحت اچھی رہتی ہے۔''

''یہ سب حرام کاری کو جائز بنانے کے ہتھکنڈے ہیں۔''

''تم کفر بک رہے ہو..... مذہب کے توہین۔''

''ارے جایئے بڑے مذہب والے آئے۔ مذہب کی بس ایک ہی بات دل پر نقش ہے۔''

(''عصمت چغتائی کے افسانے'' افسانہ ''باندی'' ص۔۱۳۰۔۱۳۱)

ان مکالموں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کے متعلق کتنی غلط فہمیاں رائج کر دی گئی تھیں، جہالت کی انتہا تو دیکھیے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلق پیدا نہ کرنا رسوائی کا باعث ہوتا ہے۔ نوابوں کے طبقے میں ''جوان لڑکوں کی بے راہ روی کے وجوہات'' کو الگ طرح سے ڈیفائن کیا جاتا تھا۔ گھر پہ ہی عیش کا سامان مہیا کر دیا جائے تو جوان لڑکا اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا۔ اور بری لتوں سے بچ جائے گا۔ ایسے ناجائز طریقوں سے ان کی صحت بھی اچھی رہے گی، مطلب جہالت کی انتہا ہے۔ اس لیے نوابوں کے یہاں اپنے بیٹوں کو بری لت سے بچانے اور صحت یاب رکھنے کے لیے لونڈیوں کا

انتظام اتنا ہی ضروری قرار دیا جاتا تھا جتنا زندہ رہنے کے لیے سانسوں کی ضرورت ہوتی ہے، اگر نواب زادہ ایسا نہ کرے تو پورے معاشرے میں رسوائی ہوتی ہے۔ اس افسانے میں چھمن میاں لونڈی حلیمہ سے تعلقات بنانے سے انکار کر دیتے ہیں جس کے لیے ان کی والدہ محترمہ اس طرح اظہارِ افسوس کرتی ہیں:

''میں تو عاجز ہوں اس لڑکے سے۔ اٹھارہ انیس کا ہونے کو آیا کیا مجال
جو کسی لونڈی باندی کو چھیڑا ہو، کہ چٹکی بھری ہو، ہمارے بھائی تو ادھر دس بارہ کے
ہوئے اور خرمستیاں شروع کر دیں۔ سولہ سترہ کے ہوئے اور پھیل پڑے۔''

(''عصمت چغتائی کے افسانے'' افسانہ ''باندی'' ص۔۱۲۷)

اس سے بھی بڑی کم ظرفی دیکھیے جب چھمن میاں اور حلیمہ میں ناجائز تعلقات بن جاتے ہیں تو والدہ صاحبہ دو رکعت نفل شکرانے کے پڑھتی ہیں۔ اس طرح مذہب کی آڑ میں عیاشی کرنے کو جائز قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ باتیں چھمن میاں کی سمجھ سے باہر تھیں۔ انہوں نے جتنی بھی علمی اور ادبی کتابیں پڑھی تھیں سبھی میں بغیر شادی کئے کسی خاتون سے تعلقات بنانے والے کو زانی یا بدکار کہا جاتا ہے۔ گھر والوں کی بے طرح کوششوں سے چھمن میاں لونڈی حلیمہ کی دامِ محبت میں گرفتار تو ہو جاتے ہیں مگر دوسرے نوابوں کی طرح ان کی یہ محبت وقتی نہیں رہتی، اس کے ساتھ وہ پوری زندگی گزارنے کا بھی مصمم ارادہ کر لیتے ہیں، اپنی روشن خیال پھوپھو فرخندہ نواب کے ذریعہ پولیس کی مدد سے اپنی حاملہ حلیمہ کو بے رحم نوابوں کے چنگل سے آزاد کراتے ہیں، اور اتنی بڑی موروثی جائداد کو ٹھوکر مار کر اپنی حلیمہ کے ساتھ ایک مفلسانہ مگر باعزت زندگی گزارتے ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا کہنا تھا ''پھر واں طرف کو ہوا ہو جدھر کی'' انہوں نے ایسے ہی نہیں کہہ دیا تھا۔ ان کے سامنے مسلمانوں کا ایک طویل سفر روز روشن کی طرح عیاں تھا، جو اپنے عروج و زوال کی کہانی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا، عروج کے وجوہات اور زوال کے اسباب، باشعور اور روشن خیال ذہن رکھنے والے ہی سمجھ سکتے تھے۔ سرسید اور حالی جیسے دور اندیش مفکر ہی یہ کہہ سکتے تھے کہ ہمیں وقت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے ترقی کی راہ طے کرنی ہے ورنہ پچھڑے رہنے والوں میں ہمارا شمار ہونے لگے گا۔ ایسے مفکروں کی مخالفت ہوئی کیوں کہ وہ مسلمانوں کی روایتی اور دقیانوسی روش کو بدلنا چاہتے تھے، اسی میں اس قوم کی بھلائی تھی، مگر ایک دور میں عروج کی انتہا کو چھونے والی قوم آج تنزلی کا شکار ہے۔ صرف جاہ و جلال، حشمت و ثروت، تعلیم و تربیت ہی نہیں بلکہ شعوری طور پر بھی مفلوج ہو گئی ہے۔ اس قوم کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ وہ کسی بھی طرح کا بدلاؤ پسند نہیں کرتی۔ بدلتی ہوئی رتوں کے ساتھ چلنے کے لیے آپ کو بھی اپنے ذہن کو بدلنا پڑے گا۔ برّصغیر کی گنگا جمنی تہذیب کے پروردہ یہاں کے لوگ کسی بھی میدان میں اپنے خالص پن کو برقرار نہیں رکھ پائے۔ وہ چاہے پہناوا ہو یا کھان پان، لب و لہجہ ہو یا زبان و بیان، مذہب ہو یا تہذیب

زندگی کے ہر گوشے میں ایک دوسرے کے طور طریق کی آمیزش کا تجربہ ہر کوئی بہ آسانی محسوس کر سکتا ہے۔ دیگر میدانوں کی طرح برصغیر کے مسلمانوں نے دوسرے مذاہب کے مثبت پہلوؤں کے ساتھ منفی اثرات بھی جانے انجانے قبول کر لیا۔ اسلام نے تعلیم کے معاملے میں مرد یا خاتون کی کوئی تخصیص نہیں کی۔ ہر کوئی تعلیم حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مگر یہاں کی مسلم قوم میں آج بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ صرف تعلیم نہیں زندگی کو بہتر بنانے والے دیگر معاملوں میں بھی خاتون کو کمتر گردانتے ہوئے اسے اس کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ غزالہ قمر اعجاز نے اپنے افسانے ''دُھند'' میں اسی مدعے کو آٹھایا ہے اور اس کے برے نتائج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر حنا جو اس افسانے کی راوی کی والدہ ہیں گلناز بیگم کے انگریزی سیکھنے کے جنون کو دیکھتے ہوئے ان کی والدہ سے کہتی ہیں کہ گلناز پڑھنے میں تیز ہیں اور انہیں تعلیم دلائی جائے، بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ خود میں بھی بدلاؤ لایا جانا ضروری ہے، تو یہ سن کر گلناز بیگم کی والدہ غصے میں بپھر جاتی ہیں اور کہتی ہیں:

''تاکہ دو چار کتابیں پڑھ کر بڑوں سے بات کرنے کی تمیز اور تہذیب
بھی بھول جائے.....اور بحث کے لیے بڑوں کے سامنے کھڑی ہو جائے.....ہم
بدلتے ہیں زمانہ۔ گلناز کو ہم نے وہ تمام تعلیم و تربیت دی ہے جو اس کی زندگی بہتر بنا
سکے۔ ہمارے یہاں کے مرد عورتوں کی کمائی پر گزارہ نہیں کرتے۔''

(افسانوی مجموعہ ''چاند میرا ہے'' افسانہ ''دُھند'' ص۔۱۴۹)

پروفیسر حنا کو یہ سن کر بہت افسوس ہوتا ہے اور ان کے یہ جملے ان کی دور اندیشی اور روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ:

''مسلمانوں میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ کسی بھی تبدیلی کو وہ بہت
جلد اور بہت آسانی سے قبول نہیں کرتا۔۔۔ بلکہ روایت اور اصول کی آڑ میں آنے والی
نسلوں کو دوسروں سے بہت پیچھے کر دیتا ہے۔ ہر تبدیلی کے منفی اثرات اس پر اس طرح
حاوی ہو جاتے ہیں کہ مثبت پہلو اجاگر ہی نہیں ہو پاتے.....''

(افسانوی مجموعہ ''چاند میرا ہے'' افسانہ ''دُھند'' ص۔۱۴۹۔۱۵۰)

اسلم شیرازی جو اس افسانے میں گلناز بیگم کے چچازاد اور منگیتر بھی ہیں، لندن میں مقیم ہیں، اس لیے گلناز بیگم پروفیسر حنا سے انگریزی سیکھ رہی ہیں کہ وہ اپنے شوہر سے انگریزی میں بات کر پائیں۔ مگر چونکہ گلناز بیگم کو روایتی روش کی پیروی کرتے ہوئے تعلیم سے محروم رکھا گیا اس لیے لندن کی آب و ہوا کے شیدائی اسلم شیرازی صاحب نے انہیں اپنی بیوی بنانا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور وہیں ایک گوری میم سے شادی رچالی۔ ۲۵ سال بعد اس افسانے کی راوی اپنی والدہ کے کہنے پر گلناز بیگم کے جاہ جلال کا دیدار کرنے

چھتاری جاتی ہیں تو وہاں حویلی کی بوسیدگی کے ساتھ ساتھ گلناز بیگم کا سراپا اپنی ٹوٹی پھوٹی حسرتوں کے ساتھ بوسیدہ روایت کے سبق آموز انجام سے باخبر کراتا ہوا نظر آتا ہے۔

مذہب اسلام میں خاتون کو ایک معزز زندگی گزارنے کے لیے جتنی سہولتیں اور آزادیاں عطا کی گئی ہیں اُس طرح کی آزادی کسی بھی مذہب میں موجود نہیں ہے۔ مرد ہو یا خاتون زندگی کے ہر میدان میں مذہب نے ہر کسی کے لیے ایک دائرہ مقرر کیا ہے۔ اس حد کے اندر رہ کر آپ کو کھلے آسمان میں پرواز کرنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ مگر مرد حاوی سماج نے مذہبی قوانین کو بھی اپنی سہولت کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اور اس قدر یہ تصرف شدہ قوانین رائج چلے آرہے ہیں کہ یہ صرف مرد نہیں خاتون کی بھی سائکی کا حصّہ بن گیے ہیں۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ماں ایک خاتون ہونے کے باوجود اپنی بیٹی کے تئیں وہی رویہ روا رکھتی ہے جیسا مرد مرکز سماج چاہتا ہے۔ اس کی شادی کے متعلق اسے پوچھا تو جاتا ہے مگر اس سے یہ توقع قطعی نہیں رکھی جاتی کہ وہ اس کا جوب ''نہ'' میں دے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ اسے اس کی خود سری مانا جاتا ہے۔ صادقہ نواب سحر کا افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' میں شمع کی والدہ پڑوس کے حارث صاحب کے لڑکے زید کے لیے اس کے رشتے کے متعلق شمع سے اس کی مرضی جاننا چاہتی ہیں۔ جب شمع اس کی بد صورتی کا ذکر کر کے اپنی ناگواری کا اظہار کرتی ہے تو اس کی والدہ کہتی ہیں:

''چپ بے شرم کہیں کی! کہیں اپنے ہونے والے دلہے کے بارے میں ایسا بھی کہتے ہیں! خوبصورتی کیا گھول کر پیوگی؟ شریف لڑکا ہے۔ پھر دولت مند بھی ہے۔''

(افسانوی مجموعہ ''خلش بے نام سی'' افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' ص۔۹۰)

پھر شمع کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھ کر خوش ہو جاتی ہیں:

''میں نہ کہتی تھی، میری شمع پڑھی لکھی ہے تو کیا ہوا۔ گائے کی طرح ہے۔ خوش رہو۔'' (افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' ص۔۹۰)

ہمارا معاشرہ ایسا ہی ہے۔ لڑکی گائے کی طرح ہے۔ بے زبان۔ اسے بولنے کا حق نہیں ہے۔ شمع کی والدہ اسے سمجھاتی ہیں کہ زید بہت شوقین طبیعت کا مالک ہے۔ شادی کے بعد اس کا ہر کام شمع کو بخوشی کرنا ہوگا۔ کیوں کہ خدمت اور محبت سے ہی شوہر کا دل جیتا جاتا ہے۔ اس کے کپڑے تیار کرنا، ایک روز پہلے سے ہی جوتے پالش کر دینا، اسکی ہر بات پر اپنا سب کچھ قربان کر دینا شمع کا فرض عین ہونا چاہیے۔ وہ جیسا کہے شمع ویسا ہی کرے۔ ناچنے کہے تو ناچے، گانے کہے تو گائے، اپنی ماں سے یہ سب سننے کے بعد شمع کو جیسے اپنی تذلیل محسوس ہوئی۔ کیوں کہ ان ساری نصیحتوں میں شمع کی خوشی کے تئیں اس کے شوہر کا فرض کیا ہوگا، اس کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ شادی کے بعد شوہر کی دلجوئی ہی بیوی کا عین مقصد ہونا

چاہیے چاہے اس کے لیے اس کی عزت ہی داؤ پر کیوں نہ لگ جائے۔ اس لیے شمع اپنی والدہ سے کہتی ہے کہ:

''مجھے اتنا بے عزت نہ کریں۔ امی جان!''

(افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' ص۔۹۱)

اتنا کہنا تھا کہ اس کی والدہ آپے سے باہر ہو جاتی ہیں اور اس کی منہ زوری پر غصے سے بولتی ہیں کہ:

''اسی لیے میں تجھے پڑھانے کے حق میں نہ تھی۔ ہائی اسکول سے ہی ختم کروا دیتی۔ لیکن تیرے ابا کو بڑا شوق تھا نہ! بس یہی نتیجہ نکلنا تھا۔ عورت اپنے کو مرد کے برابر سمجھنے لگے، تو ہو چکا..... اری حرامزادی..... شوہر مجازی خدا ہوتا ہے، خدا میں کا آدھا خد..... خدا کے بعد اگر کسی کا سجدہ جائز ہوتا۔۔ تو وہ شوہر کا ہی ہوتا..... اس برس سے منی کو گھر نہ بیٹھالیا تو رحمت بی نام نہیں.....''

(افسانہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی'' ص۔۹۱)

شمع سسک کر اللہ سے صرف اتنا ہی کہہ پاتی کہ یا تو اسے سو سال بعد پیدا کرنا تھا جب زمانہ اتنا بدل گیا ہوتا کہ اسے احتجاج کی ضرورت ہی نہیں پڑتی یا سو سال پہلے پیدا کرنا تھا جب سچ میں لڑکیاں بے زبان گائے کی طرح ہوتی تھیں اور اپنے ساتھ ہو رہے سلوک کو ہی اپنی قسمت مان کر خاموشی کو ہی اپنا وطیرہ بنا لیتی تھیں۔ اپنے ساتھ ہو رہی ساری حقیقتوں کو چپ چاپ قبول کر لیتی تھیں۔ یہی بات شمع کی بارہ سال کی چھوٹی سی بہن منّی بھی شمع سے کہتی ہے، جس پر شمع کو بہت تعجب ہوتا ہے کہ یہ ساری باتیں جو شمع اب سوچ رہی تھی وہ اس ننھی سی بچی کے ذہن میں اتنی جلدی کیسے پنپ رہی تھیں۔ منی نے کتنے پتے کی بات کہی کہ شمع انسان کی طرح جینا چاہتی ہے اور:

''اخبار، رسالے، ٹی وی، کمپیوٹر، اسکول کالج بکواس کرتے ہیں..... گھر کی چہار دیواری میں پہنچ کر ہم صرف عورت ہیں نا..... اور کچھ نہیں نا..... محکوم، مظلوم.....!..... اور آزادی کا لیبل پیشانی پر لگا کر پنجرے میں رہنا کتنا مشکل ہے نا باجی!!''

(ہزاروں خواہشیں ایسی'' ص۔۹۲)

مرد حاوی معاشرہ خاتون کو بحیثیت انسان قبول نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے ساتھ جانوروں کی طرح وحشیانہ سلوک برتنے میں انتہا کی حد کر دیتا ہے۔ مذہب اسلام میں جتنے سارے قوانین خاتون اور مرد کے ازدواجی رشتے کے متعلق پیش کیے گیے ہیں اُس میں ذرّہ برابر بھی ترمیم کے بارے میں سوچا تک نہیں جا سکتا۔ جہاں مرد کو انچا ہے رشتے سے آزادی حاصل کرنے کے لیے طلاق کو جائز قرار دیا گیا ہے وہیں خاتون کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ بھی ایک ناپسند رشتے کو زندگی بھر ڈھونے کے بجائے خلع لے کر اپنے آپ کو آزاد کر سکتی ہے۔ خاتون کا خلع لینا اتنا رائج نہیں ہے کیوں کہ خاتون ہر ممکن کوشش کرتی ہے کہ رشتہ نبھ جائے۔ مگر

معاشرے میں طلاق کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔تین طلاق کے درمیان جتنی مدّت ہونی چاہیے اس کا اہتمام کہیں نہیں کیا جاتا،بس ایک ہی وقت میں جاہلوں کی طرح تین طلاق کہہ کر جلد بازی میں غلط قدم اٹھالیا جاتا ہے۔انپڑھ اور جاہل طبقے جو دینی معاملات میں علماء کے آراء پر ہی انحصار کرتے ہیں، میں اسلام کی دیگر بنیادی فرائض کی جانکاری ملے نہ ملے طلاق کا معاملہ اس قدر ان کی نفسیات کا حصّہ بنا رہتا ہے کہ شراب کے نشے میں بھی اپنی بیوی پر طلاق کا قہر ڈھانے سے درگذر نہیں کرتے۔حالانکہ نشے میں دیے گیے طلاق کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔جلد بازی میں اٹھایا گیا قدم بعد میں پچھتاوا چھوڑ جاتا ہے۔اگر پھر سے اپنی بیوی کو اپنانا چاہیں تو حلالہ جیسے مشکل مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے۔زرّین فاطمہ نے اپنے افسانے میں حلالہ والے موضوع کو اختیار کیا ہے اور انجام بھی بڑا سبق آموز دکھایا ہے۔ان کا افسانہ ''حلالہ'' کا مرکزی کردار تانیہ کو اپنے شوہر سے طلاق کا تحفہ اس لیے ملتا ہے کہ اس کا شوہر جنید تانیہ اور اس کے کزن بلال کے رشتے کو لے کر غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔اور اسے کریکٹر لیس جان کر تانیہ کی صفائی دینے کے باوجود اسے طلاق دے دیتا ہے۔تانیہ ایک گہرے زخم کے ساتھ اپنے میکہ واپس آجاتی ہے۔تانیہ کی ایسی حالت والدہ شکیلہ بیگم کو ہسپتال پہنچا دیتی ہے۔جنید کا غصّہ جب ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو وہ اپنی امّی سے اصرار کرتا ہے کہ وہ اس کی زندگی، تانیہ کو واپس لے آئیں۔والدہ اسے سمجھاتی ہیں کہ طلاق کے بعد تانیہ کا واپس آنا ناممکن ہے۔جنید حلالہ کرنے کو کہتا ہے۔اس درمیان تانیہ کو اپنے تئیں بلال کی محبت کے بارے میں پتہ لگ جاتا ہے۔اب سب مل کر یہ فیصلہ لیتے ہیں کہ حلالہ کیا جائے،تو بلال تانیہ کی خوشی کے لیے ایک اور قربانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔تانیہ کی شادی بلال سے ہو جاتی ہے اس شرط پہ کہ بلال تانیہ کو طلاق دینے کے بعد اس کی شادی پھر سے جنید سے کر دی جائے گی۔بلال سے شادی کے بعد تانیہ نے ایک ایسا قدم اٹھایا جو اس طرح لڑکیوں کے جذبات اور جسم کے ساتھ کھیلنے والوں کی من مانی پر کاری ضرب لگاتا ہے۔تانیہ بلال سے کہتی ہے:

''سچی محبت آپ نے کی ہے مجھ سے،جنید نے نہیں۔جو ایک جملے کو وجہ بنا کر مجھے طلاق دے سکتا ہے، پھر میری زندگی میں کسی دوسرے مرد کی شمولیت کے بعد وہ مجھے کس طرح اپنائے گا۔اپنا بھی لے گا تو کیا گارنٹی ہے کہ اس کے پاس کوئی دوسری وجہ نہیں ہوگی طلاق کی۔''

(افسانوی مجموعہ ''محبت کا خراج'' افسانہ ''حلالہ'' ص۔۱۱۱)

بلال یہاں بھی تانیہ کی خوشی کو ہی اوّلین فرض مانتے ہوئے اس سے اس کی مرضی جاننا چاہتا ہے۔تانیہ کہتی ہے:

''آپ کا ساتھ۔بلال آپ میری خوشیاں چاہتے ہیں تو پھر مجھے ایسے

شخص کے حوالے کیسے کر سکتے ہیں، جو بغیر کسی وجہ کے مجھے طلاق دے دے۔جنید کے الزام میں سچائی نہیں تھی،مگر آپ سے پوچھتی ہوں کہ اگر مجھ سے غلطی ہو بھی جاتی تو کیا اس کی محبت میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ مجھے معاف کر دے، مجھ سے ناراض ہو جاتے، مجھ پر ظلم کی آخری انتہا کر دیتے،مگر مجھے اتنی بڑی گالی تو نہ دیتے۔مجھے اپنے مذہب پر بڑا فخر ہے کہ اگر اس نے مرد کا رتبہ عورت سے بلند کیا ہے تو عورت کے ساتھ بہیمانہ سلوک کرنے کی اجازت نہیں دی۔حلالہ ان مردوں کے لیے ایک سبق ہے، جو عورت کو اپنے پیر کی جوتی سمجھتے ہیں۔''

(افسانوی مجموعہ ''محبت کا خراج'' افسانہ ''حلالہ'' ص۔۱۱۱۔۱۱۲)

دوسری شادی کے بعد اسلامی قانون نے لڑکی اور لڑکا دونوں کو یہ اجازت دے رکھی ہے کہ دونوں اپنی مرضی سے ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کریں،ان پر کسی بھی طرح کی زبردستی نہیں کی جا سکتی۔اس لیے تانیہ اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرتے ہوئے اپنے دل کا ہی سنتی ہے۔اس کا یہ قدم جنید،جس نے ایک غلط فہمی کے بل بوتے تانیہ پر طلاق کا قہر برپا کر دیا تھا،اس کے اور اس جیسے بے حس مردوں کے چہرے پر ایک قرارا طمانچہ جڑتا ہے۔مذہبی قوانین کو اپنی سہولت کے مطابق تصرف میں لا کر اپنی مخالف صنف پر اس قدر ظلم روا رکھنے والے مردوں کے طور طریق کو بدلنے کے لیے تانیہ جیسی ہی حوصلہ مند خواتین کی ضرورت ہے جو مذہبی قوانین کو اپنے حق میں استعمال کرنا سیکھیں اور ایک خوشگوار زندگی کی شروعات کریں۔کیوں کہ اب گھٹ گھٹ کے جیتے رہنے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔اپنی ذات اور شخصیت کو مسخ ہونے سے بچا کر معاشرے میں بحیثیت انسان اپنی پہچان قائم کرنے کے لیے خود کے اندر بھی جسارت پیدا کرنی ہوگی کہ مذہب اسلام نے سہولیات مہیا کرنے میں مرد اور خاتون میں کوئی تخصیص نہیں کی ہے۔انجم آرا انجم نے افسانہ ''میرے گرو نے میرے چہرے پر تیزاب ڈال دیا'' میں ایک ایسے مدعے کو اٹھایا ہے جو صرف ہندو نہیں مسلم معاشرے میں بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔اکثر برِّصغیر میں آئے دن یہ سنا جاتا ہے کہ ڈھونگی باباؤں نے مذہب کی آڑ میں بھولی بھالی عوام کو فریب کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔خصوصاً معصوم اور بھولی بھالی لڑکیاں ہی دھوکے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ان میں سے کچھ ایسی نازیبا حرکتوں کو مذہبی افعال مان کر سورگ پانے کی خواہش میں خاموشی اختیار کر لیتی ہیں مگر کچھ باشعور اور روشن خیال لڑکیاں ان مجرمانہ حرکتوں کے پس پردہ باباؤں کی ہوس پرست جبلت کا پردہ فاش کر دیتی ہیں۔یہ راہ ان سے ان کا بہت کچھ چھین تو لیتی ہے مگر ان پاکھنڈیوں کو انجام تک پہنچا کر جو ابدی سکون ملتا ہے وہ ناقابلِ بیان ہوتا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار گریجویٹ ہونے کے باوجود ایک ایسے گرو (godman) کے جال میں پھنس جاتی

ہے جو اسے ایک بھیانک انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ لڑکی پہلے ناستک تھی مگر اس گرو کے زہر آلود ماحول اور پُر فریب جال کا ایسا شکار ہوتی ہے کہ خود سے بھگوان کے بعد صرف اس پر بھروسہ کرنے لگتی ہے۔ چوں کہ یہ تعلیم یافتہ تھی اس لیے گرو اسے اپنی خاص شاگردوں میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ مگر ایک دن اس لڑکی پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ جہاں روحانی تعلیمات کا درس دیا جاتا تھا وہیں گرو اور چیلوں کے درمیان مجرمانہ سرگرمیوں کے متعلق بحثیں ہو رہی ہیں۔ اپنے godman کو ایسی حرکتوں میں ملوث پا کر اس لڑکی نے پُر زور احتجاج کرنے کی کوشش کی:

> ''جب انہیں یہ اندازہ ہوا کہ مجھے حقیقت معلوم ہوگئی ہے تو انھوں نے مجھے طرح طرح کی دھمکیاں دیں اور متنبہ کیا کہ اگر کسی کو یہ راز بتایا تو نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ لیکن میں نے ان کی ساری دھمکیوں کو ہوا میں اڑا دیا۔ میں بے وقوفی میں چلّانے لگی۔ میں دن نکلنے سے پیشتر تم سب کو گرفتار کروادوں گی۔''
>
> (افسانوی مجموعہ ''لمحہ لمحہ زندگی'' افسانہ ''میرے گرو نے میرے چہرے پر تیزاب ڈال دیا'' ص۔۶۸)

بار بار چلّا کر گرفتار کروانے والی دھمکیوں کی وجہ سے گرو نے اس پر تیزاب پھینک کر اس کی ہنستی کھیلتی زندگی کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کرانے پر پولیس نے آشرم پر چھاپا مارا مگر وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ گرو چیلے سب فرار ہو چکے تھے۔ اس لڑکی نے اپنی ہمت اور پُر زور احتجاج کی بدولت خود کی خوبصورتی کو زائل کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی بھر کی ذہنی اذیت کو گلے سے لگا لیا مگر معصوم اور سادہ لوح عوام کے سامنے دھرم کا مکھوٹا پہنے ہوئے socalled godman کے چہرے سے بظاہر پاکیزہ مگر کریہہ نقاب نوچ ڈالا۔ معاشرے میں ایسے باہمت لوگوں کی ضرورت ہے کہ جوش میں ہوش نہ کھو کر عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسے نقلی اور مفاد پرست باباؤں کی اصلیت منظرِ عام پر لائیں۔ ہندوستان، جہاں لوگ پیڑ، پودے، جانوروں اور پتھروں کو بھگوان کی طرح پوجتے ہیں وہاں انسان میں بھگوان تلاشنے کا دعویٰ کرنا کوئی عجوبہ نہیں۔ مفاد اور موقع پرست دھوکے بازوں نے اسے ایک بہترین پیشے کے طور پر اپنا لیا ہے۔ کیوں کہ اس میدان میں تھوڑی سی عقلمندی سے دولت، شہرت، عزت اور عورت ،ایک خوشحال زندگی کی تمام بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے دن بدن ایسے godfathers کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، جن کے سحر زدہ جال میں پھنس کر معصوم ضرورت مند عوام خصوصاً خواتین کچھ پانے کی تمنا لیے ان کی ہوس کا نشانا بن جاتی ہیں، مگر چوں تک نہیں کرتیں۔ ایسے نظام کی تبدیلی کے لیے اپنی آزادی اپنا حق اور خالص اور پاکیزہ مذہب کے تئیں باشعور رہنے والے روشن خیال

افراد کی نہایت ضرورت ہے۔

مذہبی قوانین اپنی جگہ مستحکم ہیں، مگر مرد اساس معاشرے نے اپنی انانیت کے شعلہ بار ہتھوڑوں سے ان آہنی قوانین پر کاری ضرب لگا کر انہیں من چاہی شکلوں میں ڈھال لیا ہے۔ یہ ایسی شکلیں ہیں جن کے استعمال سے معاشرے کے برتر طبقے کو ہی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ایک طبقہ کم سے کمتر ہوتا جارہا ہے اور تضادی صفات کا اہل دوسرا برتر طبقہ اس کمزوری اور کمتری کو روند کر اپنی حاکمیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جدید سماج کا روشن شعور کہاں ایسی اونچ نیچ کو برداشت کرسکتا تھا۔ چاہے حاکم طبقے سے تعلق رکھنے والا مرد ہو یا محکوم گروہ کی متعلقہ خاتون، دونوں نے اس غیر متوازی معاشرے کے توازن کی بحالی کے لیے آواز اٹھائی۔ نتیجے کے طور پر بڑی حد تک آج معاشرہ مردانہ کاریگری سے آراستہ چولے کو اتار کر اپنی اصلی صورت میں چاک و چوبند نظر آرہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ توازن پوری طرح قائم ہو چکا ہے، کئی ایک جگہوں پر دیکھی جانے والی ناہمواری آج بھی مرد حاوی معاشرے کی سیاہ تاریخ کی روداد سناتی ہے۔ چونکہ باشعور ذہنی کاوشیں دشوار گزار راہوں میں اپنی منزل کی اور رواں دواں ہیں تو ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ افق کے ساحل پر آفتابِ امید ضرور طلوع ہوگا اور پوری دنیا اس کے کرنوں کی پھلجھڑیوں میں برابری کا جشن مناتی نظر آئے گی۔

◂◂ ● ▸▸

Lecturer,Dept. of Urdu,Dham Nagar Degree College,
DhamNagar,Bhadrak,Odissa
8320380244,7416761831
shaziatamkeen011@gmail.com

مرے ہوئے آدمی کی لالٹین

(افسانے)

صدیق عالم

ناشر

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دھلی۔ ۲

● مضمون

● رافد اویس بھٹ

ترنم ریاض کی تخیلاتی تکثیریت

ترنم ریاض اردو فکشن کا ایک ایسا نام ہے جس سے تقریباً پوری اردو دُنیا واقف ہے۔ وہ نہ صرف اردو فکشن اور شاعری میں اپنا ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہیں بلکہ ترجمہ، تنقید اور صحافت میں بھی اپنے کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اُنھوں نے بہ طور اردو نیوز براڈ کاسٹر (News Broadcaster) اور ترجمہ نگار کی حیثیت سے بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں کافی عرصے تک اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ اُنھوں نے کئی ادبی و کلچرل پروگراموں کو منعقد کروایا ہے؛ جس سے اُن کے علمی و ادبی کاموں میں دلچسپیوں کا پتا چلتا ہے۔ ترنم ریاض نے کشمیر کے معروف رسائل و جرائد کے خواتین گوشوں میں بہ حیثیت مدیرا پنے فرائض انجام دیئے ہیں۔ اُنھوں نے اب تک تقریباً ۱۵ کتابیں (تنقید، فکشن، شاعری اور ترجمہ) اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ''یہ تنگ زمین''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''یمبر زل'' اور ''میرا رخت سفر'' اُن کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ''پُرانی کتابوں کی خوشبو''، ''بھادوں کے چاند تلے'' اور ''زرسبزہ محو خواب'' شعری مجموعے اور ''مورتی''، ''برف آشنا پرندے'' اور ''فریب خطائے گل'' (ناویلا) اُن کے ناول ہیں۔ اُن کی دیگر تصانیف میں ''بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب''، ''چشمہ نقش قدم'' اور ''اجنبی جزیروں میں'' شامل ہیں۔

ترنم ریاض اپنے منفرد و غیر معمولی اسلوب اور طرز نگارش سے اردو کی قد آور خواتین فکشن نگاروں کی صف میں شامل ہیں۔ اُنھوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیتوں سے انسانی زندگی اور اُس میں پیدا شدہ متنوع حالات و واقعات کو افسانے کے روپ میں پیش کر کے سماج کے ذی حس فرد ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اُن کے افسانوں میں وہ آفاقیت بھی ہے جو اُنھیں ادب عالیہ کے تخلیق کاروں کی صف میں شامل کرتی ہے اور وہ مقامیت بھی موجود ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو اپنے افسانوں میں پیش کر کے اپنے اطرف و اکناف میں بسنے والے افراد یعنی عوام کی تخلیق کار ہیں؛ اُس عوام کی جو سماج کے چند اشرافیہ افراد کے استحصال کا شکار ہو جاتی ہے۔ ترنم ریاض کی خلاقانہ اور ذہنی ساخت اس قدر بالغ ہے کہ وہ عہد حاضر کے ٹیکنالوجیکل دور میں بھی انسانی خصائص کے منفی رویوں پر نہایت حساس طریقے سے نظر رکھی ہوئی ہیں جن سے مابعد جدید دور کا سماج دوچار ہے۔ زمانے کے تغیر و تبدل سے کس طرح انسانی اقدار

اپنے رنگ بدلتے ہیں اور کس طرح نئے دور کے تقاضوں کی آڑ میں سماج کی بدعتیں اپنا روپ دھار کر سماجی زندگی کو کھوکھلا کرتی ہیں؛ اُس کی عکاسی ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں بہترین انداز میں کی ہے۔

ترنم ریاض اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کی غذا انسانی زندگی سے حاصل کرتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں کے لیے مواد اپنے اطراف و جوانب میں حقیقی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل سے لیا ہے۔ سماج میں رونما ہونے والا ہر واقعہ اُن کی نوک قلم سے ہوتا ہوا گزرتا ہے۔ وہ اپنی قلم کی نوک سے نہ صرف کاغذ سیاہ کرتی ہیں بلکہ انسانی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات کی سیاہی کے تاریک پن کو بھی اپنی نوک قلم کے نور سے منور کرنے کی خواہاں نظر آتی ہیں۔ اُن کے افسانے نسائی استحصال اور سماج میں نسائیت کی ثانوی حیثیت کے طور پر پیش آنے والے مسائل سے بھی تشکیل پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانے رشتوں کے تقدم و تقدس کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کا تانا بانا اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بنتی ہیں۔ موضوعات کے لحاظ سے ترنم ریاض کے افسانوں کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نئے تقاضوں کو محسوس کر کے نت نئے موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں؛ جس سے اُن کی ذی حسی اور تخلیقی شعور کی وسعت کا پتا چلتا ہے۔ اپنے افسانوں کے لیے موضوعات کے انتخابی عمل کے حوالے سے وہ خود یوں رقم طراز ہیں۔

> ''ہر انسان اپنے حسی اضطراب اور روحانی اسرار لیے جیتا ہے، دُنیا کا ہر ذی روح اپنے ساتھ ایک کہانی لے کر چلتا ہے، کسی کی کہانی مختصر ہوتی ہے کسی کی طویل، کبھی دردانگیز کبھی پُر مسرت، مگر یہ دونوں اثرات دیرپا نہیں ہیں۔ وقت کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جن میں ہماری زندگیوں کے واقعات و حادثات جنم لیتے ہیں افسانے بن جاتے ہیں۔''[1]

جدید عہد کے افسانے نے فنی سطح پر علاماتی اور استعاراتی تجربات سے افسانے کو موضوعاتی سطح پر بہت حد تک فراموش کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قاری کہانیوں سے دور ہوتا ہوا دکھائی دیا؛ مگر ترنم ریاض اردو افسانہ نگاروں کے اُس حلقے سے تعلق رکھتی ہیں جنھوں نے قاری کو کہانی سے جوڑنے کا ایک اہم فریضہ انجام دیا اور کہانی پن کی واپسی میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ رشتوں میں عدم احساس، بڑے شہروں کے مسائل، غریبی سے پیدا ہونے والی نا آسودگی، تشدد اور فرقہ وارانہ فسادات اُن کے خاص موضوعات ہیں۔ لیکن دوسری طرف وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہیں کہ دُنیا تضادات سے پُر ہے، لہٰذا ایک تخلیق کار کے لیے موضوعات کے انتخاب کے عمل میں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی ہے بہ شرط یہ کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو صحیح موقع پر کام میں لائے۔ ترنم ریاض مذکورہ تضادات کے ضمن میں حساس ہیں اور اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر افسانے کے قالب میں پیش کرتی ہیں۔ اس تناظر میں وہ خود لکھتی ہیں:

''مجھے احساس ہے کہ دُنیا تضادات کا مجموعہ ہے۔ میری نظر میں یہ تضادات افسانوں کی تخلیق میں ایک بہت بڑا رول ادا کرتے ہیں، تضادات قائم رہیں گے اور میرے افسانے بھی میری تخلیقی صلاحیت اور قابلیت کے حساب سے ظہور پذیر ہوں گے۔'' ۲

ترنم ریاض کا تعلق چوں کہ وادیٔ کشمیر سے ہے جہاں کی سیاسی اُتھل پُتھل سے ہر کوئی واقف ہے، لہٰذا ہر تخلیق کار کی تحریر میں کشمیر کی سیاسی عدم استحکام کے پہلو نظر آتے ہیں۔ کشمیر کی معصوم عوام پر کس طرح مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور کس طرح ہر کشمیری کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے اور دہشت گرد تصور کیا جاتا ہے؛ اس کی بھرپور عکاسی افسانہ ''مٹی'' میں کی گئی ہے۔ یہ افسانہ کشمیر کی سیاسی افراتفری اور بے چینی کا مظہر ہے۔ اس افسانے کے پس منظر میں کشمیر میں Polotical Instability کی وجہ سے بگڑتے حالات کو افسانے کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کا کردار ''ہلال احمد'' انجینئیرنگ کا طالب علم ہے۔ لیکن اچانک پولیس دہشت گرد کی کھوج کے بہانے اُس کے محلے میں آتی ہے۔ لوٹ کھسوٹ اور مار پٹیائی کے بعد بے گناہوں کا خون بہا کر چلی جاتی ہے، جس میں ہلال کا باپ بھی مارا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہلال اپنی پڑھائی چھوڑ کر اس سسٹم کے خلاف لڑنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے؛ جسے بعد میں قانونی طور پر دہشت گرد قرار دیا جاتا ہے۔ پھر اُسے قید کیا جاتا ہے۔ جیلر کشن لال ہلال سے جیل میں پہنچنے کی وجہ پوچھتے ہیں تو ہلال سیاسی بدنظمی اور اندھے قانون پر انگلی اُٹھا کر پولیس محکمہ کی بُرائی کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اچھا طریقہ ہے۔ اگر وہ نہیں پکڑا جاتا تو اُس جیسا کوئی جے سے علم تک نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے، اُسے پکڑ لیتے ہو۔ ورنہ اُس جیسا نہ بھی ہو تو بھی کہاں بچ پاتا۔'' ۳

افسانہ ''مٹی'' میں جہاں پولیس کے ظلم و جبر کو کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے وہیں دوسری طرف سیاسی ابتری اور سیاسی لیڈروں کی بے حسی اور اُن کی نااہلی کی طرف بھی خوب اشارہ کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں کشمیری عوام کے دُکھ درد، اُن کی گھٹن اور ذہنی کرب کو افسانہ نگار نے نہایت ہی فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کشن لال کے پوچھنے پر کہ وہ (ہلال) کس طرح اور کیوں کر پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بغاوت کی راہ اپنانے پر مجبور ہوتا ہے اس ضمن میں ہلال سیاسی لیڈروں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کہتا ہے:

''اصل میں سب کو جھیلیں اور پہاڑ چاہیں بھلے ہی زمیں خون سے سُرخ ہو جائے، اس پر ادھر والے بھی اپنا آسمان چاہتے ہیں اور اُدھر والے بھی۔''

''یہ بات تم اپنے لیڈروں سے کیوں نہیں کہتے۔'' کشن لال کچھ سوچتے ہوئے بولا:

''رہبر ہوتا تو ہم اس طرح کیوں بھٹکتے، جن پر تکیہ تھا، اعتماد شکن ہوئے۔'' ۴

مذکورہ افسانے میں سیاسی بدنظمی اور سیاسی عدم استحکام کو لے کر سخت طنز کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ چند سیاسی لیڈروں کی بے حسی اور نااہلی سے کس طرح معصوم جوان باغی بننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کے مطالعے سے اس بات کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے کہ کشمیر کی اس تباہی کے اصل ذمہ دار سیاسی لیڈر ہیں۔ اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا کہ ایک نوجوان کے لیے جب حالات اس قدر تنگ کر دیئے جائیں تو اُس صورت حال میں اُس نوجوان کا باغی ہونا فطری عمل ہے۔ ترنم ریاض نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے مناظر کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کو بھی ملحوظ نظر رکھا ہے۔ ''متاعِ گم گشتہ''، ''بابل''، ''برف گرنے والی''، ''میرا پیا گھر آیا'' وغیرہ جیسے افسانے بہ طور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ افسانہ ''مٹی'' کی تخلیقیت کی وجہ کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

''افسانہ ''مٹی'' نے بھی از حد رنجیدہ کیا تھا۔ مجھے اس افسانے کو تحریر کرنے سے پہلے میں کچھ دیر کے لیے میں اس ماحول میں رکی تھی، وہاں گھٹن، درد کرب اور ہر شئے پر محیط مایوسی میرے اندر جذب ہو گئی تھی تب ''مٹی'' کا ظہور ہوا تھا۔'' ۵

ترنم ریاض عصر حاضر کی ایک ایسی خاتون فکشن نگار ہیں جنھوں نے جدیدیت کی تصنع کاری، بے جا حسن کاری، رنگین لفاظی اور زبان کی مشکل پسندی اور مبہم علامات اور دقیق استعاروں کے برخلاف سادہ اور راست طرز نگارش اپنایا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کا سروکار عوام سے ہے، اُن کا مقصد یہ ہے کہ عوام تک اُن کی تحریر کی وساطت وہ بات پہنچ جائے جو وہ پہنچانا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موضوعات کے لیے بھی اِدھر اُدھر نہیں بھٹکتی ہیں بلکہ وہ اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھتی ہیں اور اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے اخذ کرتی ہیں، اُسے ہی افسانے کے قالب میں ڈھال کر قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوی مجموعہ ''یہ تنگ زمین'' کے ابتدائیہ میں اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ وہ اپنے افسانوں کے لیے خام مواد اپنے گرد و پیش میں رونما ہونے والے حالات و واقعات سے حاصل کرتی ہیں اور اُنہی حالات و واقعات کو بے ساختگی اور صفائی سے بیان کرتی ہیں۔ کیوں کہ اُن کا ماننا ہے کہ افسانہ ہی اُن کے تجربات، مشاہدات اور احساسات کا وسیلۂ اظہار ہے۔ مظہر امام ترنم ریاض کی افسانہ نگاری کے انفرادی پہلوؤں پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترنم ریاض کے افسانوں کی جو فضا ہے وہ بڑی مانوس سی فضا ہے، جس سے ہم سب واقف ہیں۔ اُن کے اظہار میں کوئی تصنع آمیز صفائی نہیں ہے۔ بہت ہی صفائی اور شستگی کے ساتھ وہ اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔ کہیں کہیں تو اُن کے اسلوب میں خاص طرح کی مقناطیسیت آجاتی ہے، جو اپنے ساتھ ساتھ پڑھنے

والے کو بھی بہالے جاتی ہے۔ترنم ریاض اپنی سادگی، بے تکلفی اور بے ساختگی کی وجہ سے ہمیں متاثر کرتی ہیں۔'' ۶

ترنم ریاض نے اگرچہ جدید افسانے کی بے جا تصنع کاری اور تجریدیت سے اپنے دامن کو بچالیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اُن کے یہاں جدید افسانے کی خصوصیات کلی طور پر مفقود ہیں۔اُن کے افسانوں میں علامتی رنگ بھی پایا جاتا ہے مگر اُن کے یہاں مشکل پسندی اور تصنع کاری کا دخل زیادہ نہیں ہے۔ اُنھوں نے بہ طور ایک جدید فکشن نار علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے لیکن اُن کے یہاں علامتیں اس قدر بھی مبہم نہیں ہیں جو ماورائے عقل معلوم ہوتی ہیں۔اُنھوں نے سادگی اور بے ساختگی سے اپنے نقطہ نظر کو قاری کے سامنے رکھ دیا ہے جس سے قرأت کے دوران قاری شروع سے آخر تک کہیں بھی اُکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔

''باپ'' ترنم ریاض کا ایک ایسا افسانہ ہے جو مرد ذات کی بے حسی اور عورت کے استحصال پر مبنی ہے۔جس میں ایک باپ نشے کی وجہ سے اپنے باپ ہونے کے فرض سے اس قدر بے حس ہو جاتا ہے کہ وہ نشے کی حالت میں اپنی بیٹیوں پر بھی گندی نگاہیں ڈالتا ہے۔نشہ اُسے اس قدر بدمست کر دیتا ہے کہ اُسے اپنی بیٹیوں کی عزت و آبرو کا بھی لحاظ نہیں رہتا۔ایک باپ گھر کا ذمہ دار فرد ہوتا ہے؛ لیکن یہاں ماں محنت کر کے گھر کا خرچہ برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ بچیوں کو تعلیم بھی دے رہی ہے۔مگر وہ بھی اپنے شوہر کی مار پیٹ سے اندرونی اعضا کے چوٹ لگنے سے ہمیشہ کے لیے بستر پر لیٹ جاتی ہے۔باپ کی بے حسی سے گھر روز بہ روز جہنم بنتا جا رہا ہے۔باپ کی گندی نگاہ سے بڑی بیٹی ناظمہ بھی محفوظ نہیں رہ پاتی ہے، یہاں تک کہ وہ شائستہ پر بھی بُری نگاہ ڈالتا ہے؛ لیکن ناظمہ اس ظلم کے خلاف احتجاج بھی نہیں کر پاتی ہے۔اس کے برعکس ساحرہ اس ظلم کے خلاف آواز بلند کر دیتی ہے۔اُن کی ماں اپنی بچیوں پر ہو رہے اس ظلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے لیکن کچھ کر نہیں پاتی ہے۔باپ کی بے حسی اور ظالمانہ رویے سے کس طرح گھر جہنم میں تبدیل ہو جاتا ہے؛ اس کا نقشہ افسانہ نگار نے کچھ یوں کھینچا گیا ہے:

''امی کو کتنا ارمان تھا اپنی بچیوں کی اُونچی تعلیم کا۔وہ خود ہی محنت مشقت سے اُن کی پڑھائی کا خرچ پورا کرتیں۔اس میں باپ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔باپ کو اپنے علاوہ گھر میں کسی اور کی بہبودی سے کوئی واسطہ نہ تھا''

''.....باپ نے ایک دن ایسا مارا پیٹا کہ بہت دن تک بستر سے نہ ہل سکیں.....امی کھٹیا پر پڑی کراہتیں.....آنسو بہاتی ہوئی، نقاہت بھری آواز میں سانپ سانپ چلاتیں اور بے ہوش ہو جاتیں۔'' ۷

''باپ کی نگاہیں کبھی کبھی شائستہ کے ننھے سے بدن کا طواف کر کے اُس

کے بھرے بھرے رخساروں پر ٹھہر جاتیں۔وہ منہ بھر بھر اس کے گالوں کو کئی کئی بوسے بھی لے لیتا۔'' ۸

بیوی اپنے شوہر کی حرکتوں سے اس قدر تنگ آ چکی تھی کہ وہ بار بار چلاتی رہتی ہے ''شیطان.....درندے.....سانپ ہو تم۔اپنی ہی بچیوں کو کھاتے ہو۔۔سانپ.....میری معصوم کلیوں کو.....میری بچیوں پر..... میری..... میری.....کاش.....کاش.....میں تمہیں.....میں.....تمہیں کوئی.....سنگسار کیوں نہیں کر دیتا؟'' ۹

ترنم ریاض نے اس افسانے میں سماج میں پلنے والی اُن برائیوں کی طرف انگشت نمائی کی ہے جو ایک انسان کو حیوانیت اور درندگی کی انتہا تک پہنچاتی ہیں۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ موجودہ سماج میں شراب اور نشے کی لت نے کئی گھر برباد کر دیئے ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ اس وجہ سے عورتیں مردوں کے استحصال کا شکار بھی ہوتی رہی ہیں۔یہاں تک کہ نشے میں دُھت مرد کو رشتوں میں وہ امتیاز باقی نہیں رہتا اور وہ درندگی کی اس حد تک اُتر آتا ہے کہ وہ اپنے ہی خون کی عزت و عصمت تک کو نہیں بخشتا ہے۔ترنم ریاض کا ایک اور افسانہ ''رنگ'' نفسیاتی اعتبار سے اہم ہے۔جس میں ایک ماں حقیقی زندگی میں سب کچھ ہونے کے باوجود خیالی دُنیا میں پناہ لیتی ہے۔دراصل یہ افسانہ حقیقت اور خواب پر مبنی ہے۔جس میں ایک ماں اپنے بچوں سے بے حد محبت کرنا چاہتی ہے لیکن اُس کے بچوں کو ماں کی اس محبت کا احساس نہیں ہوتا ہے؛ یہاں تک کہ وہ بچے اپنے والدین کی پرورش تک کو بے مصرف قرار دیتے ہیں۔اس افسانے میں ماں کی مسکراہٹ سے تخلیق کار قاری کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں کہ بچے اپنی ماں کو بھلے ہی حقیقت میں بھول جائیں مگر اُس ماں کے دل میں اپنی اولاد کے تئیں محبت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے اور وہ حقیقت میں نا سہی مگر خواب و خیال میں اپنے بچوں کو سینے سے لگائے رکھتی ہے جیسے کہ مذکورہ افسانے میں دکھایا گیا ہے۔یعنی بچے چاہے اپنی ماں سے کسی بھی حد تک دوری اپنا لیں، ماں کی محبت کو ٹھکرا دیں لیکن اُس کے باوجود بھی ماں اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔اس افسانے میں بھی موجودہ سماج پر طنز کیا گیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مشینی اور ٹیکنالوجیکل دور نے انسان کو رشتوں سے اس قدر دور کر دیا ہے کہ بچوں کو اپنی ماں کی محبت کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔دوسری بات یہ کہ موجودہ دور کی مادیت پرستی انسانی رشتوں کے درمیان حائل ہو چکی ہے، جس کی آڑ میں ایک انسان اپنے رشتوں کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔اسی افسانے کے طرز پر ترنم ریاض نے دوسرا افسانہ ''اماں'' لکھا ہے۔اسی طرح ایک اور افسانہ ''بابل'' میں بے جوڑ شادی کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس میں خوبصورت اور کمسن لڑکی کی شادی ایک دراز عمر آدمی سے کر دی جاتی ہے جو کہ ایک آنکھ سے نابینا بھی ہوتا

ہے۔ یہ بدعت بھی سماج کو ایک ناسور کی طرح اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکی ہے کہ محض چند روپیوں کی خاطر ایک لڑکی کی زندگی جہنم بنا دی جاتی ہے۔ افسانہ ''شیرنی'' میں ترنم ریاض نے انسانیت پر چوٹ کی ہے۔ نجمہ جو ایک بے خوب لڑکی ہوتی ہے جس نے ڈرنا نہیں سیکھا تھا، کھیتوں اور جنگلوں میں گھومتے ہوئے کبھی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی، جو ہر وقت یہ کہتی پھرتی تھی کہ '' ڈر کا ہے کا جی۔۔۔ڈرنا تو صرف اُوپر والے سے چاہیے''۔لیکن سماج کے چند بھیڑیئے نما انسان جو کہ ہر وقت انسانی گوشت کو اپنی حوس کے دانتوں تلے چبانے کے انتظار میں منہ سے لال ٹپکائے ہوئے تیار رہتے ہیں؛ کی وجہ سے نجمہ ڈر جاتی ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے شہر کے اُس گندے ماحول کی عکاسی کی ہے جہاں نجمہ جیسی بے خوف گاؤں کی لڑکی انسان کی حیوانیت سے ڈر جاتی ہے۔گاؤں کے جنگل میں نجمہ اکیلی گھوما پھرا کرتی تھی لیکن جنگل کے حیوانوں سے اُسے کوئی ڈر نہیں لگتا لیکن شہر میں آتے ہی انسان کی حیوانیت کا اس قدر شکار ہو جاتی ہے کہ اُس کے دل میں بھی خوف وڈر پیدا ہو جاتا ہے۔ نجمہ کس طرح انسان کی حیوانیت کا شکار ہو جاتی ہے۔اقتباس ملاحظہ کریں:

''میں جب اپنے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے غسل خانے کی طرف جانے لگی تو ایک عجیب سی آواز آئی.....جیسے کوئی سرگوشیوں میں کہہ رہا ہو جی.....سنو کیا نام ہے تمہارا؟ ابھی میں نے غسل خانے کی طرف دو ہی قدم بڑھائے تھے کہ پھر سے آواز آئی۔اے سنو نا.....کیا نام ہے تمہارا؟ میں بھی ادھر ہی رہتا ہوں۔اس ساتھ والے مکان میں کام کرتا ہوں۔ادھر دیکھو نا۔مجھ سے کیا شرمانا۔دیکھو.....ادھر اُوپر.....میں نے اُوپر دیکھا۔پھر دائیں طرف کی دیوار کی طرف نظر ڈالی تو.....تو.....تو بی بی جی.....ادھر.....دیوار پر ایک پاؤں ادھر کو لٹکائے ایک مونچھ والا لڑکا بیٹھا تھا جی.....میرے کمرے کے دروازے کے بالکل قریب.....دیوار پر چڑھا ہوا۔میں ڈر گئی۔'' [۱۰] ہم عصر ادیبوں کی طرح ترنم ریاض بھی اپنے افسانوں میں عہد حاضر کے وہ تمام مسائل کو پیش کرتی ہیں جن سے آج کی نسل دوچار ہے۔چاہے وہ شوہر اور بیوی کے ازدواجی اور گھریلو مسائل ہوں جیسے کہانی ''میرا پیا گھر آیا'' اور ''بجھائے نہ بنے'' اور ''برآمدہ'' میں دکھایا گیا ہے یا پھر سماج میں ظلم اور بربریت کے شکار لوگوں کو ''اچھی صورت بھی کیا'' اور ''ایجاد کی ماں'' جیسے افسانوں میں پیش کیا گیا ہے۔ترنم ریاض نے نہایت ہی باریک بینی سے اپنے اطراف و اکناف کے نشیب و فراز کو محسوس کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدہ موضوعات کو افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے۔ وہ انسانی نفسیات میں بچوں کی

نفسیات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں۔اُنھوں نے بچوں کی نفسیات میں جھانک کر اُن پہلوؤں کو افسانے کی صورت میں پیش کیا ہے جو ایک طرف دور حاضر کے سماج کا حقیقی عکس پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف ماں باپ کے لیے لمحۂ فکریہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔''یہ تنگ زمین''، ''آدھے چاند کا عکس''، ''میرا کی شام'' اس تناظر میں اہم افسانے ہیں۔افسانہ ''یہ تنگ زمین'' میں بچوں کی نفسیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس افسانے میں کشمیری عوام پر ہو رہے ظلم و جبر، تشدد اور بربریت سے بچوں کے اذہان پر پڑے منفی اثرات کو مرکز بنایا گیا ہے۔اس میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ جو بچے کھیل کھیل میں جانوروں اور پرندوں کی بولیاں نقل کرتے ہیں مگر بدلتے ہوئے ماحول کے پیش نظر وہ اب پیڑ پودوں پر بیٹھے پرندوں کی بولیاں نکالنے کی بجائے بندوقوں اور بموں کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ یہ کہانی تشدد کے نتیجے میں بچوں پر اُن کی متاثر شدہ نفسیات کی خوب عکاسی کرتی ہے۔

افسانہ ''ایک تھکی ہوئی شام'' میں ماں کی محبت کو مرکزیت حاصل ہے۔جس میں اپنی اولاد کے تئیں ماں کی محبت کا انداز نصیحت لیے ہوئے ہے۔ کہانی کا اختتام قاری کو جھنجھوڑ دیتا ہے جو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ ماں کے دل میں اپنی اولاد کے تئیں بے پناہ محبت ہوتی ہے یکساں ہوتی ہے چاہے وہ غریب ماں ہو یا پھر امیر۔اس افسانے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مادیت پرستی چاہے انسان کو کس قدر جدید ذہن اور سوچ عطا کرے مگر ایک ماں اپنی اولاد کے تئیں اپنی محبت کو کسی بھی صورت میں کمی واقع نہیں ہونے دیتی ہے۔ بہر طور اس افسانے میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک ماں کی محبت خالص اور بے غرض ہونے کے ساتھ ساتھ ہر ایک صورت حال میں ایک جیسی ہوتی ہے۔یعنی ایک امیر ماں جس قدر اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے، غریب ماں بھی اپنی اولاد کو اُتنا ہی محبت کرتی ہے۔

ترنم ریاض کشمیر کی خوبصورت اور دلفریب وادیوں سے تعلق رکھنے والی فکشن نگار ہیں۔ جہاں ہر قدم پر پیڑ پودے ندیاں اور جھیلیں اپنی فطری خوبصورتی سے مزین ہیں۔ترنم ریاض کی تخلیقات ان خوبصورت مناظر سے بھی تشکیل پاتی ہیں۔کشمیر کی فطری خوبصورتی اور دلفریب مناظر کو جب وہ اپنے افسانوں میں بیان کرتی ہیں تو اُن کا انداز شاعرانہ ہو جاتا ہے۔یعنی اُن کے افسانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کہیں کہیں اپنے افسانوں کے ذریعے شاعری کا مزہ دیتے ہیں۔اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''کچھ ہی مہینے پہلے کی بات ہے۔درخت ابھی ابھی اپنی رنگین بانہوں سے برف جھاڑ کر لہرانے لگے تھے۔ بہار کا موسم شروع ہی ہوا تھا۔ بادام کے پیڑ

ننھے ننھے ہرے پتوں اور گلابی شگوفوں کی چُنر اوڑھے شرمائے سے جھکے جارہے تھے۔ ہد ہد جانے کس نگر سے ہجرت کر کے آتے اور چناروں کی کھوکھلی ٹہنیوں پر اپنی لمبی چونچ سے ٹک ٹک آوازیں پیدا کرتے ہوئے چھید کر کے جانے کن ننھے ننھے کیڑوں کے سکون میں خلل کا باعث بنتے اور فیروزی رنگ کے دھلے دھلائے نکھرے نہلائے آسمان میں ایک لمبی سی اڑان بھر کر دوبارہ اسی کام میں نئے انہماک سے مشغول ہو جاتے۔ نرم نرم دھوپ ہری ہری دھرتی کو اپنی کرنوں سے گدگدا دیتی اور گھاس کے تنکے لہک لہک کر فضا میں اپنی مہک بکھیر دیتے۔'' ۱۱

بہر کیف ترنم ریاض اپنے افسانوں میں عصری سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی اور نفسیاتی غرض ہر طرح کے موضوعات کو سمیٹ لیتی ہیں۔ ''یہ تنگ زمین''، ''کلچیں''، ''چھوئی موئی''، ''ایک تھکی ہوئی شام''، ''مٹی''، ''باپ'' اور ''شہر'' اس ضمن میں اُن کے پُر اثر انداز میں لکھے ہوئے افسانے ہیں۔ اُن کے کردار مختلف رنگوں میں رنگے ہونے کے باوجود زمین یعنی حقیقت سے اپنا رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی ترنم ریاض کی افسانہ نگاری خصوصاً 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ترنم ریاض اُن افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کا اظہار اور بیانیہ اُن کی اپنی ذات کے ساتھ تہذیب و ثقافت اور اعلیٰ اقدار پر مبنی ہوتا ہے۔ مجھے ترنم ریاض کی کہانیوں میں روایت کے بھرپور شعور کے ساتھ تجربہ کا رنگ بھی شامل نظر آتا ہے۔ وہ صورتحال کو کہانی بنانا جانتی ہیں اور اپنے زمانے کے اسلوبیاتی رویوں سے واقفیت کے باعث کسب فیض بھی کرتی ہیں۔۔۔ ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' اُن کے فنی سفر کا دوسرا پڑاؤ ہے، جو اپنے آپ میں قابل توجہ بھی ہے اور اپنے زمانے کے نمائندہ افسانوی رجحانات کا عکاس بھی مثال کے طور پر، 'برف گرنے والی' ہے، 'مٹی'، 'شہر'، 'باپ'، 'اماں' وغیرہ۔'' ۱۲

ترنم ریاض اردو کے جدید افسانہ نگاروں کی صف میں اپنا ایک اہم اور مستند استھان بنا چکی ہیں۔ وہ اپنی فکری صلاحیتوں سے اپنے گردوپیش کے مسائل سے آگاہ ہونے کے بعد اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اپنی فکر کو عملی جامہ پہناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانے قاری پر دور رس اثرات چھوڑتے ہیں اور سوچنے اور سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کیوں کہ افسانے کے موضوع کے انتخاب سے لے کر کردار، منظر کشی، زبان و بیان تک اُن کا سفر ایک منطقی عمل سے ہوتا ہوا گزرتا ہے۔ طارق چھتاری ترنم ریاض کی افسانہ نویسی کی خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترنم ریاض کی انفرادیت یہ ہے کہ اُن کے افسانوں کے بیشتر کردار، واقعات اور مناظر سب سے پہلے قاری کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر فہم و دانش سے لبریز ہو جانے والے دل سے پھوٹتی شعاعیں اس کے ذہن کو بھی منور کر دیتی ہیں اور خود کو افسانے کا ایک کردار سمجھ کر افسانہ نگار کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ فن کی معراج ہے، اس کی کسوٹی پر ترنم ریاض کے افسانے پورے اُترتے ہیں۔'' ۱۳

ترنم ریاض کے افسانے کرادر نگاری کے اعتبار سے بھی انفرادیت کے حامل ہیں۔ وہ واقعہ کے ساتھ ساتھ کردار کے داخلی و خارجی کیفیات پر بھی اپنی نگاہ رکھتی ہیں۔ اس ضمن میں افسانہ ''مٹی'' کا ہلال اور کشن لال، ''میرا پیا گھر آیا'' کی شمع، ''باپ'' کی ناظمہ اور ساحرہ، ''شیرنی'' کی نجمہ، ''آدھے چاند کا عکس''، کا عاطف بہ طور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اُن کے افسانے کردار نگاری کے علاوہ مکالمہ نگاری اور منظر کشی کے اعتبار سے بھی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو کے اہم ناقد عتیق اللہ ترنم ریاض کی افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ترنم ریاض کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو وہ کسک ہے جسے ایک ٹیس کی طرح اُن کے افسانوں کے بطن میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ اُن افسانوں کا ماحول اور سارا سیاق بے حد خاموش آگیں ہیں لیکن اس خامشی کے اندر جو بلا کا شور برپا ہے اسے اُن کا قاری بہت جلد محسوس کر لیتا ہے۔ ترنم ریاض میں چیزوں کو اُن کے اندر اُتر کر دیکھنے کی جو صلاحیت ہے وہ ایک افسانہ نگار کے لیے بڑی نیک فعال ثابت ہوتی ہے۔'' ۱۴

بہر حال ترنم ریاض اپنی فکریاتی اور نظریاتی اعتبار سے اردو فکشن میں اپنا ایک اہم مقام حاصل کر چکی ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور ذی حسی سے اپنے گردوپیش میں ہر چھوٹی بڑی تبدیلی کو افسانے میں سمیٹنے کی کوشش کی؛ جس سے اُنھوں نے موضوعاتی طور پر اردو افسانے کا دامن وسیع کرنے میں اپنا اہم رول ادا کیا۔ اُنھوں نے فن افسانہ نگاری کو زمینی حقائق کے حدود میں رہنے دیا اور اسے محض تفریحِ تفنن یا دل بہلاوے کا ذریعہ سمجھنے کی کوتاہی نہیں کی بلکہ افسانے کو انسانی زندگی اور اُس سے جڑے حالات و واقعات نیز اقدار، روایات اور ثقافت اور تہذیبی عناصر پر مبنی ایک اہم اور کارآمد صنف کے طور پر پیش کیا ہے جس میں وہ کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

◄◄ ● ►►

حوالہ جات:

۱۔ پیش لفظ، ابابیلیں لوٹ آئیں گی (ص ۹)

۲۔ایضاً،(ص۱۰)
۳۔افسانہ،''مٹی''،مشمولہ ابابیلیں لوٹ آئیں گی (ص۸۰)
۴۔ایضاً،(ص۸۲)،۵۔پیش لفظ،ابابیلیں لوٹ آئیں گی،(ص۱۰)
۶۔فلیپ کور،ابابیلیں لوٹ آئیں گی
۷۔افسانہ''باپ''،مشمولہ ابابیلیں لوٹ آئیں گی،(ص۴۳)
۸۔ایضاً،(۴۵)۹۔ایضاً،(۴۷)
۱۰۔افسانہ''شیرنی،مشمولہ،ابابیلیں لوٹ آئیں گی،(ص۱۹۱)
۱۱۔افسانہ''مٹی''،ابابیلیں لوٹ آئیں گی (ص۷۵)
۱۲۔ فلیپ کور،ابابیلیں لوٹ آئیں گی
۱۳۔شعروحکمت،دسمبر۲۰۰۶ء(ص۳۵۶)،۱۴۔فلیپ کور،ابابیلیں لوٹ آئیں گی

ResaearcScholar,University of Hyderabad(Telengana)
8686810506,
ais@gmail.com

راجدیو کی امرائی

(ناول)

صادقہ نواب سحر

صفحات:۲۱۶ قیمت : ۲۵۰ اشاعت : ۲۰۱۹

مصنفہ کا پتہ

۳۰۱/صادقہ مینشن شاستری نگر،کھپولی،رائے گڈھ مہاراشٹرا (انڈیا)

- **مضمون**
- **محمد نعیم یاد**

کینوس کے رنگوں میں امر ہونے والی.....اَمرتا شیرِ گل

قدرت نے انسان میں بے پناہ جواہر سموئے ہیں جس میں جوہرِ تخلیق خاص ہے۔انسان کو اس عظیم تحفہ کی بدولت ہی فنونِ لطیفہ میں دِلچسپی پیدا ہوتی ہے۔فنونِ لطیفہ میں جہاں خطاطی،موسیقی،مجسمہ سازی اور فنِ تعمیرات کو اہمیت حاصل ہے وہیں فنونِ لطیفہ میں فنِ مصوری بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔رنگوں سے کھیلنے اور تصویروں کو زبان دینے کا نام ہی مصوری ہے،مصور اپنے قلم اور رنگوں کے ملاپ کے بعد حقیقی عکس کینوس پر ڈال دیتے ہیں۔سقراط نے کیا خوب کہا تھا:شاعری بولتی ہوئی مصوری ہے اور مصوری خاموش شاعری ہے۔

کہتے آئے ہیں کہ عظمت فن کار از محض ہنرمندی یا کسی ایک گوشہ فن میں دسترس سے وابستہ نہیں بلکہ اس کی اصل کُنجی تو وہ ذہنی اور جذباتی صفت ہے،وہ ذوق و وجدان ہے جو حسن و خوبی کے کسی ایک مظہر تک محدود نہیں،ان کے سبھی شواہد پر محیط ہے،یہی وہ شے ہے جسے اقبال خونِ جگر کا نام دیتے ہیں،معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود۔

تاریخ کے اعتبار سے مصوری نہایت ہی اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔ یہ نہ صرف ثقافتی،سماجی اور مذہبی حالات کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اس سے معاشی اتار چڑھاؤ کے اثرات کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اقوام کی تہذیب وتمدن پرکھنے میں بھی مصوری اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بڑے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مصوری ایک تصویری زبان بھی ہے جو ہر دور میں بولی جاتی رہی ہے۔زمانہ قدیم سے اب تک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اس کے مقاصد میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جیسے غاروں کے دور میں مصور جنگل میں جانوروں وغیرہ کی تصاویر کے ذریعہ اپنا مدعا بیان کرتا رہا ویسے آج کے دور میں بھی تحت الشعور کے خیالات کو فن پاروں میں عیاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ سوچ اور ٹیکنیک میں جو تبدیلی آئی ہے اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا۔مصور بھی زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئی راہیں تلاش کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ ہمارے مذہبی عقائد کی مضبوطی مصوروں کو اپنی طرف کھینچے رکھتی ہے۔شاید اسی لیے مسلمانوں نے خطاطی نقاشی اور آرائش میں تجریدیت کا پہلو ایجاد کیا۔ ہندوستان جو کثیر المذاہب اور مختلف تہذیب وتمدن کا گہوارا رہا ہے جس کی مثالیں تاریخی تعمیرات،تاج محل،لال قلعہ،شاہی قلعہ،قطب مینار اور مختلف مساجد و منادر و دیگر مقامات پر بکھرے ہوئے فن پاروں میں ہندوستان کی تہذیب عظیم فن کاروں کی عکاسی کرتی ہے۔اُنہیں

فن کاروں میں ایک اہم نام اَمرتا شیر گل کا ہے۔امرتا شیر گل، جسے انڈیا کی فریڈہ کاہلو کہا جا سکتا ہے وہ عظیم مصورہ ہیں جنھوں نے صرف اٹھائیس برس کی عمر پائی اور اس عمر میں فنِ مصوری میں رہتی دنیا تک اپنا نام لیے زندہ کر دیا۔امرتا شیر گل ہندوستان کے ممتاز مصوروں میں شامل ہیں جنھوں نے جدید آرٹ کی بنیاد رکھی جو مغرب اور مشرق کا حسین امتزاج ہے۔

امرتا شیر گل 30 جنوری 1913ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ان کے والد کا نام عمراؤ سنگھ شیر گل مجیتھیا تھا جو ایک سکھ اور حکمران اشرافیہ سے تعلق اور سنسکرت اور فارسی پر عبور رکھتے تھے۔امرتا کی والدہ، میری اینٹونیٹی گوٹسمن، ہنگری سے تعلق رکھنے والی ایک یہودی اوپیرا سنگر تھیں۔امرتا شیر گل نے پانچ برس کی عمر ہی میں رنگ اور برش سنبھال لیے تھے۔مصوری سے اس کے شغف کو دیکھتے ہوئے والدین نے انھیں اٹلی بھیجا تا کہ مائیکل اینجلو اور ڈاونچی کی سرزمیں کے اساتذہ سے استفادہ کر سکیں۔اَمرتا کا وہاں دل نہ لگا اُن کے تخیل میں ہندوستان رچا بسا تھا وہ وہاں سے واپس ہندوستان آئیں تو ان کے والدین نے اُنھیں پیرس بھیج دیا جہاں انھوں نے فائن آرٹس سکول میں داخلہ لے لیا۔وہاں انھوں نے تقریباً چھ برس جم کر کام کیا اور پیرس کے نامور مصوروں کی معیت میں کام کرنے کے نادر مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

فن کسی کی میراث نہیں۔ایک اچھا فن کار وہی ہوتا ہے جو اپنے اندر چھپی قدرتی صلاحیتوں سے کام لیتا ہے۔وہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہے۔وہ کسی پہ گزرتے ہوئے ہر اُس لمحے کو اپنے اوپر اُسی طرح طاری کرتا ہے جیسے اُسی پہ بیت رہا ہو چاہے اس کا تعلق درد سے ہو، کسی تکلیف سے ہو، دل ٹوٹنے سے ہو یا محبت کے کسی نرم گزار پہلو سے۔تب اس کا برش کینوس پہ وہ سارے رنگ بکھیرتا ہے جو وہ اپنے گردوپیش میں محسوس کرتا ہے۔امرتا نے بھی سیماب صفت ذہن پایا تھا جو قدرت کے اس عطا کردہ تحفے کو کینوس پر بکھیرنا چاہتی تھیں۔1933ء جب وہ ہندوستان آئی تھیں تب ان کی آنکھوں نے ہندوستان کی جو سیر کی پھر دِل کے آئینے پہ جو نقش کیا اور برش کے ذریعے جو کینوس پہ اُتارا، وہ ایسے حسین شاہکار کے طور پر سامنے آئے کہ جو دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتے تھے۔

مصوری میں ان کی توجہ اور دلچسپی کا مرکز غریب، نادار اور محروم طبقہ ہوتا تھا اور اپنی پینٹنگز میں انہوں نے ہندوستانی دیہاتیوں اور خواتین کی بھرپور عکاسی کی۔اگر امرتا کی بنائی کی تصاویر کو فنی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انہیں اپنے جذبات پر پورا قابو تھا، اسی لئے ان کی تصویروں میں توازن پایا جاتا ہے۔شاید اس لیے انھیں ہندوستان کی سب سے مہنگی مصورہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔اگر امرتا شیر گل کی ابتدائی مصوری نمونہ جات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں غیر ملکی اثر زیادہ پڑتا دکھائی دیتا ہے مگر ہندوستان آتے ہی ان کی مصوری کو جو رنگ ملتا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔اس حوالے سے وہ خود لکھتی ہیں

کہ جونہی میں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اس وقت سے میری تصویروں میں خیالات اور رجحانات بدل گئے۔ان میں فنی اور بنیادی حیثیت سے بھی ہندوستانی رنگ شامل ہو گیا۔اس وقت سے میرے دل میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا کہ میں اپنی تصویروں اور شاہکاروں کے ذریعہ ہندوستان کے غریب عوام کی ترجمانی کروں، ایسے عوام کی جو خاموش ہیں، صابر ہیں، جن کے جسم دھوپ کی شدت سے جھلس چکے ہیں جو زبان سے اف تک نہیں کرتے بلکہ جن کی آنکھیں ان کے دلوں کی ترجمان ہیں۔ایک جگہ امرتا یہ بھی کہتی ہیں:

> ''میں نے ہندوستانی کسانوں کی ترجمانی اس طرح کی ہے جس طرح تھائی تیاں میں گوگاں نے کی۔ایک اور جگہ یہ بیان کیا ہے: ہندوستان میں موسم سرما کا تصور اس طرح سے آتا ہے کہ بڑے بڑے میدان اداس اور خاموش دکھائی دیتے ہیں، جن میں دور تک پیلی پیلی چمکدار فصلیں کھڑی نظر آتی ہیں اور کسان جن کے میٹالے رنگ، اداس چہرے، دبلے پتلے جسم ہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔''

1934ء کو سمر ہل شملہ میں امرتا نے اپنا سٹوڈیو بنایا اور اپنے فن کو آگے بڑھایا۔کہا جاتا ہے 1935ء میں شملہ آرٹ سوسائٹی کی سالانہ نمائش میں امرتا شیر گل نے دس فن پارے بھیجے جن میں سے پانچ واپس کر دیئے گئے۔جس پہ امرتا کو غصہ آ گیا اور انھوں نے ادارہ کی طرف سے دیئے گئے مہاراجا فرید کوٹ انعام کو واپس کرتے ہوئے ایک تنقیدی خط بھی لکھا جس کو شملہ فائن آرٹ سوسائٹی نے آج تک سنبھالا ہوا ہے۔

1938ء ان کی شادی ہنگری سے تعلق رکھنے والے اپنے پہلے کزن ڈاکٹر وکٹر ایگن سے ہوئی اور بعد میں وہ بھارت منتقل ہو گئیں تا کہ وہاں اپنے آبائی گھر میں قیام کر سکیں جو بھارتی ریاست اتر پردیش کے شہر گورکھ پور کے علاقے سارایا میں ہے۔1941ء میں وہ اپنے خاوند کے ساتھ لاہور منتقل ہو گئیں جہاں انھوں نے لاہور کے مال روڈ (23 گنگا رام مینشن) میں رہائش اختیار کی۔امرتا شیر گل کے احباب میں بہت سے لوگ شامل تھے بہت سے دوست تھے جن سے محبت میں امرتا نے انھیں پورٹریٹ بنا کر دیئے۔خود امرتا نے اپنے تین چار پورٹریٹ بھی بنائے جن میں سے ایک میں کینوس پہ کام کر رہی ہیں، دوسری میں مسکراتی ہوئی بالوں میں کنگھا کر رہی ہیں۔ایک میں ان کی بہن بیٹھی ہیں۔

لاہور رہائش پذیر ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد 5 دسمبر 1941ء کو اس دنیا سے کوچ کر گئیں۔یوں 30 جنوری 1913ء کو طلوع ہونے والا فنِ مصوری کا یہ ستارہ 5 دسمبر 1941ء کو لاہور کے افق سے عدم کی بے کراں وادیوں کی جانب غروب ہو گیا۔ 23 گنگا رام مینشن لاہور آج بھی اس عظیم مصورہ کا گھر موجود ہے جو ہمیں ان کی یاد دِلاتا ہے۔بقول کے۔بی فراق:

امرتا !

تم سیزان کی مانند رنگوں کو پانی کی طرح
پتلا نہیں کرتی
ادھار لیتی ہو گوگیں کی تصویروں سے رپیلی اداسی
رسولن بائی کے گائن سی
کتھئی دھرتی پر اکثر
اداس چہرے رگم صم آنکھیں
بھٹکتی روحیں
ورق دل گیلا کرتی ہیں
کینوس پر رنگوں کے ہجے
چہروں میں تبدیل ہوتے ہیں
ابھی ابھی تو شروع ہوا تھا مکالمہ
رنگ اور برش کا
اور اچانک ختم ہوا
کینوس پر اب پھیل رہی ہے
پیلی اداسی کی اک نظم

◂◂ ● ▸▸

Dastan Manzil,Street No:6,Nasim
Colony,Joharabad,Dist:Khoshab(Pakistan)
+92.3137716609
naeemarts@gmail.com

- **مضمون**
- **اسماء شکیل**

سکوت سے گویائی تک.....اردو شاعرات کا سفر

تہذیب وتمدن کے ارتقا میں جہاں مردوں کا رول اہم ہے وہیں خواتین کا رول اس ضمن میں اہم ترین ہے۔نہ صرف تہذیب وتمدن بلکہ زبان وادب کی تشکیل اور ترسیل میں خواتین کا حصہ نا قابلِ فراموش ہے لیکن یہ بات قابلِ تعجب ہے کہ ہر زبان اور ہر ادب پر ہمیشہ مرد حضرات ہی حکمران نظر آتے ہیں۔اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں جو قدیم لوک ادب شامل ہے اس کے فروغ میں زیادہ تر حصہ داری خواتین کی رہی ہے۔گیت، بھجن، لوریاں، پہیلیاں، کہاوتیں، حکایات، شہزادے شہزادیوں کے قصے، مذہبی قصے کہانیاں، وغیرہ زیادہ تر خواتین ہی چھوٹے چھوٹے بچوں کو سنا کر الفاظ، محاورات، ضرب الامثال وغیرہ میں اضافہ کرتی گئیں اور یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا۔لوک گیت کے فروغ میں خواتین سے اہم کردار کوئی نبھا نہیں سکتا اس لیے کہ ان گیتوں میں عورتیں اپنے جذبات، احساسات، تجربات اور مشاہدات کو بڑے ہی دلکش انداز اور دلچسپ رنگ وآہنگ سے نواز کر گاتی تھیں۔ان گیتوں میں زیادہ تر مذہبی عقیدت مندی، پیار ومحبت، ہجر وصال، سماجی رسم ورواج، بادشاہوں کے قصص وغیرہ بیان کیے جاتے۔آگے چل کر یہی گیت، قصے، کہانیاں، حکایات وغیرہ تحریری ادب میں شامل ہو گئے لیکن المیہ یہ کہ عورتوں کے رول کو ابتدا سے ہی نظر انداز کیا گیا۔

اردو ادب کی تاریخ اور قدیم تذکروں کو زیرِ مطالع لایا جائے تو وہاں خواتین تخلیق کاروں کا ذکر قلیل ملتا ہے یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ذکر ناپید ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ پدرانہ سماج کا غلبہ ہے جس میں عورت کو مکمل طور پر پسِ پردہ رکھا گیا۔عورت کو تمام حقوق اور تعلیم سے نا آشنا رکھ کر ناقص العقل، کمزور، جذباتی، کم دماغ اور دوسرے درجے کی مخلوق قرار دیا گیا۔ان کے اظہارِ خیال پر پابندیاں عائد کی گئیں۔جن خواتین نے اظہارِ خیال کے لئے قلم اٹھانا چاہا انہیں کبسی، تتشاعر اور طوائف کہا گیا۔ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ وہ مرد کی خوشہ نشین اور پروردہ ہیں۔ان پابندیوں کے باوجود جن خواتین نے اس گھٹن زدہ ماحول میں اپنے کلام کو پیش کرنا چاہا، انہوں نے اپنے کلام کو کسی مرد کے نام کے ساتھ منسوب کیا یا مرد تخلیق کاروں کا اسلوب اختیار کرنے کے لئے مجبور ہوئیں جس سے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوا کہ یہ کلام مردوں کا ہے کہ خواتین کا۔یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی سب سے پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ''لطف النساء امتیاز'' کی شاعری کو طویل

عرصے تک مرد کی شاعری سمجھا جا رہا تھا۔ان کا اصل نام لطف النساء بیگم اور امتیاز تخلص تھا۔ان کا دیوان 1797 میں مرتب ہوا اور 2005 میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ان کے دیوان کا واحد قلمی نسخہ کتب خانہ حیدر آباد میں ہے ۔ان کے بارے میں جتنی بھی معلومات ملی ہیں ان کا ماخذ اس کی مثنوی ہے اس مثنوی کے علاوہ ان کے دیوان میں بے شمار قصائد،مخمسات،مسدسات،قطعات،رباعیات،مثمن،منقبت،فارسی غزل وقطعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔انھیں کم وبیش تمام اصناف پر عبور تھا۔ان کے دیوان سے چند اشعار ملاحظہ ہیں؛

ہے زیب آور تخت وہ تاجدار   سکندر مثال و سلیمان عصر
جس طرح میکشی چاہے سو کر لے امتیاز   ساقی مہوش کہاں اور یہ گلستان پھر کہاں
(امتیاز)

اسی طرح قدیم شاعرات میں اور ایک نام ہمارے سامنے آتا ہے جو کہ مہ لقا بائی ہے جن کا دیوان 1798 میں مرتب ہوا۔

7 اپریل 1768 کو ماہ لقا بائی اورنگ آباد میں پیدا ہوئیں ۔ان کی پرورش نام پلی حیدر آباد میں ہوئی۔وہ ایک گلوکارہ،طوائف،شاعرہ اور مصنفہ تھیں۔ان کا دیوان پہلی مرتبہ ''گلزار ماہ لقا بائی'' کے نام سے 1824 میں شائع ہوا۔ان کے دیوان میں 39 غزلیں اور 5 قطعات شامل ہیں۔ان کے کلام سے چند اشعار یوں ہیں؛

گر مرے دل کو چرایا نہیں تو نے ظالم   کھول دے بند ہتھیلی کو دکھا ہتھیلی کو
ہم جو شب کو نا گہاں اس شوخ کے پالے پڑے   دل تو جاتا ہی رہا اب جان کے لالے پڑے
(ماہ لقا بائی)

انیسویں صدی میں ہندوستانی سماج میں کئی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔انگریزی دور اقتدار نے ہندوستانی سماج و معاشرے میں کئی تبدیلیاں پیدا کی۔ نیا مشنری انتظام اور نئی تکنالوجی کے اختراع ہوتے ہی اس نئے نظام کو چلانے کے لئے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت پیش آئی۔جدید تعلیم کو فروغ ملا جس وجہ سے ہندوستانی معاشرے کی کئی فرسودہ روایات،رسم ورواج اور جاہلانہ افکار پر غور وفکر کیا جانے لگا۔تعلیم نسواں کو عام کرنے کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا۔خواتین کو تعلیم سے آشنا کرنے کا یہ شعور اعلیٰ طبقے میں فوراً پیدا ہوا جبکہ متوسط اور ادنیٰ طبقے میں یہ شعور پیدا ہونے میں طویل عرصہ گزر گیا۔کئی شاعرات سامنے تو آئیں لیکن ابھی بھی انھیں اپنی پہچان اور شناخت کو مخفی رکھنا پڑا۔اس کی بہترین مثال زاہدہ خاتون شروانیہ ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات کو '' ز خ ش '' کے نام سے پیش کیا ۔ زاہدہ خاتون شروانیہ 1894 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئیں ۔ان کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ غزلوں کا مجموعہ '' دیوان نزہت

الخیال'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔وہ نہ صرف ایک ادیب اور شاعرہ تھیں بلکہ ایک مصلح کی حیثیت سے اپنی خدمات سرانجام دے رہی تھیں۔ 12 فروری 1922 کو ان کا انتقال محض 27 سال کی عمر میں ہوا۔ز خ ش کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں؛

یوں تو ہر مغلوب تھا غالب کے ہاتھوں دردمند   سب سے بڑھ کر زخم خوردہ فرقۂ نسواں تھا
عورتوں کے حق میں ہر مذہب کا، ہر ملت کا مرد   جانور تھا ، دیو تھا ، عفریت تھا ، شیطان تھا
(ز خ ش)

ان اشعار میں احساسِ مظلومیت اور محکومیت دیکھنے کو ملتا ہے ۔

اس دور کی شاعرات میں ز خ ش کے علاوہ خفی، بیگم، امراؤ، اختر وغیرہ مشہور ہیں۔کئی شاعرات نے ہجر ووصال،عشق وعاشقی، بے وفائی، جبر واستحصال وغیرہ جیسے مضامین پر لکھنے کی سعی کی ہے ۔مختلف شاعرات کے کلام سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں؛

اتنا بھی کافی ہے تیری طرف سے ظالم   کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھا
(بیگم)

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں   ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں
(خفی)

گرچہ منظور نہ تھا خانہ نشینی میری   تو مجھے ساکن ویرانہ بنایا ہوتا
(امراؤ)

لکھ کر جو میرا نام زمین پر مٹا دیا   ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا
(اختر)

بیسویں صدی کی عورت میں خود اعتمادی اور خود شناسائی مکمل طور پر پیدا ہو چکی تھی۔تعلیم نسواں کی بنیادیں مستحکم ہوتی گئیں اور بڑی ہی تیز رفتاری کے ساتھ ایک خاتون اپنے وجود سے باخبر ہوئی۔نئی صدی کی عورت قدیم روایتی شاعری کو ترک کر کے نئے اسلوب اور نئے لب و لہجے کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی۔ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کر کے،سماجی پابندیوں،محکومیت اور مظلومیت کی زنجیروں کو توڑتے ہوئے یک عورت لب کشائی کرنے لگی۔اپنی ذات اور شخصیت کی بازیافت کرتی ہوئی بے شمار خواتین نے اردو شاعری میں اپنے منفرد فن اور متنوع مضامین کے ساتھ ایک الگ شناخت قائم کی ۔ان ہی شاعرات میں ادا جعفری اردو ادب کی ایسی پہلی شاعرہ ہے جس نے مکمل طور پر اپنی شخصیت کا اظہار کیا اور نسائی وجود کے ساتھ زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے احساسات اور جذبات کا برملا اظہار کیا۔اس باہمت اور باشعور شاعرہ نے باقی

شاعرت میں ہمت وحوصلہ پیدا کیا اوران کے لئے نئی راہیں ہموار کیں۔یوں کئی شاعرات اس قافلے میں جڑتی گئیں اوراپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کرنے کی پرزور کوشش کی کہ ایک خاتون اپنے آپ میں ایک اعلیٰ وجود کی حامل ہے۔ان شاعرات کی فہرست طویل ہے جن میں سے چند مشہور شاعرات کے نام یوں ہیں؛۔سعیدہ جہاں مخفی، رفیعہ بانو مضمر، یاسمین حمید، عشرت آفرین، کشور ناہید، عذرا پروین، زاہدہ زیدی، بلقیس ظفر الحسن، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، شہناز نبی، ترنّم ریاض، صدیقہ شبنم، شفیق فاطمہ شعریٰ، شبنم عشائی، سیّدہ نسرین نقاش، رخسانہ جبین۔خود آگہی اور خود شناسائی کے بارے میں یوں فرماتی نظر آتی ہیں؛

تفرقے یہ آپس کے مٹا ڈالیں ہم آؤ اب جرأت نسواں کو نمایاں کر دیں
(سعیدہ جہاں مخفی)

سماجی بندشوں اور پابندیوں کے بارے میں ان کے خیالات یوں ہیں؛

پردہ آنکھوں سے ہٹانے میں بہت دیر لگی ہمیں دنیا نظر آنے میں بہت دیر لگی
(یاسمین حمید)

نسوانی جذبات کو کھول کے یوں بیان کیا جارہا ہے؛

آ دیکھ کہ میرے آنسوؤں میں یہ کس کا جمال آگیا ہے
(اداجعفری)

طنزیہ لب ولہجہ یوں اختیار کیا گیا ہے؛

یہ ہم گنہگار عورتیں ہیں کہ سچ کا پرچم اٹھا کے نکلیں تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں
ہر ایک دہلیز پہ سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملے ہیں
(کشور ناہید)

ظلم وستم کے خلاف یوں اظہارِ خیال کرتی نظر آتی ہے؛

ظلم سہنا بھی تو ظلم کی حمایت ٹھہر خامشی بھی تو ہوئی پشت پناہی کی طرح
(پروین شاکر)

یوں کہا جاسکتا ہے کہ آج کی خاتون ایک با اعتماد وجود لئے ہوئے گمنامی کے اندھیروں کو خود شناسائی سے بدل کر زندگی کے ہر شعبے میں اپنے حقوق منوارہی ہے۔سکوت سے گویائی کی طرف کا یہ سفر مشکل سہی لیکن ایک نئی امید اور روشن صبح لئے ہوئے تمام خواتین کی فلاح وبہبودی کی ایک واضح مثال ہے۔

◂◂ ● ▸▸

Research Scholar ,University of Hyderabad(India)
6005020717asmashakeel762@gmail.com

- مضمون
- فرزانہ

بیدی کے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات

راجندر سنگھ بیدی نے جب افسانوں کی تخلیق کے لئے قلم اٹھایا تو اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ بیدی ترقی پسند تحریک سے وابستہ ضرور تھے لیکن صرف اس حد تک ترقی پسند تھے کہ اپنے ارد گرد کے ماحول کی مصوری اور مرقع کشی کر دیں۔ دیگر ادباء کی طرح انہوں نے بھی انسان کی معاشی و اقتصادی مجبوریاں، تقسیم ہند، فسادات، بھوک، افلاس، نسلی امتیازات اور ایسے ہی دوسرے مسائل کو پنپتے دیکھا اور ان موضوعات کو ایک مخصوص ڈھنگ سے اپنے افسانوں میں سمویا اور اس طرح ادب کی دنیا میں زندہ رہنے کے لئے اپنی الگ پہچان قائم کی۔

اردو ادب میں اپنی خاص پہچان بنانے والے راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں نمایاں کردار بچے، بوڑھے اور عورتیں ہیں۔وہ اپنے ہر کردار کو کسی خاص مقصد سے پیش کرتے ہیں۔ان کے ہر کردار اور ہر واقع کے پس منظر میں کوئی نفسیاتی یا جذباتی عنصر کارفرما ہوتا ہے جن کی وجہ سے وہ کردار حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ بیدی کے یہاں نفسیاتی کشمکش کے بہترین نمونے ملتے ہیں جن کا مرکز عورت ہوتی ہے۔عورتوں کی نفسیات کو سمجھنا اور انہیں اپنے افسانوں میں پیش کرنا یہ وہی شخص کرسکتا ہے جس کے پاس ایک دردمند دل ہو، اور جس نے کڑی محنت اور کڑی ریاضت کے بعد مشاہدے کی دروں بینی پر قدرت حاصل کی ہو۔حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی تمام رونق رنگ و بو اور چہل پہل کا بڑی حد تک انحصار عورت پر ہے۔ ماں، بیوی، بیٹی، بہن اور محبوبہ کے روپ میں عورت کے ایسے ان گنت جلوے ہیں جن سے زندگی کی ہماہمی عبارت ہے۔ بیدی نے آس پاس کے ماحول کا گہرا مطالعہ کیا اور ان ہی مشاہدات کو افسانوں کی شکل میں پیش کیا۔

ڈاکٹر نگہت ریحانہ خان اپنی کتاب ''اردو مختصر افسانہ: فنی وتحقیقی مطالعہ'' میں کرشن چندر کا حوالہ دے کر بیدی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> ''.....اکثر اوقات اپنے افسانوں میں جذباتی واردات اور نفسیاتی جذبات کی تعبیر اس نستعلیق انداز میں کرتے ہیں کہ افسانے پر تاج محل کی مرمریں جالی کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔انسانی شعور کے غواص ہیں اور اپنے کرداروں کی تعمیر

میں اس صلاحیت سے بدرجہ اتم کام لیتے ہیں''۔[۱]

بیدی کے تین مجموعوں خاص طور پر ''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' اور ''دانہ و دام'' کی زیادہ تر کہانیوں کے کردار نسوانی ہیں۔ مجموعہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں لاجونتی، جوگیا، ببل، لمبی لڑکی، اپنے دکھ مجھے دے دو، ٹرمنس سے پرے اور دیوالہ۔ ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' میں کلیانی، متھن، باری کا بخار۔ ''دانہ و دام'' میں گرم کوٹ، من کی من میں، چھوکری کی لوٹ، وغیرہ جیسے افسانے بھی نسوانی کرداروں کے اردگرد ہی گھومتے ہیں۔ ان کہانیوں میں بیدی نے عورت کی فطرت، جذبات اور احساسات اور سماج میں اس کے مقام اور اس کی نفسیاتی الجھنوں کو فنکارانہ روپ میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر فردوس قاضی بیدی کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بیدی کے افسانوں میں انسان کی مختلف حیثیتوں میں نفسیاتی کیفیت کی اچھی مصوری ملتی ہے۔ خصوصیت سے عورت کی نفسیاتی کیفیت، اس پر معاشرتی جبر، جنسی جبر اور معاشی جبر کیا ثرات کی بہترین نمائندگی بیدی کے افسانوں میں موجود ہے۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' عورت کی نفسیاتی کشمکش، جذبات اور احساسات اس کے ضبط حوصلہ، مستقل مزاجی اور محبت کی گہرائی کی انتہائی کامیاب عکاسی ہے۔''[۲]

''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں بیدی نے اندو کا کردار خون جگر کی آمیزش سے تراشا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی بیوی کے کردار کی پیکر تراشی کرتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کی وہ تمام تمدنی اور مذہبی روایات کو روشن کر دیتے ہیں جن سے بیوی کا کردار وابستہ ہے، ہمارے افسانوی ادب میں اندو ایک شہکار کردار ہے۔ شادی کی پہلی رات اندو کا وہ فقرہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' مدن کو پہلے پہل محض ایک رٹا رٹایا ہوا فقرہ محسوس ہوتا ہے لیکن زندگی کے شب و روز نے اس حقیقت کا احساس اسے شدت سے دلایا کہ اندو نے واقعی اس کے تمام دکھ سمیٹ لئے تھے۔ بابو جی کا خیال اور گھر کی دیگر ذمداریوں کو اندو نے بخوبی انجام دیا تھا۔ اندو خوب سیرت ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی تھی۔

''اڑوس پڑوس کی ساری عورتوں نے بابو جی کی بہو کی خوبصورتی کی داستانیں دور دور تک پہنچادی تھیں۔ جب کوئی عورت بابو جی کے سامنے بہو کے پیارے پن اور سڈول جسم کی باتیں کرتی تو وہ خوشی سے پھول جاتے اور کہتے .....ہم تو دھنیہ ہوگئے'' (افسانہ اپنے دکھ مجھے دے دو)

''اپنے دکھ مجھے دے دو'' میں ایک عورت کے کردار کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ ایک عورت اپنے شوہر کو حاصل کرنے کے لئے تمام تر حربہ استعمال کرتی ہے۔ بیدی کے اس افسانے پر باقر

مہدی نے اپنا اظہار خیال کچھ اس طرح کیا ہے۔

''عورت اپنا سب کچھ دے کر خالی ہاتھ ہو جاتی ہے۔ سب کا غم اپنا کر اپنا غم کسے دے؟ یہ کہانی ایک ایسا المیہ ہے جو زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں رونما ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور اس کے غم کی تھاہ نہیں ہے۔ بیدی کے فن کی جلوہ گری اس کہانی میں نمایاں ہے۔ اس کی مانوس گھریلو فضا، اس کے معمولی لوگ ان کے غم اور خوشی اور ایک ایسا ڈرامائی موڑ جب بیوی اپنے آپ کو طوائف کی طرح سجاتی ہے تا کہ پھر سے وہ شوہر کو پالے۔ اس کہانی کی سچائی افسانوی ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے زیادہ سچی معلوم ہوتی ہے۔ یہی اس کہانی کے شدید تاثر کا راز ہے۔ اس میں بیدی کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس میں صرف ایک عورت کا غم ہی نہیں بلکہ زندگی کی اس ابدی محرومی کا اظہار ہے جو جیتے جی آدمی کا ساتھ نہیں چھوڑتی ہے''۔[۳]

افسانہ ببل کی ہیروئن سیتا درباری لال سے بہت زیادہ محبت کرتی ہے لیکن شادی سے قبل جسمانی تعلق قائم کرنے پر وہ کسی طرح سے راضی نہیں ہوتی۔ وہ درباری لال سے شادی کرنے کے لئے زور ڈالتے ہوئے کہتی ہے کہ:

''میں تمہاری ہوں۔ نس نس پور پور تمہاری ہوں پر میں ایک بدھوا ماں کی بیٹی ہوں۔ مجھ سے شادی کر لو پھر.....'' (افسانہ: ببل)

سیتا کا کردار ہندوستانی معاشرے میں عورت کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ سیتا کے کردار میں بے کسی بھی ہے اور لاچاری بھی ہے، چونکہ اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا ہے اور اسے اس بات کا احساس ہے کہ اس کی ماں بیوہ ہے اور ایک بیوہ کی بچی کو ہمارے معاشرے میں کن حالات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس بات سے بیدی بخوبی واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے سیتا کے کردار کو اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ جذبہ محبت انسانی سرشت میں داخل ہے۔ اس لئے سیتا کے کردار کو محبت بھی عزیز ہے اور محبوب بھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اسے اپنی حدود کا بھی اندازہ ہے۔ ''مجھ سے شادی کر لو پھر.....'' اس جملے میں کہانی کی روح چھپی ہوئی ہے اور یہ جملہ سیتا کے کردار کی وضاحت بھی کرتا ہے۔

بیدی کے تمام نسوانی کرداروں کی ایک مشترکہ خصوصیت ان کا جنسی اعتبار سے قوی ہونا ہے۔ بیدی نے جہاں ایک طرف ان کرداروں میں محبت اور قربانی کے جذبات نمایاں کئے ہیں تو وہیں دوسری طرف اس نکتے کو بھی واضح کیا ہے کہ ان کرداروں کے جنسی جذبات اور خواہشات فطری اور حقیقی ہے۔ نسوانی کرداروں میں جنس کی دلچسپی کا نکتہ ''لاجونتی'' میں بڑی شدت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ جب لاجونتی

کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے شوہر نے اس کو گوشت پوشت کی عورت کے روپ میں نہیں بلکہ ایک دیوی کے طور پر قبول کیا ہے تو اس کی ذہنی کیفیت کیسی ہوتی ہے اس کو بیدی نے اس افسانے میں بڑی خوبصورتی سے ابھارا ہے:

''اور لاجونتی کی من کی من میں رہی...... جب بہت سے دن بیت گئے تو
خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی......لاجونتی آئینے میں اپنے سراپا کی طرف
دیکھتی اور آخر اس نتیجہ پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجونتی نہیں ہو
سکتی......وہ بس گئی......پھر اجڑ گئی۔'' (افسانہ: لاجونتی)

اس افسانے میں بیدی نے لاجونتی کی نفسیات، مجروح احساسات اور بے بسی کو پیش کیا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں عورت اپنے آپ کو تب تک ادھورا سمجھتی ہے جب تک کہ اس کا شوہر اس کے ساتھ روحانی اور جسمانی طور پر راضی نہ رہے۔ ایک عورت اپنے شوہر کو مجازی خدا تصور کرتی ہے۔ لاجونتی جب پاکستان سے لوٹ کر آتی ہے اور سندر لال کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ وہ وہاں کسی دوسرے مرد کے ساتھ کچھ دن گزار کر آئی تھی تو وہ اسے ذہنی طور پر بیوی قبول نہیں کر پاتا بلکہ اسے ایک دیوی کا درجہ دیتا ہے۔ لاجونتی سندر لال کے اندر محبت کی اسی شدت کی خواہش رکھتی ہے جو تقسیم سے قبل اس کے اندر تھی اور جب وہ لاجونتی کو حاصل نہیں ہو پاتی تو اسے ایسا لگتا ہے جیسے سندر لال کے پاس آ کر وہ بس گئی لیکن بس کر بھی اجڑ گئی۔ بیدی نے اس افسانے کے ذریعے انسانی تاریخ کے تمام صفحات کھول کر رکھے ہیں جو حقیقت کے بالکل قریب نظر آتے ہیں۔

یوں تو فسادات پر کئی کہانیاں لکھی گئی ہیں، لیکن بیدی کی یہ کہانی ان سب سے الگ اور ایک گہرا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ جذباتیت سے بچ کر اور نعرہ بازی سے ہٹ کر اس موضوع کو ایک فنکارانہ ذہن میں ڈالنا بے حد مشکل تھا، لیکن بیدی اس فن کی ہنرمندی میں کامیاب ہو گئے، اسی وجہ سے یہ اردو کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

بیدی نے بیوی کے علاوہ ماں کے روپ میں بھی عورت کو پیش کیا ہے۔ عورت کی فطرت میں شامل ایثار و محبت کے گہرے جذبات کی نقش گری کرتے ہوئے اپنی کہانیوں میں ماں کے روپ کو بھی پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:

''کہتی ہے سوئے کا سویا رہ جائے تو......'' وہ بے وقوف کیا جانے کہ
جب ماں یہ کہتی ہے کہ سوئے کا سویا رہ جائے تو اس وقت وہ اسے ہمیشہ بچانے کے
لئے طوفان، باد و باراں میں تن تنہا بے یار و مددگار اپنی جان تک لڑا دیتی
ہے''۔ (افسانہ: بھولا)

بیدی نے عورت کے محبوبہ، بیوی اور ماں کے کرداروں کے علاوہ بیوہ کے ذاتی مسائل اور بیوہ کی سماجی حیثیت اور ان پر عائد پابندیوں کو بھی افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ''دانہ و دام'' مجموعہ میں شامل افسانہ ''بھولا'' میں مایا کا کردار ایک بیوہ کا ہے جو کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کرتی ہے۔ بیدی نے بیوہ کی زندگی کو اس افسانے میں اس طرح پیش کیا ہے:

''مایا بیوہ تھی اور سماج اسے اچھے کپڑے پہننے اور خوشی کی بات میں حصہ
لینے سے بھی روکتا تھا۔ اس نے اپنے تمام کپڑے اور زیورات کی پٹاری ایک
صندوق میں مقفل کر کے چابی ایک جوہر میں پھینک دی تھی''۔ (افسانہ: بھولا)

مذکورہ بالا اقتباس میں بیدی نے حقیقت نگاری کے ساتھ بیوی کی سماجی حیثیت کو دکھایا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں ایک بیوہ کو خوشی کے موقعہ پر بھی نئے کپڑے، گہنے پہننے کا سماجی حق حاصل نہیں وہ اپنی خواہشات کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

ڈاکٹر کہکشاں پروین اپنی تحریر کردہ تصنیف ''منٹو اور بیدی تقابلی مطالعہ'' میں خلیل الرحمان اعظمی کا حوالہ دے کر بیدی کی فنکارانہ صلاحیت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''بیدی کے یہاں کرداروں کی نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ
اور ان کی حقیقت نگاری میں بے لاگ خارجیت ملتی ہے وہ کسی مقصدی
وجہ سے انسانی کمزوریوں اور مجبوریوں پر پردہ نہیں ڈالتے بلکہ ان کی
تصویر دکھا کر سماج کے تضادوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔''

اپنے تمام تر افسانوں کی نسوانی کرداروں کی نفسیات کو بے نقاب کرنے کے ساتھ ہی ساتھ بیدی نے سماج میں عورت کے مقام، ان کے ساتھ ہونے والے سلوک اور ان کے مسائل کی نقاب کشائی کی ہے۔ اپنی کہانیوں کے ذریعے بیدی عورت کی مظلومیت کے خلاف نہ سستی جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں نہ احتجاج کے طور پر نہ نعرے بلند کرتے ہوئے ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے ہمارے ذہن میں عورت پر ہونے والے مظالم اور ان کے مخصوص سماجی و معاشرتی مسائل کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

بیدی کے افسانوں میں عورت اپنے مکمل وجود میں نظر آتی ہے۔ جو اپنے اندر محبت، سچائی اور رومان رکھے ہوئی ہیں۔ ان کے افسانوں کی ہر عورت مرد کے لئے زندہ رہتی ہے خواہ یہ مرد محبوب کی شکل میں ہو یا باپ، بھائی، بیٹا کسی بھی صورت میں کیونکہ خلوص، محبت اور ایثار کا دوسرا نام ہی عورت ہے۔ حقیقی معنوں میں جن تخلیق کاروں نے عورت کو ایک وقار قائم کیا ان میں بیدی سرفہرست ہیں۔ انہوں نے پدرانہ نظام کا

احترام بھی کیا ہے لیکن کہیں کہیں اختلاف بھی۔ بیدی نے عورت کی دکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھا ہے اور اسے یقین دلایا ہے کہ عورت سماج کی زینت ہے۔

◄◄ ● ►►

حوالہ جات

۱: ڈاکٹر ریحانہ خان، اردو مختصر افسانہ: فنی و تحقیقی مطالعہ، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۱۹۸۴) ص ۱۰۹

۲: ڈاکٹر فردوس انور قاضی، اردو افسانہ نگاری کے رجحانات، (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۰) ص ۳۳۹

۳: گوپی چند نارنگ، اردو افسانہ روایت اور مسائل (راجندر سنگھ بیدی، بھولا سے ببل تک) از باقر مہدی (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۰) ص ۴۰۰

۴: ڈاکٹر کہکشاں پروین، منٹو اور بیدی تقابلی مطالعہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۲) ص ۶۶

R/o Tral-i-payeen
Tehsil-Tral
Dist-Pulwama
Kashmir-192123
cell no; 8899728160

● مضمون

● عرفان رشید

ترنم ریاض......ایک حقیقت پسند افسانہ نگار

ترنم ریاض جموں وکشمیر کی واحد فکشن نگار خاتون ہیں جنھوں نے اپنے فن کی بنا پر بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان قائم کی ہے۔ برقی میڈیا سے وابستہ ہونے کے باوجود انہوں نے اردو ادب کو خاص طور پر فکشن کو اپنی نگارشات کی بدولت ایک جہت عطا کی ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقی کائنات سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور جلد ہی اردو کے ممتاز افسانہ اور ناول نگاروں میں اپنا نام شامل کیا۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز روزنامہ ''آفتاب'' سے کیا ہے۔ اب تک ان کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''یہ تنگ زمین''، ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی''، ''یمبر زل''، اور آخری مجموعہ ''میرا رخت سفر'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔

ترنم ریاض کا کینوس اس موضوع کے لحاظ سے کشمیر کے باقی قلمکاروں سے قدرے مختلف ہیں۔ انہوں نے یہاں کے مقامی موضوعات کے ساتھ ساتھ برصغیر میں آئے روز حالات و واقعات کو اپنے افسانوں کی زینت بنانے کی عمیق کوشش کی ہے۔ ان کی افسانوی کائنات میں موضوعاتی تنوع ہے۔ ان کے یہاں ہر قسم کے جذبات و احساسات، مشاہدات و تجربات کی عکاسی نہایت ہی نازک انداز سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کا افسانوی ڈکشن امتزاجی مزاج رکھتا ہے، جس میں رومانی فضا کے ساتھ ساتھ دکھ اور غم کی داستان بھی ملتی ہے ۔عورتوں کے مسائل کی عکاسی کرنا ان کی افسانہ نگاری کا خاصا ہے۔ عورتوں پر ہو رہے ظلم و جبر، ازدواجی زندگی میں عورتوں کی حد سے زیادہ قربانیاں اس نوعیت کے نازک مسائل کی طرف موصوفہ نے توجہ دی ہے۔ ''بلبل'' اسی نوعیت کی ایک بہترین کہانی ہے۔

موجودہ سماج میں خونی رشتوں کے درمیان خونی لکیریں کھینچی گئی ہیں صحت مند سماج کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ یہاں تک کہ بیٹیاں اپنے باپ کی حفاظت میں محفوظ نہیں۔ اسی صورت حال کا تذکرہ ترنم ریاض کے افسانہ ''باپ'' میں ملتا ہے۔ باپ جو بہت ڈراونا ہے اور جسے ہر وقت شراب کی دھن سوار رہتی ہے۔ ازدواجی زندگی کی جو مٹھاس ہوتی ہے اسے کوسوں دور رہنے کا عادی ہو گیا ہے۔ یہی خلش اور تناو جب شہوانیت کا روپ دھار لیتا ہے تو اسے اپنی بیوی کے بجائے اپنی بیٹوں کے جسم سے چھیڑ چھاڑ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ اسی پردانہ سماج کی عکاسی موصوفہ نے مندرجہ ذیل اقتباس سے یوں کھینچی ہے :

''ناظمہ...... جب وہ اٹھنے لگی تو باپ نے اس کے شانے کے پیچھے ایک بھاری سی تھپکی دی اوراس کی پوری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا کر اس کے کندے کو انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان زور سے پکڑ کر آواز دھیمی کر کے بولا'' آج ہری مرچ نہیں ہے کیا ؟'' ناظمہ نے بات کرتے ہوئے کندھا آہستہ سے چھڑا دیا اور اندر جانے لگی۔ باپ کی نگاہیں کبھی کبھی شائستہ کے ننھے سے بدن کا طواف کر کے اس کے بھرے بھرے رخساروں پر ٹھہر جاتیں۔ وہ منہ بھر بھر اس کے گالوں کے کئی کئی بوسے بھی لے لیتا۔''

(حوالہ: مجموعہ: ابابیلیں لوٹ آئیں گی، افسانہ، باپ، ص ۴۸)

افسانے کا کردار باپ کی صورت میں اپنی بیٹیوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے۔ اقتباس سے ساری صورت حال واضح ہو جاتی ہے۔ اصل میں افسانہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس سماج کو ہم مہذب (Cultured) کہتے ہیں۔ حقیقت میں وہ کتنا غیر مہذب (Uncultured) ہو گیا ہے۔ جسے یہ تمیز بھی ختم ہو گئی ہے کہ بیوی اور بیٹی میں کیا فرق ہے۔ عصر حاضر میں ہمارے سماج کا منظر نامہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اسی کی عکاسی مندرجہ بالا افسانے کے حوالے سے پیش کی گئی ہے اور ساتھ ہی افسانہ نگار نے ان افراد پر بھی طنز کیا ہے جو اس سماج میں باپ ہونے کا ڈھونگ رچتے ہیں۔

''شہر'' ان کا مشہور افسانہ ہے، جس کے متعلق مصنفہ کی رائے ہے کہ'' لکھنے کے بعد میں اس افسانے کو پڑھنے کی جرات نہ کر سکی''۔ یہ افسانہ ایک عجیب فضا پیش کرتا ہے۔ ایک دلدوز کہانی ہے جس میں ایک نوجوان اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ شہر کی رونق اور بچوں کے مستقبل کے پیشِ نظر گاؤں سے اپنا تبادلہ شہر میں کراتا ہے اور ۱۴ منزلہ عمارت کی آخری منزل میں فلیٹ لیتا ہے۔ کمپنی کے کام کے حوالے سے ادنان (کردار) کو ایک بار باہر جانا پڑتا ہے۔ اس کی بیوی 'بابرا' اچانک فلیٹ میں مر جاتی ہے اور ننھے بچے سمجھتے ہیں کہ ماں گہری نیند میں سوئی ہوئی ہے۔ ادنان دو دن کے بجائے چار دن میں بھی واپس نہیں آجاتا ہے۔ اس طرح سے چھوٹے بچوں کے سامنے ان کی ماں ان سے دور چلی جاتی ہیں اور ان کی مایوس سسکیاں اور ہچکیاں شہر کی بیڑ اور اس ۱۴ منزلہ عمات میں دھب کر رہ جاتی ہیں۔

اصل میں ترنم ریاض نے ایک طرف سے شہر اور گاؤں کا موازنہ کیا ہے تو دوسری طرف اقدار کی پامالی کا رونا رویا ہے۔ انہوں نے metro politian cities کے فلیٹ سسٹم پر طنز کیا ہے کہ کس طرح سے ایک انسان ایک دوسرے سے الگ رہنا پسند کرتا ہے۔ جب 'بابرا' کی لاش کئی روز پڑی رہتی ہے اور فلیٹ میں عجیب بدبو اور 'بابرا' کی شکل تبدیل ہو کر بچے ڈر جاتے اور یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ ہماری ماں کی شکل نہیں ہے۔ بچے بھوک اور ماں ماں کر کے جب نڈھال ہو جاتے ہیں تو خوف زدہ ہو کر بچے فلیٹ کی بند

کھڑکیوں سے آواز لگانے کی کوشش میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ تب جا کے قاری کو احساس ہو جاتا ہے کہ گاؤں کا بوسیدہ مکان فلیٹ سسٹم سے کئی زیادہ پرسکون ہے جس میں ہمسایہ اور رشتوں کی قدر اب بھی باقی ہے۔ ملاحظہ کیجئے ایک اقتباس:

''صبح پھر دروازے کی کال بیل لگاتار بجی تو وہی بیدار ہوا دروازے تک گیا اور بے چارگی سے اسے دیکھتا رہا۔ کچھ منٹ بعد لوٹ آیا...... گھر میں ہوتا تو کھڑکی سے نانی کو آواز لگاتا۔ یہاں تو نہ دروازہ کھول سکتا تھا نہ کھڑکی، کھول بھی لیتا تو اس کی آواز کون سن پاتا کہ کھڑکی سے نظر آنے والے لوگ اس کی آواز کی رسائی سے بہت دور تھے۔'' (افسانہ: شہر)

ترنم ریاض نے دلی، ممبی اور کشمیر کے امتزاجی کلچر کی نمائندہ تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ ان کا اسلوب اور ڈکشن انہیں کشمیر کے معاصر افسانہ نگاروں سے الگ کرتا ہے۔ زبان و بیان اور افسانے کی شعریات پر انہیں گہری دسترس حاصل ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی حمایت کرتے ہوئے وارث علوی یوں رقمطراز ہیں:

''ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھ کر مجھے پہلا احساس یہی ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی صلاحیت کی افسانہ نگار ہیں لیکن کوئی نقاد ان کی یہ شاخت قائم کرتا نظر نہیں آتا۔ یعنی ایسا لگتا ہے کہ نقاد کے دل میں ایک خوف سا ہے کہ اگر انہوں نے اس خاتون کو دوسروں سے الگ کیا یا بہتر بتایا تو دوسرے ناراض ہو جائیں گے۔''[۱]

کشمیر کے متعلق ان کا بہترین افسانہ ''یمبر زل'' افسانوی مجموعہ ''میرا رخت سفر'' ۲۰۰۸ء میں شامل ہیں۔ حالانکہ افسانہ کافی طویل ہے لیکن انہوں نے اسے ایک بہترین ڈکشن اور اسلوب کے تحت بوریت سے بچائے رکھا اور قاری کے تسلسل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جو اس افسانے کی عمدہ خصوصیت ہے۔ افسانہ ۳۴ صفحات پر مشتمل ہیں۔ نکی باجی، یوسف اور یاور اس افسانے کے بنیادی کردار یعنی Main Character کے طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ افسانے کا موضوع ''یمبر زل'' اپنے آپ میں ایک علامت ایک استعارہ ہے۔ لفظ یمبر زل اصل میں کشمیری لفظ ہے جسے اردو میں ''نرگس'' کے مترادف ٹھہراتے ہیں۔ ''نرگس'' قبرستان کی زینت ہے، جسے مرنے والے کی روح کو آرام پہنچتا ہے۔ یہاں پر ''نرگس'' کے معنی کثیر المعنویت میں لیا جا سکتا ہے۔ ''نرگس'' خوشی اور غم کی علامت ہے، ''نرگس'' معصوموں کا استعارہ ہے، ''نرگس'' ماتم اور موت کی علامت ہے یعنی یہاں پر ہم اسے کسی مخصوص معنی یا مفہوم میں قید نہیں کر سکتے ہیں۔

''یمبر زل'' افسانے کا محو و مرکز کشمیر ہے۔ یہاں کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات و واقعات کا برملا اظہار پہلی ہی قراءت میں قاری کو محسوس ہو جاتی ہے۔ بظاہر کہانی تین بچوں یعنی ان کے اسکول

زندگی کے اردگرد رقصاں ہیں لیکن اس کے پس منظر میں ایک تاریخ رقم کی گئی ہیں۔ترنم ریاض نے کشمیر کے دورِ عطیق کے سیاسی پس منظر کو نہایت ہی عمیق انداز میں پیش کیا ہے۔افسانے کی قرات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنفہ کو کشمیر ہسٹری پر ایک گہری نظر ہے۔انہوں نے یہاں کے سیاسی ادوار کو اس واضح اور پر کیف پیرائے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ قاری کے سامنے کشمیر پولیٹکس کا نقشہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے:

"اس خطے کے ساتھ سولہویں صدی سے ہی یہ سلسلہ ہوگیا تھا۔چندر گپت موریہ اور پھر اشوک کے مہان ہندوستان کو افغانستان اور نیپال کی آخری سرحدوں تک وسیع کرنے والی عظیم الشان سلطنتِ مغلیہ کے شہنشاہوں نے بھی ایسا ہی کیا، جس شاعرہ معروف ومقبول اور ہر دل عزیز ملکۂ کشمیر زُون، یعنی چودھویں کا چاند ملقب حبہ خاتون کے شوہر بادشاہ یوسف شاہِ چک کو اکبر اعظم نے دھوکے سے قید کرلیا تھا۔شاہ غریب الوطنی میں اپنی ملکہ سے دور انتقال کر گیا۔وطن کی مٹی بھی اسے نصیب نہیں ہوئی۔اور ملکہ روتے روتے دیوانی ہوگئی۔پھر افغان سے افغان آئے۔کشمیری محکوم ہی رہے......صدیوں سے۔اب کہیں آدھی صدی بھر پہلے جمہوریت آئی تو کچھ سکون کے بعد پھر یہ بے سکون شب وروز۔کیوں۔کیوں ہورہا ہے یہ سب......کیوں؟"ص ۲۶۶۔۲۶۷

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ مصنفہ نے کس طرح سے بلیغ انداز میں کشمیر کے سیاسی ادوار کی عکاسی کی ہے، کس طرح سے مختلف ممالک سے آئے ہوئے حکمرانوں نے یہاں کی معصوم اور مظلوم قوم کا استحصال کیا اور عصر حاضر میں بھی قوم پر ظلم کیا جارہا ہے اور یہ بیچاری قوم اف تک بھی نہیں کرپا رہی ہے۔یعنی روایت میں جس نوعیت کی سیاست یہاں جلوہ گر تھیں آج تک اسی کی بازگشت ہورہی ہے یعنی صرف چنگیز بدل گئے قوائد وہی ہیں۔

افسانے میں افسانہ نگار نے یہاں کے موجودہ منظر نامے کو پیش کیا ہے حالانکہ کہیں کہیں انہوں نے اس حسین وادی کے آبشاروں، لالہ زاروں، ندی نالوں، پہاڑوں، عمارتوں، یہاں کے کلچر سے وابستہ نادر چیزوں کو ایک نئے اور دلکش پیرائے اظہار کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن عصر حاضر کی بدلتی رخ کا منظر نامہ غالب موضوع بن جاتا ہے۔حالانکہ قاری پہلے صفحات پڑھنے کے بعد ایک الگ موضوع کی سیر کو نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن تھوڑی دیر بعد اس کا ذہن نئے معنی اخذ کرنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے۔یہ بھی اس افسانے کی کامیابی کی پہچان ہے۔یہاں کے تعلیمی نظام پر بھی اس افسانے میں طنز کے تیر برسائے گئے ہیں کہ کس طرح سے یہاں کا نظام درہم برہم ہوچکا ہے جس میں سب سے زیادہ نقصان تعلیمی نظام کو اُٹھانا پڑتا ہے:

"کرفیو لگا رہا تو کہیں ہمارے Exams اب Postpone ہی نہ ہوجائیں"۔

اس میں ایک ٹرم "کرفیو" کا استعمال ہوا ہے جس کی ہمارے یہاں اپنی ایک معنویت ہے۔یعنی اب بچوں کی نفسیات پر بھی اس ٹرم کا گہرا اثر پڑا ہے اور اب انہیں اس بات کا علم بخوبی ہے کہ ہڑتال، کرفیو، اور کشمیر بند کیا بلا ہیں۔اس وجہ سے ہمارے تعلیمی نظام پر کس نوعیت کا اثر پڑھ چکا ہے اور افسانہ نگار لوگوں کو باور کرانا چاہتا ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام دن بہ دن خراب ہوتا جارہا ہے اور کرفیو کا دوسرا رخ:

"ڈرائیور آگیا۔بازار ہوآئیں ذرا۔ابھی تین گھنٹے کرفیو نہیں لگے گا۔"ص ۲۵۶

اس سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہاں کے مکین کن حالات سے گزر رہے ہیں۔کرفیو کے تحت نظام میں لوگ کس طرح سے اپنی ضروریات پورا کرتے ہیں اس کا اندازہ مندرجہ بالا اقتباس سے بخوبی ہوجاتا ہے۔

اس افسانے میں ایک اہم مسئلے کو اجاگر کیا گیا ہے کہ کس طرح سے یہاں کے طلاب ان حالات میں امتحانات میں حصہ لیتے ہیں ان کے اذہان میں ایک عجیب وغریب ذہنی تناو ہمیشہ رقصاں رہتا ہے۔اس سب کے باوجود یہ بچے ہر امتحان میں حصہ بھی لیتے ہیں اور کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ترنم ریاض نے اس افسانے میں جہاں ایک طرف کشمیر کی سیاسی حالات و واقعات کو بروئے کار لایا ہے وہیں دوسری طرف انہوں نے یہاں ہورہے ظلم وجبر کی نوحہ خوانی بھی کی ہے۔عجیب معاملہ یہ ہے کہ یہاں کے حالات کی زد میں یہاں کے شاپنگ مال اور بازار اب سویرے ہی بند ہوجاتے ہیں کیونکہ انہیں خدشہ رہتا ہے کہ کہیں دکانوں کی وجہ سے ان کو جان کو نقصان نہ دینا پڑے۔اسی نوعیت کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا طویل سڑک پر چلا جارہا تھا۔راستے میں کہیں کہیں دکانیں تھیں جو بند ہورہی تھی۔ابھی تو اندھیرا بھی نہیں ہوا۔تو پھر۔۔دُکانیں کیوں بند۔۔"ص ۲۶۳

حقیقت میں جس وادی کو فردوس کے لقب سے نوازا گیا تھا وہیں اب سانس لینا دشوار بن گیا ہے۔یہاں اب uncertainty نے اپنے بال وپر پھیلائے ہیں انسان خود کو بے یار ومددگار تصور کرنے لگا۔موت کا سوداگر ہر وقت اور ہر دن کسی نہ کسی گلِ لالہ میں رقصاں نظر آتا ہے۔شام ہوتے ہوئے یہاں ہر طرف ماتمی ہوائیں چلتی ہیں، ہر دن گولیوں اور ٹیر گیسوں کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔کسی کو مخبری اور کسی کو دہشت گردی کی لیبل لگائی جاتی ہیں اور کبھی شک کی بنیاد پر یہاں معصوموں کا قتل کیا جاتا ہے:

"کہتے ہیں وہ رات قیامت کی رات تھی۔اندرون شہر، ہر گھر میں چھاپے

پڑتے تھے۔خطاوار دھما کے کر کے غائب ہو گئے تھے اور بے گناہوں کو غالباً غلط مخبری
کی وجہ سے دھڑ ادھڑ پکڑ کر کسی نامعلوم منزل کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ہوسٹل سے
چھٹیوں میں گھر لوٹے دو بھائیوں کو ان کے والدین کے سامنے دہشت گردی کے
الزام میں گولیاں ماردی گئی تھیں۔غصے یا غلط فہمی یا کسی اور انجانی وجہ سے۔''ص۲۶۲

کشمیر میں جن فنکاروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان میں موصوفہ کا ڈکشن منفرد اور نرالا ہے۔موقع ومحل کے اعتبار سے افسانے میں تشبیہات ،استعارات ،اور علامات کا استعمال کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریران کے ہم عصر افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف ہو جاتی ہے۔انہیں زبان و بیان پر ایک گہری نظر ہے،منظر نگاری،کردار نگاری اور پلاٹ پر انہیں قدرت حاصل ہے۔بقولِ گوپی چند نارنگ:

''ترنم ریاض وادی کشمیر کا گلِ نورس ہے جس نے افسانے کی دنیا میں
قدم رکھا ہے جہاں زمین سخت اور آسمان دور ہے''۲

مذکور بالا افسانوں کے علاوہ ان کے بیشتر ایسے افسانے ہیں جنہوں نے ادبی منظر نامے پر ایک گہری چھاپ قائم کی ہے جن میں ابابیلیں لوٹ آئیں گی، پورٹریٹ، یہ تنگ زمین، میرا رخت سفر، ٹیڈی بیئر ،ایک تھکی ہوئی شام وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

حوالہ جات:

۱: وارث علوی، گنجفہ بازِ خیال، موڈرن پبلشنگ ہاوس، نئی دہلی، سنہ اشاعت، ۲۰۰۷ء، ص، ۱۲۱
۲: گوپی چند نارنگ، بحوالہ: اردو افسانے کے صد رنگ جلوے، ۲۰۱۶ء، میزان پبلیکیشنز بٹہ مالو، کشمیر، ص ۲۰۰

Dept.of Urdu,University of Kashmir Kashmir(India)
cellno: 9622701103
irfanrasheedf@gmail.com

● **مضمون**

● **جاوید احمد شاہ**

قمر جمالی کا ناول ''آتش دان''.....ایک مطالعہ

قمر جمالی بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن ناول کے فن میں بھی انہوں نے اپنا کمال دکھایا ہے۔مصنفہ کا ناول'' آتش دان'' مارچ ۲۰۱۵ء میں ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاوس نئی دہلی سے شائع ہوا ہے ۔ناول ۲۵۳ صفحات اور ۳۲ چھوٹے چھوٹے ابواب پر مشتمل ایک انقلابی ناول ہے۔ناول کا انتساب مصنفہ نے اپنے والد محترم کے نام کیا ہے۔آتش دان کا بیرونی حصہ قاری کو جاذب نظر بناتا ہے اور جتنا خوبصورت اس ناول کا باہری پہلو ہے اتنا ہی اس کا اندرون قاری کے ذہن و دل کو متاثر کرتا ہے نیز یہ کہ اس ناول سے انسان کا اندرونی آتش دان جو ہر انسان کی سرشت میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے وہ ہر آن جلتا رہتا ہے۔

''آتش دان'' کی شروعات قمر جمالی نے ایک نثری نظم سے کی ہے جس میں زندگی اور وقت باہم متصادم نظر آتا ہے اور وقت ہر چیز اور ہر شئے کو عبور کر کے انسان کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے جس میں انسان بہت سے مراحل اور مشکلات و مصائب سے گزر کر زندگی کی باریک حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے جو اس کی زندگی کو تجربہ خیز بناتی ہے۔وقت دنیا کی سب سے بڑی کسوٹی ہے ہر چیز، ہر شئے اور ہر انسان کو پرکھتا ہے،حق اور باطل کو الگ کر کے رکھ دیتا ہے۔من وعن ویسے ہی انسان کا کام صرف جدوجہد میں مصروف رہنا ہے باقی اس سے کیا حاصل ہو جائے یہ وقت ہی بتا دیتا ہے۔انسان کا کام صرف اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے جیسے کہ سورۃ الانعام (۱۶۶ آیت) کا ذکر اس ناول کی ابتدا میں کیا گیا ہے۔

ترجمہ:''اور اسی نے تم کو خلیفہ بنایا زمین پر اور بلند کر دئے تم میں درجے
ایک کے ایک پر تا کہ آزمائے تم کو اپنے دئے ہوئے حکموں میں۔''

ہر انسان زمیں پر اللہ کا خلیفہ ہے۔ان میں بعض کو بعض پر فوقیت عطا کی گئی ہے۔یہاں فوقیت سے مراد صلاحیت اور علم ہے۔صلاحیت اور علم کو بھرپور استعمال میں لانا ہی اس امانت سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ ''آتش دان'' موضوع کے لحاظ سے ترقی پسند نظریے کا حامل ہے اگر چہ ناول کی شروعات داستانی انداز سے

ہوتی ہے مگر اس کا مرکزی خیال جس کے اردگرد یہ ناول گردش کر رہا ہے وہ مظلوم عوام پر ڈھائے ہوئے ستم ہیں۔ جس کے مناظر اس ناول میں بڑی روشنی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ ظلم کی بھٹی جب معصوم عوام کے لئے تیار کی جاتی ہے تو وہاں سے مظلوم عوام جل کر نہیں بلکہ پختگی اور عزائم کے ساتھ نکلتے ہیں جن کے دلوں میں ایک سوزش اور شور انگیزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے۔ یہ شورش اور سوزش انہیں اس قابل بناتی ہے کہ بڑی سے بڑی سلطنت کا تختہ پلٹ سکتی ہے۔ مظلوم عوام کی مثال اس جوالے کی طرح ہے جو خاموشی سے زمین کی تہوں سے دن رات گزرتا رہتا ہے مگر جب اس پر pressure آجاتا ہے تو یہ خاموشی لاوے کی شکل اختیار کر کے تباہی مچا دیتی ہے۔ مذکورہ ناول میں بھی وہی لوگ موضوع بحث بنے ہوئے ہیں جو خاموشی سے ظلم سہتے رہتے ہیں مگر ان کے اندر کے لاوے جب بھڑک اٹھے تو 'میر مدار' اس چھپے لاوے کے لئے ایک راستے کا کام فراہم کرتا ہے جہاں سے یہ لاوا SVF کی شکل میں پھٹ کر راجیشور ریڈی کی انانیت اور سلطنت کے چیتھڑے اڑاتا ہے۔ آتش دان زندگی کے رزمیہ ہی کو پیش نہیں کرتا بلکہ رزمیہ کے ساتھ ایک نظریہ اور فلسفہ کو بھی پیش کرتا ہے۔ یہ ناول ایک مزدور کے روزمرہ اور اس کی عام زندگی جو اسی کشمکش میں گزر جاتی ہے کہ کب اس کا نفس روٹی کے ٹکڑے سے سیر ہو جائے۔ ناول میں ایک خاص قبیل کے افراد کے اردگرد قصہ کا تانا بانا بنا گیا ہے اور اسی طرح کے کردار اس میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک مشکل کام تھا مگر مصنفہ کی جہد وجگر کاوی نے اسے سہل ثابت کیا۔

ناول ''آتش دان'' میں طبقاتی کشمکش ہے جس میں ایک خاص طبقے کی کشمکش کو ایک قصہ کی شکل میں پرو دیا گیا۔ اس ناول میں ایک خاص انداز فکر کو سمویا گیا اور یہی انداز فکر اس ناول کو اشتراکی زمرے میں ضم کرتا ہے۔ ایک طرف میر مدار اور اس کے ساتھیوں کی ہمہ تن کوششیں اور راجیشور ریڈی کے ڈھائے ہوئے ظلم وستم اور دوسری طرف SVF کی عسکری جدوجہد جو راجیشور ریڈی کے مظالم کا نتیجہ تھی۔ عسکری جدوجہد کے بعد جب SVF والوں کو اپنے حقوق مل جاتے ہیں تو ان کے اندر ایک عام آدمی کی طرح جینے کی امنگیں جاگتی ہیں۔ جو اس بات کو آشکار کرتی ہیں کہ ان کو بغاوت کیلئے سماج نے مجبور کیا تھا۔ اس میں ایک اشتراکی پیغام یہ ہے کہ ہر انسان جب سماج کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے تو وہ فرار کی راہ کا انتخاب کرتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب SVF کے نوجوانوں کو اپنے حقوق مل جاتے ہیں تو وہ ایک عام آدمی کی طرح جینے کے خواہش مند ہوتے ہیں تب جا کے وہ 'شہباز خان' کے آگے

surrender کرتے ہیں۔

''مگر سردار کا کہنا ہے کہ سرنڈر آپ کے آگے کیا جائے کیوں کہ آپ ہی کی وجہ سے ہماری برسوں کی ریاضت بارآور ہوئی ہے اور.....ہم نے ہتھیار جس مقصد کے لئے اٹھایا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب ہم عام شہریوں کی طرح جینا چاہتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور ہمیں سر اٹھا کر جینے کا موقع فراہم کریں گے۔'' [۱]

قمر جمالی کا ناول 'آتش دان' سوشل ناول کا ایک ادبی شاہکار تصور کیا جانا چاہئے۔ کیوں کہ انہوں نے اس میں فنی خصوصیات کے علاوہ سماجی قدروں کو بھی ابھارا اور طبقاتی کشمکش کو بھی پیش کیا ہے۔ شہباز خان ''آتش دان'' کا مرکزی اور اہم کردار ہے۔ وہ ایک جاندار، متحرک اور جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس میں زندگی کی حرارت شروع سے آخر تک ملتی ہے، اس میں عزم وہمت اور برائی کو ختم کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ اگر اس کردار میں ڈر اور خوف ہوتا اور ظلم کے خلاف لڑنے کا حوصلہ نہ ہوتا تو اس کی دادی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو پاتا اور نہ ہی راجیشور ریڈی کی سیاسی چکّی میں صدیوں سے گھسے پٹے عوام کو اپنا حق مل پاتا۔ شہباز خان ہی دادی اور مظلوم عوام کے مابین ایک پل کا کام دیتا ہے اسی کردار کی وجہ سے ناول میں تجسس قائم رہتا ہے۔ اس کے علاوہ شہباز خان ہر آنے والے دور کے نوجوان کے لئے ایک ایسی علامت ہے۔ جو ہوا کے رخ کو موڑنے کا عزم رکھتی ہے اور بڑے سے بڑے طوفان خیز آندھیوں کو بھی موڑنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

سورج پور آبی تنازعہ جو برسوں سے پڑا ہوا تھا، اس مسئلہ کو حل کرنے کے کیے شہباز خان نے جی جان سے محنت کی اور آخر کار وہ دن آ گیا جس دن اسے اپنی اس محنت کا پھل بھی حاصل ہوا۔ جوندی سورج پور کے مظلوم کسانوں کی زمینوں کو کسی زمانے میں سیراب کرتی تھیں، آج شہباز خان کے ذریعے پھر سے اس ندی کا رخ سورج پور کی طرف موڑ دیا گیا اور مظلوم کسانوں کی برسوں کی تمنا پوری ہو گئی۔ اس تناظر میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آپ نے جو کام کیا ہے جو پچھلے سو برسوں میں کسی نے نہیں کیا۔ اور تو اور سورج پور کی رعایا یہ بھول گئی تھی کہ ندی چھل چھل کرتی بہتی تھی اور اس کے طاس میں سینکڑوں ایکڑ زمین سیراب ہوا کرتی تھی۔ کہتے ہیں زمین پر جب ظلم کی زیادتی ہو جاتی ہے تب اللہ تعالی کسی مسیحا کو بھیج دیتے ہیں۔ سورج پور کی مظلوم رعایا کے

لیے اس نے آپ کو بھیجا ہے۔ آپ واقعی مسیحا ہیں سر _____!'' ۲

''دادی'' آتش دان کا ایک اور اہم کردار دادی کا ہے یہاں بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ دادی علامت ہے ماضی کی، ماضی جو شہباز خان کے جذبہ دروں یا ان کے اندرونی آتش دان کو کبھی بھی ٹھنڈا ہونے نہیں دیتا یہاں تک کہ وہ انقلاب کی منزلوں کو چھو جاتا ہے۔ اس کردار میں ہر انسان کے لئے ایک پیام ہے کہ ہر وہ جذبہ ہر وہ چیز جو اپنے ماضی سے متصل رہتا ہے اسے مستقبل کے مراحل اور منزلیں طے کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ چونکہ ماضی اس کا سہارا بن کر اسے ان چیزوں کو عبور کرنے میں آسانی فراہم کرتا ہے۔ بس جونہی کوئی انسان ماضی کے پنّوں سے کٹ جاتا ہے تو اسے انقلاب کی راہوں کو عبور کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ جو قوم یا گروہ اپنے ماضی سے کٹ کر الگ ہو جاتی ہے اس کی ہستی صفحہ قرطاس سے مٹ جاتی ہے یہی ازل سے وقت کا دستور رہا ہے۔ دادی جو شہباز خان کا ماضی ہوتا ہے اسے بحر انقلاب کو عبور کرنے میں تساہل عطا کرتی ہے اگر وہ اُس جذبہ ماضی کو فراموش کرتا شاید مزدوروں اور ان تشنہ لب کسانوں کو کبھی بھی اپنا کھویا ہوا حق نہ ملتا۔ یہی ماضی شہباز خان کے اندر جذبہ انقلاب کو بھڑکا دیتا ہے اور اسے عزائم کی بھٹی میں کندن بنا کے چھوڑ دیتا ہے۔ انسان میں جب عزائم و حوصلہ بیدار ہو جائے تو یہ ہواؤں کا رخ جس سمت چاہے موڑ سکتا ہے۔ عزم و حوصلہ کے بغیر انسان کی مثال خس و خاشاک کی سی ہوتی ہے۔ جو ہواؤں کے زور سے جدھر چاہے بہہ سکتا ہے۔ الغرض دادی کا کردار دادی کے انتقال کے بعد بھی ہر جگہ ناول میں بصورت جذبہ و خیال متحرک رہتا ہے۔ یہی اس ناول کا شرط اولین ہے جو اس کے انہاک کا سب سے بڑا سبب ہے۔

جوں جوں وقت گزر جاتا ہے تہذیب و تمدن، طور طریقے، نقش و نگار اور در و دیوار بھی بدل لیتے ہیں۔ دادی کا جو کردار مصنفہ نے مذکورہ ناول میں پیش کیا ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دادی محبت، خدمت، خلوص کا پیکر تھیں۔ دادی کا تخت خالی ہونا ایک بلیغ اشارہ ہے پرانے رسم و رواج، طور طریقے تہذیب و تمدن کا مٹ جانا۔ دادی کے کردار کی وضاحت قمر جمالی نے شہباز کے ذریعہ کچھ اس طرح کی ہے:

> '' دادی کیا تھیں۔! ایک پوری سلطنت تھیں۔ کسی کی کیا
> مجال کہ ان کے آگے نظر اٹھا کر بات کرے۔! کسی کی ہمت کہ انہیں ہاتھ لگائے۔! یا
> ضعیف سمجھ کر سہارا دے۔!! وہ اپنی طاقت آپ تھیں۔ اکثر کہا کرتیں۔ تو
> میری سلطنت کا ولی عہد ہے۔'' ۳

میر مدار ''آتش دان'' کا متحرک کردار ہے، اگر چہ اس ناول کا مفلس اور لاچار کردار ہے مگر اس میں ہمت، حوصلہ اور عزائم کی لہریں ہمیشہ مضطرب رہتی ہیں۔ میر مدار کا کردار عصر نو کے جابر اور ظالم لوگوں کے لئے ایک انتباہ ہے کہ خاموشی اور بیچارگی کا لاوا جب پھٹنے لگتا ہے تو بڑی سے بڑی سلطنت کی کایا پلٹ سکتی ہے اور جب جوشِ جنوں حد سے تجاوز کر لیتا ہے تو ہوش والوں کی عقل ٹھکانے آجاتی ہے۔ ''راجیشور ریڈی'' مذکورہ ناول کا وہ کردار ہے جو آئے دن اپنے ذاتی اغراض و مفادات کے لئے سیاسی سفا کی اختیار کر کے لوگوں کا نہ صرف استحصال کرتے ہیں بلکہ ان کا اپنے حقوق طلب کرنے پر قتل بھی کرتے ہیں۔ مکاری، دغا بازی، خون خرابہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ آج کے دور میں ایسے حقیقی کردار سیاسی درباروں میں بے شمار رقصاں ملیں گے جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے انسانیت کی بیٹھ پر چھری چلاتے ہیں اور انسانیت کا ناحق خون بہا کر اپنی عنادیت کی پیاس بجھاتے ہیں۔

کردار نگاری میں قمر جمالی کے قلم نے کمال دکھایا ہے۔ شہباز خان کے علاوہ ناول میں کئی اور کردار ہیں۔ کچھ دور تک پھیلے ہوئے، کچھ پل بھر کو نظر آکر آنکھ سے اوجھل ہو جانے والے مگر وہ کردار لازوال اور حافظے سے کبھی نہ مٹنے والے ہیں مثلاً دادی، میر مدار، مولوی رحمت اللہ، درویش محمد خان، شیو نارائن ریڈی، SVF کے نوجوان، راجیشور ریڈی وغیرہ۔ کسی ناول میں کوئی کردار ایک دم سے ہمارے سامنے نہیں آجاتا بلکہ رفتہ رفتہ ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ 'آتش دان'' کا یہی وصف ہے کہ اس میں جو گہرا تجسس نمایاں طور پر ملتا ہے وہ سب اس کے کرداروں کی بدولت ہے۔ ہر کوئی کردار اپنے آنے والے کے لئے ایک معمہ حل کرنے کے لئے چھوڑتا ہے اور جس کی گتھیاں سلجھانے کے لئے وہ کردار متحرک ہو جاتے ہیں۔

قمر جمالی نے مکالمہ نگاری میں بھی اپنی فن کاری کا اچھا مظاہرہ کیا ہے اور ہر کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کروائے ہیں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ دادی اور پوتے کے درمیان کی اس مکالمہ نگاری سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی کو بچوں کی نفسیات سے پوری واقفیت حاصل ہے۔ انھوں نے شہباز اور دادی کے مکالموں کے ذریعہ ان کے خیالات اور جذبات کی اچھی ترجمانی کی ہے، شہباز کے کردار کے ذریعہ انھوں نے بچوں کی نفسیات کی بڑی عمدہ عکاسی کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کبھی کبھی جب میرا دل اسکول جانے سے اچٹ جاتا اور میرے پیٹ
> میں، سر میں یا ٹانگ میں جانے کہاں کہاں درد اٹھتا کہ میں سرتاپا درد بن جاتا اور

مجھے اسکول جانے سے چھٹی مل جاتی۔ممی ڈیڈی کے آفس چلے جانے کے بعد ہا، ہو ،کرتا ہوا دادی کے کمرے میں داخل ہوتا تو دادی کسی نٹ کھٹ بچّے کی طرح ہنس رہی ہوتیں۔کیوں بیٹا! بنالیا الّو''!''نہیں دادی تمہاری قسم نہیں''''ہاں بیٹا! کھائے جا جھوٹی قسمیں۔کیا حرج ہے'' [4]

سورج پور کے لوگ کس طرح ظلم وجبر میں پس رہے ہیں، کیسے راجیشور ریڈی نے اپنے منصب کا رعب جماتے ہوئے ان مظلوم کسانوں کو ندی کے پانی سے محروم کیا۔میر مدار اور شہباز خان کے درمیان مکالموں سے ان خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔مثال کے طور پر:

سرکار۔!ندی دونوں کناروں تک پانی سے لبریز رہا کرتی تھی۔۔۔مگر فی الحال جائے وقوع پر ایسا کچھ نہیں تھا۔ندی کا یہ اتھل پن قدرتی نہیں ہے۔ترائی میں رتن پور گاؤں آباد ہے۔اس گاؤں کا مکھیا ایک سفاک اور نہایت ہی ظالم آدمی ہے۔برسات کا پانی بظاہر باڑ سے بہتا محسوس ہوتا ہے مگر نیچے پہنچ کر ایک ایسے آبی ذخیرے میں جمع ہو جاتا ہے جسے رتن پور کے مکھیا نے بند باندھ کر اپنے لئے محفوظ کر رکھا ہے۔'' [5]

منظر نگاری کے لحاظ سے جب ہم ناول ''آتش دان'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ قمر جمالی نے منظر نگاری کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔انھوں نے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو قصے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔موسم سرما کی منظر کشی قمر جمالی نے اس ناول میں کچھ اس کی ہے:

''دسمبر کی ٹھٹرا دینے والی سردی تھی۔ٹھند ہڈیوں میں پیوست ہونے لگی تھی۔دادی کے حکم پر میں بستر پر لیٹ تو گیا لیکن دوسرے ہی لمحے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ایک اضطراب تھا۔بے چینی تھی انجانی سی جو مجھے بستر پر لیٹنے سے روک رہی تھی۔میں دادی کے پیچھے باہر جانا چاہتا تھا مگر سردی تھی کہ برف کی سل لیے دروازے پر کھڑی تھی۔سچ تو یہ ہے کہ میں دو قدم دروازے کی طرف بڑھا بھی......پھر لوٹ آیا۔اف رے سردی......!! میرے دانت کٹکٹانے لگے تھے۔'' [6]

شام کے منظر کو بہت ہی خوبصورت انداز میں قمر جمالی نے اپنے ناول میں پیش کیا ہے۔اقتباس پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہم اس جگہ موجود ہے اور اپنی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں۔مثال دیکھے:

''جب میں ایوننگ واک کے لیے باہر نکلا تو سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔مگر اب......سورج چمک چمک کر تھک گیا تھا۔درختوں پر سنہری کرنیں پرندوں کو اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹنے کا اشارہ کر رہی تھیں۔سر پر رنگ برنگے پرندے نہایت تندہی سے پرَ مار رہے تھے۔انہیں اندھیرے گہرے ہونے سے پہلے اپنی ٹھکانوں تک پہنچ جانا تھا۔شاید انہیں بھی اندھیروں میں گھل مل جانے کا خوف تھا۔'' [7]

مندرجہ بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قمر جمالی کو کسی واقعے کی سچی تصویر کشی کرنی کتنی عمدگی سے آتی ہے۔وہ جس واقعہ اور منظر کی تصویر کھینچتی ہیں وہ واقعہ اور منظر ہماری آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے۔اس ناول میں انھوں نے ایسے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں جن کے مطالعہ سے ایسا لگتا ہے مصوری اور آرٹ میں بھی قمر جمالی کو بڑی مہارت حاصل ہے جس کا مسلم ثبوت انھوں نے اس ناول کو پیش کرنے میں دیا ہے۔

کسی بھی ناول کے معیار کو جانچنے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس ناول کے قصے، کردار، فضا، ماحول اور اس میں پیش کیے گئے مواد کے علاوہ ناقدین فن اس کے اسلوب اور زبان کے محاسن ومعائب کا بھی جائزہ لیتے ہیں کیوں کہ فن ناول نگاری میں اسلوب وزبان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔کسی بات کو صرف کہہ دینا ہی ناول کے لیے کافی نہیں بلکہ اس انداز میں کہنا لازمی ہوتا ہے جس سے بات میں اثر پیدا ہو۔مذکورہ ناول کا اسلوب بیان نہایت سادہ، سلیس اور آسان ہے۔مصنفہ نے ناول میں تخلیقی اور معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی موقع اور محل کے مطابق استعمال ہوئے ہیں جس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مصنفہ کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل ہے۔اس سلسلے میں ناول سے لیا گیا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سونا گاؤں ایک ایجنسی ایریا (Agency Area) یعنی قبائیلوں کے لیے مختص کیا گیا علاقہ تھا جو مال گزاری قوانین کی رو سے محفوظ ارضی یعنی (Reserved Land) تھا جو Prohobition of Land transfer Act 1959 کے تحت سرکاری ملکیت تھا اور قبائیلوں کے حق میں محفوظ تھا جسے نہ خریدا اور نہ بیچا جاسکتا تھا۔'' [8]

مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اِن انگریزی الفاظ کا اس لیے بھی استعمال کیا ہے کہ وہ محکمہ جنگلات سے متعلق اصطلاحات ہیں اور ایسی زبان کسی مخصوص طبقے یا پیشے میں استعمال کی جاتی ہیں جو کہ موضوع کا تقاضہ بھی معلوم ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ناول میں ناول نگار نے نہایت ہی بلیغ اشاروں سے ناول کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے مگر انہیں سمجھنے میں قاری کو کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔مثال کے طور پر ناول میں ایک جگہ اس جملے کا استعمال کیا گیا ہے ''دادی کا تخت خالی ہوگیا'' تخت خالی ہونا ایک اشارہ ہے ایک سلطنت ،ایک تہذیب کا مٹ جانا۔قمر جمالی کا تخلیقی ذہن جب کسی تجربے یا واردات کے اظہار پر آتا ہے تو بڑے خوش اسلوبی سے اس واردات کو قلم بند کرتی ہیں موقع اور محل کے اعتبار سے حسین اور دلکش تشبیہات واستعارات ،ضرب الامثال اور کہاوتیں پیش کرنا ان کے اسلوب زبان میں شامل ہے۔قمر جمالی کی زبان پر مضبوط گرفت ہے۔مذکورہ ناول میں کئی جگہ ایسے موڑ آئے جہاں مصنفہ اگر احتیاط سے کام نہ لیتیں تو کلائیمکس کھل جاتا اور وہاں کہانی کا دم نکل جاتا۔کمال یہ ہے کہ ناول نگار ایسے ہر موڑ سے بچ کر نکل گیئں۔پورے ناول میں تجسس برقرار رہتا ہے۔کسی بھی کہانی کی یہ خوبی ہے اور یہی خوبی قاری کو کلائمکس تک لے جاتی ہے۔زبان و بیان پر قمر جمالی کو بے پناہ مہارت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے جگہ جگہ کہاوتوں ،ضرب الامثال ،محاوروں اور تشبیہات کی بہتات نظر آتی ہے قمر جمالی کا یہ ناول زبان و بیان کے اعتبار سے ایک خاص معیار کا حامل ہے۔انھوں نے اس ناول کو پیش کرنے کے لیے سادہ اور عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی موقع ومحل کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔ان انگریزی الفاظ کی وجہ سے ناول کے لطف میں اضافہ بھی ہوجاتا ہے۔علاوہ ازیں یہ بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ مصنفہ کو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی قدرت حاصل ہے۔

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اب تک تکنیک کی سطح پر بہت سارے تجربے ہوئے ہیں۔ڈائری کی تکنیک ،سوانحی تکنیک ،فلیش بیک ،شعور کی رو اور بیانیہ تکنیک میں لکھے ہوئے ناول موجود ہیں۔اکثر ناول نگاروں نے بیانیہ تکنیک میں ہی ناول لکھے ہیں جس میں کہیں کہیں ڈرامائی پیش کش اور دوسری تکنیک کا بھی استعمال کیا گیا۔''آتش دان'' میں تکنیک کی سطح پر کوئی نیا تجربہ نہیں کیا گیا ہے۔روایتی تکنیک میں ہی ناول کو پیش کیا گیا ہے۔ناول نگار نے زیادہ تر بیانیہ تکنیک کا استعمال کیا ہے اور کہیں کہیں فلیش بیک کی تکنیک اور ڈرامائی پیش کش سے قصے کو آگے بڑھایا۔مثال کے طور پر ناول سے لیا گیا یہ اقتباس فلیش بیک تکنیک کی غمازی کرتا ہے:

''ایک وہ زمانہ تھا جب،سردیوں کی راتیں طلسماتی ہوا کرتیں۔شام کے ساتھ ہی آتش دان گرم ہوتے ،کمروں میں سرِ شام عود،لوبان کی دھونی ،رمائی جاتی۔بعد نماز عشا سب مل کر کھنا کھاتے ،پھر.....صدر دالان میں گھر کے تمام افراد جمع ہوتے۔چائے کے دور چلتے۔نمکین اور مٹھائی اڑائی جاتی۔خاندان کے تمام افراد ایک دوسرے کے احوال پوچھتے جو حاضر ہے ان سے باتیں ہوتیں اور جو غائب ہیں؟ان کا ذکر خیر ہوتا۔اور آخر میں تان جا کر ٹوٹتی.....کہانیوں پر۔کھر کے بڑے اپنے اپنے کاموں پر لگ جاتے اور بچے.....؟بزرگوں کے گرد جمع ہوجاتے۔مگر اب.....یہ سب تو.....خوبوں کی باتیں ہوگئیں۔ ۹

قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' فنی نقطہ نظر سے اپنی مثال آپ ہے۔انھوں نے اس ناول میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔جس میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں ناول کے جو بنیادی عنصر ہونے چاہیے قمر جمالی نے ان تمام لوازمات کو اس ناول میں برتا ہے۔زبان و بیان ہو یا تکنیک ناول پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ انھوں نے بڑی فن کارانہ چابک دستی سے کام لیا ہے۔کہانی میں ایک جگہ ایسا موڑ آتا ہے جب شہباز خان کو ان تمام سوالات کے جوابات خود بخود مل جاتے ہیں جو انھوں نے وقت پر چھوڑے تھے اور وہیں سے اصل قصے کی شروعات ہوجاتی ہے۔جہاں سے اصل قصہ شروع ہوتا ہے وہاں سے کہانی بیانیہ انداز اختیار کر لیتی ہے۔کہانی ابتدا،وسط اور اختتام کی منزلوں سے گزر کر قاری کے دل پر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتی ہے قمر جمالی نے اس ناول میں کہیں کہیں خود کلامی کی تکنیک کے ذریعے بھی ناول کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

مجموعی طور پر قمر جمالی ایک ایسی نسائی آواز ہے جو اپنی تحریروں کی وساطت سے اردو دنیا میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ان کے فن پاروں کی زبان نہایت شستہ اور معیاری ہے۔وہ الفاظ کو نگینوں کی صورت جڑنا جانتی ہیں۔ان کا ذوقِ جمال ان کے ناول ''آتش دان'' میں نکھر کر سامنے آیا ہے۔''آتش دان'' میں جاگیردارانہ ظلم و جبر،اعلیٰ افسر شاہی ،معاشرتی نظام اور سیاسی اور سماجی حال کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔انھوں نے اپنے ناول میں پیچیدہ لب و لہجے سے گریز کیا ہے۔انھوں نے اپنے ناول میں کہیں کہیں تلگو اور انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو ناول کے اسلوب میں چاشنی پیدا کر دیتے

ہیں۔چھوٹے چھوٹے جملے یا فقرے ایک صوتی آہنگ پیدا کر دیتے ہیں۔کہانی میں ان کا لب ولہجہ سادہ اور سپاٹ ہے۔انھوں نے تمام واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے تمام اسرار و رموز کی مضبوط گرہیں کھولنے کی سعی میں اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔''آتش دان'' بلاشبہ عصر حاضر کا ایک اہم ناول ہے، جو قمر جمالی کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

حواشی:

ا۔ناول ''آتش دان'' از قمر جمالی ، ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاوس ، نئی دہلی ۲۰۱۵ء ، ص،۲۰۵۔۲۔ ایضاً ، ص،۲۳۲۔۳۔ایضاً،ص،۴۶/۴۷۔۴۔ایضاً،ص،۲۴/۲۵۔۵۔ایضاً،ص،۶۴۔۶۔ایضاً،ص،۱۱۔۷۔ایضاً ،ص،۱۲۵۔۸۔ایضاً،ص،۵۴۔۹۔ایضاً،ص،۱۲/۱۳۔

Resaerch Scholar,Dept.of Urdu,Jammu University(India)
:7006834309
shahjavaid002@gmail.com

● **مضمون**

● **ریحانہ بشیر**

ذکیہ مشہدی کی افسانوی جہات

ذکیہ مشہدی افسانہ نگاری کے میدان میں اہم اور معتبر نام ہے۔اُنھوں نے اُس دور میں اپنے فن کا بھرپور اظہار کیا ہے جب اردو فکشن کے تقاضے بدل چکے تھے اور نئے نئے موضوعات سے فن افسانہ نگاری کا دامن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔یعنی موضوعاتی تناظر میں اردو افسانے کا کینوس بہت وسیع ہو گیا تھا۔متنوع موضوعات کو کہانی کے پیرئے میں ڈھال کے پیش کیا جا رہا تھا۔ذکیہ مشہدی کی فطرت میں افسانہ نگاری سے شغف پہلے سے ہی تھا،لیکن اُنھوں نے اپنی خلاقانہ صلاحیتوں کا افسانے کی صورت میں اظہار کرنے میں کافی وقت لگا لیا۔جس کی وجہ وہ خود افسانوی مجموعے ''پرائے چہرے'' کے پیش لفظ میں یوں بیان کرتی ہیں:

> ''.....گرچہ میری فطرت میں افسانہ نگاری کے جراثیم کم عمری سے ہی موجود تھے لیکن چونکہ شدید قسم کی لاپرواہی اور لاابالا پن بھی مزاج کا حصہ تھے اس لئے میری افسانہ نگاری کی عمر جتنی ہونی چاہئے تھی،اس سے بہت کم ہے۔'' ا

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکیہ مشہدی نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے پہلے سے ہی واقف تھیں،لیکن وہ شاید اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی پختگی کی منتظر تھیں۔کیوں کہ ہر تخلیق کار یہ چاہتا ہے کہ اس کا قاری بھی ٹھیک اُسی طرح متاثر ہو جائے جس طرح تخلیق کار کسی واقعہ کو افسانے کی صورت میں پیش کرنے سے قبل متاثر ہو چکا ہوتا ہے۔جس کے لیے تخلیقی صلاحیتوں کا پختہ ہونا لازمی ہے۔ذکیہ مشہدی بھی اپنے خلاقانہ صلاحیتوں کو پوری طرح سے پختہ ہونے کا انتظار کر رہی تھیں،تاکہ وہ جب فن افسانہ نگاری میں باضابطہ قدم جمائے تو ایک معتبر نام کی صورت میں فکشن نگاری کی صف میں شامل ہو جائے۔

ذکیہ مشہدی بہت کم وقت میں اپنے افسانوں کی بنیاد پر اردو فکشن کے اہم افسانہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئیں۔اُن کا شمار اردو کے اُن فن کاروں بالخصوص افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے فن افسانہ نگاروی میں اعلا مقام حاصل کیا ہے۔جن کی فنی کاوشوں سے اردو فکشن کا کینوس وسیع ہو گیا۔ذکیہ مشہدی کے افسانے اُس شعلے کو برقرار رکھے ہوئے ہیں جس شعلے کو روشن کرنے میں اردو افسانہ کی ممتاز خواتین فکشن نگار مثلاً: قرۃ العین حیدر،عصمت،رضیہ سجاد ظہیر کا اہم کردار رہا ہے۔یعنی ذکیہ

مشہدی دور حاضر میں اردو افسانہ کا اہم نام ہے جس کی اہمیت اس بات میں مضمر ہے کہ اُنھوں نے اردو افسانہ کی موضوعاتی اور فنی بنیادیں مستحکم کرنے میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ اردو افسانہ کے نئے رجحانات کے تحت فن افسانہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بھی کامیاب کوششیں کیں۔ ذکیہ مشہدی اردو افسانہ نگاری میں ایک نمایاں نام ہے۔ڈاکٹر محمد کاظم اردو افسانہ نگاری میں اُن کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''نصف صدی پہلے جس انگارہ کو رشید جہاں نے روشن کیا اسے شعلہ میں تبدیل کرنے میں عصمت چغتائی ،قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں نے اہم کارنامہ انجام دیا اور موجودہ دور میں اس شعلہ کو نہ بجھنے والی آگ میں تبدیل کرنے کا کام جیلانی بانو ،جمیلہ ہاشمی ،واجدہ تبسم ،زاہدہ حنا اور ذکیہ مشہدی نے کیا۔اِن میں بھی پاکستان میں زاہدہ حنا اور ہندوستان میں ذکیہ مشہدی زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہیں۔'' ۲؎

ذکیہ مشہدی کو بہ طور ایک کامیاب افسانہ نگار پورے ادبی حلقے میں پذیرائی ملی ہے۔اُن کی افسانہ نگاری کا اعتراف ناقدین ادب نے بھی کیا ہے۔اُنھوں نے اردو افسانہ نگاری میں اپنے افسانوں کی معنویت فنی پختگی اور فن افسانہ نگاری کے اسرار ورموز سے شناسائی کی بدولت پائی ہے۔اُنھوں نے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے وہ عصری ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی وجود کے متنوع پہلوؤں تک رسائی پانے میں کامیاب ثابت ہوئے۔ چوں ذکیہ مشہدی جدیدیت کے دور کی تخلیق کار ہیں۔اس لیے اُنھوں نے مادی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان کی داخلی زندگی کے متنوع عناصر کو اپنے افسانوں کا ماضوع بنایا۔جس میں نفسیات، تنہائی، دکھ درد، انسانی آرزوئیں، خواہشات وغیرہ پر قلم اُٹھا کر اپنے افسانوی کینوس کو وسیع کر دیا۔ اُن کی اِس فنکارانہ بصیرت کا اعتراف کر کے پروفیسر وہاب اشرفی یوں لکھتے ہیں:

''......کہہ سکتے ہیں کہ ذکیہ مشہدی اردو کی مایہ ناز افسانہ نگار ہیں جن کے امکانات وسیع ہیں'' ۳؎

ذکیہ مشہدی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں فن افسانہ نگاری کے جملہ اصول وضوابط کو احسن طریقے سے برتا ہے، جو کہ فن کی بنیاد پر مکمل نظر آتے ہیں۔ پلاٹ، مکالمہ، کردار نگاری، منظر کشی، زبان و بیان غرض افسانہ نگاری کے جتنے بھی عناصر ترکیبی ہیں، اُنھیں فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اُن کے یہاں جیسے کو ویسا بیان کرنے کا عمل موجود نہیں ہے بلکہ وہ ہر واقعہ کو اپنی خلاقانہ صلاحیتوں سے فن افسانہ نگاری کے قالب میں ڈال کر افسانہ کے فنی

اصول وضوابط کو ملحوظ نظر رکھ کر پیش کرتی ہیں۔جس سے اُن کے افسانوں میں وہ تاثر پیدا ہو جاتا ہے جو ایک افسانہ نگار اپنے قاری پر چھوڑنا چاہتا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ واقعہ کو برتنے کا انداز اس قدر موثر ہے کہ قاری میں شروع سے آخر تک تجسس برقرار رہتا ہے۔موضوع کے لحاظ سے بھی اُن کے افسانے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ایک کامیاب افسانہ نگار کی ایک پہچان یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی مخصوص موضوع کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ وہ قاری کے ذہن جھنجھوڑ دے اور اُسے سوچنے اور غور وفکر کرنے پر اُکسائے۔ذکیہ مشہدی میں وہ خصوصیات بہ درجہ اُتم موجود ہیں۔وہ جب بھی کسی واقعہ کو افسانے کے قالب میں ڈھال دیتی ہیں تو اُس میں محض کہانی پن نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ قاری کو اُس مسئلے پر سوچنے کی دعوت بھی دیتی ہیں۔جس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے جن مسائل پر قلم اُٹھایا ہے اُن مسائل سے معاشرے کا ہر فرد دو چار ہے۔ سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی، اقتصادی اور نفسیاتی وغیرہ سے جڑے مسائل، گھریلو زندگی کے مسائل، عورتوں اور بچوں کی نفسیات سے جڑے متنوع پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔

ذکیہ مشہدی کسی بھی تحریک یا ازم سے باضابطہ طور وابستہ نہیں ہیں۔کیوں کہ اُنھوں نے انسانی کی خارجی زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے اور داخلی وباطنی زندگی کی مخفی بصیرتوں کو بھی آشکار کیا ہے۔جہاں وہ ادب برائے زندگی کی قائل نظر آتی ہیں وہیں وہ ادب کے فنی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے بھی نظر آتی ہیں۔جہاں اُنھوں نے فرد کی خارجی زندگی سے جڑے حالات وواقعات مثلاً سیاسی، سماجی، معاشی وغیرہ کو احاطۂ تحریر میں لایا ہے، وہیں اُنھوں نے فرد کی داخلی زندگی کے مختلف عناصر مثلاً نفسیات، آرزوئیں، تمنائیں، خوف، دُکھ درد، تنہائی وغیرہ کو بھی موضوع بنایا ہے۔اُن کے یہاں ترقی پسندی کی ''حقیقت پسندی'' بھی ہے اور جدیدیت کی ''داخلیت پسندی'' بھی ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ نا تو اُنھوں نے ترقی پسند جیسا انداز بیان اور اسلوب نگارش اپنایا ہے اور نا ہی اُن کے یہاں جدیدیت کا ابہام نظر آتا ہے۔اُن کے زبان وبیان میں نا ہی مشکل پسندی ہے اور نا ہی نامانوس علامتیں اور استعارات ملتی ہیں۔وہاب اشرفی اُن کی اس غیر جانبداری اور کسی مخصوص تحریک یا ازم سے وابستہ نا ہونے کے تعلق سے یوں لکھتے ہیں:

''کسی ازم سے اِن کا تعلق نہیں۔لیکن انسانیت کی شیرینی ان کے رگ وپے میں دوڑتی رہتی ہے۔لہٰذا زندگی کی آلودگیاں اس کی سنگین ناہمواری استحصال سبھوں کے ساتھ وہ برسرپیکار ہیں لیکن نہ تو اِن کے یہاں ترقی پسند کا اُونچا لہجہ ہے اور نہ ہی جدیدیت کی مبہم کیفیت ان کے افسانوں میں زندگی کے نشیب وفراز تخلیقی جہات سے گزر کر پرکشش بن جاتے ہیں۔لہٰذا ان کے مطالعہ سے جذبے کی تطہیر ہوتی ہے اور وژن میں اضافہ ہوتا ہے۔'' ۴؎

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ ذکیہ مشہدی باضابطہ طور کسی تحریک یا ازم سے وابستہ نہیں تھیں۔ مگر اُن کا تخلیقی شعور اس قدر نشو ونما پا چکا تھا کہ مخصوص خانوں میں بٹ کر وہ ادب تخلیق نہیں کرنا چاہتی ہیں۔ بلکہ اُنھوں نے انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو افسانوں کی صورت میں پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ہاں اب اتنا ضرور ہے کہ اُن کے افسانوں میں ہمیں ترقی پسند عناصر بھی ملیں گے اور جدیدیت کے چند پہلو بھی۔ لیکن اعلانیہ طور اُنھوں نے کسی بھی تحریک سے وابستہ ہونے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس بات میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ ذکیہ مشہدی کا ذہن ترقی پسند ہے لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس کا مطلب پھر یہ ہوا کہ کوئی بھی تخلیق کار تب تک ترقی پسند نہیں ہو سکتا جب تک اُسے ترقی پسند تحریک سے ناجوڑا جائے۔ ترقی پسند تحریک یا جدیدیت سے وابستہ ہونے کا جہاں تک سوال ہے؛ ذکیہ مشہدی اس ضمن میں غیر جانبدار ہیں۔ اُن کا جھکاؤ کسی طرف زیادہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ ذکیہ مشہدی ترقی پسند تحریک سے باضابطہ طور نہیں جڑی ہیں اور نا ہی اُنھوں نے جدیدیت سے اپنی وابستگی کا اظہار کہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر نزہت پروین لکھتی ہیں:

''بہار کے کچھ افسانہ نگار باضابطہ ترقی پسند تحریک سے جڑے ہوئے نہیں تھے لیکن کسی نہ کسی طریقے سے ان کا ذہن ترقی پسند ضرور تھا۔ ان میں ذکیہ مشہدی کا بھی ایک نام آتا ہے۔ ذکیہ مشہدی کے گھر ترقی پسند تحریک سے جڑے فنکار آتے تھے۔ بدیع مشہدی اور بعد میں شفیع مشہدی نے انہیں ترقی پسند سوچ کی طرف مائل کیا۔'' ۵

نزہت صاحبہ نے ذکیہ مشہدی کی ترقی پسندی کی طرف مائل ہو جانے کی بات تو کی ہے لیکن اُن کا باضابطہ طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے حوالے سے بات نہیں کی۔ اُنھوں نے خود ہی اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ ترقی پسند سوچ کی طرف مائل ہونے سے قبل اگر چہ وہ کسی مخصوص نظریہ (جدیدیت) کی افسانہ نگار بھی رہی ہوں گی، مگر بعد میں اُنھوں نے اپنے نظریئے کو وسیع کر کے اپنی سوچ اور اپنے ذہن کو ترقی پسند بنا لیا۔ یعنی اب وہ کسی مخصوص نظریئے کی قائل نہیں رہی۔ نزہت صاحبہ نے شروع میں ہی کہا کہ ذکیہ مشہدی باضابطہ طور ترقی پسند تحریک سے جڑی نہیں تھیں مگر اُن کا ذہن ترقی پسند تھا۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ذکیہ مشہدی پر کسی مخصوص تحریک کا ازم کا لیبل چسپاں نہیں کیا جا سکے گا۔ جس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی تحریک یا ازم سے تعلق رکھ کر ادب کو خانوں میں بانٹنا نہیں چاہتی ہیں۔ وہ اپنے ادبی نظریئے کے حوالے سے یوں لکھتی ہیں:

''دو باتیں میں خاص طور پر کہنا چاہوں گی۔ پہلی بات تو یہ کہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث اب ختم ہونی چاہئے۔ آج بھی لوگ ادیبوں سے

یہ سوال پوچھتے ہیں اور ادبی محفلوں میں بھی یہ سوال اکثر دوہرایا جاتا رہتا ہے۔ ادب برائے ادب' داستان پارینہ ہے۔ آج کا ادیب نہ زندگی سے آنکھیں چرا رہا ہے نہ چرا سکتا ہے۔ جس ادیب نے زندگی کو نظر انداز کیا اس کی تخلیقات اپنی طرف توجہ مبذول کرانے میں کامیاب نہیں ہوں گی۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے۔ شاید پہلے بھی خاصہ تھا اس لئے کہ پچھلوں نے بھی اِس کا رونا رویا ہے'' ۶

ذکیہ مشہدی کہانی بیان کرنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ وہ افسانہ کے آغاز سے ہی قاری کا ہاتھ نہیں چھوڑتی ہیں۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں وہ تاثر شروع سے آخر تک برابر قائم رہتا ہے جس سے قاری گرفت میں رہتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ اُن کے افسانوں کو پڑھتے وقت قاری کو اکتاہٹ کا ذرہ بھی شائبہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اُن کا منفرد اور غیر معمولی انداز بیان قاری کو اپنی طرف کھینچ کر اُسے اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتی ہیں۔ اُن کے جملوں کی ساخت و ترتیب و تنظیم اور الفاظ کا انتخاب اُن کے انداز بیان کو اور بھی زیادہ دلکش بنا دیتا ہے جس سے قاری لطف اندوز ہو کر افسانے میں کہیں بھی جھول یا کسی بھی قسم کی اُکتاہٹ کو محسوس نہیں کرتا ہے۔ اُن کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ محض لفظوں کی سجاوٹ یا پھر حد درجہ مبالغہ آرائی اور مشکل پسندی سے کام نہیں لیتی ہیں، بلکہ بڑی صاف گوئی، سلاست اور سلیس طرز نگارش اور سادہ بیانی کے ساتھ کہانی کو آگے بڑھاتی ہیں۔

ایک تخلیق کار معاشرے کا ایک حساس ترین فرد ہوتا ہے، جو ہر تبدیلی کو بہت جلد محسوس کرتا ہے اور اس کا ردعمل ظاہر کر دیتا ہے۔ لیکن تخلیقی عمل میں محض حساس ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مشاہدات اور تجربات میں وسعت ہونا بھی لازم ہے۔ ذکیہ مشہدی کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر 'حساس دل' اور اُن کے مشاہدات اور تجربات کس قدر وسیع و بلیغ ہیں۔ کیوں کہ اُنھوں نے جن موضوعات پر قلم اُٹھایا، اکثر موضوعات بہ ظاہر تو معمولی نظر آتے ہیں۔ لیکن جب اُس کی گہرائی میں ذکیہ مشہدی کسی اہم مسئلے کو نکال لاتی ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُن کی نظر اور اُن کا تجربہ کس قدر وسیع و عمیق ہے۔ ذکیہ مشہدی کامیاب افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنا ایک خاص نقطہ نظر رکھتی ہیں اور تین بنیادی باتوں کو کامیاب افسانہ نگاری کے لیے اہم قرار دیتی ہیں:

''میرا خیال ہے کہ کامیاب افسانہ نگاری کے لئے حساس دل، وسیع تجربے، اور الفاظ پر قدرت یہ تینوں ضروری ہیں۔'' ۷

ذکیہ مشہدی الفاظ پر قدرت ہونے کو بھی کامیاب افسانہ نگاری کے لیے اہم متصور کرتی ہیں۔ الفاظ کا انتخاب اور اُن کی ترتیب و تنظیم (Arrangement of Words) ایک افسانہ ہی کے لیے

نہیں بلکہ ہر تخلیقی تحریر کے لیے ضروری اور بنیادی چیز ہے۔ایک افسانہ نگار کا الفاظ پر قدرت (Vocabulary) ہونا اُس کے افسانے کو کامیابی کی اور لے جانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ذکیہ مشہدی کے افسانے مذکورہ تینوں خصوصیات کے حامل ہیں۔

اُن کے کہانی لکھنے کے دور کو اردو افسانے کا اہم دور متصور کیا جاتا ہے۔کیوں کہ اُن سے قبل فن افسانہ نگاری کے چند نام ایسے ہیں جنھوں نے اردو افسانے کو نیا آہنگ اور نیا شعور عطا کیا۔جنھوں نے اردو افسانے کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں اردو افسانہ فنی طور اپنے نئے تقاضوں کو پورا کرتا ہوا نظر آتا تھا اور دوسری طرف انسانی زندگی کے خارجی و داخلی عناصر کو افسانے نے پوری طرح اپنے دامن میں سمو یا تھا۔ اُن ممتاز افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، جوگندر پال، قاضی عبدالستار وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ذکیہ مشہدی نے جب فکشن میں قدم رکھا تو افسانہ فنی اور موضوعاتی طور پر کافی بدل چکا تھا۔ اس تناظر میں اردو افسانے میں نئے نئے تجربے آزمائے جارہے تھے، جن میں جیلانی بانو، طارق چھتاری، پیغام آفاقی، ترنم ریاض، زاہدہ حنا، غضنفر علی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔اردو افسانہ نگاری میں جدید یت کے پیش نظر علامتی اظہار بیان کو زیادہ فوقیت ملی۔جدیدیت نے اردو افسانے کے علامتی اظہار اور مبہم بیانیہ کی وجہ سے افسانے سے کہانی پن کے عنصر پر گویا قدغن لگا دی۔جس کی وجہ سے قاری وہ لطافت اور حظ محسوس نہیں کر پا رہا تھا جو اُسے افسانہ پڑھنے کے دوران حاصل ہوتی تھی۔لیکن ذکیہ مشہدی ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے جدیدیت کے دور میں بھی اپنے قاری کو جدید افسانے کی مشکل پسندی اور دقیق علامتی اظہار و بیان اور نامانوس استعارات سے دل شکستہ نہیں کیا۔ بلکہ اُنھوں نے ترقی پسند اور جدیدیت کے ایک سنگم کا کردار ادا کیا ہے۔اُنھوں نے جدیدیت کے عہد میں بھی افسانے کی حقیقت پسندی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور مختلف فنی و موضوعاتی تجربوں کے ساتھ ساتھ کہانی پن کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

ذکیہ مشہدی کا دور افسانہ نگاری کا وہ دور جس میں نہ صرف ہیئت کے تناظر میں اردو افسانے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں بلکہ موضوعاتی تناظر میں بھی افسانہ نے کافی حد تک فروغ پایا۔جدیدیت میں کہانی کی ترسیل کے لیے علامتوں کا استعمال زیادہ ہونے لگا تھا؛ اور موضوعات کا انتخاب بھی ایسا ہوتا تھا کہ حقیقی ہوتے ہوئے بھی حقیقی معلوم نہیں ہوتے تھے۔لیکن ذکیہ مشہدی ایسی موضوعات کا انتخاب کرتی ہیں جو زمینی حقائق سے جڑے ہیں، جو عام زندگی سے منسوب ہیں، جن سے روزمرہ کی زندگی دوچار ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُنھوں نے جدید افسانے کے چیلنج بالخصوص علامتیت سے یکسر منہ موڑ لیا۔اُن کے افسانے بھی علامتوں سے خالی نہیں ہیں، مگر جیسا کہ اُوپر مذکور ہو چکا ہے کہ اُن کا طرز اظہار نہایت دلکش، سادہ اور سلیس ہے۔ہاں البتہ اُن کی علامتیں اس قدر مشکل نہیں ہیں کہ قاری سمجھنے سے قاصر رہے۔وہ مبہم علامتوں کے انتخاب سے قاری کو کہانی پن

سے دور نہیں کرنا چاہتی ہیں۔اُن کے افسانوں کی بنت ایسی ہے کہ جدید رنگ میں رنگنے کے باوجود بھی اُن میں وہ حقیقت پسندی اور کہانی پن کا عنصر باقی رہتا ہے کہ پڑھنے والا حظ بھی اُٹھا سکے اور اُکتاہٹ بھی محسوس نا ہو اور ساتھ ہی وہ مقصد بھی پورا ہو جائے جس کے لیے افسانہ نگار نے افسانہ تخلیق کیا ہوتا ہے۔

ذکیہ مشہدی کے افسانوں کو جب موضوعاتی تناظر میں دیکھتے ہیں تو اُن کے افسانوں میں ہر نوع کے موضوعات ملتے ہیں۔اُن موضوعات کا تعلق ہمارے موجودہ معاشرے میں آئے دن پیش آئے حالات و واقعات سے ہوتا ہے۔وہ اپنے افسانوں میں سماج کی اُن ناہمواریوں کو پیش کرتی ہیں جن سے معاشرے کا ہر فرد دوچار ہے۔یعنی اُن کے یہاں اگر روایتی موضوعات بھی ملتے ہیں تو وہ بھی ایک منفرد اور غیر معمولی انداز بیان کے ساتھ ملتے ہیں۔اُن کے افسانوں میں بھی متوسط طبقے کے مسائل کا اظہار، جہیز جیسی بدعیت اور معاشرے پر اس کے منفی اثرات، اولادوں کی نافرمانی، مادہ پرستی، ذات پات، عورتوں کا استحصال، ہائی سوسائیٹی کے تام جام وغیرہ جیسے موضوعات ملتے ہیں۔بہ ظاہر مذکورہ موضوعات میں نئے پن کا شبہ تک نہیں ہوتا ہے۔لیکن ان موضوعات کے ذریعے وہ یہ ذہن نشین کرانا چاہتی ہیں کہ جدید دور میں بھی ہمارے معاشرے میں ابھی بھی وہی مسائل ہیں جن سے اب انسان کو کنارہ کش ہو جانا چاہئے تھا۔اُن کا ماننا ہے کہ ہم صرف وقت کے لحاظ سے جدید (Modern) ہوئے ہیں لیکن ذہنی طور پر ہمارے اندر وہی فرسودہ ذہنیت کا ڈھیرا ابھی بھی موجود ہے۔اس نوعیت کے موضوعات کے انتخاب سے وہ قاری کو بھی وہی محسوس کرانا چاہتی ہیں جو وہ خود اپنے معاشرے کے اردگرد نظر دوڑا کر محسوس کرتی ہیں۔وہ اپنے معاشرے کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کی طرف اپنے قاری کی توجہ کو مبذول کراتی ہیں۔وہ سماج کے ہر فرد کے دُکھ درد اور کرب کو نہ صرف خود محسوس کرتی ہیں بلکہ افسانے کے پیرائے میں اس کا اظہار بھی کرتی ہیں۔اس ضمن میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''کیا میرے قاری بھی بار بار میرے افسانے پڑھیں گے اور میرے ساتھ غمگین ہوں گے، میرے ساتھ خوش ہوں گے، میرے ساتھ اس بے بس غصے کو محسوس کریں گے جو سماجی ناانصافیاں اور ظلم بیدار کرتے ہیں؟ بہر حال اپنے گردو پیش میں گھومتے اس جہانِ رنگ و بو کو اپنی متحیر (اور اب تھکی ہوئی) آنکھوں سے دیکھتی ہوں اسے لوگوں کو کہانی کی صورت میں سنانا چاہتی ہوں۔'' [۸]

ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں سماج میں پل رہی فرسودہ روایات اور مظلوموں کی آہ و فغاں سنائی دیتی ہے۔اُنھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا یا جس چیز کا مشاہدہ کیا، اُسی کو من و عن صفحہ قرطاس پر اُتارنے کی کامیاب سعی کی ہے۔اُنھوں نے معاشرے کے اُن مسائل کی طرف انگشت نمائی کی ہے جنھیں جان بوجھ کر آج کا Modern انسان ان دیکھا اور ان سُنا کر دیتا ہے۔دراصل ذکیہ مشہدی ایک درد

مند دل رکھتی ہیں، دوسروں کے دُکھ درد کو سمجھتی ہیں اور اُن کا ہمدرد بھی بنتی ہیں مگر سینہ پیٹ کر نہیں بلکہ ہاتھ میں قلم اُٹھا کر اُن تمام دُکھ درد کا اظہار کر کے اُن پر غور و فکر کرنے اور ان کا ازالہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔

ذکیہ مشہدی کا لہجہ بے باک ہے؛ موضوع کے ساتھ ساتھ فن پر بھی غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ افسانے کو ایک بہترین فنی پیرائے میں برتنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ اُن کے افسانوں کو فنی تناظر میں دیکھا جائے تو اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُن کے افسانے فنی لحاظ سے اُن تمام فنی عناصر سے مملو ہوتے ہیں جو ایک بہترین افسانے کی بنت میں بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی اُن کے افسانوں کی فنی گھڑت ایسی ہے کہ وہ فن کی کسوٹی پر کھرا اُترتے ہیں۔ زبان و بیان کا استعمال اور کہانی میں واقعات کے تسلسل میں بھی سنجیدگی اور پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔ مکالمہ نگاری پر بھی اُنھیں اچھی خاصی گرفت ہے، وہ ہر کردار سے اُسی کی عمر کے لحاظ سے مکالمے ادا کرنے کے فن سے خوب واقف ہیں۔ وہ بچے، بوڑھے، پڑھے لکھے، اَن پڑھ اور عورتوں کی زبان سے اُن کی مناسبت سے مکالمے ادا کرواتی ہیں۔ اچھا ایک خاص بات یہ ہے ذکیہ مشہدی خود ایک عورت ہو کر اپنے افسانوں میں عورتوں کے جذبات اور احساسات کا اظہار بہترین پیرائے میں کرتی ہیں؛ جس میں مبالغہ آرائی یا بے جا اظہارانہ رویے کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رخسانہ جمیل ذکیہ مشہدی کی اس انفرادیت کے حوالے سے لکھتی ہیں:

> ''ذکیہ مشہدی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے بیشتر مسائل اور ان کی پیچیدگیوں اور بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کا ہر افسانہ دیر پا اثر چھوڑتا ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے تو وہ بہار کی صفِ اول کی افسانہ نگار قرار دی جاتی ہیں۔ وہ آسان، سادہ اور رواں زبان استعمال کرتی ہیں۔ عورتوں کی زبان استعمال کرنے اور ان کے جذبات کی عکاسی کرنے میں وہ صالحہ عابد حسین اور جیلانی بانو کے قریب نظر آتی ہیں۔'' ۹

ذکیہ مشہدی کی فن کارانہ مہارت کا اعتراف ناقدین ادب نے بھی کیا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں فنی اور موضوعاتی سطح پر بھی نہایت سنجیدگی کا مظاہرہ کیا ہے اور نظریاتی و فکری اعتبار سے بھی ایک غیر جانبدار تخلیق کار کا رول ادا کیا ہے۔ اُن کے نزدیک ادب میں قدیم و جدید یا ترقی پسند ادب اور جدیدیت سے متاثر ادب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے کمزور اور متوسط طبقوں نیز اُن کے مسائل کو اُجاگر کیا ہے۔ اُنھوں نے Modern Society اور اُس میں پیدا شدہ عورتوں کے مسائل کی عکاسی بھی کی ہے۔ علاوہ ازیں اُن کے افسانوں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ عصر

سے نا صرف آگہی رکھتی ہیں بلکہ عصری مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دے کر بہترین پیرائے میں اظہار بھی کرتی ہیں۔ اس تناظر میں وہ اپنے افسانوں کے لیے کردار بھی ایسے گھڑتے ہیں جن کا راست تعلق معاشرے سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر احمد صغیر ذکیہ مشہدی کی فن کارانہ بصیرت پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ اپنے افسانوں میں صرف متوسط اور کمزور گھرانوں کی تصویریں نہیں کھینچتی ہیں بلکہ سوسائٹی میں زندگی گزارنے والی عورت کو بھی صفحہ قرطاس پر فنکاری کے ساتھ اس کی تصویر ابھارتی ہیں۔ وہ اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتی محسوس کرتی ہیں نیز عصری آگاہی اور سماجی معنویت کو خود اپنے تجربے اور غور و فکر کا حصہ بنا کر افسانے میں بڑی فنکاری سے ڈال دیتی ہیں۔ ان کے کردار معاشرے سے الگ نہیں ہوتے۔ وہ روزمرہ کی عام زبان استعمال کرتی ہیں جو محض گھریلو ماحول میں بولی جاتی ہے۔ بہر حال ذکیہ مشہدی افسانوی دنیا میں ایک باشعور ادیبہ کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔'' ۱۰

ذکیہ مشہدی کے یہاں افسانہ پیش کرنے کا ایک انوکھا اور منفرد انداز ملتا ہے۔ جو قاری کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں شروع سے آخر تک لے لیتا ہے۔ یعنی اُن کے افسانے نا صرف حقیقت حال کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ پیش کرنے کا ڈھنگ اس قدر غیر معمولی اور نرالا ہے کہ قاری کے لیے تازگی اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ الفاظ کی ترتیب، انتخاب اور جملوں کی ساخت اور اُن کی ترسیل واقعات کی رو میں بہانے کا انداز اُن کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ جس سے افسانہ نگار کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے اور قاری بھی تجسس کا دامن پکڑ کر متاثر ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر ذکیہ مشہدی کے افسانوں کی خصوصیات پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ذکیہ مشہدی بہار کی ایک ایسی خاتون افسانہ نگار ہیں جنھوں نے بہت جلد شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی..... انہوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں اتنا اونچا مقام حاصل کر لیا ہے کہ ان کے ہم عصر اور بہت سے پرانے لکھنے والے بھی قد میں ان سے چھوٹے نظر آتے ہیں۔ یہ سب ان کی کوششوں اور کاوشوں کا ثمر ہے۔۔ کہانی کہنے کا انداز انہیں خوب آتا ہے۔ قارئین ان کی کہانی پڑھ کر محسوس کرنے لگتے ہیں کہ واقعی ان کی نگاہوں کے آگے رونما ہو رہا ہے۔ تجسس قائم رکھنا کوئی اُن سے سیکھے۔'' ۱۱

ذکیہ مشہدی کے افسانوں میں عورت ایک نمایاں بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ محبوب موضوع ہے۔ کیوں کہ اس عالم آب و گل میں عورت ایک اہم تخلیق متصور کیا جاتی ہے۔ کیوں کہ عورت کے بغیر زندگی کو محال تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے کئی روپ ہیں جن سے اُس کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ ماں کے روپ میں دلار، بہن بن کر لاڈ، اور بیٹی کی فکر غرض ہر لحاظ سے وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ عورت کے ان متنوع روپ کے

جذبات کی عکاسی ادب میں بھی کی گئی ہے۔

ذکیہ مشہدی چوں کہ خود ایک ادیبہ ہیں اور ایک عورت کے احساسات و جذبات اور کیفیات سے شرابور ہیں۔لیکن یہاں معاملہ محض جنس کا نہیں ہے کہ خود عورت ہونے کے ناطے اُنھوں نے عورت اور اُس سے جڑے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ذکیہ مشہدی ایک حساس اور سنجیدہ تخلیق کار ہیں؛لہذا وہ معاشرے کے روزمرہ کے مسائل سے آگہی رکھتی ہیں اور اُن کو احاطۂ تحریر میں لاتی ہیں۔ پھر وہ مسائل عورت سے جڑے ہوں یا پھر مرد سے متعلق ہوں۔ ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ خود عورت ہوکر وہ عورتوں کے احساسات و جذبات کی عکاسی وترجمانی خوب کرسکتی ہیں۔ذکیہ مشہدی کے افسانوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اُن کے افسانوں میں انسانی زندگی سے جڑے حالات وواقعات کا ایک بھرپور اظہار ملتا ہے۔یعنی وہ اپنے عمیق مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر سماجی حقائق کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتی ہیں۔جس کے لیے اُنھوں نے اپنے افسانوں کے لیے کردار بھی ایسے گھڑے ہیں جو زمین سے جڑے ہیں۔جو اُن کے افسانوں میں قاری کے لیے دلچسپی کا سامان بہم پہنچانے میں کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں کو قاری دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ذکیہ مشہدی کی کہانیاں زمینی حقائق اور انسانی زندگی کے نشیب وفراز سے مملو ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

حوالہ جات:

اپرائے چہرے، ذکیہ مشہدی، پیش لفظ، ۱۹۸۴ء، دہلی، (ص ۵)، ۲۔ ''ذکیہ مشہدی کی افسانہ نگاری''، ڈاکٹر محمد کاظم، مشمولہ، اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار اور ان کی خدمات، مرتبہ ڈاکٹر نعیم انیس، دسمبر ۲۰۱۲، دہلی (ص ۸۲)، ۳۔ تاریخ ادب اردو، از وہاب اشرفی، جلد سوم (ص ۱۳۲۶)، ۴۔ تاریخ ادب اردو، از وہاب اشرفی، جلد سوم، (ص ۱۳۲۶)، ۵۔ بہار میں ترقی پسند اردو ادب افسانہ، از، ڈاکٹر نزہت پروین، (ص ۱۶۴)، ۶۔ پیش لفظ، تاریک راہوں کے مسافر، از ذکیہ مشہدی، ۱۹۹۳، پٹنہ (ص ۵)، ۷۔ پرائے چہرے، ذکیہ مشہدی، پیش لفظ، ۱۹۸۴ء، دہلی (ص ۷)، ۸۔ پیش لفظ، یہ جہانِ رنگ وبو، از ذکیہ مشہدی، ۲۰۱۳، دہلی، (ص ۹)، ۹۔ اردو کی اہم خواتین افسانہ نگار (صوبۂ بہار کے حوالے سے)، از ڈاکٹر رخسانہ جمیل، ناشر ایم۔آر۔پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۳، دہلی، (ص ۵۱۔۵۲)، ۱۰۔ بہار میں اردو فکشن ایک مطالعہ، از ڈاکٹر احمد صغیر، ۲۰۱۴، (ص ۲۸۲۔۲۸۳)، ۱۱۔ بہار میں اردو افسانہ نگاری ابتداء تا حال، از ڈاکٹر قیام نیر، طبع دوم 1996ء، (ص ۲۸۲)

Research Scholar , Moulana Azad National Urdu University
Gachibowli Hyderabad(Telengana) India
ilhanrehana@gmail.com 7006584438

● مضمون

● شبیر احمد لون

عصمت چغتائی کی فلمی دنیا

عصمت چغتائی اردو ادب کی ایک نمائندہ ناول اور افسانہ نگار ہے انہوں نے ساری زندگی افسانوی ادب کی خدمت کی اور ادبی سرمایے میں ان کے قلم نے بیش بہا اضافہ کیا۔ادبی افق پر جب عصمت چغتائی کی فن کاری کا سورج چمکنے لگا جب آس پاس کا ماحول کچھ ساز گار نہیں تھا۔ ہندوستان میں زبردست تبدیلیاں نمودار ہورہی تھیں، ایک طرف تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی تو دوسری طرف ترقی پسند تحریک نے فرسودہ ادبی روایتوں کو توڑ کر حقیقی زندگی سے موضوعات لینے شروع کیے تھے۔ایسے ماحول میں ادیبوں اور شاعروں نے حقیقت سے آنکھیں ملانے کا تہیہ کیا۔عصمت چغتائی بھی ترقی پسند تحریک کی حامی تھی اور اس کی کارکن بھی۔ وہ بچپن ہی سے بے باک' آزاد خیال اور صاف گو تھی۔ترقی پسند تحریک سے ان کی بے باکی میں اور اضافہ ہوگیا اپنی بے باکی کی وجہ سے عصمت چغتائی کو فحش نگار کہا گیا۔اصل میں سماج جن بیماریوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ادیب، قاری کو اسے باخبر کردیتا ہے۔سماج کی گندگی اور غلاظت اس کے دل پر چوٹ کرتی ہے عصمت چغتائی بھی سماج کے عیبوں کو ظاہر کرتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مصنف پر کوئی بھی لیبل چسپاں کی جائے۔لیکن اس کا ذہن ہمیشہ سماج کی ناہمواریوں پر مرکوز رہتا ہے جہاں سے وہ اپنا مواد حاصل کرتا ہے اور یہی عالم عصمت چغتائی کا بھی ہے۔

عصمت کی بہت ساری حیثیتیں ہیں وہ ناول نگار' افسانہ نگار' ڈراما نگار اور خاکہ نگار ہے اس کے علاوہ ان کی حیثیت ایک فلم ساز اور اسکرپٹ رائٹر کی بھی ہے۔فلمی دنیا سے وابستگی کی اصل وجہ شاہد لطیف سے شادی کرنے سے ہے۔کئی معاشقوں کے بعد عصمت نے ۱۹۴۲ء میں شاہد لطیف سے شادی کی۔شاہد ان دنوں فلمی دنیا کی ایک جانی مانی شخصیت اور فلم ساز تھے۔وہ بھی آزاد خیالی کے حامی تھے افسانہ 'لحاف' کی وجہ سے عصمت پر فحش اور عریانی کا الزام لگا تھا۔پھر بھی انہوں نے یہ رشتہ ہنستے ہنستے قبول کیا۔سینما کی زندگی میں کبھی کوئی رشتہ حائل نہیں ہوتا ہے عصمت نے اپنے جذبات کے اظہار میں کبھی لاج نہیں کی۔شاہد بھی ایک ایسی دنیا سے وابستہ تھے جہاں کی ہر کوئی چیز جائز مانی جاتی تھی۔اس لیے شادی کے بعد دونوں نے آزادانہ زندگی گذاری۔فلموں کے لیے لکھنا عصمت چغتائی کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔ یہاں ان کے اندر کی مصنفہ نے ان کی مدد کی۔شفیق احمد لکھتے ہیں:

’’وہ اردوادب سے وابستہ ہونے کے علاوہ فلموں سے بھی وابستہ تھیں۔ انہوں نے کئی فلموں کی کہانیاں لکھیں اور کچھ فلموں کے مکالمے بھی اور دو فلمیں ڈائریکٹ کیں اور ایک فلم پروڈیوس بھی کی۔ اس طرح وہ ایسی اردوادیبہ تھیں جن کا اردوادب میں ایک مقام رہا اور فلموں میں بھی۔ حالانکہ ان کی تحریر کردہ فلموں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن ان میں کچھ فلمیں ایسی ہیں جو بہت کامیاب رہیں‘‘۔

(شفیق احمد۔ ادبی و فلمی شخصیات‘ ۲۰۱۵ء۔ ص ۱۴۳)

عصمت چغتائی نے سب سے پہلے ۱۹۴۳ء میں کے۔ امرناتھ کی ہدایت کاری میں بنی فلم ’’چھیڑ چھاڑ‘‘ کی کہانی لکھی اور مکالمے بھی لکھے۔ یہ اُن کا پہلا فلمی تجربہ تھا اس کے بعد انہوں نے اپنے شوہر کے دوش بدوش فلمی کام میں ہاتھ بٹایا۔ ۱۹۴۱ء میں عصمت چغتائی نے اپنا پہلا ناول ’’ضدی‘‘ لکھا۔ یہ ایک رومانی ناول ہے۔ شاہد لطیف نے ۱۹۴۸ء میں اسی ناول پر ’’ضدی‘‘ نام کی فلم بنائی۔ اس کا منظرنامہ اور مکالمے عصمت نے ہی لکھے۔ یہ اپنے زمانے کی ایک کامیاب فلم ہے جس کے نمایاں کردار دیو آنند‘ کامنی کوشل اور پران تھے۔ اس فلم کے لیے کشور کمار نے پہلی بار گانا گایا ہے۔ اس فلم کے بارے میں پریم پال اشک لکھتے ہیں:

’’۱۹۴۸ء میں بامبے ٹاکیز کے جھنڈے تلے اردو کی ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائی کے ناول ’’ضدی‘‘ پر مبنی اسی نام سے ایک فلم آئی تھی۔ اس فلم میں کردار نگاری ماحول اور بنیادی کہانی میں فنی امتزاج کوئی اعلیٰ سطح کا نہ تھا۔ البتہ اس کے نغمات اور موسیقی غضب کی تھی۔ کشور کمار بطور پلے بیک گلوکار اسی فلم کے ذریعہ فلمی دنیا میں داخل ہوئے تھے۔ اس میں کامنی کوشل اور دیو آنند نے اداکاری کے عمدہ جوہر دکھائے تھے لیکن اس فلم میں ناول کی روح عنقا تھی‘‘۔

(پریم پال اشک۔ ہندوستانی سینما کے پچاس سال‘ ۲۰۰۰ء۔ ص ۹۴۔۹۳)

۱۹۴۸ء میں ہی عصمت چغتائی نے شاہد لطیف کی ہدایت کاری میں بنی فلم ’’شکایت‘‘ کے لیے کہانی لکھی۔ ۱۹۵۰ء میں شاہد لطیف نے دلیپ کمار اور کامنی کوشل کو لے کر ایک اہم فلم بنائی جس کا نام ’’آرزو‘‘ ہے۔ عصمت چغتائی نے اس فلم کی کہانی کے ساتھ ساتھ اس کے مکالمے بھی تحریر کیے۔ یہ اپنے وقت کی ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کا ایک گانا جو بہت مشہور ہوا تھا جو طلعت محمود کی آواز میں تھا۔

اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل جہاں کوئی نہ ہو　　اپنا پرایا مہرباناں‘ مہربان کوئی نہ ہو

اس کے بعد عصمت نے جن فلموں کی کہانیاں‘ منظرنامے اور مکالمے لکھے ان کے نام اس طرح ہیں۔ ’’بزدل‘‘ ۱۹۵۱ء ’’شیشہ‘‘ ۱۹۵۲ء ’’فریب‘‘ ۱۹۵۳ء ’’دروازہ‘‘ ۱۹۵۴ء ’’سوسائٹی‘‘ ۱۹۵۵ء ’’لالہ رخ‘‘ ۱۹۵۸ء اور ’’سونے کی چڑیاں‘‘ ۱۹۵۸ء، یہ فلم بھی ایک کامیاب فلم تھی۔ ۱۹۶۷ء میں شاہد لطیف فلم ’’جواب آئے گا‘‘ بنا رہے تھے تو ان کا اچانک انتقال ہوا۔ پھر اس کی ہدایت کاری کا ذمہ عصمت چغتائی نے اپنے کندھوں پہ لے لیا۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے ہدایت کار ایم۔ ایس۔ سیتھو کی فلم ’’گرم ہوا‘‘ کی کہانی تحریر کی۔ اس فلم کے مکالمے اور نغمے کیفی اعظمی نے لکھے۔ یہ کہانی ایک ایسے مسلم خاندان کی ہے جس کے کچھ افراد تقسیم کے بعد پاکستان چلے جاتے ہیں۔ سلیم مرزا اس بات پر بضد ہے کہ وہ ہندوستان میں ہی رہے گا یہی اس کا وطن ہے لیکن یہاں سلیم مرزا کی زندگی کا دائرہ تنگ کیا جاتا ہے اس پر کبھی غداری اور کبھی جاسوسی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اس طرح ہمیں سلیم مرزا کی شکل میں ان بہت سے مسلمان گھرانوں کی مصیبت کا پتہ چلتا ہے۔ جنہوں نے تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہنا مناسب سمجھا۔ تقسیم ہند کے موضوع پر تمام فلموں میں ’’گرم ہوا‘‘ کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس زمانے کے مسلم ہندوستانیوں کے درد و کرب کو بہت ہی مؤثر انداز میں پیش کیا گیا۔ سلیم مرزا کا کردار بلراج ساہنی نے ادا کیا اور ایسا کردار نبھایا کہ اصل اور نقل میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عصمت چغتائی کو اس فلم کے لیے بہترین کہانی کار کا فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس فلم کے بارے میں زین شمسی رقم طراز ہے:

’’گرم ہوا میں تقسیم کے بعد پیدا ہوئے بحران سے مختلف سوالات کو اٹھایا گیا۔ آخر کوئی مسلمان اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان کیوں جائے‘ صرف مقام کی بات نہیں ہے بلکہ روزگار‘ کاروبار‘ گھر‘ زمین‘ سماج کو ایک ساتھ اس لیے چھوڑ دے کہ وہ مسلمان ہے؟ اس فلم کا کردار سلیم (بلراج ساہنی) سوال اٹھاتا ہے کہ میں نے پاکستان مانگا تھا؟ جس نے مانگا تھا اور جس نے بنایا وہ جائے میں کیوں جاؤں‘‘۔

(زین شمسی۔ اردو دنیا۔ فروری ۲۰۱۳ء۔ ص ۳۴)

ہدایت کار شیام بینیگل کی ایک اہم فلم ’’جنون‘‘ ۱۹۷۹ء میں پردہ سیمین کی زینت بنی یہ ایک انگریزی کہانی پر مبنی فلم تھی جس کا اسکرپٹ کیفی اعظمی نے تیار کیا تھا اور مکالمے عصمت چغتائی نے تحریر کیے۔ اس فلم میں انہوں نے ایک مسلم خاتون کا کردار بھی نبھایا۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی کسی تھیٹر اور فلم میں کام نہیں کیا تھا۔ کردار میں ایسی جان ڈال دی کہ لگتا نہیں کہ یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ اس کے علاوہ عصمت چغتائی نے دو دستاویزی فلمیں بنائی جن کا نام ’’مائی ڈریم‘‘ اور ’’علی سردار جعفری‘‘ ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کہانیاں بہت ہی چُست ہوتی تھیں۔ مکالمے کرداروں کے عین مطابق لکھتی تھیں جس کردار کے لیے لکھا اس کو ابھارنے میں کامیاب ہوگئی۔

◀◀ ● ▶▶

Resaerch Scholar,Dept.of Urdu,Kashmir University(India)

● مضمون
● شافعہ بانو

معاصر اردو افسانوں میں خواتین کے مسائل

معاصر اردو افسانہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی ابتدا جدیدیت کے زیر اثر ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔ معاصر افسانہ دراصل وہ افسانہ ہے جو کسی تحریک یا رجحان سے وابستہ نظر نہیں آتا ہے۔ بلکہ معاصر افسانہ نگاروں نے وابستگی اور اجنبیت سے اجتناب کر کے زندگی، معاشرہ اور کائنات سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ معاصر افسانہ نگاروں کے موضوعات متنوع اور مختلف ہوتے ہیں۔ جن موضوعات کو وہ اپنے افسانوں میں اُٹھاتے ہیں، اُن کا تعلق آج کے دور کے انسان اور گردونوح کی فضا سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی معاصر افسانوں میں خواتین کے مسائل کو بھی بڑی اہمیت دی جارہی ہے۔ چونکہ عورت قدرت کی ایک ایسی شاہکار تخلیق ہے جو خود ایک خالق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی بے لوث محبت، ایثار، خدمت اور رنگارنگ شخصیت کے سبب اس دنیا کے چمن کو سیراب بھی کر رہی ہے اور فروغ بھی دے رہی ہے۔ اگر زمانۂ قدیم پر نظر دوڑائی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عورت کو بے انتہا ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مختلف ملکوں اور مختلف مذاہب میں اس کی نوعیت مختلف تھی، اس کی بے حرمتی اور بے جا ظلم وزیادتیاں ہر ملک اور ہر قوم میں روا تھیں۔ یونان، روم، چین، عرب اور مغربی ممالک کے ہر مذہب میں عورت مظلوم، محکوم اور لونڈی رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وقت بدلا اور سماجی تقاضے بدلے تو عورت کی زندگی میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ادب میں پہلی بار عورتوں کے وجود اس کے حقوق اور تحفظ کی پامالی پر یعنی عورتوں کے مسائل پر لکھا گیا۔ اس سلسلے میں پہلی تانیثی کتاب A Vindication Of The Right OF The Women منظرِ عام پر آئی۔ جس کی مصنفہ میری وال سٹوں کرافٹ تھیں۔ اس میں مصنفہ نے خواتین اور ان کے مسائل پر کھل کر بات کی اور پھر آہستہ آہستہ یہ آواز ایک تنظیم اور تحریک کی شکل اختیار کرتی گئی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اُردو افسانوی ادب میں بھی خواتین کے مختلف مسائل کو اُجاگر کرنے کی کوشش ابتدا سے ہی کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یم چند کے افسانے 'نئی بیوی' اور 'کفن' میں عورت پر ہو رہے ظلم وجبر اور تشدد کی اصل اور حقیقی منظر کشی کی گئی ہے۔ اس کے بعد ترقی پسند دور میں 'انگارے' میں رشید جہاں، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو وغیرہ نے خواتین کے مسائل پر افسانے قلم بند کئے۔ بعد کے قلم کاروں نے بھی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے افسانوی ادب کا ایک طویل سفر طے کیا اور آج عصرِ حاظر میں معاصر افسانہ نگار خواتین کے

مختلف مسائل، ان کی سماجی، سیاسی ومعاشی حالت پر قلم آزمائی کر رہے ہیں اور خواتین کے مسائل کو سامنے لانے کی سعی کر رہے ہیں۔ جن میں عبدالصمد، ذکیہ مشہدی، قمر جہاں، واجدہ تبسم، شائستہ فاخری، اقبال مجید، ترنم ریاض، ساجد رشید وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے چند معاصر افسانوں پر اکتفا کر کے خواتین کے مسائل کی نشان دہی کی جائے گی۔

''دیوی'' عبدالصمد کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں عورتوں کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ 'روپ کنول' اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ روپ کنول ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ جو کہ خود شوہر کے ساتھ ستی ہونے کا اعلان کر دیتی ہے اور تمام لوگ اس کو ستی ماتا کے روپ میں تسلیم کرتے ہیں اور اس کو دیوی کا درجہ دیتے ہیں اس کی پوجا وغیرہ کرتے ہیں۔ 'روپ کنول' تمام عمر ساس اور سسر کے ظلم کے سبب ستی ہونے کا اعلان کرتی ہے اور اس ظلم کے سبب اس کے اندر نرمی اور معصومیت ختم ہو جاتی ہے۔ دیوی بننے کی جو وجہ ہوتی ہے وہ اس کا انتقام ہے۔ اس کے دکھوں کا خاتمہ اور سماج کے منہ پر احتجاج بھرا طمانچہ مارنے کا موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ ظالم ساس کو ہاتھ جوڑ کر پوجتے ہوئے دیکھ کر اس کے دل میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ یہاں پر عبدالصمد نے اس کہانی میں وحشیانہ ظلم وجبر کے خلاف عورت کا احتجاج 'دیوی' کے روپ میں دکھانے کی بھرپور کوشش کی۔ انہیں اس سماج سے سخت چڑ ہے جو عورتوں کو غلام بنائے رکھنے پر کمر بستہ ہے اور ان پر بے جا ظلم کرتے ہیں۔ اگر چہ یہ افسانہ ظالم طبقے کے مسائل پر مبنی بہت سے موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن جو خیال ابھر کر سامنے آیا ہے وہ خواتین کی زندگی اور ان سے متعلق مسائل ہیں۔ اس افسانے میں عورتوں کی مظلوم زندگی کی تصویر کشی نہایت ہی خوبصورت انداز میں کی گئی ہے۔

معاصر افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی بھی ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ذکیہ مشہدی نفسیات کی طالب علم رہی ہیں۔ اس لئے انہیں خواتین کی نفسیات پر ملکہ حاصل ہے وہ جس طرح خواتین کی نفسیات کی ترجمانی کرتی ہیں اس کی مثال خال خال ہی نظر آتی ہے۔ عورت ہونے کے ناطے وہ عورت کے سماجی جبر واستحصال سے بخوبی واقف ہیں اور چاہتی ہیں کہ مرد بالادستی والے سماج کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ عورت کے بنیادی مسائل، اس کی جنسی کیفیات اور آرزوئیں، اُمنگوں کے علاوہ سماج میں اس کے بہتر مقام پر خاصا زور دیتی ہیں۔ ذکیہ مشہدی کے نزدیک مرد کی عیاش طبیعت اکثر عورت کو دھوکہ دیتی ہے اور اس کے ساتھ بے وفائی کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ذکیہ مشہدی کا افسانہ ''چرایا ہوا سکھ'' بہترین مثال ہے۔ اس افسانے میں دوشادی شدہ مرد وعورت کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اجیت اور ایتا کی خوشگوار زندگی میں مسز کھنہ جیسی جنس زدہ عورت داخل ہو جاتی ہے تو اجیت نام کا مرد جو اپنی بیوی ایتا سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ مگر جب مسز کھنہ ان کی کرایہ دار بنتی ہے تو وہ اسے اپنی طرف مائل کر لیتی ہے۔ کیونکہ مسز کھنہ کے شوہر اپنے دفتری کاموں کے سلسلے میں اکثر ٹور پر رہتے ہیں۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ اپنی جوان بیوی کی جنسی خواہشات کو پورا کر سکیں۔ اس لئے مسٹر کھنہ کی غیر موجودگی میں اجیت وہ سارے کام انجام دیتا ہے جو کھنہ کے ذمہ تھے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''آیئے بھئی کیا سوچ رہے ہیں؟'' کھڑکی کا پردہ اٹھا۔مسز کھنہ ناک کی لونگ جگمگائی۔اجیت اندر داخل ہوا۔کمرے کی ہر چیز میاں بیوی کے نفیس ذوق اور آرام طلب مزاج کی غماز تھی اس نے ایک نظر مسز کھنہ پر ڈالی۔وہ بے نیازی سے بالوں میں برش پھرا رہی تھیں تقریباً بیک لیس چولی سے اُس کی سنہری کمر جھانک رہی تھی۔اجیت پر پھر وہی دورہ پڑا۔جی چاہا انہیں چھو کر دیکھے۔کچھ لوگ اصلی نہیں معلوم ہوتے۔تخیل کا واہمہ محسوس ہوتے ہیں۔''آپ کی خاطر میں نے امیتا کو تنہا ہی بھیج دیا۔''اجیت''''آپ کی خاطر''پر زور دیتا ہوا بولا۔'' (چرایا ہوا سکھ،مشمولہ: بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب،صفحہ ۳۱۰)

اس افسانے میں ذکیہ مشہدی نے مرد کو عیاش،دغاباز اور بے وفا قرار دیا ہے پوری کہانی میں دو عورتوں کا کردار جن میں ایک نیک اور باوفا بیوی کا کردار ہے اور دوسری بدچلن اور جنس زدہ ہے مگر عورت کو بدچلنی کی راہ پر مرد ہی گامزن کرتا ہے۔دوسری طرف اجیت جیسا عیاش اور بے وفا مرد ہے جو اپنی سیدھی سادی اور حسین بیوی سے دغا کرتا ہے۔اس افسانے کے ذریعے ذکیہ مشہدی نے بڑی بے باکی سے عورتوں کے اہم مسائل کو سامنے لایا۔کہانی بالآخر مرد اور عورت کے جسمانی اختلاط پر ختم ہو جاتی ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں اُن تمام سماجی قدروں کو نشانہ بنایا جن کی وجہ سے خواتین کا استحصال کیا جاتا رہا ہے۔

قمر جہاں بھی معاصر افسانہ نگاروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔انہوں نے بھی عورتوں کے مختلف مسائل پر لکھا۔عورتوں کی ذہنی کشمکش کی مرقع کشی میں انہیں مہارت حاصل ہے۔دراصل اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عصری منظرِ نامے میں تعلیم یافتہ برسرِ روزگار خواتین کو بیک وقت خارجی اور داخلی دونوں محاذوں پر جس طرح مقابل ہونا پڑ رہا ہے اور جس کرب ناک صورتِ حال سے دوچار ہو کر ان کا سکون درہم برہم ہو رہا ہے اس کا نہ صرف گہرا مشاہدہ قمر جہاں کو ہے بلکہ عمیق تجربات سے بھی انہیں آئے دن گزرنا پڑتا ہے۔چنانچہ اس ذہنی کشمکش،تصادم اور حیات و کائنات کے کربناک ماحول اور فضا کو خونِ جگر سے سینچ کر انہوں نے کہانی جنم دی ہے۔اپنے افسانوں میں انہوں نے موجودہ دور کی عورت کے مسائل اور اس کی الجھنوں کو منظرِ عام پر لایا ہے جیسے ان کا ایک افسانہ ''آج کی عورت''جس میں انہوں نے ایسی عورت کی کہانی پیش کی جو سرکاری ملازمت کرتی ہے۔ایک کالج لائبریرین کے عہدے پر کام کرتی ہے۔جس میں انہوں نے دکھایا کہ آج کی عورت دوہری ذمہ داری نبھا رہی ہے اور اس صورت میں اُس کی حالت قابلِ رحم ہے۔لیکن مرد بالادستی والے سماج کے پاس انصاف والی آنکھیں نہیں ہیں۔افسانہ''آج کی عورت'' کی ابتدا مصنفہ نے جس طرح سے کی ہے وہیں سے ایک ملازم پیشہ عورت کی بھاگ دوڑ اور اس کے انتشار زدہ ذہن کا پتہ چلتا ہے۔مثلاً قمر جہاں نے اس افسانے کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے:

''اُس نے دونوں بچوں کو ٹفن دے کر اسکولی بس پر سوار کیا اور پھر جلدی

سے آکر منا کے لئے دودھ تیار کرنے لگی۔دودھ پاٹ میں ڈال کر جلدی جلدی ٹھنڈا کیا۔پھر دودھ کی بوتل بچہ کے ننھے منے ہاتھوں میں تھما کر خود باتھ روم میں گھس گئی۔دو ہی منٹ میں باتھ روم سے نکل کر بیڈ روم میں آئی اور ہینگر پر لگی ہوئی ساڑی اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔جلدی جلدی ہلکا سا میک اپ کیا۔بچہ کے قریب آئی۔ایک پیار بھرا بوسہ اس کی پیشانی پر دیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔چلتے چلتے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ گھڑی کی سوئی بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔وہ بھی گھڑی کی سوئی کی رفتار سے بھاگنے لگی۔یہ روز روز کی بھاگ دوڑ بھی کیسی عجیب ہوتی ہے۔وہ ہر روز سوچتی ہے کہ وقت سے پہلے ہی تیار ہو کر گھر سے نکل جائے گی لیکن ہر روز کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ تاخیر ہو ہی جاتی ہے اور اس وقت اُسے احساس ہوتا ہے کہ نوکری کرنے والوں کے لئے کبھی کبھی پانچ منٹ بھی کتنے قیمتی ہوتے ہیں۔'' (مشمولہ،بہار میں اردو افسانہ نگاری،مرتبہ:وہاب اشرفی اور احمد حسین آزاد(بہار اردو اکادمی ۱۹۸۹ء صفحہ ۶۸۱)

اس کہانی میں قمر جہاں نے عصر حاضر کی عورت کی جو بھاگ دوڑ دکھائی ہے وہ اس بات کا سراغ فراہم کرتی ہے کہ مردانہ سماج کے وضع کردہ اصولوں اور روایات کے خلاف اگر چہ عورت نے بغاوت کا اعلان کر دیا ہے لیکن اس بدلے میں اُسے بہت سی اُلجھنوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ آئے دن ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبتی چلی جا رہی ہے۔

الغرض ان چند معاصر افسانہ نگاروں کی کہانیوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم دور کی عورت اور جدید دور کی عورت میں بہت فرق آچکا ہے۔آج کی عورت اگر چہ سیاسی،سماجی اور معاشی طور پر ترقی پزیر اور خود کفیل ہو چکی ہے اور وقت پڑنے پر مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت اس میں پیدا ہو گئی ہے،خود اعتماد اور خودداری جیسے بیش بہا جذبات بھی پیدا ہو گئے ہیں،تعلیم یافتہ ہے،بچوں کی پرورش و پرداخت بخوبی کر سکتی ہے،یعنی آج کی عورت زندگی کے کسی بھی شعبے میں مرد سے پیچھے نہیں ہے لیکن اس کی ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا ہے،اس کے مسائل اور اس کے استحصال اور اجبار کے نئے طریقے اس کے سامنے ہیں۔معاصر افسانوں میں عورت موضوع بنی ہوئی ہے۔اردو معاصر افسانہ نگار عورتوں کی تبدیل ہوتی ہوئی دنیا،ان کے موضوعات پر سب سے زیادہ توجہ دے رہے ہیں اور ان کے مسائل کی تصویر کشی بہتر طور پر کر رہے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

Resaearch Scholar,Dept.of Urdu,Kashmir University(India)
7780801336
khurooshafia208@gmail.com

● مضمون

● عروسہ فاروق

ممتاز شیریں کی افسانوی کائنات

ممتاز شیریں اردو ادب کے افق پر ایک ایسا درخشندہ ستارہ ہے جو نہ صرف ایک بہترین افسانہ نگار ہے بلکہ ایک معتبر نقاد، کامیاب مترجم اور قابلِ تحسین مدیر کے حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں۔انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۲۲ء سے شروع کیا ہے۔اپنے ہم عصروں کی بہ نسبت انہوں نے بہت کم لکھا ہے۔ان کے افسانوں کے دو مجموعے ''اپنی نگریا'' (۱۹۴۷ء) اور ''میگھ ملہار'' (۱۹۶۲ء) میں شائع ہو چکے ہیں۔انہوں نے مغربی ادب کا گہرائی سے مطالعہ کر کے جدید تکنیک کا استعمال کیا، شعور کی رو، آزاد تلازمہ خیال ان کے افسانوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔

ممتاز شیریں کا پہلا افسانہ ''انگڑائی'' رسالہ ساقی ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔اس افسانے سے ممتاز شیریں ادبی حلقوں میں بحیثیت افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئیں۔بقول محمد حسن عسکری:

> ''ممتاز شیریں اردو کے ان چند لکھنے والوں اور لکھنے والیوں میں سے ایک ہیں جن کی تعریف ہی ان کی شہرت سے شروع ہوتی ہے۔انہیں مشہور ہونے کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا بلکہ پہلے ہی افسانے کے بعد ادب کے شائقین کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔''[۱]

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اپنی نگریا'' محمد حسن عسکری کے دیباچے کے ساتھ مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں چھ افسانے ''آئینہ''، انگڑائی، گھنیری بدلیوں میں، اپنی نگریا، رانی اور شکست شامل ہیں۔

ممتاز شیریں نے اپنی بیشتر کہانیوں میں عورت کی کامیاب ازدواجی زندگی کو موضوع بحث بنا کر پیش کیا ہے۔انہوں نے عموماً زندگی کے خوشگوار لمحات کی عکاسی کی ہے۔ان کے یہاں ترقی پسندی کے تمام عکس صاف نظر آتے ہیں۔ممتاز شیریں نے عورت کو گھر کی زینت بنا کر پیش کیا ہے۔افسانہ ''آئینہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔متذکرہ افسانے میں ماضی اور حال کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔افسانے میں بوڑھی ''نانابی'' کا کردار خوبصورت انداز سے پیش کر کے افسانے میں مشرقی عورت کو برتا گیا ہے۔اس افسانے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ شوہر جیسا بھی ہو بیوی محبت کرنے والی، وفادار اور اطاعت گزار ہونی چاہئے، شوہر کتنے بھی ظلم و

جبر کیوں نہ کرے بیوی پھر بھی مسکرا کر پیش آنی چاہیے۔کہانی کا مرکزی کردار ایک وفادار بیوی (نانابی) ہے۔وہ اپنے شوہر کی فرمابردار ہونے کے ساتھ ساتھ شوہر کے تمام ظلم و جبر کو بہ آسانی اور خوشی خوشی برداشت کرتی ہے۔وہ اپنی زندگی کا مقصد صرف شوہر سے والہانہ محبت، وفاشعاری اور خدمت گزراری سمجھتی ہے۔افسانے میں عورت کی ہمدردی اور جذبہ کو انتہائی موثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔افسانے میں نانابی کو اس کا شوہر شراب کی حالت میں ہر روز پیٹتا ہے لیکن وفاشعار زہرہ اُف تک نہ کرتی بلکہ اسے شوہر کا حق جان لیتی ہیں:

> ''شراب کے نشہ میں چور آدھی رات کو آتے اور جیور کے لیے تکھا جا کرتے۔کبھی ہاتھ روک لیتی تو بس شامت ہی آجاتی۔اتنا مارتے اتنا مارتے ،لاتوں سے گھونسوں سے ،لکڑے کہیں دیکھ پاتے تو اس سے بھی دھڑک پیٹتے۔''(افسانہ آئینہ)

نانابی میں مشرقیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔کہیں پر بھی احتجاج کی آواز نہیں ہے۔اتنے ظلم و جبر کے بعد بھی وہ کسی سے کوئی شکایت نہیں کرتی اور ہمیشہ معاف بھی کرتی اور عزت سے بھی پیش آتی ہیں۔دراصل افسانہ شوہر کے مرتبے اور شادی شدہ زندگی کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔شادی ایک مقدس بندھن ہے۔ایک بار بندھ گیا پھر موت ہی دونوں کو الگ کر سکتی ہے۔مصنفہ نے اس بات کو مدِنظر رکھ کر افسانے کا تانا بانا پیش کیا ہے۔افسانہ حال سے شروع ہوتا ہے جہاں پروین (منھی) آئینے میں اپنا عکس دیکھتی ہے، حال سے اچانک رشتہ ٹوٹ کر پروین کے خیالوں سے ہی افسانہ ماضی کی اور رخ کرتا ہے جہاں ہمیں نانابی اور اس کی روداد سے ہمکنار کرایا جاتا ہے۔اور آخر پر افسانے کو پھر حال میں لا کر پروین پر ہی اختتام کرایا جاتا ہے۔نانابی پروین کی انا تھی اور اسے طرح طرح کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ایک دن نانابی نے اسے اپنی رودادِ قلب سنائی جو اس نے اس سے پہلے کسی اور کو نہیں سنائی تھی۔

> ''نانابی! تم سچ میں کتنا دکھ اٹھائی ہو۔کیسا خراب تھا تمہارا آدمی۔تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا؟ کیسا خراب آدمی۔تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا؟''
>
> ''کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا، کیسا ہنس مکھ تھا، بیبا نکا سجیلا جوان! گھٹا ہوا بدن، چوڑا چکلا سینہ۔اور صورت کا تو کیا کہنا۔''(افسانہ آئینہ)

افسانے کے اقتباس سے احساس ہوتا ہے کہ ظلم و جبر کی انتہا کو پہنچ کر بھی نانابی کو اپنے شوہر سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ظلم سہ کر بھی وہ اپنے شوہر کی عزت کرتی تھی اور انہیں شہزادہ کہہ کر پکارتی تھی۔دراصل موصوفہ نے نانابی کے کردار کے ذریعے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کی لاج و شرم اپنے شوہر سے محبت کرنے

میں پنہاں ہیں۔مزکورہ افسانے کی تعریف کرتے ہوئے خود افسانہ نگار اپنا اظہارِ خیال یوں کرتی ہیں؛

''میں آئینہ کو اپنا بہترین افسانہ سمجھتی ہوں یہا فسانہ ایک شدید تخلیقی امنگ کے تحت لکھا گیا ہے۔یہ افسانہ خاص طور سے مجھے اس لیے پسند ہے کہ اس میں زندگی کی ٹریجڈی ہے۔'' ۲

ممتاز شیریں کے مطابق ازدواجی زندگی کی سیڑھی صرف عورت کی وجہ سے کھڑی اور ٹھہری ہوتی ہے۔اگر عورت اس رشتے سے ایک قدم پیچھے ہٹالے تو اس میں کچھ باقی نہیں رہے گا۔انہوں نے عورت کے مقابلے میں زیادہ درجہ مرد کو دیا ہے۔عورتوں کو بنیادی حیثیت نہ دیتے ہوئے ان کو زندگی کی نشونما کے لیے لازمی جز قرار دیا ہے۔ان کی افسانوں کی قراءت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازدواجی محبت اور ازدواجی زندگی ممتاز شیریں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔

انسانی نفسیات کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہر انسان زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف چیزوں کا خواہش مند رہتا ہے، جو چیز بچپن میں پسند آتی ہے بلوغت کی عمر تک آتے آتے اس چیز سے انسان کبھی کبھی نفرت بھی کرنے لگتا ہے۔غرض یہ کہ انسان کی پسند ناپسند زندگی کی نشونما کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔اردو میں بیشتر ایسے افسانے اور ناول ہیں جن میں لڑکیوں کی ابتدائی بلوغت میں ہونے والی تبدیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے، ممتاز شیریں کا افسانہ ''انگڑائی'' اس کی بہترین مثال ہے۔

افسانے میں گلنار ابتدائے بلوغت سے اپنی استانی مس فنانس سے جذباتی طور پر وابستہ ہو جاتی ہے جسے حسن عسکری نے ''ہم جنسی میلان'' کا نام دیا ہے۔گلنار بلوغت کے پہلے دور میں اپنی ہی جنس کی طرف مائل ہو جاتی ہے لیکن ذہنی شعور کے بعد وہ مخالفِ جنس کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔افسانے میں ماضی اور حال کو دکھایا گیا ہے۔حال میں گلنار پرویز کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن گلنار ماضی کو بار بار یاد کرتی ہے اور مس فنانس سے لگاؤ اسے ذہنی انتشار میں مبتلا کرتا ہے۔ممتاز شیریں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے گلنار کی شخصیت کو منجمد بنا کر نہیں بلکہ اس کی شخصیت کو فعال بنا کر پیش کیا ہے۔افسانے میں گلنار کی شخصیت جس طرح نشونما پاتی ہے وہ ایک فطری امر ہے جسے ممتاز شیریں نے فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔حسن عسکری کے اس قول کو مدِ نظر رکھ کر افسانہ اس بات کی تصدیق خود کرتا ہے کہ گلنار ''ہم جنسی میلان'' کے مرض میں مبتلا ہے۔

''گلنار! نہ جانے تم مس فنانس پر مرتی ہو وہ کون سی ایسی حسین ہیں کہ بلکہ انہیں بدصورت بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا جی چاہتا ان چڑیلوں کے منہ نوچ لوں۔انہیں کیا معلوم کہ وہ مجھے کیسی حسین نظر آتی تھیں؛'' (افسانہ انگڑائی)

افسانے میں ہم جنسی اور مخالفِ جنس دونوں طرح کے جذبات کو برانگیختہ کیا گیا ہے۔بقولِ ڈاکٹر فوزیہ اسلم:

''جب عمر بلوغت کی حدود میں داخل ہوتی ہے تو گلنار کے خارج میں ہونے والی تبدیلیاں داخل میں ایک انگڑائی لے کر اس کے سارے نفسیاتی تناظر کو تبدیل کر دیتی ہیں اور اس کی توجہ ٹیچر یعنی ہم جنسی سے ہٹ کر پرویز یعنی جنسِ مخالف کی طرف مبذول ہو جاتی ہے'' ۳

ڈاکٹر فوزیہ اسلم کے اس قول میں کوئی شک نہیں کہ ہم جنسی سے جنس مخالف کا سفر طویل کرتی ہیں۔ممتاز شیریں نے افسانے میں اس بات کو یوں اجاگر کیا ہیں؛

''پھر جیسے دماغ میں خیالات سے یکلخت خالی ہو گیا ہو۔اور ان کی جگہ پرویز! پرویز! پرویز! پرویز!اور میں ایک حسین دنیا میں جا پہنچی ،جذبات کی ایک رنگین دنیا ،ہاں نہایت حسین ،کالج اور مس فنانس والی دنیا سے کہیں زیادہ حسین!'' (افسانہ انگڑائی)

افسانہ انگڑائی کی قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ افسانہ کوئی بناوٹی کہانی کو پیش نہیں کرتا ہے بلکہ کہانی حقیقی زندگی پر مبنی ہے۔ممتاز شریں نے گلنار کے کردار میں جو تبدیلی پیدا کی ہیں وہ بناوٹی یا خارجی نہیں ہے بلکہ داخلی تبدیلی ہے، جو حقیقت سے لبریز ہیں۔

افسانہ ''گھنیری بدلیوں میں'' کا موضوع ازدواجی زندگی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار ''نجمہ'' جو شادی کے کئی سال گزرنے کے بعد بھی اپنے شوہر سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔شوہر کا ہر کام خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہے۔لیکن جمیل کی دفتری زندگی اور مطالعے کے شوق نے نجمہ کو بے حد پریشان کیا ہے۔جمیل نجمہ کے لیے فرصت کے لمحات نہیں نکال پاتا پھر بھی نجمہ شوہر سے شکایت کیے بنا خود سے روٹھ جاتی اور خود ہی مان بھی جاتی ہے۔جمیل کی بے رخی اور نجمہ کی پریشانی سے کہانی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔آخر کار اس کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد نجمہ پر مایوسی کا عالم چھا جاتا ہے اور جمیل اسے اپنے بانہوں میں بھرتا اور پیار کرنے لگتا ہے۔اس طرح سے نجمہ کی ساری شکایتیں دور ہو جاتی ہیں۔افسانے میں شروعات سے آخر تک نجمہ کے خیالوں کا تسلسل برقرار رکھا ہے۔نجمہ اپنے شوہر سے جو چاہتی ہے وہ دنیا صرف خوابوں اور خیالوں تک محدود تھی۔مصنفہ نے نجمہ کی کشمکش کو افسانے کے آخر تک فنی چابکدستی سے قائم و دائم رکھا ہے جس میں مصنفہ کامیاب ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔

''نجمی! میری جان'' اور وہ اس کے سینہ میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے گی اتنا کہ اس کا دل پگھل کر آنکھوں کے رستے بہہ جائے جمیل اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر اسے تسلی دے گا'' (افسانہ گھنیری بدلیوں میں)

افسانے میں نئی بات یہ ہے کہ ایک بچہ ہونے کے باوجود بھی نجمہ اپنے شوہر سے ایسے محبت کرتی

ہے جیسے شادی کی ابتداء اب ہو چکی ہو۔ دراصل ذمہ داریوں کے بوجھ تلے بیوی اور شوہر کی محبت میں کمی آجاتی ہے اور بچہ ہونے کے بعد ساری توجہ بچے کہ اور چلی جاتی ہے، لیکن موصوفہ نے افسانے میں اس کے برعکس دکھانے کی کوشش کی ہے۔ عورت ہمیشہ اپنے شوہر کی توجہ اور محبت چاہتی ہے، اس کے عوض وہ شوہر کے سارے کام خوشی خوشی کرتی ہیں۔ افسانے کی نجمہ اس کی بہترین مثال ہے۔

نجمہ ایک فعال کردار ہے جس کی خواہشات شادی کے بعد بھی ویسی ہی رہتی ہے جیسے کہ ابتدائی دور میں تھی۔ اس حوالے سے ممتاز شیرین خود ''اپنی نگریا'' کے دیباچے میں یوں لکھتی ہیں؛

''گھنیری بدلیوں میں' اپنی نگریا اور انگڑائی بڑی حد تک آٹو گرافک ہیں، اس میں موضوع الگ ہیں، ''گھنیری بدلیوں میں'' میں کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔ اس میں میاں بیوی کی محبت ہے اور یہ کہ شدید محبت کی وجہ سے بیوی شوہر کی معمولی مصروفیتیں بھی اپنی رقیب معلوم ہونے لگتی ہیں، اس افسانے میں جو خاص بات ہے وہ اسکا پیش کرنے کا انداز ہے'' ۴

افسانہ ''رانی'' ایک نچلے طبقے کے میاں بیوی کی داستان محبت ہے۔ افسانہ رانی ممتاز شیریں کے دوسرے افسانے ''گھنیری بدلیوں میں'' کے بالکل برعکس ہے۔ متذکرہ افسانے میں بیوی اپنے شوہر کی توجہ کو ترستی ہے جبکہ افسانہ رانی میں بیوی اپنے شوہر کے بیمار ہونے پر دل و جان سے خدمت کرتی ہے اور بدلے میں شوہر کی توجہ اور محبت پاتی ہے۔ افسانے کی تکنیک کے حوالے سے ابوبکر عباد اپنی تصنیف ''ممتاز شیریں، ناقد، کہانی کار'' میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں؛

''رانی میں دو طرح کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ ایک واحد غائب کا بیانیہ، دوسری ہجوم کی گفتگو کی تکنیک'' ۵

افسانہ ''کفارہ'' ممتاز شیریں کا آٹو بیوگرافک افسانہ ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی تجربے کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے شہر سے دور مصنفہ نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔ افسانے کا عنوان ''کفارہ'' ایک بہترین اور موثر عنوان ہے، کفارہ جو مذہبی فریضہ ہے، کوئی گناہ ہونے کے بعد کفارہ ادا کیا جاتا ہے جس سے گناہ باقی نہیں رہتا ہے۔ افسانے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عورت کے لیے سب سے زیادہ خوشی کا مرحلہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ماں بن جاتی ہے۔ معاشرے میں عورت کا ماں نہ بننا گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ افسانے میں ان ہی باتوں کو سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔ افسانے میں بچے کی موت کا المیہ پیش کیا گیا ہے، دراصل موصوفہ نے اس تجربے کو بچے کی موت کے المیہ سے زیادہ ماں کی خواہش کا المیہ پیش کیا ہے کہ کس طرح بچے کی موت کے ساتھ ماں کے ارمان بھی قتل ہو جاتے ہیں۔ کفارے کا ہر لفظ اس کی بہترین مثال ہے:

''ساری ویرانی اور بنجر پن ساری تنہائی میرے اپنے اندر تھی سارا درد کرب پھر جاگ اٹھا یہ درد بڑا اذیت دہ تھا بہت.....زیادہ.....اذیت دہ.....'' (افسانہ کفارہ)

بچے کی موت کے بعد کہانی کا ایک ایک لفظ کردار کی بے چینی و بے قراری کی عکاسی کرتا ہے۔ اس الم ناکی سے ہر وہ عورت دوچار ہوتی ہے جو ماں ہو کر بھی ماں نہیں بن پاتی ہے۔ افسانے میں بچے کی پیدائش سے ماں کی عظمت کا احساس ہوتا ہے، جس طرح ماں کے بنا بچہ ادھورہ رہتا ہے ٹھیک اسی طرح بچے کے بنا عورت کو سسرال میں وہ مقام حاصل نہیں ہوتا ہے جس کی اصل میں وہ حقدار ہوتی ہے اور اسے ہمیشہ اس بات کا خدشہ رہتا ہے کہ کہیں اسے بانجھ کہہ کر شوہر اپنے گھر نکال نہ دے۔

اصل میں مذکورہ افسانہ اُن سینکڑوں عورتوں کی داستان ہے جو ماں بننے سے قاصر رہتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے پدرانہ نظام پر ایک گہری چوٹ ہے جس نے عوتوں کے لیے ایسے قوانین نافض کیے ہیں۔

مجموعی طور پر شوہر کو خوشی و سکون عطا کرنا ممتاز شرین کے نذدیک ازدواجی زندگی کا حاصل ہے۔ خوشحال ازدواجی زندگی ان کے افسانوں کا غالب موضوع رہا ہے۔ ان موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں افسانوی تکنیک کا تنوع ملتا ہے۔ مغربی علوم وفنون کا گہرائی سے مطالعہ کر کے انہیں افسانوں میں برت کر ایک کامیاب اور نمائندہ فنکار کی حیثیت سے ادبی دنیا کی افق پر چھاتی رہیں۔

◂◂ ● ▸▸

حوالہ جات:

۱؛ محمد حسن عسکری دیباچہ ''اپنی نگریا'' مکتبہ جدید لاہور، ۱۹۴۸۔ص۹

۲؛ ممتاز شریں قند خصوصی نمبر ۱۹۷۴۔ مشمولہ: خورشید زہرہ عابدی، ترقی پسند افسانے میں عورت کا تصور، اردو گھر انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۷۔ص۱۸۶۔۱۸۵

۳؛ ڈاکٹر فوزیہ اسلم، اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۰۹۔ص۲۶۸

۴؛ ممتاز شیریں، میرے افسانے (اپنی نگریا)، ۱۹۴۸۔ مکتبہ جدید لاہور نومبر ۱۹۴۷۔ص۲۳۹۔

۵؛ ابوبکر عباد، ممتاز شیریں: ناقد، کہانی کار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ ۲۰۰۶ء۔ص۹۱۔

Research scholar Department of urdu,University of Kashmir (India)190015
8082706051 orussashyakh123@gmail.com

- **منتخب افسانہ**
- **نجمہ محمود**

خالی جھولی

گھنٹے کی آواز کی گونج اور کلاس روم سے جلدی جلدی نکلتی ہوئی لڑکیوں کی ملی جُلی آوازوں کے شور میں جب وہ باہر نکلی تو ایک بج رہا تھا۔ اور اُس کے ذہن میں اپنے ننھے بچے ببلو کی تصویر اُبھر رہی تھی۔ آج اس نے کچھ زیادہ ہی اچھا پڑھایا تھا۔ اس بات سے خوش خوش اور اپنے بچے سے پانچ گھنٹے کی جدائی کے خیال سے اُداس اُداس وہ اسٹاف روم میں گپ کرنے کے بجائے سیدھی گیٹ کی طرف چل دی۔

ببلو کھانا کھا کر سو چکا ہوگا اور اب پانچ بجے اُٹھے گا۔ اُس کو مجھے دیکھے ہوئے پورے نو گھنٹے گزر چکے ہوں گے اور پھر مجھے تین سے چھ بجے تک امتحان کی ڈیوٹی کرنے پھر آنا ہے۔ وہ چکرا گئی۔

رکشا تیز کرو بھئی۔'' وہ بوکھلائی ہوئی سی بولی...... ببلو سو گیا ہوگا...... یقیناً سو گیا ہوگا...... اور شاہد میرے منتظر ہوں گے۔

''بی بی اس سے بھی تیز چلاؤں گا تو ٹکر ہو جائے گی۔'' رکشے والے نے نسبتاً شرافت سے کہا۔ راستہ میں اس نے رکشہ رکوایا۔'

'یہ پیسے اس بچے کو دے دو۔'' بچے نے جھپٹ کر سکہ اس کے ہاتھ سے تقریباً چھین لیا۔

''بے چارہ'' ...... کسی بچے کو بھیک مانگتے دیکھ کر وہ نہ جانے کیوں سہم جاتی تھی۔

''بیٹے کیا نام ہے تمھارا؟''

''منگلو...... پیسے مانگتا...... پیٹ کھالی ہے۔'' اس نے قمیض اُٹھا کر پیٹ دکھایا اور اس کے پیر چھونے لگا۔ اس نے بوکھلا کر اپنے پیر ہٹا لیے......

''مائی او مائی کھانا دے دے...... بھوکے ہیں...... مائی اور مائی او......''

رکشا والے نے جھنجھلا کر رکشا چلا دیا۔ لیکن وہ بچّہ رکشے کو پیچھے سے پکڑے ہوئے دوڑ رہا تھا۔ اُس نے رکشا رکوایا اور ایک دکان سے بسکٹ خریدے اور بنڈل اُسے تھما دیا۔ جسے پا کر وہ اس طرح سرپٹ بھاگا جیسے وہ بسکٹ کوئی اس سے چھین لے گا۔ ببلو اب سو گیا ہوگا...... یقیناً سو گیا ہوگا۔ اس نے بسکٹ کا ایک پیکٹ ببلو کے لیے بھی لیا اور...... کاش وہ ابھی سویا نہ ہو...... رکشا والا کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

''کیا کہہ رہے بھئی؟'' وہ تیزی سے رکشہ چلاتے ہوئے بولا۔

''بی بی اب یہ تم کو یونہی روز ملے گا۔''

وہ سنی اَن سنی کر گئی۔ ننھا ببلو یقیناً بہت مظلوم ہے۔ شکر ہے کہ اسے آیا اچھی ملی ہے کتنا پیار کرتی ہے وہ اُسے، شاید مجھ سے بھی زیادہ...... ٹہلاتی ہے، کھلاتی پلاتی ہے، نہلاتی ہے، سلاتی ہے۔ لگتا ہے جیسے وہی اس کی ماں ہو تو پھر میں اُس کی کون ہوں؟ کیا اُسے جنم دے کر میری ذمہ داری ختم ہوگئی ہے۔ گویا ایک بوجھ جو اُتر گیا۔ ہاں لطیفن ببلو کو اپنے گھر بھی لے جاتی ہے۔ ابھی اُسی دن لے گئی تھی تو بہت دیر بعد لائی تھی۔ اس وقت تو میں نے بھی سوچا تھا کہ چلو اچھا ہے میں لیکچر کی تیاری کر لوں گی...... لیکن...... بھئی یہ غلط ہے۔ اب میں اس سے کہہ دوں گی کہ ببلو کو جلدی لایا کرے...... لیکن سوال یہ ہے کہ جلدی لائے بھی تو کس لئے؟ میں تو اکثر و بیشتر گھر سے باہر رہتی ہوں۔ شاہد اپنے ڈیپارٹمنٹ چلے جاتے ہیں یا پھر گھر پر بھی ہوتے ہیں تو بھی بچے کی دیکھ بھال میں نہ جانے کیوں ایک روایتی قسم کی شرم محسوس کرتے ہیں۔ ہاں اب اُس سے ضرور کہوں گی...... کہوں گی کہ...... لیکن بھئی...... سچ مچ میرا سر پھر گیا ہے، میں بلاوجہ شک میں پڑ کر خود کو اذیت میں ڈال رہی ہوں...... یہ میرا وہم ہے۔ میری عدم موجودگی میں اگر وہ ببلو کا اتنا خیال نہ کرے تو نہ جانے بے چارے بچے کا کیا حال ہو۔ مانوس بھی کتنا ہو گیا ہے وہ اُس سے...... میری بھی پروا نہیں کرتا ہے۔ بے چارہ میرا ننھا سا بچہ...... اس کا دل ٹکڑوں میں بٹنے سا لگا۔

''رکشے والے جلدی چلاؤ بھئی۔''

''بی بی اس سے بھی تیز چلاؤں؟''

''ہاں بہت تیز چلاؤ...... میرا بچہ گھر پر اکیلا ہے...... لیکن آیا تو ہوگی...... شاہد بھی ہوں گے...... ہاں اُس دن نہ جانے کیوں شاہد کہہ رہے تھے کہ ببلو روز بروز دُبلا ہوتا جا رہا ہے...... واقعی دُبلا تو بہت ہو رہا ہے...... خیر میری چھٹیاں قریب ہیں، خوب اچھی طرح دیکھ بھال کروں گی۔ اُسے ہر وقت اپنے ہی پاس رکھوں گی...... پر ایک بات سمجھ نہیں آتی...... لطیفن یہ کیوں نہیں چاہتی کہ ببلو میرے پاس زیادہ رہے یا مجھ سے مانوس ہو جب بھی میری گود میں ہوتا ہے فوراً آ کر لے لیتی ہے...... ''او بھیا! چھوڑ و امّاں کا پیچھا۔ جائے دیو انھیں پڑھے لکھے کھاتِن...... '' یا پھر کہے گی...... لاؤ دیو ہمکا......'' اور ببلو بھی تو میری گود چھوڑ کر اس کے پاس چلا جاتا ہے۔ آخر کیوں؟...... ماں ہو کر بھی میں ماں نہیں لگتی۔ سب کہتے ہیں...... ''بچہ لطیفن پر بہت ہلا ہوا ہے، ماں کو پوچھتا تک نہیں......'' اونہہ بھئی...... میں کن بے کار باتوں میں الجھ گئی۔ اے بھئی یہی کیا کم ہے کہ وہ بچے کو اتنا زیادہ خیال رکھتی ہے۔ اور پھر خود کتنی صاف ستھری رہتی ہے اور بچے کو بھی صاف رکھتی ہے۔ اپنے گھر بھی لے جاتی ہے تو اس کے کپڑے لے جاتی ہے۔ کہتی ہے گھر پر کھیلتے کھیلتے گندا ہو جاتا ہے تو میں اسے نہلا دُھلا کر لاتی ہوں ورنہ رستہ میں لوگ دیکھ کر کیا کہیں گے کہ شاہد کا بچہ اتنا گندا رہتا ہے۔ واقعی اگر لطیفن جیسی آیا نہ ملتی تو سروس کرنا میرے بس میں

نہ تھا۔ میں کتنی بدھو ہوں جو اتنی محبت کرنے والی، تمیز دار عورت کے سلسلے میں ایسی باتیں سوچتی ہوں۔

سوچ کے دھارے رُکے تو سامنے گھر کا دروازہ تھا۔ شاہد خاصے بوکھلائے ہوئے سے برآمدے میں بیٹھے تھے..... بولے۔

''لطیفن کو گئے پورے چار گھنٹے ہو چکے ہیں پتہ نہیں کہاں لے جاتی ہے..... بھئی مجھے یہ عورت.....'' اور وہ بُری طرح گھبرا گئی۔

''یہ تو اس نے روز کا ہی دستور بنا لیا ہے..... اچھا میں ابھی آئی۔'' یہ کہتی ہوئی وہ جلدی سے باہر نکلی اور لطیفن کے گھر کا رُخ کیا جو خاصی دوری پر تھا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ وہ وہاں نہیں ہے۔ اُس کے گھر والے بے شک کافی گھبرائے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اور جب وہ وہاں سے نکلی تو اسے سمتوں کا اندازہ ہی نہ رہا..... نہ جانے کدھر جا رہی تھی..... خون اُس کی رگوں میں جم سا رہا تھا۔ سڑک پر بھاگتی رہی نہ جانے کتنی دیر..... رکشا لینے کا بھی اُسے ہوش نہ تھا۔ اور ایک جگہ وہ ٹھٹک سی گئی۔ سامنے ایک بچہ پھٹے ہوئے میلے چکٹ کپڑے پہنے ہاتھ میں بڑا سا پیالہ لیے دوڑ رہا تھا ہر راہ گیر کے پیچھے.....

''اے بابو پیسہ دے دے نا..... دو دن کے بھوکے ہیں..... اے بابو.....'' وہ ایک صاحب کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھول میں اَٹا ہوا تھا اس لیے اُسے پہچاننا ذرا مشکل تھا۔ لیکن اتنا زیادہ بھی نہ تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی جس کے ہاتھ میں بھی ایک پیالہ تھا اور ہر راہ گیر کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی تھی۔ اس کے پیالے میں چند سکّے تھے اور بچے کے پیالے میں بھی..... ''مائی..... او مائی..... وہ اس کی طرف پلٹا اور اس کے پیر چھونے لگا وہ کانپ گئی۔

اور پھر اس نے خود پر قابو پایا..... بڑے پُرسکون انداز میں آگے بڑھی اور ایک سکّہ اس نے بچے کے پیالے میں ڈال دیا..... اس لیے کہ اب اس کے پاس اُس کو دینے کے لیے یہی سکّہ تھا..... اور..... جھولی خالی تھی.....!

یہ بچہ اس کا اپنا بلو تھا..... اور لطیفن وہاں سے غائب ہو چکی تھی۔

اور روٹھا روٹھا سا ننھا بلو بھیک کا پیالہ لئے ہوئے ''مائی او مائی'' کہتا ہوا بھاگ گیا اور نہ جانے کدھر بھیڑ میں گم ہو گیا۔

◀◀ ● ▶▶

F 5 Azim Residency , Naale wali gali
New Sir Syed Nagar Aligarh
91 9837214069

● افسانہ

● نیلم احمد بشیر

خَلا

مہمانوں کے آنے سے پہلے فضیلہ نے اپنے بیک یارڈ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ سب کچھ کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ نفاست سے کٹی ہوئی ہری گھاس، ٹراپیکل پھولوں والے سرامک کے نمائشی گملے، لان کے ایک طرف نیلے نگینے کی طرح چمکتا ہوا بڑا سا سوئمنگ پول اور اس کے پانی سے اٹھتی کلورین کی مہک، اطراف میں بچھی پکنک ٹیبلز پر ہر طرح کا سامان خورد و نوش۔

''بڑی گرینڈ پارٹی لگ رہی ہے۔ فیزی!'' فضیلہ کے شوہر طارق احمد نے پارٹی کی تیاریاں دیکھ کر اپنی بیوی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''بس دیکھ لیں تیاری، آپ کو تو پتہ ہی ہے آپ کی بیٹر ہاف کی پارٹیاں کتنی سپیشل ہوتی ہیں۔ مہینوں اپ سٹیٹ نیویارک کی پاکستانی کمیونٹی میں چرچے ہوتے رہیں گے ہمارے۔'' فضیلہ اترا کر بولی اور قریب جا کر میزوں کو چیک کرنے لگی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو۔ ہر میز پر سفید میز پوش بچھا تھا جس پر سجی اعلیٰ کوالٹی کی ایسی خوبصورت ڈسپوزیبل پلیٹیں اور گلاس رکھے تھے جو دور سے بالکل اصلی چائنا کے لگتے تھے۔ باربی کیو انگیٹھیاں پہلے ہی جلا دی گئی تھیں جن پر سنکتے ہوئے سیخ کباب، چکن پیس اور یو ایس ڈی اے گریڈ ون کے بیف سٹیک کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

''یار فیزی! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔'' طارق زور زور سے ہنسنے لگا۔

''پلیز تاری! ابھی سے ٹپسی ہونے لگے تو آگے جا کر کیا ہوگا۔ ابھی تو پوری شام پڑی ہے۔'' فیزی نے خود سے چپکتے طارق کو اپنے سے علیحدہ کرتے ہوئے اس کا ڈرنک چھین لیا اور خود پی گیا۔

''یو آر اے ڈیول'' طارق نے اسے بھینچ لیا اور دونوں ہنس پڑے۔ ان کی نظریں اپنے ملین ڈالر ہاؤس پر پڑیں اور مسرت و اطمینان سے بھر گئیں۔ اللہ نے انہیں کتنا نوازا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل اور آپس میں محبت۔ ایک ہونہار، فرمانبردار پیارا سا بیٹا اور اس کی آئندہ زندگی کے خوشگوار خواب، انہیں اور کیا چاہئے تھا؟ آج وہ بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے بیٹے عمران نے اپنے ہائی سکول سے آنرز سٹوڈنٹ اعزاز

کے ساتھ گریجویشن کیا تھا اور سپورٹس میں بھی ڈسٹنکشن (Distinction) حاصل کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ساری کمیونٹی والے عمران کو کامیابی کی راہوں پر گامزن ہونے پر اپنی نیک تمناؤں سے نوازیں اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوں، ہنسیں بولیں، ہلہ گلہ کریں کیونکہ زندگی کی کامیابیوں کو اپنے دوستوں سے شیئر کرنا وہ بہت ضروری سمجھتے تھے۔ عمران کو کاؤنٹی سکولوں کے مابین مقابلوں میں بھیجا جاتا تھا، جہاں سے وہ ہمیشہ ٹرافیاں جیت کر لاتا اور اپنے سکول اور ٹاؤن کا نام روشن کرتا۔ مقامی اخبارات میں اس کی کامیابیوں کی خبریں اور تصاویر چھپتیں اور سب سے شاباش ملتی۔ طارق اور فضیلہ کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا اور وہ بیٹے کو سو سو دعائیں دیتے۔

امریکہ میں ہر طرح سے کامیاب زندگی گزارنے کے باوجود فضیلہ اور طارق احمد کے دلوں میں وطن کی محبت زندہ تھی۔ وہ باقاعدگی سے پاکستان جاتے اور کئی اداروں اور این جی اوز کو غریبوں کی مدد کرنے کے لیے موٹے موٹے چیک دیتے رہتے۔ طارق اپنے بیٹے عمران کو پاکستان کے بارے میں بتاتے اور یاد دلاتے ہوئے کہتے ''وہ بنیادی طور پر ایک پاکستانی امریکن بچہ ہے، اسے اپنی اصلیت، شناخت اور حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ جو لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے، ان کی آئندہ نسلیں بھٹک کر رہ جاتی ہیں بیٹا۔'' کبھی کبھار وہ عمران کو ایک کہانی سناتے اور کہتے ''سنو عمران! امریکہ دریافت کرنے کے بعد جب کولمبس اپنا سفینہ لے کر وطن واپس لوٹا تو اس کے عملے میں شامل ایک قیدی عورت دوڑ کر ساحل پر اتری اور بے تابانہ اپنی جنم بھومی کو بوسے دینے لگی۔ وطن کی محبت ایسا ہی طاقتور جذبہ ہوتا ہے بیٹا۔ وہ عورت میری آئیڈیل ہے اور میرے خیالوں میں بستی ہے۔ ہمیں اپنی اصل کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے عمران بیٹا۔'' عمران اپنے ڈیڈ کی باتیں سن کر مسکراتا اور انہیں ہمیشہ یاد رکھنے کا وعدہ کرتا۔

عمران ہائی سکول کے بعد کالج میں ایسے کورسز لینا چاہتا تھا جو اسے ایئر و ناٹک فیلڈ میں لے جانے میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ اسے بچپن سے ہی خلا باز بننے کا بہت شوق تھا۔ اس کے والدین اس کے اس عزم میں اسے مکمل طور پر سپورٹ کرتے تھے اور کیوں نہ کرتے۔ ان کے پورے خاندان میں، جن میں امریکہ میں بسنے والے کئی بہن بھائی اور کزن رشتہ دار شامل تھے، کسی کے بچے نے بھی کبھی اس طرف جانے کی خواہش یا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔

''میں تو اس دن کے انتظار میں جی رہا ہوں کہ میرا بیٹا کسی بڑے ناسا مشن میں جائے اور کامیاب لوٹے۔ ایک آدھ ستارہ تو ہماری گود میں لا کر ڈال ہی دے گا نا۔'' طارق سوچتے اور پھر سارے گھر میں گنگناتے پھرتے، ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں..... ''محبت مجھے ان جوانوں سے ہے، ستاروں پر جو ڈالتے ہیں کمند''..... عمران اپنے والد سے ان اشعار کا مطلب پوچھ کر مسکراتا اور ان کا یہ خواب پورا کرنے کا وعدہ کرتا۔ تھوڑی ہی دیر میں مہمان آنا شروع ہو گئے اور ہیلو ہائے، السلام علیکم کی ملی جلی آوازیں رنگین غباروں کی طرح فضا میں تیرنے لگیں۔ کمیونٹی کی معتبر شخصیات، قونصلیٹ کا عملہ، دوست احباب سب

ایک دوسرے سے ہیلو ہائے کر رہے تھے اور حال احوال پر چھڑ رہے تھے۔ طارق تیس سال سے یو ایس اے میں ایک کامیاب کارپٹ ایکسپورٹر کے طور پر اپنی ساکھ قائم کر چکے تھے اور آج ان کے اکلوتے بیٹے کی گریجویشن پارٹی تھی۔ ایسا ہنگامہ تو ہونا ہی تھا۔

''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' فیزی کے گلے سے لگنے والی نرم کومل آواز والی خاتون بولی۔

''روزی تم؟ یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بھئی؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔'' فضیلہ مکمل طور پر برقع پوش خاتون کو دیکھ کر حیرت سے کہنے لگی۔

''کم آن روزی، ہمیں بتا دیا ہوتا تو ہم بھی فینسی ڈریس پہن کر آ جاتے۔'' فضیلہ اور روزی کی مشترکہ دوست رشمی ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔

''فار گاڈ زسیک پلیز، تم دونوں خدا کا خوف کرو..... یہ فینسی ڈریس نہیں ہے۔ اب میں ہمیشہ اسی لباس میں رہتی ہوں۔ ناؤ آئی ایم بورن اگین مسلم۔ یونو، اللہ تعالیٰ نے ہم عورتوں کے لیے یہی ڈریس کوڈ تجویز کیا ہے تو ہمیں اسی طرح رہنا چاہئے اور اب پلیز مجھے آئندہ سے روزی نہیں، رضیہ کہہ کر بلایا کرو۔''

''اوہ آئی ایم سوری.....'' رشمی کچھ سنجیدہ ہو گئی۔ فضیلہ بھی اپنی پرانی سہیلی کی اس بدلی ہوئی ہیئت کو دیکھ کر پل بھر کو تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی روزی ہے جسے لاس اینجلس کی لائٹ آف دی پارٹی کہا جاتا تھا۔ اس کی ڈرنکنگ، ڈانسنگ، اور مردوں سے بے تکلفی کی داستانیں ویسٹ کوٹ سے نکل کر ایسٹ کوسٹ تک پھیل چکی تھیں۔ روزی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شرط لگا کر جس مرد کو چاہے اپنی طرف مائل کر سکتی تھی۔

''اچھا میں ذرا مغرب کی نماز پڑھ آؤں۔ وقت نکلتا جا رہا ہے۔ ایکسکیوزمی۔'' رضیہ اپنی سہیلیوں کو حیران پریشان چھوڑ کر گھر کے اندر چلی گئی۔

''کتنا چینج آ گیا ہے اس میں۔'' رشمی کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''یہ نائن الیون تو ہماری جان کو ہی آ گیا ہے۔ جسے دیکھو اسلامک فنڈامنٹیلسٹ بنتا جا رہا ہے یہاں۔ کیا ہو گا اس قوم کا آخر؟''

''سب نے برقعے، حجاب اور عبائیں پہن لی ہیں۔ خدا خیر ہی کرے۔'' دونوں سہیلیوں نے روزی کی کایا پلٹ جانے پر اپنے اپنے تبصرے شروع کر دیئے۔

سوئمنگ پول کے اردگرد پارٹی زوروں پر چل رہی تھی۔ ڈیک سے موسیقی فل بلاسٹ پر لگی ہوئی تھی اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ عمران کے ہم جماعتوں میں گورے، کالے، میکسیکن، چینی، ہسپانوی، ہر نسل کے بچے شامل تھے۔ خوش باش، کھاتے پیتے،

مسکراتے بچوں کو دیکھ کر ان کے ماں باپ بھی خوش تھے کہ سب اتنا گڈ ٹایم انجوائے کر رہے ہیں۔ کوئی پول میں نہا رہا تھا تو کوئی کسی کو پول میں گرا رہا تھا۔ کوئی میز پر تھرک رہا تھا تو کوئی تصویریں کھنچواتا ہوا پھڑک رہا تھا۔ عمران اپنے دوستوں کو آلو کے چپس اور سافٹ ڈرنکس پکڑاتا جا رہا تھا اور خوش تھا کہ وعدے کے مطابق اس کے تقریباً سبھی کلاس فیلوز پارٹی میں شریک ہونے کے لیے آ گئے تھے۔

''ماشاءاللہ بڑا پیارا انکل آیا ہے عمران بیٹا۔'' ایک آنٹی نے پاس آ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''کیوں نہ ہو، آخر بیٹا کس کا ہے۔'' طارق احمد فخریہ انداز میں ہنس کر کہنے لگے۔

''ہاں ہاں جب کسی بات کا کریڈٹ لینا ہو تو یہ آپ کا بیٹا بن جاتا ہے اور جب اس سے کوئی شکایت ہو تو یہ صرف میرا بیٹا ہوتا ہے۔'' فضیلہ مصنوعی غصے سے بولی تو طارق نے اپنی منہ بسورتی بیوی کے منہ میں آئس کریم کا چمچ ڈال دیا اور سب ہنسنے لگے۔

پارٹی اتنی زبردست تھی کہ کمیونٹی میں ہفتوں اس کا چرچا ہوتا رہا۔ دور دور کی ریاستوں سے ان دوستوں نے جو بوجوہ شریک نہیں ہو سکے تھے، مبارکباد کے فون کیے اور پارٹی مس کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے رہے مگر تحفے بھجوانے میں کسی نے کنجوسی نہیں کی۔ عمران کے لیے چیزوں کا انبار لگتا چلا گیا اور فضیلہ اور طارق انہیں سمیٹنے لگتے حالانکہ عمران کے پاس پہلے ہی بھلا کس چیز کی کمی تھی۔

گریجویشن کے بعد لمبی موسم گرما کی ایک تعطیل تھی اور پھر ستمبر میں کالج میں داخلہ ہونا تھا مگر کچھ عرصے سے طارق اور فضیلہ محسوس کر رہے تھے کہ سمسٹر قریب آتے آتے عمران اپنے داخلے میں کوئی خاص دلچسپی کا اظہار کرتا نظر نہیں آ رہا۔ اس کی بھلا کیا وجہ تھی؟ عمران جیسا تعلیم پسند بیٹا نہ کالج کے پلانز بنا رہا تھا اور نہ ہی ان سے کچھ زیادہ ڈسکس کر رہا تھا۔

''عمران بیٹا! تم نے اپنے کاغذات مکمل کر کے یونیورسٹی کو بھجوا دیئے ہیں نا؟'' ایک روز طارق نے اسے ناشتہ کی میز پر گھیر لیا۔

''ابھی نہیں ڈیڈ، میں آج کل ذرا کچھ مصروف ہوں۔'' عمران مزید کچھ کہے سنے بغیر اچانک کھڑا ہوا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک روز ڈیڈ نے اسے پھر جا لیا۔ ''دیکھو بیٹا! اگر تم نے واقعی خلاباز بننا ہے تو گھر بیٹھے تو نہیں بنو گے۔ اس کے لیے کالج تو جانا ہی ہوگا۔ پری کورسز کے بغیر ناسا پروگرام میں کیسے داخل ہو گے، سمجھ آ رہی ہے یا نہیں؟'' طارق کا لہجہ کرخت ہو گیا۔ فضیلہ نے شوہر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کی کہ اتنا غصہ نہ دکھائیں۔

''بیٹا! ڈیڈ کیا کہہ رہے ہیں، کچھ سنا تم نے یا نہیں؟'' ماں نے پیار سے بیٹے کے آگے چکن کا پیس

رکھتے ہوئے پوچھا۔

''مام، ڈیڈ! میں آپ دونوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' عمران کے چہرے پر ایک عجیب سی سنجیدگی چھا گئی۔ ''دراصل میں فی الحال آگے نہیں پڑھنا چاہتا۔'' کمرے میں ایک بم سا پھٹا اور در و دیوار لرزنے لگے۔

''کیا کہا؟ واٹ نان سینس؟ کیوں نہیں پڑھنا چاہتے؟ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ یہ کیا امریکن بچوں والی بات ہے۔ ہائی سکول نہ کالج ختم کیا۔ کوئی jobOdd کر لی، گیس سٹیشن پر گیس بھری۔ wages Hourly پر کام کیا، پھر Quit کیا۔ نہ کوئی تعلیم نہ تربیت، نہ کوئی مستقبل کا منصوبہ۔'' طارق غصے سے چیخنے لگے۔

''بیٹا ہم امریکیوں جیسے حرکتیں نہیں کر سکتے۔ ہم ایشین لوگ ہیں، ہم لوگوں کے زندگی میں Goals ہوتے ہیں، پلانز ہوتے ہیں، ہم اپنا وقت ضائع نہیں کر سکتے۔'' فضیلہ تحمل سے بات کرنے لگی۔

''آپ لوگ ایشین ہیں، میں نہیں۔ میں امریکن ہوں کیونکہ میں اسی سرزمین پر پیدا ہوا ہوں۔ آپ مجھے اپنی طرح سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔'' عمران پورے اعتماد سے ماں باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''ہائے اللہ پڑھو گے نہیں تو کرو گے کیا؟ باہر گھوم پھر کر آوارہ گردی؟ امریکن بچوں کی طرح، شراب، ڈرگز، بدکاری، ان لوگوں کا تو نہ ماں ہے نہ باپ، مگر تم ہمارے بیٹے ہو۔ ہم تمہیں یوں بگڑنے کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔'' فضیلہ بھی چیخنے لگی۔

''میں آوارہ گردی نہیں کروں گا مام!'' عمران نے اسے پیار سے چھوا۔

''تو کیا کرو گے گھر بیٹھ کر؟'' طارق نے فضیلہ کی طرف دیکھ کر سر پکڑ لیا۔ ''مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ صاحبزادے کے ارادے کیا ہیں؟''

''میں شادی کروں گا، مام! ڈیڈ!!'' عمران بڑے اطمینان سے بولا۔

''شادی؟ یہ شادی بیچ میں کہاں سے آ گئی؟ ابھی شادی کا کیا ذکر؟ ابھی تو تم بچے ہو۔ بیٹا عقل کرو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ شادی بھی وقت آ جانے پر ہو جائے گی۔ یہ وقت تمہاری تعلیم کا ہے۔'' فضیلہ نے پیار سے کہا۔

''کون ہے وہ؟ ڈاکٹر عنایت کی بیٹی نادیہ تو نہیں؟'' فضیلہ نوٹ کر رہی تھی کہ کچھ دنوں سے اس کے کافی فون آ رہے ہیں۔

''نو مام، وہ تو صرف میری دوست ہے۔'' عمران کچھ نروس سا نظر آنے لگا۔

''تو پھر؟ ہائے کہیں کوئی امریکن لڑکی تو نہیں؟'' فضیلہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

''کیا پاکستانی لڑکیوں کی کوئی کمی ہے امریکہ میں؟'' فضیلہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''ملوادوں گا آپ لوگوں سے اسے.....آج ہی.....مام! ڈیڈ!! آئی ایم سوری، آپ کو دکھ ہوا، لیکن بس میں اب کیا بتاؤں۔ مینڈی اور میں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بہت پیار ہے ہمیں ایک دوسرے سے۔ پلیز ٹرائی ٹو انڈرسٹینڈ۔'' عمران ماں باپ کو حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا اور وہ سوچنے لگے، جب ہیروشیما پر ایٹم بم گرا تھا تو کیا وہاں کے باسی بھی اسی طرح اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے راکھ کی ڈھیریوں میں تبدیل ہو گئے تھے؟''

کیا ہم سے کوئی غلطی ہوئی ہے فیزی؟'' طارق نے بچوں کی طرح روتے روتے فضیلہ کی گود میں سر دے دیا اور وہ خاموشی سے اسے تھپکا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

اگلے چند دن کچھ عجیب سی خاموشی میں کٹے۔ عمران صبح سویرے نکل جاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ ماں باپ سے بھی کم ہی ملاقات ہوتی۔ نہ جانے کہاں رہتا تھا وہ؟ فضیلہ اٹھتے بیٹھتے اس امریکن چڑیل کو کوسنے اور بددعائیں دیتی رہتی جس نے اس کے معصوم بیٹے پر جادو کر دیا تھا۔

''فیزی، ٹیک اٹ ایزی۔ کیا پتہ وہ اچھی لڑکی ہو۔ شاید وہ ہماری بیٹی بن جائے۔ آخر ہماری کوئی بیٹی بھی تو نہیں ہے ناں.....شاید اس میں خدا کی کوئی مصلحت چھپی ہو۔ آخر ہم اپنا اکلوتا بیٹا کھونا تو نہیں چاہتے نا'' طارق بیوی کو سمجھاتے رہے۔

''ہیلو مام! ڈیڈ!!'' عمران نے ایک شام گھر میں گھستے ہی انہیں پیار سے مخاطب کیا اور پھر کسی کو دروازے کے پیچھے چھپتے ہوئے دیکھ کر آواز دی.....''مینڈی، اندر آجاؤ.....ڈونٹ بی شائی۔'' چند لمحے مکمل خاموشی رہی، پھر عمران اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ فضیلہ اور طارق کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس کالی لمبی تڑنگی لڑکی کو انہوں نے عمران کی گریجویشن پارٹی میں دیکھ تو رکھا تھا لیکن شاید زیادہ قریب سے نہیں کیونکہ موٹے موٹے ہونٹوں، بڑی بڑی آنکھوں اور پیٹ کے نمایاں ابھار والی آبنوسی لڑکی کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ!'' طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ فضیلہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا اور اس نے کرسی تھام کر لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیئے۔

''کیا تم؟'' فضیلہ نے مینڈی کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے سوال بیچ ہی میں چھوڑ دیا۔

''یس۔ چار مہینے ہونے والے ہیں۔'' مینڈی نے اپنے پیٹ کی طرف فخر سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مینڈی کے جانے کے بعد گھر میں بھونچال سا آ گیا۔ ڈیڈ چیخ رہے تھے۔ مام زار زار رو رہی تھی اور عمران گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

''ہم نے تمہیں کیا نہیں دیا؟ تمہاری ہر فرمائش پوری کی.....پھر تم ہمارے ساتھ یہ سب کیسے کر

سکتے ہو؟''

''ڈیڈ سمجھنے کی کوشش کریں.....ہم نے جان بوجھ کر تو بے بی پلان نہیں کیا تھا۔ بس ہو گیا۔ یونو It happens.۔ عمران نے کندھے اچکائے۔ مینڈی بہت تنہا تھی۔ جیک کے ساتھ اس کا بریک اپ ہوا تو میں نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے، آپ ملیں گے تو خود ہی دیکھ لیں گے۔

''بے شرم لڑکے یہ ہمارا کلچر نہیں ہے۔'' ماں تڑپ کر بولی۔

''مام! یہ اس ملک کا کلچر ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ میں امریکن ہوں۔ یہاں کا رہنے والا ہوں۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ ہم ایشین بچوں پر اس سوسائٹی میں کتنے پریشرز ہوتے ہیں۔ جوان ہونے کے بعد ہم اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ کیسے ہو جائیں؟ اگر ہم کسی کے ساتھ ڈیٹنگ نہ کریں تو ہمیں ابنارمل یا ''گے'' سمجھ لیا جاتا ہے اور اگر اپنے فرینڈز کی طرح امریکن لائف گزاریں تو آپ لوگوں کی ویلیوز خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ہم لوگ اس سوسائٹی میں رہ کر مس فٹ نہیں ہونا چاہتے۔ یہ ہمارے سروائیول کا مسئلہ ہے۔ آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں یہاں رہنا ہے، ہمیشہ اور مستقلاً۔ ہمیں مت روکیں۔'' عمران کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ایک غلام زادی اب ہماری بہو بنے گی۔'' فضیلہ نے دانت پیسے۔ امریکی آسائشوں اور معاشی آسودگیوں کے غلام، تیسری دنیا کے تارک وطن، بے بسی کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اور لہریں اونچی سے اونچی ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ فضیلہ کو اپنی ایک پرانی امریکن ہمسائی یاد آ گئی جس نے اپنے بیٹوں کے لیے گھر میں پلے بوائے میگزین لگوا رکھا تھا۔ ''تم اپنے بیٹوں کو خود ہی کیوں بگاڑ رہی ہو؟'' ایک بار فضیلہ نے اس سے سوال کیا تو اس کے جواب نے فضیلہ کو حیران کر دیا ''میں نے یہ اس لیے لگوایا ہے کہ کہیں میرے بیٹے، لڑکیوں کی جگہ لڑکوں میں دلچسپی نہ لینے لگ جائیں۔''

طارق اور فضیلہ کی پاکستانی کمیونٹی کے لوگ حیران تھے کہ اتنی پیاری فیملی کو کس کی نظر کھا گئی؟ سب کچھ اچھا بھلا تو تھا۔ چند ماہ پہلے ہی تو اتنی عالیشان گریجویشن پارٹی دی تھی انہوں نے اپنے بیٹے کے لیے اور اب یہ اچانک شادی کا دعوت نامہ؟ فضیلہ نے رو رو کر پہلے ہی سب دوستوں کو بتا دیا تھا کہ ان کے بیٹے سے ایک غلطی ہو گئی ہے اور اب وہ اسے باعزت طریقے سے نبھانا چاہتے ہیں۔ راز تو شادی کے دن کھل ہی جانا تھا۔ ''شیطان کا کیا ہے کسی بھی وقت کسی کے بچے کو بھی بہکا سکتا ہے۔'' ان کے بچے کو بھی بس شیطان نے بہکا دیا تھا۔

ساری کمیونٹی میں ایک شادی پارٹی ہونے کے خیال سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خواتین اپنے نئے نئے پاکستان سے منگوائے ہوئے جوڑے پہننے کے خیال سے جھوم اٹھیں اور نوجوان لڑکے، لڑکیاں مہندی کے فنکشن پر ناچنے گانے کے خیال سے پروگرام سیٹ کرنے لگے۔ فضیلہ اور طارق نے سوچا اب سر پر پڑ ہی

گئی ہے تو کیوں نہ اسے خوبصورتی سے ہی نبھائیں۔انہوں نے دولہا دلہن کے لیے نئے سرے سے بیڈ روم کوری ماڈل کیا اور لاہور سے دلہن کے لیے ڈیزائنر عروسی جوڑے آرڈر کر دیئے۔طارق کی بہن زبیدہ نے کپڑے تو بھجوائے تھے مگر چونکہ اسے دلہن کی اصلی صورت حال نہیں بتائی جا سکتی تھی لہٰذا لہنگا شلوار ٹخنوں سے اونچی اور قمیض کمر سے تنگ رہی۔

شادی والے دن آبنوسی رنگت والی دلہنیا کو لال جوڑے میں لاکھ سجایا مگر وہ کسی بھی طرح پاکستانی دلہن نہ لگ سکی۔کرتے کی سلائیاں سائیڈ سے نکال دی گئیں مگر پھر بھی اس کا پیٹ گیند کی طرح باہر کو ابلتا دکھائی دیتا رہا۔چھوٹے چھوٹے گھنگھریالے سیاہ بالوں کے چھتے پر دوپٹہ ٹکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔بالوں کو ہر طرف سے لاکھ کلپ لگائے گئے تب جا کر کہیں سر پر دوپٹہ ٹھہرا اور فضیلہ کی جان میں جان آئی۔

''تم ایک بہت بڑی نیکی کا کام کر رہی ہو فضیلہ بہن۔اللہ تمہیں اس کا بہت اجر دیگا۔'' چہرہ چھپائے ہوئے رضیہ عرف سابقہ روزی نے فضیلہ کو گلے لگا کر پیار کیا تو فضیلہ آنے والی زندگی میں ملنے والی دودھ اور شہد کی نہروں کے کنارے بیٹھ کر ستانے کے خیال سے مسکرا دی۔دونوں سہیلیاں دلہن کو سرخ دوپٹہ اٹھا کر دھیرے دھیرے باہر لائیں تو مینڈی کی باسکٹ بال پلیئر سہیلیوں نے مسکرا کر تالیاں بجائیں اور آگے بڑھ کر اس کا دوپٹہ اور لہنگا اٹھا اٹھا کر اس پر ہونے والا کام دیکھنے لگیں۔انہیں مینڈی کے کپڑے بہت اچھے لگ رہے تھے۔

''Give me a joint.'' مینڈی نے اپنی ایک دوست لِنڈا کو قریب پاتے ہی اس سے ایک سگریٹ لیا اور زور زور سے کش لینے لگی۔

''you look stressed'' لنڈا نے پیار سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا تو مینڈی نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔

''بہت تھک گئی ہے مینڈی'' عمران نے اسے دور سے دیکھا تو اس کے قریب جا پہنچا اور مینڈی کی فرینڈز سے اپنی شیروانی آؤٹ فٹ پر داد سمیٹنے لگا۔مینڈی نے اپنے پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہنے لگی۔

''بے بی! لُک یور ڈیڈ از لکنگ سو ہینڈسم۔''

عمران بہت خوش تھا۔آخر اس کے ماں باپ اس کی خوشی کے لیے راضی ہو ہی گئے اور اب تو ان سب کی لگی بندھی روٹین لائف میں ایک خوشگوار تبدیلی بھی آنے والی تھی۔گھر کے آنگن میں ایک نئے پھول کی مہک پھیلنے والی تھی۔اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے پیارے ماں باپ کو چوم لیا۔

مینڈی کو پہلے مسلمان کر کے منزہ بنایا گیا۔اسلامی نام رکھنے کا ایک اہم مرحلہ طے ہو گیا۔جوان جہان کالی داڑھی اور شرارتی نظروں والے امام صاحب دلہن کے پیٹ کو مستقلاً گھورتے رہے مگر منہ سے کچھ نہ بولے۔

''فیزی! یہ تم نے بڑا نیکی کا کام کیا ہے.....ایک غیر مسلم کو مسلمان بنایا ہے۔اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی بہت جزا دیں گے۔'' رضیہ نے پھر سے فیزی کے کان میں سرگوشی کی تو فضیلہ پھیکی سی مسکراہٹ سے ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

بہو کے آجانے سے فیملی کے روز و شب میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔منزہ بیٹی اور عمران بیٹے کے باہر آنے جانے کے اپنے اوقات اور طور طریقے تھے۔فضیلہ کئی بار سوچتی کہ بیٹے کی شادی صحیح وقت پر اور کسی پاکستانی لڑکی سے کی ہوتی تو وہ بہو کے کتنے چاؤ پورے کرتی۔مگر یہاں تو اسے سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ بہو کے ساتھ کیسے پیش آئے؟ منزہ کھلاڑی لڑکی تھی،اس لیے جسمانی فٹنس کا پورا خیال رکھتی تھی۔چند ہی ماہ بعد اسے کسی باسکٹ بال میچ میں شرکت کرنا تھی جسے وہ کسی قیمت پر بھی مس نہیں کرنا چاہتی تھی۔اس لیے ہر وقت ورزش کرتی رہتی۔فضیلہ اسے پاکستانی کام والے زرق برق جوڑے پہنا کر فرینڈز کے گھروں میں دعوتوں پر لے جاتی تو وہ بہت انجوائے کرتی۔اتنی محبت کرنے والا شوہر اور خدمتگار ساس ملی تھی۔وہ تو ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔اس کا تو خیال تھا وہ اپنے بچے کو سنگل پیرنٹ بن کر پالے گی یا اپنی ماں کی مدد طلب کرے گی جو خود بھی ہمیشہ تنہا رہی تھی مگر یہاں تو سب کچھ اتنا مختلف اور اچھا تھا کہ لائف ونڈر فل ہو گئی تھی۔اب نہ اسے گھر کے کرائے کی فکر تھی نہ کمانے کی ٹینشن،بے بی کے لیے بھی سب انتظامات خود بخود ہوتے چلے جا رہے تھے۔

فضیلہ کو ایک فکر دن رات کھائے جا رہی تھی کہ اگر بچہ ماں پر چلا گیا تو پھر کیا ہوگا؟ وہ دن رات جائے نماز پر بیٹھی خدا سے التجائیں کرتی کہ ''اے اللہ پاک! میرے پوتے کو ماں جیسے موٹے بھدے نین نقش اور کالے چھتے جیسے پھولے بال نہ دینا۔یا اللہ! ہمارے حال پر رحم کرنا۔بچہ بیشک عمران جیسا نمکین ہو مگر اسے نقش پاکستانی دینا۔'' فضیلہ نے بہو کے کمرے میں جا بجا خوبصورت پاکستانی بچوں کی تصویریں سجا دی تھیں تاکہ وہ ہر وقت انہیں دیکھتی رہے اور ویسا ہی خوبصورت بچہ پیدا کرے۔

عمران بڑے شوق سے اپنی بیوی کو میڈیکل چیک اپ کے لیے لے جاتا اور اس کی صحت کے متعلق معلومات حاصل کرتا رہتا۔ہر ماڈرن امریکی جوڑے کی طرح ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچے کی پیدائش کے مرحلے میں ایک دوسرے کے مددگار اور معاون ثابت ہوں۔اس لیے انہوں نے ان کلاسوں میں بھی جانا شروع کر دیا تھا جہاں مرحلہ پیدائش کے دوران حاملہ ماؤں کو تنفس کے ذریعے آسان برتھ کی تربیت دی جاتی تھی۔

''مام ڈیڈ! میری پیدائش کے وقت آپ لوگ بھی بہت ایکسائٹڈ ہو رہے ہوں گے۔ہیں نا؟'' عمران نے اپنی بیوی کے لیے بنائی گئی لذیذ پنجیری اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہوئے پوچھا

''کتنا مزے کا ہے یہ۔'' منزہ بولی۔

''ہاں بیٹا! لیکن اب یہ بھی سوچو کہ تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے.....خلا باز بننا ہے۔'' ڈیڈ نے اسے وعدہ اور فرض یاد دلایا۔

''کروں گا، کروں گا.....سب کچھ کروں گا۔ آپ کے سب خواب پورے ہوں گے۔ آخر آپ میرے اتنے پیارے ڈیڈ ہیں۔ آپ کی سپورٹ نہ ہوتی تو میں زندگی کے اس حسین لمحے میں کتنا اکیلا رہ جاتا.....تھینک یو!''

منزہ بھی فرط مسرت سے ساس سے لپٹ کر بولی۔ ''یو آر دا بیسٹ۔''

فضیلہ کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا۔ ہائے کاش یہاں کوئی پاکستانی لڑکی ہوتی۔ خوبصورت، نازک اندام، پتلے پتلے نین نقش والی۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

''مام! کتنی اچھی بات ہے کہ منزہ اتنی خوش ہے.....ہم سب کو اسے خوش ہی رکھنا چاہئے۔ آپ لوگ بھی خوش ہیں نا کہ یہ بچہ اس دنیا میں آ رہا ہے؟''

طارق اور فضیلہ بیٹے کی معصومیت پر مسکرا دیئے۔

''ہاں بیٹا! ہم خوش اور بہت خوش ہیں۔ ہماری تنہائیاں دور ہو جائیں گی، گھر میں رونق ہو جائے گی، بڑا مزا آئے گا۔'' طارق بچوں کی طرح خوش ہو کر بولے۔

''میں نے اسلامی ناموں کی کتاب سے نام بھی چننے شروع کر دیئے ہیں۔'' فضیلہ نے اترا کر کہا.....''رحمان کیسا رہے گا؟''

''اچھا ہے، سویٹ ہے، لیکن ہم اسے Raymond رجسٹر کروائیں گے۔ مام ڈیڈ کے لئے رحمان رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟'' منزہ خوش ہو کر بولی۔

''گریٹ آئیڈیا ہنی! اس طرح اسے کوئی مسلم دہشت گرد نہیں سمجھے گا۔'' عمران نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

یوں تو بہو کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی جا رہی تھی، مگر پھر بھی نہ جانے کیسے ایک روز غسل خانے میں اس کا پاؤں پھسل گیا اور اُسے اُس وقت سے پہلے ہی دردیں شروع ہو گئیں۔ سب اسے لے کر بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے اور فوراً داخل کروا دیا۔ عمران اندر جا کر بیوی کو لاماز کی ورزشیں کروانے لگا اور فضیلہ نے تسبیح پکڑ کر خدا سے بچے کے صحتمند اور خوبصورت ہونے کی دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ طارق بھی نروس ہو کر ہسپتال کے کاری ڈور میں گھومنے لگے اور خدا سے یہ مرحلہ بخیریت طے ہونے کی دعا کرنے لگے۔

کئی گھنٹوں کی سخت لیبر کے بعد یکا یک عمران بھاگا بھاگا باہر دوڑ آیا۔ ''مام ڈیڈ! آ جائیں بے بی از ہیئر۔''

''اچھا؟ کیا ہوا ہے؟'' طارق نے بے چینی سے پوچھا۔

''تم نے دیکھا اسے؟'' فضیلہ نے بے تابی سے پوچھا۔

''نرس نے بس یہ بتایا ہے کہ لڑکی ہے.....بہت پیاری ہے.....چلیں چل کر دیکھتے ہیں۔'' عمران کی آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

''او ہو تو اب رحمان کا نام بدلنا ہو گا.....کیا رکھوں گی؟'' فضیلہ نے جلدی جلدی سوچا۔ ''چلو رحمان نہ سہی، ریما ہی سہی، ٹھیک عمران؟''

''آپ کی جو مرضی، مام!.....یہ آپ پر چھوڑ رہا ہوں۔'' عمران بولا۔

ذہن میں بہت ساری سوچیں جنم لینے لگیں۔ کاش لڑکی کا نام بھی پہلے ہی سوچ لیا ہوتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ تینوں بے چینی سے منزہ کے پاس چلے آئے۔ فضیلہ نے بہو کے ماتھے پر بوسہ دے کر بسم اللہ پڑھی اور چھوٹی پلنگیا میں لیٹی بے بی کو پیار سے اٹھا لیا۔

''ریما جانی آنکھیں کھول دو۔'' عمران، فضیلہ اور طارق نے سوئے ہوئے ننھی پری کو دیکھا اور اس پر سے کپڑا ہٹا دیا۔

''میرے اللہ! اس قدر خوبصورت بچی!'' سب حیران ہو کر وہیں جمے کے جمے رہ گئے۔ لچھے دار سنہری بالوں، گوری گلابی رنگت اور نیلی سمندر آنکھوں والی حسین باربی گڑیا گود میں آتے ہی بھوک کے مارے اوں اوں کرنے لگی۔ فضیلہ کو تو جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔ اس نے بچی کو ماں کے پہلو میں لٹا کر نفرت سے یوں منہ پھیر لیا جیسے اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی بدصورت بچی نہ دیکھی ہو۔

◂◂ ● ▸▸

28 B Lane V.Cavalry ground Lahore Cantt (Pakistan)
043341500108

● افسانہ

● نسترن احسن فتیحی

یہ عجیب عورتیں

نظروں کے سامنے گہری دھند تھی ..... گرد و غبار تھا شاید..... اس کا چہرہ ذرا سا چمکا تھا..... اس دھند کے پیچھے..... مگر شور اور بھیڑ میں وہ گم ہوگئی۔ میں نے اسے دو اور میں اپنی جگہ کھڑی اچانک بھیڑ سے الگ ہوگئی..... جیسے ہوا میں معلّق..... ہاں کسی کو پہچاننے کا یہ طریقہ صحیح ہے۔ میں نے ایک لمبی سانس لی اور اس چہرے کو یاد کرنے کی کوشش کی..... کون تھی وہ.....؟ حجاب تھا اس کے چہرے پر.....؟ یا..... نہیں، وہ تو سر برہنہ گھوم رہی تھی! شاید نوجوان سی تھی..... مگر پیشانی پر چند لکیریں بڑی واضح تھیں۔ پر یہ اچانک میں اس کے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی؟ مجھے یاد آیا جب وہ میرے پاس سے گزری تھی تو کسی نے کہا تھا، ''عجیب عورت ہے یہ'' اور میں نے تجسس میں ادھر نظر دوڑائی تھی۔ مگر وہ چہرہ سمجھ میں نہیں آیا تھا..... لیکن بہت شناسا بھی لگا تھا اور تب سے کانٹا سا بن گیا تھا اور دل میں چبھ رہا تھا..... ایک معمّے کی طرح..... میں اس معمّے کو حل کرنا چاہتی تھی..... کسی نے دھکّا دے کر مجھے بھی تو عجیب کہا تھا..... یہ تو ایک ایسا خطاب ہے جو کبھی نا کبھی ہر عورت کو ملتا ہے کیونکہ وہ دنیا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خود کو نہ جانے کتنے سانچے میں ڈھالتی چلی جاتی ہے اور بدلے میں اسے اس خطاب سے نواز دیا جاتا ہے۔ میں اپنی جستجو چھوڑ کر گھر واپس جانا چاہتی تھی مگر راستے کی دھند میں جیسے کھو گئی تھی۔ نظر نے ساتھ دینا چھوڑ دیا مگر میری سوچ نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ اپنے ذہن میں میں ان عجیب عورتوں کا خاکہ مرتّب کرتی رہی..... اور کیوں نہ کرتی؟ یہ لفظ عجیب اتنا سادہ بھی نہیں ہے۔ اتنا ہی پیچیدہ ہے جتنی پیچیدہ یہ عورتیں۔ اس لفظ کے اندر پرت در پرت مفہوم کی دنیا آباد ہے کیونکہ یہ اپنے اندر محبت، نفرت، غصّہ اور جھنجھلاہٹ سب کو سمیٹ لیتا ہے اور عجیب بن جاتا ہے۔ پھر کسی نہ کسی عورت کو خطاب کی طرح عطا کر دیا جاتا ہے۔ میں اسی خطاب کا پیچھا کرتے ہوئے جیسے بادلوں پر سوار ہوگئی جن میں بہت سارے رنگ شامل تھے۔ میں دونوں ہاتھوں سے ان رنگوں کو ہٹا کر جیسے کوئی واضح اور ٹھوس شبیہ تلاش کر رہی تھی مگر سب رنگ آپس میں خلط ملط ہوئے جا رہے تھے۔ ان رنگین بادلوں میں تیرتے ہوئے کبھی کبھی مجھے لگتا میں گہرے سمندر میں ڈوبتی جا رہی ہوں اور سانس لینا بھی میرے لئے دشوار ہے۔ اچانک میری آنکھ کھل گئی..... ذہن کی دھند چھٹ گئی۔ میں اپنے کمرے اور اپنے بستر پر تھی..... محفوظ و مامون۔ سانس لے رہی تھی۔ سب کچھ صاف صاف دیکھ سکتی تھی..... نہ دھند تھی، نہ بادل اور نہ

ہی کہیں گہرا سمندر تھا۔ نہ الجھے الجھے خیال..... بس دل پر کچھ بوجھ سا تھا اور سر میں درد۔

بارہ دیکھنے کی جستجو کی مگر نہیں..... دھند بہت گہری ہے..... یہ گرد و غبار نہیں، کہرا ہے شاید یا رات کا ملگجا اندھیرا..... میری جستجو جدّ و جہد میں بدل گئی..... میں اسے دیکھنا چاہتی تھی..... مجھے اس بھیڑ میں زور کا دھکّا لگا اور میں لڑکھڑا گئی.....

''عجیب عورت ہے۔'' کوئی بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

تو یہ عجیب عورتوں کی تلاش مجھے خواب میں پریشان کر رہی تھی۔ کیسی گھٹن تھی خواب میں۔ تو یہ میں نے کروٹ بدلی۔ لگتا ہے عرصے سے پرسکون ہو کر نہیں سوئی۔ کبھی بے خوابی میں پریشان سوچ الجھائے رکھتی ہے کبھی نیند میں دھندلے خواب۔

کچن کی کھٹ پٹ سے اندازہ ہوا کہ سونی آ چکی ہے اور روز کی طرح جلدی میں ہے۔ میں منھ ہاتھ دھو کر جب تک کچن میں پہنچی تو وہ چائے بنا چکی تھی۔ میں بالکنی میں آ کر بیٹھ گئی۔ خواب کا تاثّر زائل نہیں ہوا تھا۔ دل پر ایک بوجھ سا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ عرصہ سے دل میں ایک انجانی پھانس سی چبھی تھی جس سے بے خوابی کی شکایت رہنے لگی تھی اور جب نیند آتی بھی تو اس طرح کے خواب پریشان کرتے۔

''آنٹی! سب کام کر چکی ہوں، آج مسالہ آپ خود گرائینڈر میں پیس لیں؟'' اس نے چائے کی کپ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے چڑھ کر پوچھا۔

''میں نے آج نئی کرتی پہنی ہے۔ مسالے کی سل پر نہیں بیٹھوں گی۔'' یہ چھبیس یا ستائیس سالہ دوشیزہ سونی کے نخرے تھے۔ جو روز نئی نئی کرتی پہن کر آتی تھی اور کام سے جی چرایا کرتی تھی، مگر کچھ اس طرح استدعا کرتی کہ غصّہ نہیں آتا تھا۔

''ٹھیک ہے..... جیسے جی چاہے کر لو۔ پر تمہارا روز کا یہی ڈرامہ ہے۔'' وہ ہنستی ہوئی اپنا موبائیل سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر لہراتی ہوئی میرے سامنے سے نکل گئی۔

یہ بڑی عجیب ہے۔ کبھی اپنے حالات سے نالاں نظر نہیں آتی۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی اچھے لباس میں صاف ستھری نظر آتی۔ اس کی ایک بیٹی اور ایک ناکارہ شوہر ہے۔ وہ عجیب اس لئے ہے کہ شوہر سے پٹ کر ہر وقت طلاق ملنے کی دھمکی کے باوجود اس کے خلاف رپورٹ نہیں کرتی۔ جب لوگ اسے بتاتے کہ قانون بن گیا ہے تو یہ کہ کر سب کو لاجواب کر دیتی۔

''قانون بنانے والوں سے کہو، ان عورتوں کو پہلے انصاف دلوائیں جو دن رات پاور اور پیسے والوں کے ذریعے نوچی کھسوٹی جا رہی ہیں۔ وہ مجھ پر اپنی ناکامیوں کا غصہ نکال لیتا ہے پر میری عزّت کا

رکھوالا تو ہے۔دوسروں کی بہو بیٹیوں کو تو نہیں نگل رہا۔''

اسے ضد تھی کہ وہ اپنے بل بوتے پر اپنی بیٹی کو تعلیم دلوائے گی۔وہ مجبوری، بے بسی اور آنسو کو حقارت سے دیکھتی تھی۔محنتی تھی مگر اپنے کام کو آسان بنانے کا ہنر جانتی تھی۔وہ ایسے گھر اپنے کام کے لئے منتخب کرتی تھی جہاں کم اور سلجھے ہوئے کام ہوں۔چھوٹی فیملی ہو اور ہر وقت کی بک جھک نہ ہو۔وہ اپنے کام کو جاب کہلوانا پسند کرتی تھی اور اپنی بیٹی سے ہمیشہ کہتی کہ تو پڑھ لکھ کر مجھ سے اچھی جاب کرنا.....آفس والی.....گھر والی نہیں.....!ایک دن مجھے اخبار دیتے ہوئے صفورہ زرگر کی تصویر پر انگلی رکھ کر بولی۔

''میں اپنی بیٹی کو ایسا بناؤں گی..... پڑھی لکھی اور بہادر.....'' وہ خود بھی تو بہادر تھی..کتنی ہمت سے پچھلے دنوں اپنے نامساعد حالات کے باوجود مظاہرے میں ساری رات حاضر رہتی تھی، کیونکہ جینے کے لئے دن میں اسے مزدوری کرنا تھا۔یہ ہمّت اور یہ جذبہ مجھ میں کیوں مفقود ہے۔میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔اور کپ سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

اور یہ صفورہ زرگر..... یہ بھی تو کتنی عجیب لڑکی ہے۔اتنی کم عمر، نئی شادی شدہ اور تین ماہ کی حاملہ مگر اس نے کیا کچھ برداشت نہیں کرلیا اس چھوٹی سی عمر میں..اپنی پہاڑ جیسی ہمّت سے پورے ایک نظام سے ٹکرا جانا کیا معمولی بات ہے۔اس کی ہمت نے نظام کے جبر کو ہی نہیں، بلکہ اس جبر کی زد میں آئے اس خوف کو بھی للکارا تھا جو دلوں میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔اسی للکار نے تو میرے خوف کو کھینچ کر روشنی میں کھڑا کر دیا تھا اور میں خود سے شرمندہ تھی۔پچھلے دنوں ایک سو ایک دن چلنے والے احتجاج میں میں ایک دن کے لئے بھی اس اندھے قانون اور ظلم کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں اپنی آواز شامل نہیں کر پائی تھی۔گھر اور گرہستی کی مصروفیات چھوڑ کر اس طرح کے احتجاج اور مظاہرے میں شامل ہونا کیا آسان بات ہے۔.ہر وقت گولیوں بموں اور پولس کی لاٹھیوں کے خوف کے سائے میں.....وہ بھی دسمبر اور جنوری کی خون منجمد کر دینے والی اس سردی میں..... کھلے آسمان کے نیچے..... جب کہ ہر انسان اپنے گھروں کی محفوظ چہار دیواری میں آرام دہ رضائیوں میں دبکا رہتا ہے۔میں بھی تو دبکی رہی تھی۔خواب کے دھندلکے میں میں نے کئی بار صفورہ کا چہرہ بھی دیکھا تھا.....ایک پر اعتماد چہرہ۔کیا تمہیں اپنی نئی شادی شدہ زندگی کی فکر نہیں، نہ اس بدنامی کی جو تمہارے نام سے منسوب کی جارہی ہے اور نہ ہی اپنے آنے والے بچّے کی یا اس کے روشن مستقبل کی؟ اور وہ حقارت سے قہقہے لگاتی دھند میں غائب ہو جاتی جیسے کہ رہی ہو، کون سا روشن مستقبل، کون سی زندگی؟

.میرے دل کا بوجھ بڑھ جاتا۔میں نیند اور جاگنے کا فرق بھولتی جارہی تھی۔حقیقت اور خواب جب خلط ملط ہو جائیں تو جینا محال ہو جاتا ہے۔.زندگی اور موت کی دو انتہاؤں کے درمیان یہ خواب ہی تو ہے جس کے پیچھے ہم زندگی بھر دوڑتے ہیں۔اگر ان کے درمیان کی تفریق ختم ہو جائے تو ہم تعبیر ڈھونڈھنا

بند کر دیتے ہیں۔تب زندگی ہمیں ڈرانے اور تھکانے لگتی ہے۔میں سچ مچ تھک گئی تھی.....سوچتے سوچتے ڈر جاتی تھی کیونکہ بھول گئی تھی کہ جن پر زمین تنگ کر دی جاتی ہے اس کے لئے کوئی ہے جو دریا میں راستے بنا دیتا ہے اور اپنی ساری طاقت کے باوجود فرعونیت غرق ہو جاتی ہے ۔مگر ایسے نتائج کے لیے پہلے خود میں دریا میں اترنے کی ہمّت کرنی پڑتی ہے ۔

دروازے کی گھنٹی بجی تو میرے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا۔میری چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔میں دروازے کی طرف دوڑی۔اس خیال سے بھی کہ سونی کے جانے کے بعد سے دروازہ تو کھلا ہوا ہوگا۔نہ جانے کون ہے اس وقت۔دیکھا تو پڑوس والی دادی کھڑی تھیں۔انہیں ساری بلڈنگ کے ہر عمر کے لوگ دادی کہتے تھے۔

''السلام علیکم.....!''میں نے گرمجوشی سے کہا۔

''وعلیکم السلام.....آج حلیم بنایا تھا گھر کا..... بالکل صفائی سے بنا ہوا ہے۔اگر کوئی پرہیز نہیں تو لے لو۔''انہوں نے پیالہ میری طرف بڑھایا۔

''ارے آپ کے ہاتھ سے کیسا پرہیز؟ پر آپ نے کیوں زحمت کی مجھے بلا لیا ہوتا میں سونی کو بھیج دیتی۔''

''نہیں بھئی.....!پانچ ماہ سے گھر میں بند ہوں۔لاک ڈاؤن ختم ہونے کے بعد بھی، صبح کی سیر تو ختم ہی ہوگئی ہے۔اب اسی بہانے میں ذرا اپنے فلور پر ہی چل پھر لیتی ہوں۔اور دیکھو ماسک بھی لگاتی ہوں۔''

''.اتنی صبح صبح آپ نے حلیم تیار بھی کرلیا ؟''میں نے پیالہ پکڑتے ہوئے کہا

''یہ صبح ہے؟...گیارہ بجنے والے ہیں۔''

''آپ اندر تو آیئے..... میں نے تو ابھی صبح کی چائے بھی نہیں پی، اس لئے میرے لیے یہ صبح کی شروعات ہی ہے۔''میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیر تک سونا تم نئی نسل والوں کا طریقہ ہے۔ہم تو پانچ بجے اٹھنے والے لوگ ہیں۔ویسے بھی سارا دن اور ساری رات.احتجاج میں شامل ہونے کی عادت نے صبح ہی صبح سارا کام ختم کر لینے کی عادت کو اور بھی پختہ کر دیا ہے۔''وہ اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''میں حیرت کے سمندر میں غرق ہوگئی۔اسّی سالہ اس خاتون کے خون میں کہاں سے اتنی گرمی آ گئی کہ برف گراتے آسمان کے نیچے بیٹھنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا تھا ان میں۔''

''کیا ہوا بی بی.....کس سوچ میں گم ہو.....؟.میرا پیالہ خالی کر کے لے آؤ۔''میں ان کی آواز کے ساتھ سوچوں کی گرداب سے باہر آئی۔

''جی.....ابھی لائی۔مسز فرحان تو بہت تعریف کرتی ہیں آپ کے کھانوں کی۔''میں ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔واپسی میں چائے کی ٹرے میرے ہاتھ میں تھی۔

''ارے چائے بنانے کی زحمت کیوں کی؟'' انہوں نے خوش دلی سے ماسک اتارتے ہوئے کہا۔ میں نے دو پیالیوں میں چائے نکالی، اوران کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آج آپ کے ساتھ ہی سہی۔'' مسکرا کر بولیں۔

''مسز فرحان کے یہاں بھی حلیم دے کر آئی۔ آجکل تو گھر میں ہی ہیں..... آفس بند ہونے کی وجہ سے..... کورونا نے سب کو قید کر دیا ہے۔ ان کے شوہر کہنے لگے۔

''گھر کے کھانے کا مزہ تو آپ کی وجہ سے آتا ہے ورنہ نغمہ ہوٹل کا بنا ہوا لا کر سرو بھی خود سے نہیں کرنا چاہتیں۔ مگر لاک ڈاؤن میں سب بند ہے، اور ہر وقت گھر میں پکا پکا کر مسز کی حالت خراب ہے۔'' پھر کچھ توقف کے بعد بولیں۔

''کتنی عجیب ہیں نا؟ کھانا بنانا بھلا کیا مشکل ہے؟؟''

''جی ورکنگ ہونے کی مجبوری ہے۔ بے چاری گھر سے دس گھنٹے تو باہر ہی رہتی تھیں۔ اس لیے باہر کے کھانے کی عادت پڑ گئی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں اسی لیے میں نے کہ دیا جو کھانا ہو مجھے کہہ دو میں بنا دیا کروں گی۔ خوش ہو گئے۔ دونوں کہنے لگے، آپ کے یہاں کا صاف ستھرا بنا ملے تو میں اپنے دوستوں سے بھی کہوں گا آپ سے منگوالیا کریں آپ یہ کام شروع کر دیجئے۔ مفت کیوں کھلاتی ہیں۔''

''ہاں پر..... اس عمر میں اتنی محنت آپ کیسے کر لیتی ہیں؟''

''ارے بی بی یہ میرا شوق ہے۔ میں اپنی کام والی کی مدد سے سب کر لوں گی۔ مجھے سے خالی نہیں بیٹھا جاتا۔ سب نے اپنی اپنی نوکرانی کو بلانا شروع ہی کر دیا ہے۔ میں بھی بلواتی ہوں پر ہر طرح کی احتیاط لازمی رکھتی ہوں۔''

''جی..... احتیاط تو لازمی ہے، قدرت نے ایک عجیب امتحان میں ڈال دیا ہے ساری انسانیت کو۔''

''اس کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے، اس کی ذات سے نا امید نہیں ہونا چاہئے۔ اچھا خدا حافظ تمہیں بھی ابھی کام ہوگا۔ چلتی ہوں۔'' وہ چائے کی خالی پیالی میز پر رکھتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔ جاتے جاتے وہ ایک اور عجیب عورت سے میرا تعارف کروا گئیں..... مسز فرحان سے..... بلکہ دو عجیب عورتوں سے۔ خود بھی تو عجیب ہیں۔ اسّی سال کی عمر میں نہ جانے کہاں سے اتنا جوش اور شوق سنبھال کر باقی رکھا ہوا ہے۔ میں اپنے کمرے میں واپس آئی تو لگا جو پھانس دل میں چبھی ہے وہ ابھی تک نکلی نہیں ہے، اب بھی میں اس مطلوبہ چہرے تک پہنچ ہی نہیں پا رہی تھی، نہ خواب میں اور نہ ہی حقیقت میں۔ یہ ساری عجیب عورتیں ہمارے ہی درمیان کی معمولی عورتیں ہیں جو کوئی نا کوئی زندگی کا مقصد لے کر بس جئے چلی جا رہی ہیں..... میری

طرح۔ مجھے اوپر کے فلیٹ والی سنیتا یاد آئی..... سنگل پیرنٹ۔ اسے میں کبھی معمولی نہیں سمجھتی تھی۔ شوہر کے مسلسل جبر کا شکار شادی کے آٹھ سال بعد اپنے بچّوں کے ساتھ الگ ہو گئی۔ تعلیم یافتہ، خوبصورت اور اسمارٹ۔ کھل کر جیتی ہے۔ لڑکوں کے ساتھ دوستی رکھنا، خوب گھومنا، مست رہنا اس کے لئے معیوب نہیں ہے، مگر انباکس میں گلدستے، دل اور بوسے بھیجنے والوں کو دور تک رگید دیتی ہے۔ زندگی ہو یا انباکس، حد تجاوز کرنے کی کوشش کرنے والوں کو حد میں رکھنے کے لئے اس کی ایک گرم نگاہ ہی کافی ہے۔ اس کا کوئی بھی عمل مخفی نہیں ہوتا، اس لئے وہ اپنے موبائل میں پاس ورڈ لاک رکھنا پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ وہ اپنے کسی عمل پر پشیمان نہیں رہتی۔ اس کے بچّے بہت پیارے ہیں۔ جن پر وہ جان نیوچھاور کرتی ہے۔ اس لیے ان کے مستقبل کے لئے فکر مند رہتی ہے۔ گاؤں چھوڑ کر شہر بھی اسی لیے آئی کہ ان کا مستقبل محفوظ کر سکے۔ پر جب سے شہریت قانون آیا ہے۔ فکر مند رہتی ہے۔ مائکے اور سسرال کسی کا سہارا نہیں۔ صرف اسکول کالج کی ڈگری ہے۔ اب وہ کیسے اور کہاں سے لائے اپنے پرانے کاغذات؟ کہتی ہے۔

''اب سے پہلے کبھی اتنا کمزور خود کو محسوس نہیں کیا تھا۔'' اور تب احساس ہوا تھا کہ وہ بھی ایک معمولی اور کمزور سی عورت ہے۔ میں نے سوچا..... شاید اپنی کمزوری اور معمولی پن سے جوجھنے کی ادنیٰ سی خواہش انہیں عجیب بنا دیتی ہے۔ ڈگر سے ہٹ کر بنے بنائے راستوں پر چلنے سے انکار کی کوشش..... ہاں یہ سب عورتیں نہ تو خاص ہیں اور نہ ہی غیر معمولی۔ یہ سب معمولی عورتیں ہیں..... سب عورتوں کی طرح..... اپنے بچّوں، اپنے سہاگ اور اپنے مستقبل کے لئے سرگرداں اور پریشاں۔ پھر میں ان ہی کے بارے میں کیوں سوچ رہی ہوں؟ مجھے خواب میں ان کے ہی مختلف ہیولے کیوں نظر آتے ہیں؟؟ ہم سب معمولی عورتوں میں کچھ بھی غیر معمولی نہیں سب میں چند خوبیاں اور چند خامیاں ہیں بس۔ پھر ہمیشہ یہ عجیب کی تلاش. مجھے ایک بند دروازے کے سامنے لے جا کر کیوں کھڑا کر دیتی؟ فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میرے بیٹے کا ہوگا۔ ہندوستاں سے باہر بھیج کر کتنی خوش تھی کہ اس کا مستقبل محفوظ کر دیا ہے..... پر اب ڈرنے لگی ہوں۔ فون پر نہ جانے کیا سننے کو ملے؟ دنیا میں کوئی جگہ ہے جو محفوظ ہو؟ میں نے فون ریسیو کیا..... دعا کرتے ہوئے کہ سب خیریت ہو۔

''امّی.....! مجھے گھر واپس آنا ہے۔''

''کیا ہوا بیٹا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ یا نوکری؟'' میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

''اسپیشل فلائیٹ سے کافی لوگ اپنے اپنے ملک لوٹ رہے ہیں۔ میرا دل یہاں نہیں لگ رہا۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں..... اپنے ملک میں..... اپنے گھر پر۔''

''ہاں..... ہاں بیٹا..... واپس آ جاؤ۔ میرا بھی دل نہیں لگ رہا۔ حالات جیسے بھی ہوں مل کر ہمّت بنی رہتی ہے۔''

''شکریہ امّی .....میں کل بتادوں گا کب کی فلائٹ ہے۔''

کبھی کبھی ہم فیصلہ نہیں کر پاتے کہ جو ہو رہا ہے وہ بہتر ہے یا نہیں۔ مجھے لگا کہ اس کی نوکری جا چکی ہے ، جسے وہ ابھی بتانا نہیں چاہتا تا کہ میری ہمّت بنی رہے۔ایک نوکری جانے سے مستقبل تو ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس خبر سے،اس فیصلے سے مجھے ایک سکون حاصل ہوا.....جیسے میری کھوئی ہوئی طاقت واپس مل رہی ہو۔ ایسا لگا ذہن سے ساری دھند صاف ہونے لگی ہے۔میں خود کو جن عورتوں سے بالکل الگ سمجھ رہی تھی،اس ایک خبر سے اب خود کو اسی قطار میں کھڑا ہوا دیکھ سکتی تھی۔اور میرا چہرہ بھی ان سارے معمولی چہروں میں شامل ہو چکا تھا۔یہ سارے معمولی چہرے مل کر ایک بھیڑ میں بدل گئے.....جس میں سونی بھی تھی.....اسّی سالہ دادی بھی.....اکیلی بچوں کی پرورش کرنے والی پڑوسن سنیتا بھی اور گھر اور کچن کے کام سے گھبرانے والی مسز فرحان بھی۔یہ سارے چہرے ضرب ہوتے ہوتے ایک لا متناہی بھیڑ میں بدل گئے.....ایک سیلاب کی طرح سڑکوں پر ابل آئے۔یہ ساری کی ساری عجیب عورتیں طاقت کا استعارہ بن کر ابھریں اور ساری دنیا کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔انہوں نے اپنی فولادی ہمّت سے طاقت،حکومت قانون سب کی سانسیں پھلا دیں.....جوان کے سامنے آتا ان کی پھنکار سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا۔ آسمان سے برسنے والی موسم کی شدّت بھی ان کے پیر اکھاڑ نہ سکی۔موت کا خوف بھی انہیں باز نہ رکھ سکا۔اپنے آنچل میں اپنے لال کو سمیٹے.....اپنی ہی زمین پر اپنے آنے والی نسلوں کے لئے اور ان کے مستقبل اور حقوق کے لئے بھیڑ بن کر سڑکوں پر بیٹھ گئیں تھیں۔ان کی اس عجیب ہمّت اور خصلت نے بدخواہوں کے دانتوں چنے چبوادئے۔میرا لال بھی واپس آرہا تھا.....بلکہ اسے بھیج کر اب تک خود دھوکے میں جی رہی تھی۔میں ان سے الگ نہیں تھی۔مجھے بھی اس کے مستقبل کی فکر کرنی تھی۔پرندے لوٹ کر گھونسلے میں ہی آتے ہیں اور اس گھونسلے کو محفوظ رکھنا ہمارا فرض تھا۔ میرے دل میں سکون اتر آیا۔میں اب خود کو ان عجیب عورتوں میں شامل کر کے پرسکون ہو گئی تھی۔دریا پر ہمارے قدم پڑ چکے تھے۔

◂◂ ● ▸▸

LISAN". Road No.-5, Iqra Coloy, New Sir Syed,Nagar,
Aligarh(UP) 202002.
MB NO.- 9599396218

● **افسانہ**

● **ڈاکٹر صادقہ نواب سحر**

بوڑھی پڑوسن کا موبائل

جلدی جلدی برقعہ پہن کر اور چہرے پر نقاب لگا کر فائزہ نے جیسے ہی گھر سے باہر قدم رکھا،اس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی۔دو سال کا عدیل اپنے دائیں پیر میں چمکیلا اور چلتے وقت چوں چوں کرتے ہوئے روشنی دینے والا جوتا پہنے ماں کے ساتھ باہر جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔اپنے ننگے پیر سے وہ زمین پر پڑی ہوئی مٹّی کو ادھر ادھر پھیلا کر اس کھیل کا لطف لے رہا تھا۔

''ارے! آپ کا بائیں پیر کا جوتا کہاں گیا؟''

''گر گیا۔'' عدیل نے پلکیں جھپکائیں۔

''اندر گرا دیا؟ اُف! ایک تو دیر ہو رہی ہے۔اس پر.....'' فائزہ کو اس کی معصومیت پر پیار بھی آرہا تھا اور چڑ بھی۔اس نے بڑبڑا کر دروازے پر پڑے تالے کو ہاتھ لگا کر بولی۔

''جوتا اندر چھوڑ آئے بابو!''

''نہیں ،اسکوٹر پر پھینک دیا۔''

''اسکوٹر پر کیوں پھینکا؟''

''اسکوٹر گندا ہے۔چھی!''

''اسکوٹر بدرنگ اور ٹوٹا پھوٹا ہے!! بڑا آیا نزاکت والا! جیب تو فضول چیزوں سے بھری رہتی ہے۔''

گرنارا پارٹمینٹ کے پیچھے کسی کا خالی پلاٹ پڑا ہوا تھا۔جس میں اب گیراج کا کام ہوتا تھا۔درختوں کی ٹہنیوں میں ٹائر لٹکے ہوئے ہوتے تھے۔ایک پھٹا پرانا صوفہ سیٹ اور پلاسٹک بھی پڑی ہوئی تھی۔یہاں سے دن بھر اسکوٹر اور موٹر سائکلیں مرمت کرنے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔فائزہ کو یہ آوازیں پسند نہیں تھیں مگر ہال کی یہ بالکنی عدیل کو بہت پسند تھی۔اکثر اپنے کھلونوں کے ساتھ یہاں بیٹھا رہتا تھا۔سامان بھی گراتا رہتا۔

فائزہ نے جھٹ عدیل کے دائیں پیر کا اکلوتا جوتا دروازے کے ساتھ لگے شُو رَیک پر پھینک دیا،رَیک میں رکھا ہوا ایک جوڑی جوتا ہاتھ میں اٹھا لیا اور عدیل کو گود میں اٹھا کر لِفٹ کی جانب لپکی۔

''سنو بیٹا'' ایک بوڑھی آواز نے فائزہ کو پلٹنے پر مجبور کیا،''بیٹا ذرا ایک فون لگا دو۔''

فائزہ کا پہلی منزل پر دوسرا فلیٹ تھا۔ پہلے فلیٹ کے مکینوں نے فائزہ کے گھر کی دیوار تک لوہے کی گرِل لگالی تھی۔ اس طرح یہ لوگ رات کو تالا لگا کر اپنے گھر کی حفاظت کا بندوبست بھی کر لیتے تھے۔ ان کے فلیٹ کے سامنے کی دیوار بھی لوہے کے جنگلے سے محفوظ تھی۔ ''سنو بیٹا۔'' خاتون نے دوبارہ آواز دی۔

''آپ؟''

''میں اس گھر کے مالک کی ماں ہوں۔'' فائزہ نے پچھلے تین برسوں میں پہلی بار اس درمیانی مانگ، کھچڑی بال، گلابی ہونٹ، معمولی قد وقامت اور گورے رنگ کی بزرگ خاتون کو دیکھا تھا۔ اس کے کان زیور سے خالی تھے مگر وہ کلائیوں میں سونے کی ایک ایک چوڑی پہنے ہوئے تھی۔ اس کا لباس سیدھا سادہ تھا۔ وہ پنجابیوں کے انداز میں سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے تھی، جس پر ہلکے بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول بنے ہوئے تھے۔ اسے بغور دیکھتے ہوئے دیکھ کر خاتون نے سر پر پڑے دوپٹّے کو کانوں کے پیچھے اڑس لیا، دوپٹے کا ایک پلہ سر کے پچھلے حصے میں ڈال کر سینے کو ڈھکتا ہوا دوسرا پلہ بائیں کندھے سے پیٹھ کے پیچھے ٹھیک کیا۔ اس کا جھرّیوں بھرا جسم اس کے کم از کم پچاسی سال کا ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔ فائزہ نے اب تک تو اس گھر کے ریٹائرڈ تحصیلدار، ان کی بیوی، ان کے ایک بیٹے، ایک بیٹی اور اُن کے پریواروں کو ہی دیکھا تھا۔

''بیٹا، ذرا ایک نمبر لگا دو۔''

''سب کہاں ہیں؟'' فائزہ نے پوچھا۔

''پوتڑ بہو بچے کے پیدائش کے سلسلے میں یہاں آئی تھی۔ وہ بچے کو لے کر دوبئی لوٹ رہی ہے۔ وہ سب انھیں ائیر پورٹ چھوڑنے گئے ہیں۔''

''آپ گھر میں اکیلی ہیں؟''

''اب تک کام والی تھی۔ اب وہ پڑوس کی گلی میں میری چھوٹی بہو کے گھر کام کرنے گئی ہے۔ بیٹے کی بہو جا رہی تھی اس لیے میں یہاں آ گئی تھی۔ میں یہاں نہیں رہتی۔ چھوٹی بہو کے گھر رہتی ہوں۔''

''بہو کا یا بیٹے کا گھر؟''

وہ چپ رہی۔

''یہ میری چھوٹی بہو کا نمبر ہے۔'' وہ فائزہ کو ایک پیپر دیتے ہوئے بولی، ''اس کو بولو کہ کام والی سے کام ہو جائے تو بائی کو میرے پاس بھیج دے۔''

فائزہ نے فون ملایا اور کہا، ''وہ فون اٹھا نہیں رہی ہیں۔''

''اچھا!'' بڑی بی نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا، ''بچوں کو اسکول چھوڑنے گئی ہوگی۔''

''ہوسکتا ہے۔'' فائزہ نے بس جواب دے دیا۔

''مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے..... آپ رک سکیں گی کیا؟'' اس نے اپنے دوپٹے کے کنارے سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور اچانک فائزہ سے پوچھا، ''اس منزلے پر کوئی نہیں ہے؟ فلیٹ نمبر تین پر تالا پڑا ہے۔''

''اب مجھے جانا ہوگا۔'' فائزہ ہمدردی کے چکّر میں کلاس مِس کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''تھوڑا سا ٹھہر جاؤ۔''

''اچھا!''، فائزہ نے ایک لمحہ سوچا، ''اچھا، بس دس منٹ ٹھہر سکتی ہوں۔''

''آؤ بیٹھ جاؤ۔'' پڑوسن نے جھٹ گرل کا گیٹ کھولا اور سامنے پڑی اکلوتی پلاسٹک کی سفید کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

''آپ بیٹھیے۔'' فائزہ جھجکی۔

''میں ایک اور کرسی لے آتی ہوں۔''

''میں لے آؤں؟'' فائزہ کو بڑی بی پر رحم آ رہا تھا۔

''رہنے دو۔ چلو اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔''

دونوں ہال کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ فائزہ نے نقاب الٹ دیا۔ بڑی بی فلیٹ کے اندر سے ایک ہوا بند ڈبہ لے آئی اور اس میں سے چار نائس بسکٹس نکال کر عدیل کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بچہ جلدی سے ماں کی گود سے اتر گیا اور وہیں ایک گوشے میں بیٹھ کر وہاں پڑے ہوئے کھلونوں سے کھیلنے لگا۔

''گیارہ بج کر دس منٹ!'' فائزہ نے اپنے موبائل میں وقت دیکھ کر پڑوسن کی جانب نظر ڈالی۔

''میں بارہ بجے تک لوٹ آؤں گی۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

''میرا قرآن فہمی کا کلاس ہے۔'' بڑی بی چپ ہوگئی۔

''شاباش! جیتی رہو! قرآن کو سمجھ کر پڑھنا تو بڑی اچھی بات ہے۔ بلکہ ہمیں اسے اپنی زندگی میں اتارنا چاہیے۔''

''جی۔ میں چلوں؟''

بڑی بی کے چہرے پر مایوسی کی لہریں تھیں۔

''ایک کام کرتے ہیں۔ تحصیلدار صاحب کو فون لگاتے ہیں۔'' فائزہ نے مشورہ دیا۔

''میرے خیال سے وہ لوگ پہنچتے ہی ہوں گے۔'' وہ ٹیلی فون ڈائری میں بیٹے کے نام کا صفحہ نکالنے لگیں۔

''یہ نمبر ہے میرے بیٹے کا۔'' وہ اطمینان سے بولیں۔

فائزہ اپنے موبائل پر لگاتار تحصیلدار صاحب کا نمبر لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تین بار لگایا۔ تینوں بار 'نو ریپلائی' آیا ہے۔ شاید وہ اجنبی نمبر اٹھاتے نہ ہوں!'' فائزہ کی بات سن کر بڑی بی زبردستی مسکرائیں۔

''گھر کا لینڈ لائن نمبر بند کروا دیا ہے۔ آج کل سب کے ہاتھوں میں موبائل فون ہیں نا!''

''آپ کے پاس موبائل ہوگا!'' فائزہ نے پوچھا۔

''ہاں میرے پاس ہے نا! چارج کرنے کے لئے رکھا ہوا ہے۔'' خلافِ توقع جواب ملا۔

''ایسا کیجیے، آپ اپنے نمبر سے لگائیے۔''

وہ صوفے کے پیچھے کھڑکی کا پردہ سرکا کر اپنا موبائل اٹھا لائی اور نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

''فون نہیں لگ رہا ہے بیٹا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اپنے فون سے نمبر لگانے کی دوبارہ کوشش کرتی ہوں۔'' فائزہ نے کوشش جاری رکھی تھی کہ اتنے میں ایک فون آ گیا۔

''آپ کون؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے بیٹے کا فون!'' بڑی بی نے بچوں جیسی خوشی کے ساتھ کہا۔

''جی جی'' فائزہ نے فون بڑی بی کی طرف بڑھا دیا۔

''ہاں بیٹا! میں بول رہی ہوں، امّاں! بہو چلی گئی کیا؟..... جاتے وقت میں اس کو کچھ دینا بھول گئی تھی۔ میری طرف سے اس کے بابو کو دو سو روپئے دے دینا۔'' فائزہ کے موبائل سے باتیں کرتے کرتے بڑی بی فلیٹ کے دروازے کے باہر گرل تک پہنچ گئی۔

''سنو بیٹا! مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ گھر میں پڑوسن بیٹھی ہے۔ میں باہر آ کر بات کر رہی ہوں۔'' خاتون نے کہا۔

دو منٹ بعد لوٹ کر خاتون نے فائزہ کو اس کا موبائل لوٹا دیا۔ فائزہ نے موبائل بیگ میں رکھا۔ بچے کے ہاتھ کے کھلونے دوبارہ ان کی جگہ رکھ دیے، بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اس اور بولی، ''سوا گیارہ بج چکے ہیں۔ مجھے جانا ہوگا۔''

''دیر ہوئی! جاؤ جاؤ۔ شکریہ۔'' بڑی بی نے فون لوٹاتے ہوئے کہا۔ فائزہ تیزی سے لفٹ کی جانب بڑھی۔

''تم تھوڑا رک نہیں سکتیں کیا بیٹا؟'' پیچھے سے خاتون کی آواز لگائی۔

''نہیں اب میں نہیں رک پاؤں گی۔'' فائزہ نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

وہ خاموشی سے نیچے اتر آئی۔ اپارٹمینٹس کے کمپاؤنڈ سے روڈ کے بائیں طرف مڑنے تک گرل کی جالی سے جھانکتی ہوئی آنکھیں اسے بے چین کر رہی تھیں۔ فائزہ کے فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔

''میں تحصیلدار صاحب کی بیوی بول رہی ہوں۔ ذرا اماں سے بات کرائیے۔''

''معاف کیجیے۔ ابھی میں بلڈنگ سے باہر آ چکی ہوں بلکہ گلی سے باہر رویندر بھارتی اسکول سے بھی آگے نکل چکی ہوں۔'' فائزہ نے جھٹ کہا۔

''کوئی بات نہیں۔''

''مجھے کلاس کے لئے لیٹ ہو رہا تھا۔''

''ہم تھوڑی دیر میں گھر پہنچ رہے ہیں۔ دس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔''

''میں اب تک ان کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔''

''دراصل میری دیورانی بچوں کو ٹفن دینے چلی گئی تھی۔ اچھا اللہ حافظ۔ جزاک اللہ خیر۔'' فون بند کر کے فائزہ نے کندھے اچکائے اور اپنے آپ سے بولی، ''مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہیں؟ پتہ نہیں!''

کلاس اٹینڈ کر کے فائزہ ساڑھے بارہ بجے گھر لوٹی۔ عدیل کو پاس کھڑا کر کے تالہ کھولتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے جائزہ لیا۔ پڑوس کے گھر میں چہل پہل تھی۔ گرل کی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ گرل کے پیچھے سے دو شفیق آنکھیں جھانکتی سی محسوس ہوئیں۔ جیسے شکریہ ادا کر رہی ہوں۔

سردی بڑھ رہی تھی۔ عدیل نے اپنے نئے نئے تیز اور نوکیلے دانتوں سے اپنے سویٹر میں جگہ جگہ سوراخ کر دیے تھے۔ فائزہ نے شوہر سے سویٹر کے لیے اون کے گولے منگوائے تھے۔

''تم ایسا کرو کہ جلدی سے نیچے اتر کر اون لے جاؤ۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' شوہر کا فون آتے ہی فائزہ جلدی سے بلڈنگ سے نیچے اتر آئی۔

''امی! گارڈن!'' عدیل نے ماں کی گود سے آواز لگائی۔ باپ کو عدیل پر پیار آیا بولے، ''بیٹا، مجھے ایک فارین کلائینٹ سے ملنے جانا ہے۔ فائزہ تم چلی جاؤ۔ میں تمھیں نہرو گارڈن پر ڈراپ کر دیتا ہوں۔ رکشا سے لوٹ جانا۔ مجھے دیر ہو جائے گی۔'' فائزہ کار میں بیٹھ گئی۔

''اچھا سنو!'' شوہر نے ذرا رک کر کہا، میں ہی چھ بجے گارڈن سے تم دونوں کو لے لوں گا۔'' رکشہ سے مت لوٹنا۔''

''بیٹا!'' واپسی میں لفٹ سے نکلتے ہی فائزہ کو بڑی بی کی آواز سنائی دی۔ اس نے جھٹ دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

پڑوسیوں کے سیفٹی ڈور پر تالہ تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے اس نے شوہر سے پوچھا، ''تحصیلدار

صاحب کی ماں دکھائی نہیں دیتیں نا!''

''ارے میں تمھیں بتانا بھول گیا۔ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔''

''انّا للہ وانّا الیہ راجعون''، فائزہ نے جھرجھری لی،''کب ہوا یہ؟''

''اپنی بلڈنگ کے واٹس ایپ گروپ پر خبر تھی۔آج چوتھا دن ہے۔''

''پڑوس میں میت ہوئی۔خبر نہیں ہوئی!!''

''انتقال ان کے اپنے گھر میں ہوا تھا۔''

''اپنا گھر!''

''ہاں وہ اپنے گھر میں چھوٹے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔''

''آج چوتھا دن ہے!یعنی انتقال اسی دن جب وہ مجھ سے ملی تھیں!!''، وہ لرز گئی تھی،''اسی لیے وہ اتنی بے چین تھیں۔''

''تحصیلدار صاحب کے گھر پُرسے کے لیے جانا چاہیے۔''شوہر نے کہا۔

''ضرور ہو آیئے۔''فائزہ بولی۔

''نہیں،تم بھی چلنا۔''

''اوکے''شوہر نے فائزہ کی لرزتی آواز کو محسوس کیا۔

پڑوسیوں کے سیفٹی ڈور پر تالا پڑا ہوا تھا۔ایک ہفتہ بعد شوہر نے پڑوسیوں کا سیفٹی ڈور کھلا دیکھ کر پوچھا،''چلیں ان کے گھر؟''

''نہیں رہنے دیجیے۔''فائزہ نے کہا۔

''کیوں؟''

''مجھے وہ گرل اچھی نہیں لگتی۔''فائزہ نظریں جھکائے ہوئے بولی۔

''پینٹنگ کروانے کو کہوں؟''شوہر بادلِ ناخواستہ مسکرائے۔

''وہ بات نہیں۔''وہ دھیرے سے بولی۔

''.....''شوہر خاموش تھا مگر اس کی نگاہیں منتظر تھیں۔

''مجھے اس کی جالیوں میں سے بڑی بی کی آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔''فائزہ نے اپنی گھنی پلکیں اٹھائیں۔اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے تھے۔

''ایسے نہ کہو۔تحصیلدار صاحب ابھی ابھی مغرب کی نماز سے لوٹے ہیں۔چلو مل آتے ہیں۔''

وہ بادلِ ناخواستہ بچے کے بال سنوار کر شوہر کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئی۔

پڑوس کے سیفٹی ڈور پر لگی گھنٹی عدیل نے بجادی اور جھٹ باپ کی گود سے نیچے اتر گیا۔

''ارے ارے! کیا کر رہے ہو؟''، باپ نے اسے اپنی جانب کھینچا،''یہاں آؤ! یہ کچرے سے کیا نکال لیا؟''

''نئیں،میرا ہے۔''

''تمہارا کیسے ہوگیا؟''

باپ نے اسے دوبارہ گود میں اٹھاتے ہوئے کہا،''گھٹیا چیزیں منہ میں لے کر اسے چوستے ہو! پھینکو اِسے۔''

تبھی دروازہ کھُلا۔

''السلام علیکم تحصیلدار صاحب۔''

''وعلیکم السلام۔آیئے۔''

''لے لیجیے،دروازے کے باہر پڑا تھا۔بچے نے اٹھالیا۔''

''میرا ہے۔''عدیل نے ہاتھ کھینچ لیا۔

''تمہارا کیسے ہے!دے دو۔انکل کا ہے۔'' عدیل رونے لگا۔

''ارے یہ تو پچھلے سال پانی میں گر کر خراب ہوگیا تھا۔اب بچوں کا کھلونا ہے بس۔''تحصیلدار صاحب نے پیار سے کہا،''تمھیں چاہئے کیا؟لو بیٹا تم رکھ لو۔لے لو بیٹا۔''

''ذرا ادرک کی چائے بنالو۔سر درد ہو رہا ہے۔''گھر میں داخل ہوتے ہی شوہر نے چائے مانگی۔

''تھوڑی دیر سے بناؤں؟''فائزہ کی غیر ہوتی حالت دیکھ کر شوہر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''امی!امی آپ یہ لے لیں۔لیں نا!''عدیل نے اپنی امی کو تھام کر اپنا کھلونا ماں کے ہاتھ میں تھمادیا۔

''فون نہیں لگ رہا ہے بیٹا۔''فائزہ کے کانوں نے بوڑھی آواز کی سرگوشی سنی۔

''ہاں یاد آیا!''، فائزہ نے اچانک شوہر کی جانب دیکھا اور بولی،''یہ موبائل اس دن بڑی بی کے ہاتھ میں تھا۔''اس نے موبائل عدیل کے ہاتھ میں دے دیا۔

◂◂ ● ▸▸

Flat No. 301-3rd Floor SadiquaMansion,ShastriNagar,
Asbove Axis Bank
Khapoli, Dist-Raigarh,(M.S)4102031
Email:-sadiquanawabsaher@hotmail.com
Phone:9370821955

● افسانہ

● رینو بہل

دو نیناں

قاضی گنج جانے کی میری ضد سے نیل پریشان ضرور تھا مگر میرا عزم دیکھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ اُسے خوشی بھی ہوئی تھی۔ انسان جب زندگی کا طویل سفر طے کر آخری پڑاؤ کی جانب رُخ کرتا ہے تو ماضی کی یادیں سائے کی طرح اُس کے اردگرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ ماضی کا خوش گوار موسم اکثر ہلکی سی خلش ہلکی سی ٹیس ہلکی سی چبھن بھی ساتھ لاتا ہے۔ سُنبل ایسی خوشبو تھی جس کا ذکر میرے دل کو شادمانی کے ساتھ ساتھ درد میں لپیٹ لیتا۔ میری چھوٹی بہن پریتی کی سہیلی جو مجھے پریتی کی طرح ہی عزیز تھی اور جسے میں نے ننی کلی سے خوبصورت پھول بن کر کھلتے، مہکتے اور اس کے وجود کی خوشبو سے سب کو تر بتر ہوتے دیکھا اور پھر کئی سال بعد جب اچانک قاضی گنج میں دوبارہ اتفاقاً اس سے ملاقات ہوئی تو وہی پھول کملا چُکا تھا مرجھائی پنکھڑیاں ٹوٹ کے بکھر رہی تھیں۔ اُسے دوبارہ دیکھنے، اُس سے ملنے کی خواہش کو میں دبا نہ سکی۔

کار جس رفتار سے منزل کی طرف بڑھ رہی تھی اُس سے بھی کہیں تیز رفتار میرا ذہن ماضی کا سفر طے کر رہا تھا۔ نیل کا میرے ساتھ ہونا یا نہ ہونا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ میں آنکھیں موندے سیٹ کی پشت پر سر ٹکائے ماضی کے سفر میں تھی اور نیل سوچ رہا ہوگا بوڑھی ماں تھک کر سو گئی ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ پُرسکون رکھنے والا چہرہ کن کن راستوں سے گزر رہا ہے۔

میری دادی ہمیشہ کہا کرتی تھی کہ لڑکی کی شکل نہیں قسمت خوبصورت ہونی چاہیے۔ اُس وقت لگتا تھا کہ جسم کی خوبصورتی ہی سب کچھ ہے۔ سُنبل ہمارے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ لاہور کے کھاتے پیتے گھروں میں اُن کے خاندان کا شمار ہوتا تھا۔ پریتی کی دوست ہونے کی وجہ سے ہمارے گھر اُس کا آنا جانا لگا رہتا۔ بچپن سے ہی بڑی شوخ، چنچل، نرم رو، نرم خو، نرم گفتار، مسکراتی تو پھول جھڑتے کھلکھلا کر ہنستی تو جلترنگ بج اُٹھتے۔ پورے آب و تاب کے ساتھ اُس کی جوانی نے انگڑائی لی تو نہ جانے کتنوں کے دل اُسے دیکھتے ہی دھڑک اُٹھے۔ اُن میں سے ایک دل میرے اکلوتے بھائی کا بھی تھا جو اُس کی کالی کجراری آنکھوں میں ڈوبنے کو بے تاب تھا۔ اُس کی کھلی رنگت، کالی گھنی سیاہ زلفوں اور بھرے بھرے لبوں نے اُسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ میں بھی چاہتی تھی کہ یہ پھول ہمارے آنگن میں کھلے مگر اُس کے ماں باپ کو لاہور کے بڑے تاجر کے گھر سے اُن کے اکلوتے بیٹے کا رشتہ آیا تو

انہوں نے باقی سب کو نظر انداز کر دیا۔ سولہ سال کی کچی عمر میں ہی ہاتھ پیلے کر کے رخصت کر ماں باپ نے سُکھ کی سانس لی۔ ابھی ہاتھوں کی مہندی کا رنگ پھیکا بھی نہیں پڑا تھا کہ ماں باپ کو بیٹی کے چہرے کے اُڑے رنگ نے پریشان کر دیا۔ مہینے میں ہی اُس کے شوہر کیلاش نے اپنا اصلی رنگ دکھا دیا تھا۔ رئیس اکلوتے وارث کے ہر بگڑتے رنگ کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ عیاشی کے جراثیم اس کے اندر اس قدر پیوست ہو چکے تھے کہ معصوم، پارسا، خاندانی، خوبصورت، نوخیز کلی سی بیوی کی خوبیاں بھی اُسے شراب اور بازاری حسن کے رس مین ڈوبنے سے نہ روک سکیں۔ بیوی کے آنسو، ماں باپ کا غصہ، ساس سُسر کی دھمکی سب بے اثر ثابت ہوئے۔ کم سنی اور کم علمی بھی کبھی کبھی حوصلے پست کر دیتی ہے۔ اُس نے بھی اِسے اپنا نصیب مان کر ہتھیار ڈال دئے۔ واپسی کے سبھی راستے خود بند کر لئے جب اُسے علم ہوا کہ اس کے پاؤں بھاری ہیں۔ ننی سی اُمید کی کرن پھوٹی تھی کہ تقسیم ملک کے سانحہ نے زندگی کا پانسا ہی اُلٹ دیا۔ قتل و غارت، عصمت دری، لوٹ پاٹ، آگ زنی نے سب تباہ کر دیا۔ بھرا پُرا گھر چھوڑ نقدی اور زیور سمیٹ کنبے کے ہمراہ وہاں سے نکل پڑے۔ ہندوستان پہنچتے پہنچتے دس میں سے صرف تین افراد رہ گئے باقی راستے میں ہی ہلاک ہو گئے۔ اس کی پہلی اولاد کا جنم رفیوجی کیمپ میں ہوا۔

دوسروں کی طرح وہ بھی زندگی کو پٹری پر لانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ پرتھوی کا تبادلہ قاضی گنج ہوا تو اتفاقاً سُنبل سے ملاقات ہو گئی۔ مجھے پہچانتے ہی کِھل اُٹھی۔ اچانک اُسے سامنے دیکھ کر لگا کہ جیسے میرا کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔ زبردستی ضد کر کے گھر لے گئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اُس کی زندگی کی پست حالی دیکھ کر دل میں ہوک اُٹھی۔ محلوں میں رہنے والی کیسی زندگی جینے کو مجبور تھی۔ چھوٹے چھوٹے تین کمروں کا گھر باہر بڑا سا دالان اور اُس کے بیچ و بیچ آم کا پیڑ جس کے نیچے تخت اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بچوں کی ریل پیل سے چھوٹا سا گھر بھرا پُرا لگ رہا تھا۔ چائے کے دوران اُس نے بتایا کہ کیلاش نے کئی طرح کے کاروبار شروع کئے کئی بند کئے۔ نا تو اُسے کسی کام کا تجربہ تھا اور نہ ہی اُسے محنت کی عادت تھی۔ پیسہ دھیرے دھیرے ختم ہونے لگا زیور دھیرے دھیرے بکتے گئے۔ آمدنی کم سے کم ہوتی گئی اور کھانے والے افراد ہر سال بڑھتے گئے۔ بازاری عورتوں کا سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر شراب کی لت نہ چھوٹی۔ سولہ سال کی عمر میں شادی ہوئی اور پہلی اولاد سترہ سال کی عمر میں ہی گود میں آ گئی۔ اور تیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اُس نے کوکھ کی دس فصلیں کاٹ دیں۔ جس میں سے پانچ بچ گئے اور پانچ ضائع ہو گئے۔ گیارھویں فصل کا بیج بو چُکا تھا جب کہ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ کمزوری اتنی ہے کہ اگر پھر حمل ہوا تو جان کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ پھول سا بدن سوکھے پتے کی طرح مُرجھا گیا تھا۔ زرد چہرہ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ بدن کا خون نچوڑ دیا گیا ہے۔ میں نے جب اپنائیت اور حق سے ڈانٹ کر سمجھانے کے لہجے میں بات کی تو اُس کی آنکھیں برس پڑیں۔

''میں اس دوزخ میں جلتے جلتے تھک چُکی ہوں۔ اسے ناغہ کی عادت نہیں۔ اُن چار دنوں میں

بھی نہیں جب ہمارے یہاں رسوئی میں جانا معیوب ہوتا ہے۔'' یہ سُنتے ہی میری آنکھیں بھی مچل اُٹھیں۔ دیمک کی طرح وہ اُسے چاٹتا رہا اور اُس کے جسم کو کھوکھلا کر ڈالا۔

عورت کے جسم پر مرد جبراً حکومت تو کر سکتا ہے مگر دل کے دروازے جبراً کھول نہیں سکتا۔ دس بچے جن کر بھی دِل کورا کنوارا ہی رہا۔

سُنبل کے گھر سے واپس آ کر بچوں کی ریل پیل، اُن کا رونا، اُن کا چلانا، لڑنا جھگڑنا کانوں میں دیر تک گونجتا رہا اور اپنا آنگن ویران اور زیادہ سُونا لگنے لگا۔ اب میرا زیادہ وقت سُنبل کے گھر گزرنے لگا۔ پرتھوں کے دفتر جانے کے بعد گھر کا کام نپٹا کر بچوں کے لیے ہر روز کچھ نئی کھانے پینے کی چیز بنا کر لے جاتی۔ اُس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام نپٹا دیتی۔ اُس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود میں اُس کی ایک نہ سُنتی۔ سارا دن سکھ دُکھ بانٹتے بچوں کی دیکھ بھال کرتے کیسے گزر جاتا، پتا ہی نہ چلتا۔ دیپک اور چراغ پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ پرتھوی نے اپنا رسوخ استعمال کر کے دونوں کی فیس معاف کروادی اور باقی چھوٹے دونوں بیٹوں چمن اور کنچو کی فیس کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ مالک نے ایک ہی بیٹی دی اور وہ بھی سیدھی یعنی غائب الدماغ۔ نام تو اُس کا لتیکا رکھا تھا مگر لتیکا کو للّی بننے میں دیر نہ لگی۔ سُنبل سارا دن گھر کے کاموں اور بچوں میں اُلجھی رہتی، اُسے فرصت کہاں ملتی بچوں کی پڑھائی دیکھنے کی یا پھر للّی کا علاج کرانے کی۔ للّی کی ذمہ داری میں نے لے لی۔ پرتھوی کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو دکھایا، کئی طرح کے ٹیسٹ ہوئے اور نتیجہ صفر نکلا۔ پیدائش سے ہی اُس کا دماغ کمزور تھا اچھی طرح ڈیولپ نہیں ہوا جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ کیلاش پنساری کی دُکان کرتا تھا۔ صبح نکل جاتا اور دیر رات لڑکھڑاتا ہوا گھر لوٹتا۔ جب تک گھر آتا بچے سو چکے ہوتے اور جب اُس کی صبح ہوتی بچے اسکول جا چکے ہوتے۔ پیٹ کی آگ بجھتے ہی جسم کی آگ جاگ اُٹھتی۔ سارا دن کولھو کے بیل کی طرح پستی رہتی رات بوٹیاں نچواتی اور صبح پھر چکی کے پاٹوں میں پسنے کو تیار ہو جاتی۔

اِدھر گیارھویں فصل پک کر کٹنے کے کگار پر تھی کہ اُس رات کیلاش لڑکھڑاتے قدموں سے خود نہیں آیا بلکہ چار لوگ اُسے کاندھوں پر اُٹھا کر لائے۔ نشے میں دُھت بہکتے قدموں سے اندھیرے میں چلا آ رہا تھا کہ کسی تیز رفتار گاڑی نے اُسے اپنی چپیٹ میں لے لیا۔ مجھے ڈر تھا یہ جو مصیبتوں کا نیا پہاڑ ٹوٹا ہے وہ اُسے چکنا چُور نہ کر دے مگر میرے اندیشوں کے برخلاف وہ ٹوٹ کر بکھری نہیں بلکہ اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اُس کے چہرے پر نہ شکن تھی نہ بیزاری صرف افسردگی۔ فکر تھی تو بچوں کی پرورش کی۔ ویسے بھی دُکھوں کے علاوہ دیا ہی کیا تھا اُس نے جو اُسے رو کر یاد کرتی۔ بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر تو اُسے اس کے جیتے جی بھی ستاتی تھی یہ کون سا نیا مسئلہ تھا اُس کے گزر جانے کے بعد چمن کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ اُس نے سکول کے بجائے باپ کی دکان پر جانا شروع کر دیا۔ سُنبل نے جو زیور کیلاش سے چھپا کر رکھے تھے وہ بازار میں

فروخت کر دیے اور پرتھوی نے اپنے بینک سے قرضہ دلوا کر جان پہچان کے ٹھیکدار کو مکان کی اوپری دو منزلیں تیار کرنے کو دے دیں تا کہ وہ کرائے پر دی جا سکے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ بن سکے۔ دیپک اور چراغ کو وظیفہ لگ گیا تھا اس لیے سُنبل چاہتی تھی کہ اُس کے دونوں لائق بیٹے اپنی پڑھائی جاری رکھیں بہت سی اُمیدیں اُن سے وابستہ تھیں۔ کیلاش کے گزر جانے کے ایک مہینے بعد اُس کی آخری اولاد نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ ذہنی اور جسمانی طور پر وہ اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اُسے اس کے حال پر چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ پرتھوی سے اجازت لے کر گیارہ دن میں اُس کے گھر اُس کے پاس رہی۔ ماں اور بچہ دونوں کمزوری کے شکار۔ ماں کی چھاتیاں سُوکھ چُکی تھیں اور بچے کا پیٹ بھرتا نہ تھا۔ سارا دن رُوں رُوں کرتا۔ ماں کے کانوں تک اُس کے رونے کی آواز نہ پہنچتی۔ اُس کی طرف پیٹھ کر کے لیٹی رہتی۔

بھائی کے رونے کی آواز سُن کر للّی اُسے گود میں اُٹھا کر باہر لے جاتی۔ گھر کے کاموں میں بھی وہ میرا پورا ہاتھ بٹاتی۔ سبھی لڑکے اپنی ماں کو بے پناہ چاہتے تھے اُسے کسی طرح کی تکلیف نہ دیتے اور اُسے خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتے۔ دیپک نے پڑھائی کے ساتھ ساتھ ٹیوشن لینی شروع کر دی تھیں۔ اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اُنہیں۔ پرتھوی سے ہر وہ مسئلے پر شورہ کر لیتے جو شاید کبھی انہوں نے اپنے باپ سے نا کیا ہو۔ کمزور سے نوارد بچے کو چھوٹو چھوٹو کہہ کر پکارنے لگے تو میں نے سُنبل سے کہا:

''یہ بھی بھلا کوئی نام ہے۔ بچے کا کوئی اچھا سا نام رکھو تم تو بے چارے کی طرف دیکھتی ہی نہیں۔''

''بدنصیب کیسا رہے گا؟''

''بدنصیب؟ یہ نام ہے بھلا؟'' مجھے غصہ آ گیا۔

''بدنصیب نہیں تو اور کیا ہے؟ کیا ضرورت تھی ایسے میری زندگی میں آنے کی۔ خود مر گیا اور میرے سر ایک اور بلا ڈال گیا۔''

بچے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کسیلا منہ بنا کر اُس نے کہا۔

میں نے پیار سے اُسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

''تمہیں قدر نہیں اولاد کی۔ کیا قیمت ہوتی ہیں ان کی یہ مجھ جیسی سے پوچھو۔'' آنسو آنکھوں میں ضبط کر کے میں کمرے سے نکل آئی۔

وہ دوبارہ اپنی گھر گرہستی کا ذمہ سنبھالنے کے قابل ہوئی تو میں واپس اپنے گھر لوٹ آئی۔ ایک روز بینک سے آ کر پرتھوی نے بتایا کہ ہمیں صبح ہی نکلنا ہوگا۔ ماں بہت بیمار ہیں۔ صبح نکالنے سے پہلے کچھ رقم اور رقعہ سُنبل کے نام اپنے گھر کام کرنے والی بائی کو اِسے پہنچانے کو دے دیا۔

گئے تو پانچ دن کے لیے تھے ماں کو دیکھنے مگر لوٹتے لوٹتے بیس دن لگ گئے۔ ہمارے پہنچنے سے

پہلے ہی ماں نے دم توڑ دیا تھا۔

قاضی گنج واپس پہنچنے کی جب سُنبل کو خبر ملی تو وہ دیپک کے ہمراہ افسوس کرنے چلی آئی۔ گلے ملتے ہی رونے لگی۔

''آپ شہر میں نہیں تھیں تو لگا میں پھر سے یتیم ہوگئی۔''

''ایسا کیوں کہتی ہو؟ تمہارے جوان بیٹے تمہارے ساتھ ہیں۔ بچوں کے پاس ہوتے مائیں کیسے یتیم ہوسکتی ہیں؟''

باتوں باتوں میں اُس نے بتایا کہ چھوٹو کا بخار کئی روز سے اُترنہیں رہا۔ ڈاکٹرز نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دئے ہیں وہ ایک دوروز میں کروانے ہیں۔ اُسے ڈر تھا کہ کہیں وہ بچہ بھی لِلّی کی طرح غائب الدماغ نہ نکلے۔

''دوکھوٹے سکّے تو پہلے ہی نصیب میں لکھے گئے ہیں اب یہ بھی.....''

''اب دوسرا کھوٹا سکّہ کون ہے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا

''کنچو .....اور کون؟ پھر سے فیل ہوگیا ہے۔ سارا دن محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کُود موج مستی اور کچھ نہیں۔''

''بچہ ہے ابھی'' میں نے غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔

''بچہ؟ شیطان کہو شیطان۔ پڑھائی میں نہ کام میں کہیں دماغ نہیں چلتا بس شرارتیں اور کھیل چاہیے۔''

دوروز بعد جب چھوٹو کو دیکھا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ مریل ہو چکا تھا۔ گھر کے آنگن میں تخت پر اکیلے پڑا ایسے رو رہا تھا جیسے لاوارث ہو۔ میری گود میں آتے ہی خاموش ہوگیا۔ بڑے دنوں سے جو بات میرے دل میں تھی وہ میں نے سُنبل سے کہہ دی۔

''مجھے لگتا ہے اسے میں اپنے ساتھ گھر لے جاؤں۔ یہ تم سے پلنے والا نہیں۔ تُم تو مار ہی ڈالو گی اسے۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں نے خود سوچ رہی تھی کہ اس کی ذمہ داری آپ ہی لے لو۔''

اتنی جلدی اس جواب کی مجھے اُمید نہیں تھی۔

''سچ کہہ رہی ہو؟ لے جاؤں؟ دوبارہ مانگو گی تو نہیں؟''

''آج سے ابھی یہ تمہارا ہوا۔ میں کبھی نہ اس کا ذکر کروں گیا ورنہ ہی تقاضا۔''

بے یقینی میں مَیں اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ بن مانگے موتی میری جھولی میں اُس نے ڈال دئے تھے۔ اُسے میری محرومیوں کا احساس تھا۔ میرے سُونے پن میرے درد سے وہ آشنا تھی شاید اسی لیے اُس نے اپنے جگر کا ٹکڑا مجھے سونپتے ہوئے ایک بار بھی نہ سوچا۔ میرے لیے وہ گوہر نایاب تھا۔ سینے سے چپکائے میں اُسے اپنے گھر لے آئی۔ پرتھوی نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اُن کے ہونٹوں پر پیار سے انگلی رکھ دی۔

میری نم آنکھوں کی التجا نے خاموشی سے اُسے قبول کرلیا۔ اُسی دن گود میں اٹھاتے ہوئے اُنہوں نے کہا تھا:

''آج سے اس کا نام نیل ہے۔ نیلما کا نیل۔ اب خوش؟'' میں خوشی سے جھُوم اٹھی۔ چھ ماہ بعد پرتھوی کی ترقی کے ساتھ تبادلے کے آڈر بھی آ گئے۔ تب تک نیل کی شکل وصورت اور صحت میں کافی سُدھار آ چکا تھا۔ خود سُنبل اُسے دیکھ کر حیران ہوئی تھی کہ یہ وہی چھوٹو ہے جو سارا دن رُوں رُوں کرتا رہتا تھا۔ قاضی گنج چھوڑنے کا ملال جتنا ہمیں تھا اُس سے کہیں زیادہ سُنبل کو۔ ایک گہرا اٹوٹ رشتہ بن گیا تھا ہم دونوں میں اور نیل وہ کڑی تھی جس نے ہمیں مضبوطی سے جوڑ دیا تھا۔ سُنبل کی وجہ سے ہی میری بے رنگ زندگی میں ممتا کے سبھی رنگ بھر گئے تھے۔ قرض دار ہوگئی تھی اُس کی اس مہربانی کی جو شاید اس جنم میں کبھی نہ چُکا پاؤں۔

قاضی گنج چھوڑنے کے بعد بھی رابطہ نہیں چھوٹا۔ دیپک امریکہ چلا گیا اور پھر چراغ کو بھی بُلا لیا۔ بچوں کے سنہرے مستقبل کے لیے سُنبل نے دل پر پتھر رکھ لیا۔ چمن نے باپ کی دُکان سنبھال لی تھی اور بیاہ کے بعد الگ رہنے لگا تھا۔ لِلّی کی شادی ادھیڑ عمر کے آدمی سے کی تو ضرور مگر اگلے ہی روز وہ واپس آ گئی اور ضد پکڑ لی کہ واپس اُس بوڑھے کے پاس نہیں جائے گی۔

نیل کی شادی میں اُنہیں بلایا مگر کوئی آیا بھی نہیں اور نہ ہی کوئی خبر۔ پھر پرتھوی کے گزر جانے کے بعد میں نے سب سے واسطہ توڑ لیا خود کو گھر کی چار دیواری میں قید کرلیا۔ نا تو کبھی نیل کو سُنبل کے بارے میں اصلیت بتانے کی خواہش محسوس ہوئی اور نہ ضرورت۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی یہ بھول گئی کہ اُس نے میری کوکھ سے جنم نہیں لیا۔ نیل نے جب قاضی گنج جانے کی بات کی تو سارے بندھ ٹوٹ گئے۔ سُنبل سے ملنے کو دل تڑپ اٹھا۔ نہیں جانتی کہ وہ کس حال میں ہوگی۔ ہوگی بھی یا نہیں؟

نیل نے ایک دو بار مجھے اُٹھانا چاہا مگر میں آنکھیں موند کر بیٹھی رہی جیسے گہری نیند میں سوئی ہوں۔ کار رُکی تو میرے خیالوں کا سلسلہ بھی ٹوٹا۔ کار سے اُتر کر ٹانگے سیدھی کیں، کھانا کھایا اور سفر پھر شروع ہوگیا۔ راستے میں نیل باتیں کرتا رہا۔ سُنبل موسی اور اُس کے پریوار کے بارے پوچھتا رہا۔

ہمارے ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی کالج کے کچھ لوگ نیل کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھے۔ فریش ہوکر وہ اُن کے ساتھ نکل گیا اور ڈرائیور کو ہدایت دے دی کہ دو گھنٹے بعد بعد مجھے بتائے ہوئے پتہ پر لے جائے۔ کام سے فارغ ہوکر وہ ہوٹل پہنچ جائے گا۔ سفر کی تھکان اُتار کر گھنٹے بعد ہی میں جانے کو تیار ہو گئی۔ تحفے تو میں ساتھ لے کر آئی تھی پھر مٹھائی اور پھل راستے سے خرید لیے۔ گاڑی جن راستوں سے ہوکر نکل رہی تھی سب کچھ نیا لگ رہا تھا کچھ بھی تو جانا پہچانا نہیں تھا۔ تین دہائیوں میں قاضی گنج نے بھی خوب ترقی کی تھی۔ سڑکیں کشادہ ہوگئی تھیں، عمارتیں اونچی اور ہر طرف لہلہاتے ہرے بھرے درخت۔ گلی میں پہنچتے ہی مجھے مکان پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی حالانکہ آس پاس کے سبھی مکان نئی طرز کے بن چکے تھے مگر وہ ویسے کا

ویسا ہی تھا۔ گھر کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اُن کے حالات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ دروازہ لِلّی نے کھولا۔ بچپن میں دیکھا تھا پھر بھی پہچاننے میں ایک پل نہ لگا۔ ادھیڑ عمر کی دُبلی پتلی، سیاہ وسفید بالوں کی آمیزش، وہی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ماں جیسا تیکھا ناک اور باپ جیسا چوڑا دہانہ، خشک ہونٹ گندمی رنگت، حیرت سے دیکھتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کرتے میرے بولنے کا انتظار کرتی ہوئی منہ تکنے لگی۔

''لگتا ہے لِلّی نے اپنی موسی کو پہچانا نہیں؟''

''نیلما موسی؟ آپ نیلما موسی ہیں نا؟''

تپاک سے آگے بڑھ کر میرے گلے لگ گئی۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دروازے کے اندر لے آئی۔ دالان میں آم کے پیڑ کے نیچے تخت اور کرسیاں اُسی طرح بچھی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور سامان رکھ کر باہر چلا گیا۔

''سُنبل کدھر ہے؟ اس سے کہو میں آئی ہوں۔'' کرسی پر بیٹھنے ہی لگی تھی اُس نے کہا:

''ماں ادھر نہیں آسکتیں آپ کو اندر جانا ہوگا۔'' کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے اُس نے کہا۔

''کیوں؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟'' میں نے تعجب سے پوچھا پھر اُٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''کنچو دیکھ ماں سے ملنے کون آیا ہے؟ نیلما موسی آئی ہیں۔'' معصوم بچے کی طرح وہ چہک کر بولی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا۔

چھ فٹ کا جوان کنچو کمزور بوڑھی ماں کو گود میں اٹھائے بستر پر بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر اُس نے مسکرا کر کہا:

''پرنام موسی!''

''جیتے رہو۔''

تکیئے کا سہارا دے کر ماں کو بٹھا دیا تو میں سُنبل کی طرف تپاک سے بڑھی مگر وہ اجنبیوں کی طرح ویران نظروں سے مجھے تکنے لگی۔

''ماں پہچانتی نہیں کسی کو۔'' کنچو نے میرے پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔ سُنبل کے پاس بستر پر اُس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگئی ہے۔ بالوں میں چاندی چمکنے لگی ہے، چہرہ جھُریوں سے بھر گیا ہے۔ رنگ زرد، آنکھیں ویران، اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگنے لگی ہے۔ میں اُن آنکھوں میں اپنائیت تلاش کرتی رہی اور وہ اجنبی کی طرح دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے پوپلے منہ سے دھیمی نرم آواز میں بولی:

''کھانا کھا کر جانا۔''

اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ کنچو نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا:

''اگر آپ اس طرح دل چھوڑنے لگی تو ہمیں حوصلہ کون دے گا؟'' لِلّی نے پانی کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے اپنے دوپٹے سے میری آنکھیں پونچھی تو میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔

پھر میرے پوچھنے پر کنچو نے بتایا کہ پچھلے پانچ سالوں سے ماں کی یہ حالت ہے۔ ان کی یادداشت ختم ہو چکی ہے۔ کسی کو نہیں پہچانتی سوائے ہم دونوں کے۔ دو چار جملوں کے علاوہ کچھ نہیں بولتی۔ بستر سے لگ گئی ہیں۔ اپنا کوئی بھی کام نہیں کر پاتیں۔ نہلانا، دھلانا، کھلانا پلانا سب وہ ہی کرتے ہیں۔ علاج چل رہا ہے مگر اُمید کی روشنی نظر نہیں آتی۔ وہ (Alzheimer) الزیمر کی شکار ہیں۔

''پہلے ہم اس کے بچے تھے اور اب یہ ہماری بیٹی بن گئی ہے۔'' کنچو نے پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا۔

لِلّی چائے بنا کر لے آئی تو مجھے چائے کی پیالی تھمانے کے بعد لِلّی نے ماں کو چمچ سے پھونک مار مار کر ٹھنڈی کر کے بچوں کی طرح پلانا شروع کر دی۔ پاس رکھے نیپکن سے منہ پونچھتی جاتی اور چائے پلاتی جاتی۔

کنچو نے پوچھنے پر بتایا دیپک اور چراغ صرف ایک مرتبہ ہی آئے تھے۔ دونوں نے وہیں گھر بسائے ہیں۔ فون پر ماں کا حال پوچھ لیتے ہیں اور کبھی کبھی پیسے بھی بھیج دیتے ہیں۔ خود وہ فیکٹری میں ملازمت کرتا ہے۔ چمن کے بیوی بچے کبھی نہیں آئے البتہ وہ ملنے آتا رہتا ہے اور جب ماں اُسے نہیں پہچانتی اور ہم دونوں کو نام سے پکارتی ہے تو غصّے سے پھر کبھی نہ آنے کا کہہ کر چلا جاتا ہے۔ تھوڑے دن گزرنے کے بعد پھر آجاتا ہے۔

''تم نے شادی نہیں کی؟''

''اچھا ہے نا نہیں کی۔ کی ہوتی تو ان دونوں کا کیا ہوتا؟'' مسکرا کر اُس نے جواب دیا۔ اتنی مشکلوں میں بھی پُرسکون رہنا اور مسکرا کر حالات کا مقابلہ کرنا یقیناً یہ سلیقہ اُس نے اپنی ماں سے سیکھا ہے۔

''کنچو!'' سُنبل نے آواز لگائی۔

'لیٹنا ہے؟'' ماں کی طرف بڑھتے ہوئے اُس نے کہا۔

ماں کو گود میں اٹھا کر دوبارہ بستر پر لٹا دیا۔ وہ بے حس لیٹی لیٹی چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھنے لگی۔ کچھ لوگوں کی قسمت میں ہمیشہ مجبوری، لاچاری، بے بسی ہی کیوں لکھی ہوتی ہے؟ نہ جانے کون سے گناہوں کی سزا ہے جو ختم ہی نہیں ہو رہی۔ بڑی امیدیں لے کر آئی تھی کہ سُنبل سے ملوں گی، دل کھول کر دونوں دُکھ سکھ بانٹے گے۔ نیل کو مل کر یقیناً اُسے خوشی ہوگی اور تھوڑی سی خلش بھی ضرور محسوس کرے گی۔ مگر میری سُنبل تو احساسات کی حدوں سے پار جا چکی ہے۔ یہ میری سُنبل نہیں یہ تو بیمار، لاچار عورت ہے جو صرف سانسوں کی گنتی پوری کر رہی ہے۔ اس اجنبی عورت کے پاس رُک کر کیا کروں گی؟ جانے کے لیے اُٹھی تو دونوں نے بڑی محبت اور اصرار سے رات اُن کے پاس ہی رکنے کو کہا مگر میری ہمت جواب دے گئی

تھی۔ سُنبل کو اسی طرح کچھ اور دیر دیکھتی رہی تو خود کو سنبھال نہیں پاؤں گی۔ اپنے عزیز کو ہر روز تِل تِل کر کے مرتے دیکھنا بھی تو ایک سزا ہے۔ ماں کے دونوں کھوٹے سکّے تو چل نکلے۔

''کل جانے سے پہلے نیل کے ساتھ آؤں گی'' اتنا کہتے ہوئے میں سُنبل کی طرف بڑھی۔ جھک کر اُس کا ماتھا چوما۔ مجھے لگا ایک ہلکی سی چمک اُس کی آنکھوں میں اُبھری مگر دوسرے ہی پل سب اُمید ختم ہو گئی جب دھیمی آواز میں بولی:

''کھانا کھا کر جانا۔''

ڈبڈبائی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے میں جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''کھانا کھا کر جاتیں تو ماں کو اچھا لگتا۔'' لِلّی نے کہا۔

''تم فیکٹری کتنے بجے جاتے ہو؟'' میں نے بات بدل کر کنچو سے پوچھا۔

''کل چھٹی ہے میں گھر پر ہی رہوں گا۔ آپ دونوں ناشتہ ہمارے ساتھ کریں گے۔ ہمیں انتظار رہے گا'' میں نے مسکرا کر منظوری دے دی۔ پرس میں سے کچھ رقم نکال کر کنچو کو دینی چاہی تو اس نے لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ کام چل جاتا ہے بس اس وقت تو صرف دُعاؤں کی ضرورت ہے۔ دُعا ضرور کریں کہ ماں ٹھیک ہو جائے یا پھر.....'' اتنا کہہ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میری خود کی آنکھیں بے ساختہ برسنے لگیں۔ میں بھلا اُنہیں کیا دلاسہ دیتی۔ دلاسہ تو میرے پاس اُس ماں کو دینے کے لیے بھی نہ تھا جس کی نمناک نگاہیں مسلسل مجھ سے کوئی سوال کرنے کے لیے بے چین تھیں۔ قبل اس کے اوپر والا کوئی چمتکار دکھائے میں تیز قدموں سے چلتی گھر سے باہر نکل آئی۔

◀◀ ● ▶▶

1505- Sector - 49 B
Chandigarh 160047
Email : renubehl06@gmail.com

● افسانہ

● انجم قدوائی

گنگا بہتی کیوں ہو.....؟

کھلی ہواؤں میں لہراتی..... گنگناتی..... مسکراتی..... ہنستی شرماتی.....

ایسی تھی چاندنی..... ماں، بابو کے دل کا چین..... سونو۔ بھیّا کی انکھوں کی روشنی..... اور گھر کی بہار..... ایسی تھی چاندنی..... مورنی کی طرح ناچتی ہنستی گاتی مسکاتی..... سفید پھولوں سے لدی پھندی خوشبو بکھراتی وہ اچانک ہی بڑی ہوگئی۔ جوہی کی ڈالی جیسی چاندنی پر جب چندن کی نظر پڑی تو پھر ہٹ نہ سکی..... وہ تو تھا ہی چندر..... مگر اس کی روشنیاں بھی چاندنی کے سامنے ماند پڑنے لگیں۔ چاندنی کو شرمانا آ گیا تھا۔ چندر کی نگاہیں پہچان گئی تھی وہ..... اس کی ایک نظر سے وہ مہک اٹھتی..... دھان کی بالیوں کی طرح لہرا اٹھتی..... سرسرا اٹھتی۔ گنگا کے شفّاف پانی میں دونوں گھنٹوں اپنا عکس دیکھتے رہتے۔ تبھی چاندنی نے ایک پتھّر اٹھا کر پانی کی چادر پر اچھال دیا..... عکس ٹوٹ گئے..... بکھر گئے۔ چندر نے تڑپ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں چاندنی نہیں..... یہ کیا کیا تم نے؟ دیکھو کیسے بکھر گئے ہم؟؟ اب ایسا کبھی مت کرنا۔'' معصوم چاندنی ڈر گئی۔

''مجھے کبھی چھوڑ کر مت جانا چاندنی۔'' اس نے لجاجت سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

مگر چاندنی اپنے سماج کی ریتوں رواجوں کی پابند تھی..... ماں بابو، سونو بھیّا کی پیار کی بندھی چاندنی..... کیا کرتی؟ اور وہ باولا ہو گیا۔ گاؤں کے زمیندار کا اکلوتا وارث..... وہ کیسے برداشت کرتے؟ کہاں وہ..... اور کہاں ایک معمولی کسان کی بیٹی.....؟ اور وہی سب ہوا..... اپنی طرح..... پرانے دھرانے قصے دہرائے گئے..... چاندنی دور ہو گئی چندر سے.....

بنارس کی گمنام گلی رات کا ٹھہرا ہوا وقت..... رشتے کا ماما کواڑ کھول کر چپ چاپ کھڑا رہا۔

''بھیّا نندنی..... میں ہوں..... چاندنی کی ماں.....'' چاندنی کی ماں نے اپنے کو پہچنوایا۔

''ہاں ہاں جانتا ہوں۔ کیسے کشٹ کیا؟''

''بھیتر آ جاؤں؟ جاڑے کی پیر سے کپکپاتی ہوئی ماں اور چاندنی.....

ہری چرن راہ سے ہٹ گیا۔ دونوں ماں بیٹی سہمی سہمی اندر آ گئیں۔ سانولی سلونی بھابی موٹے

موٹے چاندی کے کڑے پہنے۔ڈھیر سارا سندور لگائے آنکھوں میں کاجل بھرے مسکرا رہی تھی۔اس کی طرف سے سواگت تھا۔پیاز اور چٹنی سے روٹی کھا کر جب بستر آئیں،تو بات چھڑی۔

''کہیں چاندنی کی ناؤ باندھو بھیّا......اب کون ہمارا؟ سب مرکھپ گئے،چاندنی کا ابّا زمیندار کی مجوری کر کے ہمیں پال رہا ہے۔وہاں کوئی رشتہ نہ ملا تو آ گئی۔تم بھی ماما ہو...... باپ کی طرح ہو اس کے لیے۔'' اکیلی بولتے بولتے وہ تھک گئی......ہانپ گئی۔

''ہاں ہاں کاہے نہیں۔'' مامی نے پیار سے چاندنی کے بال سنوار دیے۔

آدھی رات کو رگھو گھر آ گیا۔۔ بڑی بڑی مونچھوں والا......کرخت چہرے اور غلیظ آنکھوں والا رگھو......ہاتھ میں موٹی سی لاٹھی سنبھالے ہوئے کھٹ کھٹ کرتا ایا تو سارے گھر میں عجیب سی ناگوار سی بو پھیل گئی۔مامی کا چہرہ اتر سا گیا۔اٹھ کر کھانا دینے چولھے کے پاس گئی تو دیکھا رگھو وہیں بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔

''ای کون لوگ ہیں اماں؟''

''تیرے بابو جی کی رشتہ دار ہیں۔مصیبت میں ہیں بے چاری۔''

''کب تک ہیاں رہیین......؟اس نے بڑا سا نوالا منھ میں ڈال کر چباتے ہوئے پوچھا۔

''چلے جینہیں......ابھی تو آئے ہیں کوئی گھنٹہ بھر پہلے......تم کا کا ہے؟'' اس نے دوسری پیاز اس کی طرف بڑھائی اور وہ اسے مٹھی سے توڑ کر کھانے لگا۔

صبح کے اُجالے میں جب اسنے چاندنی کو دمکتے دیکھا تو وہ تڑپ اٹھا......معصوم چاندنی......پاکیزہ چاندنی......نکھری چاندنی۔وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی شہر پہلی بار دیکھا اس نے ماں کے ساتھ مندر کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے بھی اسکا دھیان چوڑی صاف ستھری سڑک اور موٹر گاڑیوں پر ہی رہا۔دل ہی دل سوچتی رہی کہ کاش چندن بھی یہاں ہوتا......وہ بھی میرے ساتھ یہ جہان دیکھ لیتا......کیسا دھلا دھلا یا سا ہے سب کچھ......کیسی پیاری نکھری نکھری دنیا ہے مگر چندن کے بنا سب سونا ہے۔

کئی مہینے یونہی بے رونق گزر گئے کچھ بھی نہ ہوا۔غریب کی بیٹی کو کوئی آسانی سے کہاں قبول کرتا ہے۔اور رگھو کی آنکھیں......سانپ جیسی ڈستی آنکھیں......

''امّاں ہیاں ڈر لگتا ہے......گھر چلو بابو کے پاس۔'' رات کو امّاں کے پہلو میں چھپ کر فریاد کی اس نے۔

''ہاں چلیں گے جلدی۔'' رات گزرتی رہی اور چاندنی سہم سہم کر سوتی جاگتی......رہی......

ایک دن ماما نے خوش خبری سنا دی،لڑکا برادری کا ہی تھا۔امّاں اور مامی خوشی خوشی اس سے ملنے چل پڑیں۔شام ہونے لگی تھی ابھی تک کوئی نہیں آیا تھا......اور رگھو آ گیا۔چاندنی ڈرتی سہمتی رہی......روتی رہی......منّتیں کرتی رہی اور پھر منھ سے یہی نکلا۔

''چندر...... مجھے بچا لو......''

چندر نے وہاں دور چونک کر چاروں طرف دیکھا۔اس کا دل بری طرح بے چین ہوا......پھر یہ سوچ کر دل کو تسلّی دی کہ وہ اپنے ماما کے پاس گئی ہے آ جائے گی۔

رگھو جیت گیا...... وہ ہار گئی......چاندنی بجھ گئی......دنیا ویسے ہی چلتی رہی کوئی طوفان نہ آیا......کوئی زلزلہ نہ آیا......نہ کوئی پہاڑ گرا......مگر وہ تو مٹ گئی۔

ناسمجھ بھولی بھالی چاندنی......ایک دم مرجھانے لگی۔وہ آواز دیتی۔

''چندر......چندر......میرے روم روم میں زہر پھیل رہا ہے مجھے بچاؤ۔''

اور اس کا بیاہ پکّا ہو گیا۔

جس دن مندر جا کر منّت پوری کرنی تھی اسے صبح سے چکّر آ رہے تھے۔مندر جانے سے پہلے ہی وہ چکرا کر زمین پر گر گئی۔

زمانہ شناس مامی فوراً سمجھ گئیں۔چاندنی کو بکھرا بکھرا انداز۔اسکی حالت......اور یہ نہ چھپنے والی بات......اس دن کوئی مندر نہیں گیا مانو گھر میں میّت ہو گئی۔

دوسرے دن شام ہوتے ہوتے سونو بھیّا آ گیا......اور چاندنی اسکو دیکھ کر اپنا رونا رونے دوڑی تو اسنے ہاتھ جھٹک دیا۔

''بھیّا......؟''معصوم سوال ہونٹوں پر آ کے ٹوٹ گیا۔

''یہ سب چندر کا کیا دھرا ہے نا......؟ سونو نے اسے گھور کر پوچھا تو وہ ناسمجھی میں اسے دیکھتی رہی......کیا کیا چندر نے؟؟ اسے پتہ ہی نہیں۔

رات کو جب گہرا اندھیرا ہوا تو کسی نے چراغ پھونک مار کے بجھا دیا۔

چاندنی کے گلے پر دباو بڑھ رہا تھا......وہ چھٹپٹا رہی تھی اور پھر آہستہ آہستہ چاندنی گل ہو گئی۔صبح یہ شور ہوا کہ چاندنی کو رات میں سانپ نے ڈس لیا۔میت کسی کو دکھائے بنا ہی انتم سنسکار کر دیا گیا۔

ادھر گاوں میں چندر دریا کنارے بیٹھا چاندنی کے لیے بیلے کے گجرے بناتا رہا......اور گنگا بہتی رہی......دنیا یوں ہی چلتی رہی۔

◄◄ ● ►►

Flat.no1,Zakarya Market,Madical Road
Civil line,Aligarh.202002.U.P.India
9897202594

● افسانہ

● قمر جمالی

فاتحِ عالم

یوں تو وہ بس شہر کے مضافاتی علاقے میں جاتی تھی۔ میری منزل تو راستے ہی میں تھی اور یوں بھی رات کے ساڑھے بارہ بجے کا عمل اور دھواں دھار بارش میں بس کا ملنا ایک آسمانی نعمت سے کم نہ تھا۔ دراصل میں اور میرے میاں ہم دونوں غزلوں کے پروگرام سے واپس لوٹ رہے تھے۔ ہم جس وقت تھیٹر پہنچے بالکل سوکھا تھا۔ ہاں بارش کے کچھ کچھ امکانات ضرور تھے۔ مگر پتہ نہیں کب بارش شروع ہوئی، اتنی طوفانی بارش ہو رہی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہم تھیٹر سے باہر نکل کر کاریڈور میں ایک گھنٹے تک بارش کے رکنے کا انتظار کرتے رہے مگر بارش تھی کہ اور زور پکڑتی رہی اور پھر یوں بھی شام کا مہمان اور رات کی بارش ختم کہاں ہوتی ہے۔ ہم نے اپنی موٹر سائیکل وہیں تھیٹر کے اسٹینڈ پر رکھ چھوڑا اور کسی آٹو رکشا یا ٹیکسی کی تلاش میں تھیٹر سے باہر نکل پڑے۔ ابھی سڑک عبور ہی کر رہے تھے کہ دور سے آر۔ ٹی۔ سی بس کے ہیڈ لائٹس دکھائی دیئے۔ میں تو ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ آیا بس پکڑیں کہ میرے میاں بیچ سڑک پر کھڑے زور زور سے ہاتھ ہلانے لگے۔ بس رک گئی تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

''چلو آسمان سے اتری ہے۔''

''کون.....؟ میں چونکی۔''

''ارے بھائی چڑھو۔ ایسے وقت میں بس کا ملنا نزولِ من وسلویٰ سے کم نہیں۔ چلو چلو۔''

میرے میاں ذرا زندہ دل قسم کے انسان ہیں بالکل میرے برعکس جہاں میں بات بات پر اداس ہو جاتی ہوں کسی بھی ذی روح کے اندر گھس کر زخم جگر ٹٹولنے کی عادی ہوں وہیں وہ گندی اور کڑی چیزوں میں سے بھی خوبصورتی کا ریزہ ریزہ چن کر باہر نکالتے اور ایک حسین پہلو تراشتے ہیں اور کہتے ہیں ہنسو اور ہنساؤ پتا نہیں تم کیسی ادیبہ ہو۔ ادب کے نام پر صرف آنسو بانٹتی رہتی ہو میری سنو کسی کی آنکھوں میں اتنا اندر تک نہ جھانکو کہ تمہاری نگاہوں کی چبھن محسوس کر کے اس کی اپنی آنکھیں جھلک پڑیں۔ شیبو یہ زندگی خدا نے صرف رونے اور رلانے کے لیے نہیں دی زندگی تو قدرت کی سوغات ہے۔ ذرا سجا سنوار کر دیکھو کہ کیسی چھیلی رنگیلی ہو جاتی ہے! یار شیبو! تم نے اس بے چاری کو مونگے کی چٹانوں کی طرح نکیلی کر دیا ہے کہ بس جہاں جہاں سے گزری کہ لہولہان.....نانا

بھئی ہم سے یہ نہیں چلے گا۔ ہم تمہارے فن کے قدرداں ضرور ہیں مگر تمہارے انداز فکر سے متفق نہیں۔

جوں ہی میں نے بس میں قدم رکھا وہ میری طرف پلٹے اور کہنے لگے۔ ''باپ رے.....مر گئے۔ چلو چلو اترو کوئی دوسری سواری کر لیتے ہیں۔'' جتنی تیزی سے وہ چڑھے تھے اتنی تیزی سے اترنے کے لیے فٹ بورڈ تک پہنچ گئے۔ مگر اس دوران میں بس ہل چکی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوبارہ اندر آ گئے۔

بس خاصی کھلی پڑی تھی۔ ایک تو آدھی رات کا سماں دوسرے دھواں دار بارش کس کی شامتِ اعمال تھی کہ ایسے موسم میں باہر نکلتے۔ میں نے ایک طائرانہ نظر ڈالی سارے کی سارے مسافر مرد تھے۔ کچھ مزدور قسم کے لوگ تھے کچھ بیکار قسم کے اِدھر اُدھر بھٹکنے والے تو ایک آدھ ہماری طرح اتفاقاً سفر کرنے والا بھی تھا۔ میں نے محسوس کیا جب میں بس میں بیٹھے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھی تو میرے میاں خواہ مخواہ ہی مجھے ڈسٹرب کر رہے تھے۔ ان کی اس کمزوری سے میں بخوبی واقف ہوں۔ جب بھی میری نگاہ کسی فکر طلب چیز پر پڑتی ہے وہ یوں ہی میری توجہ اس طرف سے ہٹا دیتے ہیں۔ لہٰذا اس وقت بھی وہ ایسا ہی کچھ کر رہے تھے۔ آخر وہی ہوا میری نظر پھیلتی ہوئی بس کی اس آخری سیٹ پر جا رکی جہاں ایک بے حد غریب مزدور قسم کی عورت اپنے ننھے سے بچے کو اپنے بوسیدہ پلو میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''اُف میرے خدا.....!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا۔

''کیا ہوا؟ انہوں نے پوچھا۔

''ادھر دیکھو''۔ میں نے کہا۔

''اوں.....چلو غارت ہوئی آج کی رات بھی۔ انھوں نے لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ مجھے پہلے ہی سے ڈر تھا۔''

''تو آپ میری توجہ اس کی طرف سے ہٹانا چاہ رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''پھر اور کیا کرتا.....!'' اتنے شاعرانہ ماحول سے باہر نکلتے تھے۔ طبیعت میں ترنگ ابھی تک موجود ہے مگر اب تو سب غارت ہو گیا۔ اب تم ساری رات اس غریب عورت کی بے بسی پر روتی رہو گی اور شہیر میاں تارے گن گن رات کاٹیں گے۔ سالا اپنی قسمت میں تو تنہائی ہی لکھی ہے۔''

''ایسا کیوں کہتے ہو۔ آپ دیکھیں تو دل خون کے آنسو رو دے۔''

''وہ تو ہم روتے ہی ہیں۔ ہر رات تم کسی نہ کسی کا غم یاد کر کے سارے موڈ کا ستیاناس مارتی ہو۔''

''کیا بات ہے شہیر.....اتنے سنجیدہ کیوں ہو گئے.....ناراض ہو گئے کیا.....؟''

''ارے نہیں تم سے ناراض ہو کر کہاں جاؤں گا۔ گھوم پھر کر تمہارے ہی دروازے پر دستک دینی ہو گی۔'' وہ ایک دم کھل پڑے۔ یہ ان کی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ ہنستے رہتے کبھی میری حرکت پر ناراض ہوئے تو ہوئے بھی ہوں۔ مگر اس خوف سے کہ میں سنجیدہ نہ ہو جاؤں انہوں نے اپنی خفگی کو ایک دو منٹ سے زیادہ طویل ہونے نہ

دیا۔اگر کبھی غصہ بھی ہوتے تو ہنس کر ٹال دیتے۔دراصل ہنسنا ان کی عادت ہے اور وہ اپنی عادت سے مجبور۔

شہیر کی ناراضگی کا خیال کر کے کچھ وقفے تک میں بھی ان کے برابر خاموش بیٹھی کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی مگر چلمن باراں اتنی دبیز تھی کہ باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور پھر دل تھا کہ اندر سے بار بار پیچھے مڑنے کی تلقین کر رہا تھا۔ بڑی دیر تک میں نے اپنے آپ کو دبائے رکھا۔مگر کب تک.....؟ میرے اندر کی فنکار بے طرح تڑپ رہی تھی، چلّا رہی تھی، احتجاج کر رہی تھی کہ کاش غریبی افلاس، دکھ درد مجسم ہو کر سامنے آئے تو نوک قلم سے میں ان کے دل چیر دیتی۔ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اربابِ دیار کے باوقار طبقے کے سامنے رکھتی کہ دیکھو آج میں نے ان منحوسیوں کو ختم کر دیا ہے جس پر تکیہ کر کے تم خود کو ان مجبور و بے بس انسانوں پر برتر سمجھنے لگتے ہو جو پشت ہا پشت سے ان نحوستوں کی صعوبتیں سہتے رہے ہیں کاش.....!!

آخر میں نے اپنے اطراف کا حصار توڑ دیا اور پیچھے مڑ کر اس مجبور عورت کو دیکھنے لگی۔عورت کے جسم پر اتنا ناکافی لباس تھا کہ وہ خود اپنے جسم کی گرمی قائم نہ رکھ سکتی تھی.....پھر اپنے جگر گوشے کو کس طرح گرم رکھ سکتی تھی؟ پھر بھی وہ حتی المقدور کوشش کر رہی تھی کہ بچے کو سردی سے بچائے رکھے۔اپنا بے حد پھٹا ہوا ساڑھی کا پلو اس ننھی سی جان کے اطراف لپیٹے اسے اپنے سینے سے اس طرح چمٹا ہوئے تھی کہ سردی کوئی شیطانی ی عفریت کی شکل میں خونخوار نگاہوں سے اس کے بچے کی طرف دیکھ رہی ہے۔بہرصورت اپنی جگر گوشے کو اس کی پہنچ سے باہر رکھنا چاہتی ہے۔وہ مجسم بے بس تھی۔بیس بائیس برس کا سن ہوگا۔جسم جوان، چہرہ مکھڑا بھی کوئی برا نہ تھا۔ہاں مگر غریبی اور افلاس نے اس کے چہرے سے خون چوس لیا تھا، اور جدوجہد زیست نے اس کے رخساروں سے گوشت کھرچ لیا تھا۔اس کی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں یاس وحسرت سے پھیلی ہوئی تھیں اتنے سارے مردوں کے بیچ وہ تنہا عورت تھی۔مگر اسے کسی بات کا احساس نہ تھا وہ تو اس وقت صرف اپنے بچے کے وجود میں گم تھی۔کہیں دور.....جانے کہاں.....؟ میں فنکار ہو کر بھی اسے ڈھونڈ نہیں پا رہی تھی۔اس کے حرکات وسکنات سے اس کے اضطراب کا پتہ چلتا تھا۔کبھی وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے بچے کو سینے سے بھینچ لیتی اور کبھی ہوا کے تیز جھکڑ کے ساتھ پانی کی پھوار اندر کی طرف آنے لگتی تو وہ بچے کو کھڑکی کے نیچے کر دیتی اور زانو پر لٹا کر اپنا پلّو اس کے اطراف لپیٹنے لگتی۔بچہ بھی بالکل چھوٹا تھا۔شاید ایک ماہ کا رہا ہوگا.....بس گوشت کا لوتھڑا تھا۔

بس میں بیٹھے سبھی لوگ باری باری اس کی طرف متوجہ ہوتے پھر آہستہ آہستہ اپنے آپ میں لوٹ جاتے۔آج کے تیز رفتار زمانے میں کسے اتنی فرصت تھی کہ دوسروں کے لیے اپنا سر درد کرتے پھریں۔پھر ہر ایک کے کتنے ہی اپنے درد ہیں۔یوں بھی آدمی درد کے بنا جی ہی کہاں سکتا ہے، چاہے اپنا ہو یا پرایا۔درد ہی اسے زندہ رہنے کا حوصلہ دیتا ہے اور یہ سچ ہے کہ انسان درد کی معیت میں کتنا مکمل رہتا ہے۔درد غم سب کے مشابہ ہوتے ہیں۔چاہے وہ غمِ دوراں ہوں کہ غمِ جاناں۔تب ہی آدمی جب کسی مجبور کی طرف آنکھ اٹھا کر

دیکھتا ہے تو اسے اس مجبور کی آنکھوں میں اپنی شبیہ نظر آتی ہے۔اور وہاں اس کا اپنا وجود کہیں گم ہو جاتا ہے۔نہ خود باقی رہتا ہے اور نہ وہ۔بس باقی رہتا ہے تو ایک احساس۔جو انسان کو حوصلہ دیتا ہے۔جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔زندہ رہنے کی تلقین کرتا ہے۔یہی وجہ تھی کہ شاید کوئی بھی شخص

عورت کو لمحہ بھر سے زیادہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ہاں کچھ مرد ایسے ضرور تھے جن کی نگاہیں کسی دھاردار چاقو کی طرح اس کے جسم پر نشتر لگا رہی تھیں۔وہ عورت جب بھی کسی کی چبھتی نگاہوں کو اپنے جسم پر محسوس کرتی تو تلملا جاتی اور اپنے ناکافی لباس کو ان نگاہوں کے آگے پردہ سا بنا لیتی۔مگر اس کی غریبی اس کی اپنی جوانی کی طرح سرکش تھی۔ایک طرف سے اپنے جسم کو چھپانے کپڑا ہٹاتی تو دوسری طرف سے جوانی چغلی کھانے لگتی۔میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ بے حد پریشان تھی۔اپنی تنہائی سے، آدھی رات کے سفر سے، بارش کے تابڑ توڑ حملوں سے، ناکافی لباس سے جھانکتی ہوئی اس کی بے سہارا جوانی سے، بھوکے کتوں کی بھنبھوڑتی نگاہوں سے.....اور اپنے جگر گوشے کو سردی سے اکڑتا ہوا دیکھنے سے۔

بس اب شہری حدود کو بہت دور چھوڑ چکی تھی۔جوں جوں مضافاتی علاقے کی طرف جا رہی تھی بارش کے تیور اتنی ہی خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔اب ہماری منزل بھی آنے کو تھی۔اسٹاپ آنے سے قبل ہی ہم دونوں سیٹ سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔میں نے دیکھا جوں ہی میں اٹھ کھڑی ہوئی وہ عورت قدرے بے چین ہو گئی۔ہو سکتا ہے میری موجودگی سے اسے اتنے سارے مردوں کے بیچ تنہائی کا احساس کچھ کم ہو گیا ہوگا۔جانے کیوں خود مجھے اسے اکیلا چھوڑ کر اترتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔مگر اس معاملے میں میں بھی اتنی ہی بے بس تھی جتنی وہ خود۔اسٹاپ اب کچھ ہی گز کے فاصلے پر رہ گیا تھا کہ شہیر فٹ بورڈ پر جا کھڑے ہوئے۔میں بھی ان کے پیچھے ایک قدم اور آگے بڑھی۔اب جب کہ میری نظر اس عورت پر پڑی میں نے محسوس کیا کہ وہ بھی اٹھنے کے لیے اپنے پر تولنے لگی تھی۔ایک لمحے کے لئے میں چکرا گئی کہ خدارا اس طوفانی بارش میں کیا وہ اتنے ننھے سے بچے کو لیے خود بھی اتر جائے گی.....اور وہ بھی میرے پیچھے؟

''جانے کیا ہوگا.....اللہ.....کیا ہوگا.....؟''

''کیا ہوگا.....؟ بچہ مر جائے گا۔'' شہیر کی آواز پر میں چونکی۔شاید بے خیالی میں میں بلند آواز سے کہہ گئی تھی۔

''یہ تم کہہ رہے ہو شہیر.....؟ اتنی آسانی سے.....

''کیوں سچ کہنے پر پابندی ہے کیا۔دیکھو تو بچہ کیسا نیلا پڑ گیا ہے۔''

''ہاں.....!'' میں بے حد پریشان ہو گئی اور بے چینی سے اس ننھی سی جان کو دیکھنے لگی جو سچ مچ سردی کی تاب نہ لا کر نیلا پڑ رہا تھا۔اب وہ بھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''بالانگر.....!'' کنڈکٹر نے ہانک لگائی۔اب میری منزل آنے کو تھی میں اب اترنے کے لئے بالکل تیار تھی۔یکا یک وہ عورت تیز قدموں سے چلتی ہوئی بالکل میرے مقابل آ کر کھڑی ہوگئی۔کیا یہ سچ مچ یہاں اترے گی؟ میں نے گھبرا کر ایک نظر کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا اور پھر سردی سے اکڑتے ہوئے بچے کو، وہ لمحہ بڑا پریشان اور سراسیگی میں گزرا مجھ پر بھی اور اس عورت پر بھی۔عورت کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔اس کی رنگت میں بڑی بڑی تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی۔پھر یکا یک کیا ہو.....وہ میرے زور قلم سے آگے ہے۔میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ پُر جلال ہو گیا۔اس کے سہمے ہوئے اعضا تن گئے۔اور.....اور پلک جھپکتے میں اس نے اپنے جسم پر لپٹی ہوئی ساڑھی کھینچی اور نیلے پڑتے ہوئے اپنے لختِ جگر کے اطراف کس کر لپیٹا۔اس کا پٹی کوٹ اور چولی جا بجا پھٹے تھے۔اس کا جوان جسم دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔مگر وہ تو ایسی اکڑی کھڑی تھی جیسے ننگی ہوتے ہوئے بھی اس نے بے حساب دوپٹے اوڑھ رکھے ہوں۔میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، کیا مجال جو ذرا بھی ٹس سے مس ہوئی ہو۔اس کی لرزتی پلکوں، کپکپاتے ہونٹ اور استقلال سے چمکتے چہرے پر ایک نور تھا.....بلا کا رعب تھا۔!

میں نے زندگی کے چہرے پر اتنا جلال بہت کم دیکھا تھا۔اب اس کا چہرہ پرسکون تھا۔ہر وسوسے اور پریشانی سے پاک تھا۔بس رک گئی تھی میں نے اترتے ہوئے ایک نظر مسافروں کو دیکھا حیرت سے میرا سر چکرا گیا۔ابھی کچھ دیر قبل جن مردوں کی نگاہیں اس کی پھٹی جوانی کو بھنبھوڑ رہی تھیں وہی نگاہیں اب جھکی ہوئی تھیں۔گویا ممتا کا دبیز پردہ اس کے لیے لباس جسم کے آگے حجاب بن گیا تھا۔زندگی کی اتنی شاندار فتح میں نے بہت کم دیکھی تھی۔میرے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں نے بہت ہی فاتحانہ انداز میں اپنے شوہر سے کہا۔

''زندگی کے چہرے پر اتنا جلال کبھی تم نے دیکھا ہے شہیر.....؟!اور پھر اس عورت کی طرف دیکھ کر بے اختیار کہہ اٹھی۔

''تم بہت بہادر ہو ماں.....بہت عظیم ہو.....فاتح عالم ہو.....دنیا جہاں کی تسخیر شاید اسی کا نام ہے!!!

◂◂ ● ▸▸

1-1-31-40, Plot no. 40, Phase 1, Saket Colony,
Kapra, Jai Jawan Colony post office. Hyderabad- 500062
Telangana-Phone:9985503977

● افسانہ

● ثمینہ سید

محبوبہ

رات کا روپ ہی بدل گیا تھا۔ایسی بدصورت اور گھناؤنی ہوگئی تھی کہ اسے اپنے نصیب کی پرچھائی لگنے لگی۔ماحول میں حزن وملال تھا.....آنسو اور.....آہیں۔استے تک چیخ رہے تھے۔وہ ننگے پاؤں چل رہی تھی.....نجانے کب سے۔اب تو شاید پیروں سے لہو رسنے لگا تھا۔اس کی مردہ سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

''کیسی بے شرم عورت تھی.....توبہ توبہ قرب قیامت ہے یار.....ایک عورت ایسا کیسے کر سکتی ہے؟'' کوئی دوسرا بولا۔

''اتنی ہمت کہاں سے لائی ہوگی؟'' وہ چلتی رہی.....لعنتیں.....دھکے ٹھڈے کھاتی.....گرتی پڑتی۔

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر.....

چشم نم مسکراتی رہی رات بھر.....

کسی گاڑی میں تیز آواز سے یہ گیت کیا چلا اس کا ذہن الٹی دوڑ لگانے لگا۔

آپکی یاد آتی رہی رات بھر.....

آپ کی یاد آتی رہی.....آتی رہی

''مومی، چپ کر جا بے شرم.....چپ کر جا۔'' اماں پوری قوت سے دھاڑیں تو وہ ہنسنے لگی۔ان کے سونے گھر میں اس کی ہنسی مندر کی گھنٹیوں جیسی گونجتی.....ہنسی کی بازگشت دیر تک اماں کا دل جلاتی۔وہ ایک ادا سے اماں کے قریب آ بیٹھی۔

''اماں تو نے کبھی محبت کی ہے؟'' سعدیہ آنکھیں پھاڑے اسے گھور رہی تھیں۔

''یہ جو تو کر رہی ہے یہ سب.....یہ محبت ہے کیا؟'' اماں نے سوال پہ سوال کیا تو وہ پھر ہنسی.....وہی دلربا ہنسی.....

''ہاں محبت ہے یہ.....سزا کے جیسی.....بددعا کے جیسی.....لہو میں زہر کی طرح کڑواہٹ اتارتی، جلاتی ہوئی روز نئی محبت.....اماں تجھے تو اندازا بھی نہیں ہوسکتا کیسا لطف ہے اس محبت میں۔'' مومنہ نے ایک ادا سے اپنے لمبے بال آگے کیے اور بے پناہ خوب صورت آنکھیں اماں کے درد میں ڈوبے چہرے

پہ ڈال کے بولی ''یہ محبت وحبت اصل میں کچھ ہے ہی نہیں اماں لیکن محبوبہ ہونے کا چسکا بہت برا ہے نشہ ہے......با قاعدہ نشہ......''

سعدیہ حسب معمول رونے لگی۔

تیرے باپ کو بہت روکتی تھی بہت سمجھاتی تھی کہ دل نہ دکھا......نجانے کس دل کی آہ لگ جائے اور ہماری نسلوں کو چاٹ جائے......لیکن روکتی تھی بددعا تو نہیں دیتی تھی۔کسے دیتی بددعا......؟ تو ہی تو تھی اس کا اور میرا اکلوتا رشتہ......پھر کیسے میں بددعا دیتی لیکن تو نجانے کب بددعا بن گئی۔'' سعدیہ روتی رہی۔

''اماں! باپ اور بھائیوں کے گناہ بہنوں اور بیٹیوں کے لیے بددعا کیوں بن جاتے ہیں؟ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اٹھ کے چلی گئی۔اس کے کمرے سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''پھر کسی کو بیوقوف بنا رہی ہوگی۔'' سعدیہ بڑبڑائی اور استغفار پڑھنے لگی۔

نشہ جب خون میں شامل ہو جاتا ہے تو گناہ ثواب کی تمیز ختم کر دیتا ہے۔بندہ بے بس ہو کر اس کے حصول میں بھاگتا ہے اور اسے پا کر ہی سکون ملتا ہے اسے۔مومنہ بھی روح کے کسی گھاؤ کا شکار تھی۔ہوش سنبھالنے سے بھی پہلے شاید کسی نے اس کی روح سے چادر کھینچ دی تھی۔وہ ننگی روح کے ساتھ تب سے بھاگ رہی تھی شاید ابا کے کسی دوست نے......ابا نشہ کرتے تھے۔شادی کے شروع شروع میں تو گھر سے باہر پھر دوست یار گھر آنے لگے۔پرکھوں کا چھوڑا نوابی گھر تھا اور شفیع احمد کے نوابی گناہ۔کبھی دوستوں کے ساتھ نشہ کرتا تو کبھی کوئی سہیلی لیے گھر ہی آ جاتا۔مومنہ کو یاروں سے ملواتا۔

''چاچو ہیں تیرے۔''

''نئی ماں ہے تیری دیکھ کیسی حسین ہے۔'' ابا مکروہ ہنسی ہنستا۔مومنہ نے اسی سے سیکھی تھی ایسی ہنسی۔

'نئی ماں' کا چہرہ کچھ دن بعد بدل جاتا لیکن پرانی ماں بہت پرانی لگنے لگی۔بجھی ہوئی شمع جیسی......

جو عبادت گزار اور نیک عورت تھی لیکن اس کی روشنی بیکار تھی باپ کے دل کو چمکا سکی نا ہی مومنہ کے دل کو۔

ایک دن وہ کالج سے آئی تو ابا نشے میں دھت پڑا تھا......شاید بیہوش تھا......دیر تک نہ اٹھا تو پتہ چلا مر گیا۔اماں اسے ہسپتال نہیں لے کر گئی، بس منہ پہ کپڑا رکھے روتی رہی۔اس کے نزدیک شاید رونا ہی سارے مسئلوں کا حل تھا۔اب تک رو رہی تھی۔اب جب مومنہ کے دوست گھر آنے لگے......اب جب مومنہ کے تن کے کپڑے مختصر سے مختصر ہونے لگے......اماں بس روتی رہتی۔

''مومی یہ سب ٹھیک نہیں ہے......چھوڑ دے یہ سب۔اب تو ہمارا پیسہ بھی ختم ہو گیا ہے چندا۔ایک دکان کا کرایہ آتا ہے بس......میری بات سن......کوئی کام کر......اتنا پڑھ لیا ناں......کوئی نوکری ڈھونڈ۔''

''اماں......نہ کیا کر ایسے۔'' وہ چلائی۔

''کافی ہے دکان کا کرایہ۔ہم دو ہی تو ہیں۔میں باہر کھا کے آتی ہوں۔میرا خرچہ میرے دوست اٹھاتے ہیں۔ایک تیری روٹی کے لیے دکان ہی کافی ہے۔''

''دوست تیرا ماس کھا رہے ہیں۔یہ راستہ چھوڑ دے۔'' سعدیہ نے منت کی تو وہ ہنسنے لگی۔

''ماس کو بھی نچوانے کا چسکا ہو جاتا ہے اماں......مر کے ہی چھوٹے گا اب۔'' سعدیہ افسوس اور دکھ سے بیٹی کو دیکھتی۔خود کو کوسنے لگتی۔اسے لگتا اسی کی بددعا کا اثر ہے۔اس کے باپ کی بدکرداری اور بیکاری سے تنگ ہو کر جو بھی بددعائیں اور آہیں سعدیہ کے دل سے نکلتی تھیں وہ مجسم ہو کے مومنہ بن گئی۔وہ اپنی ہی بیٹی کو چھو نہیں سکتی تھی...... پیار نہیں کر سکتی تھی۔وہ رو رو کر اپنی بچی کے لیے معافی مانگتی۔لیکن مومنہ کی معافی ممکن نہیں تھی۔کتنے ہی ٹوٹے دلوں اور برباد عورتوں کی بددعائیں اس کے خون میں گھل گئیں تھیں جنہیں ابا نے برباد کیا۔

پھر پتہ چلا مومنہ کو عشق ہو گیا۔اس کی روح کی بے چینی پروفیسر اظہر کے وجود میں سمٹ گئی۔وہ ان کی اسسٹنٹ کے طور پہ کام کرنے لگی۔ان کے لیے محبوب اداؤں میں ڈھلنے لگی۔سب چھوڑ دیا......بس وہی یاد رہتا......صرف وہی ایک شخص۔

''شادی کر لو اس سے۔مجھے لگتا ہے میری دعائیں سنی گئی ہیں۔اتنی اچھی نوکری اور تعلیم والا بندہ مل گیا ہے۔سعدیہ نے بیٹی کے ہاتھ اپنے کمزور ہاتھوں میں لیکر کہا تو وہ کچھ پل ماں کو دیکھتی رہی۔

''شادی شدہ ہے......بچے بھی ہیں۔''

''مومی......!. پھر بھی کر لے شادی......پناہ دے گا......تحفظ دے گا۔''

''اس کے پاس پناہ ہوتی تو مجھ سے ملنے میرے گھر آتا اماں؟ اور تحفظ......نہیں ہے اس کے پاس۔''

''مجھے اس سے عشق ہو گیا ہے۔میں نے اس کے ہر مطالبے کو مان لیا۔کچھ بھی نہیں مانگا۔''

سعدیہ دہل کر اسے دیکھنے لگی

''ادھر ادھر ڈول رہی تھی تو آپ کو مسئلہ تھا۔اب ٹک گئی ہوں......نوکری کر رہی ہوں، محبت کر رہی ہوں تو آپ خوش نہیں ہیں۔کیا کروں میں آپ کے لیے؟''

''تم ہی کہتی تھی محبت وحبت کچھ نہیں۔''

''کچھ تو ہے اماں......محبت کے دامن میں آسودگی ہے۔اب پہلے جیسی بے سکونی نہیں ہے۔لگ رہا ہے وہ والی محبت ہو گئی ہے جس میں اپنا ہی وجود صفر ہو جاتا ہے۔''

''مومنہ چپ کر......چپ کر جا بس۔'' وہ الٹے پاؤں پلٹ گئیں۔مومنہ سے جتنی بات کرنی ہوتی تھی کھڑے کھڑے ہی کرتیں۔وہ کبھی بھی اس کے بستر پر نہ بیٹھتی تھیں۔زیادہ پیار آتا تو اسے باہر بلا لیتیں۔بمشکل ہی کبھی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتیں اور اب تو تمام معاملات ان کی برداشت سے بہت زیادہ

برے ہوگئے.....اتنے کہ انہوں نے اس رات کو اپنی زندگی کی آخری رات کرلیا۔

مومنہ بہت اکیلی ہوگئی تھی۔ اماں کی تدفین کے سارے مراحل میں اظہر اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ محلے سے جو چند لوگ آئے ان کو مومنہ نے بتایا کہ اظہر سے نکاح کرلیا ہے میں نے۔

اب زندگی کے ڈھب ہی بدل گئے۔ بالکل ویران.....اجاڑ لگنے لگی حویلی .....جیسے گھر میں ہر طرف اماں کی نصیحت بھری نظریں گھومتی رہتیں۔ باہر لوگ گھورتے رہتے۔ مومنہ نے گھر بیچ دیا اور دکان بھی۔ پروفیسر اظہر ہر روز آتا اور دونوں زندگی کے کونوں کھدروں سے خوشیاں ڈھونڈتے اور تسخیر کرتے رہتے۔ دنیا گھومنے نکل گئے۔ ایک دوسرے کا مکمل ساتھ جی رہے تھے۔ واپس آ کے مومنہ نے چھوٹا سا اپارٹمنٹ لے لیا۔ اب اتنا ہی بچا تھا۔ نوکری کرتی اور اپنا گزارا کر پاتی ایک دن اظہر نے بتایا.....اسے اسسٹنٹ کی ضرورت نہیں رہی۔ کہیں اور نوکری بھی دلوادی۔ اب دن بھر کا ساتھ بھی نہیں رہا تھا۔ رات تو وہ کبھی ٹھہرا ہی نہ تھا۔ پھر بتایا کہ اس کے گھر کو اس کی ضرورت ہے۔ کچھ وقت کم آنا جانا رہے گا۔ مومنہ کا محبت کا نشہ ٹوٹنے لگا تو وہ نشہ کرنے لگی.....گنگناتی رہتی.....

آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
آپ کی یاد آتی رہی رات بھر
آپ کی یاد.....
چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

آنکھیں بھرنے لگیں۔ پاؤں تھک کر ٹوٹ جاتے لیکن وہ نہ آتا اور جب آتا تو بہانوں کا پلندہ ساتھ ہوتا۔

''آج کرتی ہوں اظہر سے بات۔'' اظہر کا نام اس کے ہونٹوں کو چھوتا تو ہونٹ خود بخود مسکرانے لگتے کے ساتھ اٹھی اور تیار ہونے لگی.....گنگناتی رہی.....سجتی سنورتی رہی۔ اظہر کی محبت سے پور پور مہکنے لگا۔ وہ ایک نئی امنگ وہ اس کی محبت میں ایسی گم تھی کہ اس کے رویے کے بدلاؤ پر غور ہی نہیں کیا۔ وہ آ گیا لیکن بیزار سا تھا۔

''ایسا کیا ہوا ہے جسے ہم مل کے سلجھا نہیں سکتے؟ کس چیز میں الجھے ہوئے ہو؟؟'' وہ اس کے قدموں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے گھٹنوں پہ بازو دھر دیئے تو وہ جز بز ہونے لگا۔

''سلجھاؤ بہت مشکل ہوگیا ہے مومنہ! میں نے اپنا قیمتی وقت اور توجہ تمہیں دی۔ اس دوران میرے گھر کا نظام تہس نہس ہوگیا.....سب خراب ہوگیا۔''

کچھ چھن سے ٹوٹا تھا.....شاید اعتماد.....بھرم.....محبت.....وہ سہم گئی۔ ایسے لہجے کی عادی کہاں تھی۔

''تو کیا ہوا؟ بتاؤ۔'' وہ انتہائی ضبط سے بولی۔

''کیا بتاؤں.....؟ اپنا تماشا بناؤں تم جیسی عورت کے سامنے؟'' آنسو گالوں پر بہہ نکلے۔

ہم دو تو نہیں ہیں.....سارے مسئلے ہم مل کے سلجھا سکتے ہیں۔ وہ بے بسی سے بولی۔

''وہ اور مسائل تھے جو ہم سلجھا سکتے تھے۔ باہر کے مسائل.....پیسوں کے مسائل.....تمہاری وجودی ضرورتوں کے مسائل.....''

''میری وجودی ضرورتیں؟؟؟'' وہ چیخ پڑی۔ حیرت سے گنگ اسے دیکھتی رہی۔ تبھی وہ اس کے گھنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر بولا۔

''تم جیسی آوارہ عورت کو راہ راست پہ لاتے لاتے میرے بچے.....یہاں تک کہ میری بیوی.....''

''اوہ!'' مومنہ نے سسکاری بھر کر اپنے بال چھڑائے۔ سناٹا دونوں کے درمیاں آ کھڑا ہوا .....دیر تک تکتا رہا دونوں کے بے بس چہرے اور مایوس بدن۔

''یہ ان کا وقت تھا جو میں نے تمہیں دیا۔ سب کچھ برباد ہوگیا لیکن میں اب بھی سنبھالنا چاہتا ہوں۔ کسی مرد کی مردانگی کی موت ہوتی ہے یہ کہ اس کی بیوی کسی اور سے.....تم بھی سنبھل جاؤ.....شادی کرلو کسی سے.....کوئی سہارا تو ہو بڑھاپے کا۔'' مومنہ مرگئی اسی لمحے.....اس کا مٹی وجود رل گیا۔ بمشکل پیچھے ہٹی۔

''میں تمہارا مسئلہ نہیں؟ عزت بھی نہیں؟ میرے وجود کو کوئی اور مرد.....یہ تمہاری نامردی نہیں ہوگی؟''

''نہیں.....تم عادی ہو اس سب کی۔ فلمی عورت مت بنو۔ عقل کرو کچھ عقل۔'' وہ چیخا۔ مومنہ نے منہ موڑ لیا۔ لمحوں میں سب ختم ہوگیا۔

''تو تم اب نہیں آؤ گے؟''

''نہیں! وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ٹوٹ پھوٹ جاری رہی۔ عورت صرف محبت میں کمزور ہوتی ہے.....صرف وفاداری میں بے وقوف بنتی ہے.....دونوں چپ رہے دیر تک۔

''آخری بار آئے ہو؟'' وہ بہکے سے لہجے میں بولی اور قریب تر ہو کر اس کے گریبان کے بٹن کھولنے لگی پھر اسے دھکا دے کے بستر پہ گرا دیا۔

''وقت تو میں نے بھی دیا.....محبت بھی.....توجہ بھی.....''

وہ روہانسا سا لیٹا رہا۔

''چلو یہ آخری وقت یادگار بناتے ہیں۔ چھوڑو سب.....تم جیتے میں ہاری۔'' پھر وہ پلٹی۔

''کچھ کھانے پینے کو لاتی ہوں۔'' وہ ایک پل کے ہزارویں حصے میں اس آخری لمحے کے یقین تک پہنچ گئی۔ بحث کیا کرتی..... جب وہ گندی عورت تھی تو اچھی کیسے بنتی؟ کچن میں آ کے کچھ چیزیں ڈش میں ترتیب لگائیں۔ گلاسوں کو بھرتے ہوئے روتی رہی.....بھرائی آواز میں گنگناتی رہی۔

چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

چشم نم مسکراتی رہی

وہ وہیں تھا بستر پہ..... کچھ کپڑے اتارے کچھ پہنے ہوئے تھا۔ مومنہ ڈش رکھ کے اس کے قریب آ گئی..... اس کے اوپر گر گئی اور چھرے سے وار کرتی چلی گئی..... وہ سنبھل نہیں سکا۔ وار ایسی جگہ پہ تھا کہ اس کی ساری مردانگی دھری کی دھری رہ گئی.

''محبوبہ مرد کی عزت نہیں ہوتی ؟'' وہ ایک ہی فقرہ چیخ رہی تھی۔ وہ دوہرا ہوتا گالیاں بک رہا تھا۔ پھر گر گیا..... بے دم ہونے لگا۔ مومنہ کالی چادر کھینچ کے چہرہ چھپاتی نکل آئی..... تالے جندرے مارے بغیر..... یہ سب تو وہ محبوب کی سنگت میں کرتی تھی..... اسے اور خود کو چھپانے کے لیے..... عزت سے جینے کے لیے.....

چشم نم مسکراتی رہی رات بھر

چشم نم.....

کوئی تیز رفتار گاڑی اس نے اپنی طرف بڑھتی دیکھی تھی..... نم آنکھیں چندھیا گئیں۔

تاریکی پھیلتی چلی گئی.....

◂◂ ● ▸▸

House no 620, Karim Block ,Allama iqbal Town ,
Lahore(pakistan)
03374803321

● **افسانہ**

● **فریدہ انصاری**

بے بی اماں

''چل جلدی کر! یہ بلوریاں لے، دیکھ برابر لگنا چاہئے ورنہ میں سب لے لوں گی۔'' سر پر قاعدے سے دوپٹہ اوڑھے ہوئے وہ گویا ہوئی۔

''ارے ہٹ! بڑی آئی سب لینے والی! ایک دھکا لگاؤں گا نا، دیکھ جا کر کہاں گرے گی، بڑا خود کو طُرّم خان سمجھتی ہے۔'' ثاقب نے جھٹکے سے اس کے دوپٹے کو کھینچا اور وہ گرتے گرتے بچی۔

''خبردار! دوپٹے کو ہاتھ نہ لگانا۔'' نوخیز لڑکی کی طرح شرماتے ہوئے اس نے کہا۔

''امی مرحومہ کہتی تھیں دوپٹہ لڑکیوں کے سر کا تاج ہوتا ہے۔'' اور دوسرے ہی پل اس نے زمین پر پڑے بڑے چھوٹے پتھر اٹھائے اور ثاقب پر جارحانہ انداز میں تانے۔ ثاقب کہاں رُکتا، وہ یہ جا وہ جا۔ سلیم کی اب باری تھی۔ سلیم چنچل نہ تھا۔ سمجھتا تھا۔ اس کے گھر میں بڑے چھوٹے سبھی موجود تھے۔ وہ ہر کسی کا احترام کرتا تھا۔ اس نے دھیرے سے سمجھایا دیکھو ایسے بلوریاں پھینکو پھر برابر لگے گی۔''

وہ خوش ہوگئی اور خوب تالیاں بجانے لگی۔ وہ بچوں کے ساتھ ایسے ہی کھیل کر خوش ہوتی۔ شام میں گھر کے لڑکوں اور ان کے دوستوں کے ساتھ چھت پر چڑھ جاتی اور چکری اپنے ہاتھوں میں دھر لیتی۔ لڑکوں سے پتنگ خوب اونچی اُڑانے کی فرمائش کرتی اور یک لخت تالیاں بجانے میں چکری زمین پر گر جاتی اور پتنگ بے چاری ہچکولے کھاتی زمین کا سفر کرتی۔ پھر لڑکے شرارت سے اس کے سر پر چپت لگاتے اور خوب بڑبڑ کرتے اور وہ کسی کو دھپ لگاتی زینے طے کر نیچے آ جاتی۔ وہاں کچن سے آتی اس کی دیورانی کی بڑبڑاہٹ گھر کے سبھی افراد کے لئے باعث تذلیل ہو جاتی۔

''کچھ کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی! لڑکوں بالوں کے ساتھ کھیلنا نہی نا بھولتا۔''

ایسا کیوں ہوا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ ایک سلیقہ شعار، قبول صورت بہو تھی۔ ساس کے ہاتھ کا چھالا تو میاں کے دل کی رانی۔ ساری رشتہ داریوں کا پاس بخوبی نبھاتی۔ کس کے گھر کون پیدا ہوا، کس کے گھر چھٹّی کے کپڑے بھجوانا ہے، بتیسے کے لڈو بنانا ہے، شادی بیاہ کے لوازمات تو موت میت کی بھاتی سب وقت پر ان کے گھر سے پہنچ جاتی۔ خاندان والے بھی اس کی عزت و اکرام میں کوئی کمی نہ کرتے کہ والد محترم کے قول کو

ہمیشہ دامن میں سمیٹ کر رکھا تھا کہ ''دینے والے کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا ہے۔''

لیکن وقت کا پہیہ کچھ ایسا گھوما کہ دینے والے ہاتھ لینے والے بن گئے۔ یہی دنیا کی ستم ظریفی کہ دیکھتے دیکھتے جو قصیدہ خواں تھے وہ مرثیہ خواں بن گئے اور وہ کچھ بھی تو نہ کر سکی۔ سب سے چھوٹے دیور کہ جس کو ایسے پالا تھا جیسے کوکھ کا بچہ ہو، جس کی شادی اپنے بیٹے کی طرح کی تھی اسی کی بہو نے دھیرے دھیرے اس کی بیماری کو کچھ یوں طول دیا کہ ان طعنوں کی بندش میں اس نے اپنے وجود کو گم کر دیا۔ نہ عدالت میں جُرم کی سماعت ہوئی نہ مجرم کو سزا سنائی گئی۔ ذہنی طور پر وہ حال سے بے خبر ہوتی چلی گئی۔ کچھ عمر کا تقاضے اور پہلے پہل بھولنے کی عادت سے شروعات ہوئی۔ کچھ بھولا کچھ یاد رہا کے مصداق خود کو حالات کے حوالے کر دیا اور یہاں دیورانی اس کے سجے سجائے سنگھاسن پر براجمان ہوتی چلی گئی۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے سبب جب گھر کے اخراجات و اندراج میں اس سے گڑبڑی ہونے لگی تب دیورانی کو مکمل موقع مل گیا اور وہ سیاہ و سفید کی مالک بن بیٹھی۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ لکھنے بیٹھتی تو لکھ ہی نہ پاتی۔ کاغذ پر قلم سے صرف آڑھے ترچھے دائرے بناتی۔ تب بیٹا وسیم آتا اور ہاتھ پکڑ کر اسے لکھنے کی ترغیب دیتا۔ وہ غائب دماغی سے اس کا چہرہ تاکا کرتی لکھتی کم۔ بیٹا کہتا۔

''اماں! اس طرح نہ دیکھیں۔ آپ کو یاد نہیں بچپن میں آپ نے بھی تو اسی طرح مجھے سکھایا تھا۔ اب کیا ہو گیا کہ میں نے آپ کا ہاتھ تھاما۔''

ہال سے اٹھتی دیورانی کی آواز وہ سمجھ نہ پاتی، شاید سمجھنے کی کوشش نہ کرتی اور انگوٹھا منہ میں لے کر وہیں زمین پر سو جاتی۔ ''دیکھو تو کیسے بچوں سی حرکت ہے۔ کچھ شرم غیرت ہے کہ نہیں!'' اور پھر وسیم کا دل پھٹ جاتا لیکن اماں کی سمجھائی عزت و تکریم کا لحاظ آ جاتا، ان کی بتائی باتیں یاد آ جاتیں اور وہ اپنی بیوی کو آواز دیتا اور گود میں اٹھا کر اس کے کمرے میں لے جاتا۔

''ہائے ہائے! دیکھو تو کیسا زمانہ آ گیا۔ بیٹے کی گود میں سواری ہو رہی ہے!'' ایک اور چرکا لگتا پر وسیم صبر کا دامن تھامے رکھتا۔ اس نے اپنی ساری زندگی اماں کے لئے وقف کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اس لئے شادی سے بھی انکار کرتا رہا لیکن جب اماں کی نجی ضروریات کا خیال آتا تب کسی خاتون کی مدد کے بارے میں سوچنے لگتا۔ کہتے ہیں کہ ہم جس راہ پر چلنا چاہتے ہیں پاک پروردگار وہ راہیں آسان بنا دیتا ہے اور یوں زندگی کی ڈگر پر اس کی ملاقات ڈاکٹر صبا سے ہو گئی۔

صبا ایک سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ ایک سائیکیاٹرسٹ۔ نفسیاتی ڈاکٹر۔ وسیم کے فیملی ڈاکٹر نے اسے اس کے پاس بھیجا تا کہ مریضہ کی بیماری کی بخوبی شناخت ہو۔ اس نے بتایا۔ اماں کے ساتھ ایک دن یہ حادثہ ہوا تھا کہ گھر کے قریب کے کھیتوں میں آگ لگ گئی تھی اور انھیں ایسا لگا تھا کہ ساری زندگی کا اثاثہ برباد ہو گیا۔ جس طرح بچپن میں ان کے میکے میں ایسا ہی اندوہناک واقعہ ہو گزرا تھا، وہ اس صدمے کی ہو کر رہ گئی

تھیں اور جب سارے واقعات کی ڈوریاں ملائی گئیں اور کئی ٹیسٹ کروائے گئے تب یہی بتایا گیا کہ اماں Age Inregression Dissoliative Identity Disorder کی شکار ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صبا نے بتایا کہ 60 سال کے اوپر کے لوگ اس کا شکار ہو سکتے ہیں۔ عمر کے علاوہ زندگی کا کوئی واقعہ یا بہت زیادہ دماغی تناؤ، کوئی صدمہ ان کو بچپن میں ہوئے کسی خاص واقعہ کی طرف موڑ دیتا ہے اور وہ وہیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ البتہ اسے مزید آگے بڑھنے سے افراد خانہ کی محبتیں یا ماحول کی تبدیلی روک سکتی ہے۔''

صبا نے اُن کے علاج معالجے سے رجوع کیا۔ دعائیں و دوائیں کبھی اپنا اثر ضرور دکھاتیں لیکن دیورانی کے طعنے اس کی سماعتوں سے ٹکراتے رہتے۔ شاید سمجھ جاتی ہو یا نہ سمجھے لیکن بہرحال اپنائیت کی ضرورت تھی۔ وسیم اپنے والد کے ساتھ زمینداری میں مصروف رہتا اور گھر پر ملازم بھی دیورانی کے ہاتھوں بک چکے تھے۔ وہ ویسے ہی بولائی بولائی گھر میں گھومتی رہتی۔ نہ وقت پر کھانا کھاتی نہ سوتی۔ بچے بھی کیا کبھی تنہا سب کچھ کر پاتے ہیں؟ وہ بچہ ہی تو بن گئی تھیں۔ کئی بار اس کے والد نے بھائی سے دیورانی کی شکایت کی، ڈانٹا گیا، وسیم نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن دیورانی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس کا ہدف یہ تھا کہ کسی طرح یہ افرادِ خانہ کہیں چلی جائیں اور وہ بلا شرکتِ غیر وارث قرار دی جائے۔

انسان کی سوچ سے بہت آگے مالک کائنات سوچتا ہے۔ کسی کا حق مار کر کوئی کتنا دوڑ سکتا ہے؟ اسی دوران وسیم نے پہلے اپنے ابا سے اجازت لی پھر صبا سے شادی کی درخواست کی۔ صبا نے بھی وقت لیا اور یہ کہہ دیا کہ آپ اپنے والد کو ہمارے گھر بھیج دیں اگر والدین نے مناسب جانا تو اسے انکار نہ ہوگا اور اس طرح صبا نے ایک بہو، ایک ڈاکٹر بن کر وسیم کی دہلیز پر محبت کے چراغ جلائے۔ دیورانی کو تو آگ ایسے لگی کہ سر سے چلی اور پیر تک پہنچی لیکن کچھ کر نہ پائی۔ وہ تو اپنی خالہ کی بیٹی کو اس مقام پر دیکھنا چاہتی تھی لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ سادگی سے نکاح و رخصتی ہوئی کہ کوئی خلاف قیاس بات نہ ہو جائے اور محبتوں کی چھم چھم پازیب پہنے صبا اماں کی زندگی میں آ گئیں۔ شبِ زفاف وسیم نے ایک بار پھر بات دہرائی کہ ''ماں ہی اس کی متاع حیات ہے۔'' اور اس نے بھی اس پر اپنی مہر ثبت کر دی کہ جنت جانے کا راستہ ماں کے قدموں تلے سے ہی گزرتا ہے۔

صبا کئی بار باتیں سنی ان سنی کر دیتی۔ ایک دن تو حد ہی کر دی کہ ''لو بڑی ڈاکٹر صاحبہ بنی گھومتی تھیں، کیا ہوا سارے سرٹیفکیٹ جھوٹے نکلے کہ کلینک نہیں جاتیں، گھر کی ہو کر رہ گئی ہیں محترمہ!! اس کا کیا راز ہے؟ اے منشی! ذرا پتہ تو کر آ کہ سرٹیفکیٹ جعلی تو نہیں۔'' اور وہ بھونچکی رہ گئی۔ کیا کرے کیا نہیں۔ کلینک جائے تو گھر ہاتھ سے چھوٹتا ہے نہ جائے تو ایسے طعنوں کے لئے کہاں سے اتنا بڑا جگر لائے؟ لیکن اسے اپنا وعدہ یاد رہا۔ باقی سب بھول گئی اور تن من دھن سے اماں کی ہو گئی۔ اس طرح اُن کی دیکھ بھال کرتی جیسے

اپنے بچے کی کرتی ہو۔اماں بھی اس کا ساتھ پا کر ایسی خوش ہوتیں کہ کوئی دیرینہ سہیلی مل گئی ہو۔اس کے ساتھ گڑیا گڑیا کھیلتیں، دوڑ لگاتیں، کھیتوں میں تتلیوں کے پیچھے دوڑتیں۔ بہت بہت خوش ہوتیں۔

ایک دن وسیم کے ابو ایسے سوئے کہ پھر سویرا نہ ہوا۔کفن دے کر جب اماں کو سامنے لایا گیا تب بھی اس کی غائب دماغی کے آگے پہلے تو بس بیٹھی رہیں اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر صبا کو تھا۔دلدوز چیخ کے ساتھ اس نے ہاتھ پیر چلانے شروع کئے۔ بلند آواز سے رونے لگیں اور مٹھیاں بھینچ لیں۔ کچھ منٹ نہ گزرے کہ دیوار پر سر مار کر خود کو لہولہان کر لیا۔صبا کے ساتھ وسیم اور ملازمہ بھی آگے بڑھے پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ایسی خوفناک حالت میں وہ دیورانی کی طرف دوڑیں اور اس کے بال پکڑ کر کھینچنے لگیں۔ بڑی مشکل سے بالوں کو چھڑایا اور مغلظات کا طوفان برپا ہو گیا۔صبا بھاگم بھاگ بیڈروم سے نیند کا انجکشن تیار کر، لے آئی اور کسی طرح وسیم نے کنٹرول کرا انھیں لگوایا پھر وہ ہوش وخرد سے بیگانہ ہو گئیں۔ وسیم کاندھوں پر اسے کمرے میں لے آیا۔لیکن دیورانی کی زبان پر قابو نہ تھا۔سارے سوگواران بس ٹک ٹک دیدم کی کیفیت میں مبتلا تھے۔آخر کسی طرح ان کے میاں نے کھری کھری سنائی کہ موقع تو دیکھو کہ ابھی بھائی کا لاشہ آخری سفر کا منتظر اور گھر کی یہ حالت!!!

میت میں آئے لوگوں نے بھی تدفین کے بعد اپنے گھر کی راہ لی کہ اب اس گھر میں مشفق ہستیوں کا کال پڑ گیا تھا۔مزار عین کی آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں پر کیا کرتے کہ حالات سازگار نہ تھے۔دوسرے دن بھی چچی کا حال ویسا ہی رہا۔ جہاں اماں کو ہوش آتا تو پھر بے قابو ہو جاتیں اور وسیم کے ابو! کہاں ہیں آپ؟ کہتیں، جواب نہ پا کر چیختیں اور دیوار پر سر مارنا شروع کر دیتیں۔صبا کی کوشش یہی رہتی کہ انجکشن سے ان کے ذہنی تناؤ کو کم کیا جائے۔کبھی کامیاب ہوتی اور کبھی ویسے ہی بے حال۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھنے کی بھی نوبت آ گئی۔ دل پر آری چلتی لیکن قابو پانے کے لئے کرنا پڑتا۔ واحد علاج اسپتال جا کر بجلی کے شاک سے گزاریں لیکن نہ وسیم کو یہ گوارا تھا نہ صبا اس کی اجازت دیتی کہ ایک بار اس کا تانتا چل نکلے تو بار بار مریض کو اس کرب سے گزرنا ہوتا ہے۔

اب وقت آ چکا تھا۔صبا نے وسیم سے بتا دیا کہ اب صرف ماحول کی تبدیلی ہی انھیں کچھ بہتر بنا سکتی ہے۔وسیم کے آگے اور کوئی راستہ نہ رہا۔سوئم کے دن ہی اس نے چچا کے آگے اپنی بات رکھی۔اس نے کہا۔

''چچا جان! آپ میرے والد کی جگہ ہیں۔آپ کی عزت وتکریم میرے لئے مقدم ہے لیکن گھر کے حالات سے آپ باخبر ہیں۔اب میں کیا کروں آپ ہی مشورہ دیجئے۔اماں کو میں اس حالتِ زار سے نکالنا چاہتا ہوں۔ بتائیے کیا کروں؟'' چچی نے جوں ہی سنا فوراً لقمہ دیا۔

''کیا کروں کیا؟ پاگل خانے بھجوا دو یا اسپتال ڈال آؤ اور کیا کرو؟ اور تم اور بہو اپنا سوچو۔'' چچا نے ڈانٹ کر کہا۔

''زبان ہے کہ آری! جو منہ میں آئے بکتی رہتی ہو۔ کچھ وقت کا لحاظ بھی کر لیا کرو۔'' لیکن جن کی آنکھوں کا پانی اُتر جائے وہ کہاں کسی کی سنتے ہیں۔ان کی بڑبڑاہٹ جاری رہی اور آخر چچا نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ اگر ماحول بدلنا چاہتے ہو تو وہ دو گاؤں دور پار کی اراضی ہے وہیں چلے جاؤ اور اپنا نیا جیون شروع کرو۔حالات ٹھیک ہوں تب دیکھ لیں گے۔ وسیم سوچ میں پڑ گیا کہ وہ قطعہء اراضی اتنی زرخیز بھی نہیں لیکن میری محنت، لگن اللہ کے حکم سے اسے ہرا بھرا بنا دے گی۔اس نے حامی بھر لی اور اماں وصبا کے ساتھ وہاں سے کوچ کر لیا۔وقتِ رخصت چچا، چچی سے کہہ دیا۔

''جب تک آپ لوگ یہاں ہیں یہ آپ کی لیکن جس دن اسے فروخت کرنے کا ارادہ کریں گے میں اپنا حصہ لینے آ جاؤں گا کہ وراثت اللہ پاک کا عطیہ ہے۔''

یوں وہ دور پار کا ہو گیا۔دور پار کہاں؟ بس دو گاؤں کے ہی فاصلے تھے لیکن دلوں کی دوریوں نے دریا کے دو پاٹوں میں تقسیم کر دیا تھا جب کہ وہ کبھی تقسیم کا خواہاں نہ تھا۔

ذہن کو کچھ سکون ملا تو صبا نے بھی اماں کی طرف مکمل طور پر علاج شروع کیا۔جگہ وحالات بدلے تو دوائیں بھی اثر دکھانے لگیں اور اماں کی طبیعت میں بھی کچھ فرق نظر آنے لگا۔اب ہیجانی دورے موقوف تو نہ ہوئے لیکن کچھ کم ضرور ہو گئے۔

ماہ وایام کا سفر جاری رہا۔اماں یہاں بھی بچوں کے ساتھ گلی محلے میں کھیل کر خوش ہوتیں۔تالیاں بجاتیں۔ بچے بھی ان سے مانوس ہو چلے تھے۔ایک دن گر کھیلنے نہ آتیں تو بچے جاننے کے لئے دستک دے دیتے۔ بے بی اماں ان میں مقبول ہو گئی تھیں۔صبا اکثر دور کھڑی رہ کر یا دریچوں سے جھانک کر ان کی حرکات وسکنات دیکھتی رہتی۔ پیر فلک آسمان خاموشی سے جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ کیا اماں کی واپسی ممکن ہے؟ سرسبز زمین جس پر وسیم کی محنت رنگ لا رہی تھی اس سے بھی وسیم کی خاموش سرگوشیاں کہہ اٹھتیں ''اماں! واپس آ جاؤ۔'' لیکن ننھ کھٹ بچے بھی کہاں بڑوں کے دلوں کے حالِ زار سے واقف ہوتے ہیں۔

صبا ایک سائیکیاٹرسٹ تھی، وہ جانتی تھی کہ زندگی کا کوئی کمزور لمحہ یا بڑا صدمہ ان کی زیست کی شمع گُل کرنے کے لئے کافی ہوگا۔وہ انھیں ہر طرح سے خوش رکھتی۔ایک دن جب وسیم پرانی یادیں، وہ بچپن کے واقعات جو سینت سینت کر تصاویر کی شکل میں رکھے گئے تھے انھیں دیکھ رہا تھا۔اماں بھی ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں کہ آس کے پنچھی نے ایک زبردست اُڑان لی۔اماں نے ایک تصویر اٹھالی اور اسے بڑے غور سے دیکھنے لگیں۔تصویر کو کبھی الٹا کرتیں کبھی سیدھا۔مختلف زاویوں سے اس نے دیکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔تصویر میں ابو ساتھ تھے اور اماں دلہن کے روپ میں ساری کا پلّو سر پر رکھے ہوئے تھیں۔زیوروں نے ان کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کیا ہوا تھا۔ ماتھے کا ٹیکہ اور لونگ کا لشکارا اپنی آب وتاب سے ان کی سج دھج کو

دوبالا کر رہا تھا۔سونے کے کنگنوں کے ساتھ دھانی کانچ کی چوڑیوں کی کھنک کو شاید اماں نیآج پھر سے محسوس کر لیا تھا۔منظر میں دور گگن کا چاند ان کی محبت کا گواہ تھا اور حویلی کے خوبصورت حوض میں امی کا ہاتھ جس کے پانی میں چاند کا عکس دکھائی دے رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا گویا اماں نے پانی میں چاند کو چھو لیا ہو۔پرانی تصویر نے انھیں اس جگہ کھڑا کر دیا جہاں سے انھوں نے شبستانِ حیات کی دہلیز پار کی تھی۔ہچکیوں کے درمیان وہ اس تصویر کو دیکھنے لگیں۔ساتھ دوسری تصویر جس میں کالے لانبے بالوں کے ساتھ بنگالی ساری پہن رکھی تھی اسے نہارنے لگیں اور وسیم کو ہاتھ کے اشارے سے بتایا یہ میں ہوں اور میرے بال!!!اور ہاتھوں نے بالوں کو تلاش کرنا چاہا لیکن وہ چمکتے بال تو کب کے اس سے رخصت ہو چکے تھے۔بس وہ دیکھتے ہی رہ گئی۔ہاتھ کے اشارے سے بالوں کے بارے میں چہرے پر سوالیہ نشان ابھرے اور یک لخت اس نے خود کو سمیٹا اور زمین پر ڈھیر ہوگئی۔وسیم کی چیخ سن کر صبا دوڑتی ہوئی آئی پر جانے والی نے عدم کی دنیا آباد کر لی تھی۔

گلی کے نکڑ کا بورڈ جہاں گاؤں کے لوگوں کو انتقال پر ملال کی اطلاع دی جاتی ہے، وہاں درج تھا کہ مہرانساء بیگم، وسیم زمیندار کی امی کی تدفین عصر بعد گاؤں کے بڑے قبرستان میں کی جائے گی۔اس تحریر کو پڑھ کر لوگ ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے۔یہ مہرالنساء کون ہیں؟ چہ میگوئیاں جاری تھیں کہ ہواؤں نے یہ بات وسیم تک پہنچا دی۔غم کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے اس نے خود کو نکالا اور بورڈ تک آ کر مہرالنساء نام کو اپنے ہاتھوں سے ہٹا دیا اور اس کی جگہ ”بے بی اماں“ کا نام جگمگانے لگا۔ہر گھر کا بچہ بچہ اب اس تدفین میں شریک ہو مٹھی بھر مٹی ڈال رہا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

C/O Umair Nisar Ansari,P. O. Box: 9076,Doha, Qatar
+97455428341

● افسانہ

● سلمیٰ جیلانی

رشتوں کی دیمک

اس مدرز ڈے پر پہلی بار جب نو مانے اپنے ننھے ہاتھوں سے بنا کارڈ مجھے تھمایا تو خوشی سے آنکھوں میں آنسو چھلک آئے- دل نے کہا، دنیا میں اگر کوئی رشتہ اور تعلق بے غرض ہے تو صرف ماں اور بچے کا رشتہ . اماں.....میری پیاری اماں.....میں نے آنکھیں بند کر کے اماں کو تلاش کرنے کی سعی کی مگر جانے مجھے ایک ایسی ماں کی یاد آئی جس نے اپنے ایک ماہ کے بچے کو زمانے کی سختیاں جھیلنے کو اکیلا چھوڑ دیا تھا-

منحنی سا سمیر جسے سانس کا مرض تھا جب کھانسی کا دورہ پڑتا تو لگتا آج نہیں بچے گا، ہمارے دور پرے کا رشتہ دار اوپر سے پڑوسی ہونے کی وجہ سے اماں بہت خیر خبر رکھتیں- اکثر گھر میں جو اچھا کھانا پکتا اسے ضرور بھجواتیں، مگر مجھے اس سے عجیب سا حسد محسوس ہوتا، جب اماں کی توجہ اس کی طرف دیکھتی- اماں سمجھاتیں ”بے ماں کا بچہ ہے، اس کے ساتھ تمہارا یہ برتاؤ ٹھیک نہیں۔“ پر مجھے اپنی ماں کی محبت میں کسی کی شراکت داری بالکل پسند نہ تھی۔

کئی سال اسی طرح گزر گئے۔سمیر کی کھانسی بھی اس کی عمر کے ساتھ جوان ہوتی گئی- بیماری اور مناسب دیکھ بھال کی کمی، وہ کوئی اچھی تعلیم بھی حاصل نہ کر پایا نہ کوئی کاروبار ہی ڈھنگ سے جما پایا- کچھ دن فرائی چپس کا ٹھیلا لگاتا پھر دل بھر جاتا تو کچھ اور بیچنے لگتا اور کبھی یوں ہی گلیوں میں آوارہ گردی کرتا پھرتا- سچ پوچھو تو اس کے ابا ہی کی کمائی پر گھر چل رہا تھا. دونوں باپ بیٹے اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے، ایسے میں اماں ابا ہی بیچ بچاؤ کراتے.....مگر اماں کے بے حد اصرار پر بھی وجہ کوئی نہ بتاتا آخر جھگڑا کس بات پر ہوا ..... میرا بی ایس سی کا رزلٹ آ گیا فرسٹ کلاس آئی اور سمیر میٹرک میں تیسری بار لڑھک گیا- میں آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن شادی ہوگئی اور میں کویت آ گئی اور یوں مکمل ہاؤس وائف بن کر رہ گئی، ان لوگوں سے رابطہ بس اماں کی بتائی ہوئی گفتگو تک ہی محدود رہ گیا.....

فون پر کبھی کبھار ہی اماں اس کے بارے میں بات کیا کرتی تھیں لیکن آج انہوں نے خاص طور پر یہی بتانے کو فون کیا کہ سمیر اپنے باپ کو چھوڑ کر اپنی ماں کے پاس چلا گیا- اس کی ماں نے اسے پیغام بھیجا تھا- وہ اس سے ملنا چاہتی تھیں-

’’ہمم! تو گویا وہ جانتی تھیں کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے......‘‘

’’ہاں ماں کی محبت ایسی ہی چیز ہے سعدی اور وہ تو بہت ترسا ہوا تھا اچھا ہوا اسے اس کی ماں مل گئی‘‘۔

میں سوچ رہی تھی، اماں بھی کتنی بھولی ہیں سب کو اپنی طرح سمجھتی ہیں۔ ایک عمر کی محرومیوں کو پل بھر میں کیسے بھلایا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد آیا ایک دن جب اماں کے کہنے سے اس کے لئے گارلک نان اور دال مکھنی لے کر گئی تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھا، میز پر اس کی ڈائری کھلی پڑی تھی...... کسی عورت کے اوپری بدن کا عریاں اسکیچ بنا تھا جس کی چھاتیوں کے بیچ میں ننھا بچہ جس کے ہاتھ پاؤں نہیں تھے۔ بس سر اور دھڑ نظر آ رہے تھے جیسے بچہ ماں کی چھاتی سے دودھ چوسنے کی کوشش کر رہا ہو یا پھر ممتا کی گرماہٹ پانے کو اس کے سینے میں گھسنے کی جدوجہد میں اپنے ہاتھ پاؤں تک گنوا بیٹھا ہو....... وہ اسکیچ اتنی مہارت سے بنا تھا کہ ایک لمحے کو میں مبہوت ہو کر رہ گئی تھی......اس کے نیچے ایک ادھوری نظم لکھی تھی۔

میرے خوابوں کو دیمک لگی ہے
دروں گہرا اندھیرا رس کر
کسی کھائی میں
گرتا ہے
دل ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے
ایک کہتا ہے
اس پری کو بچا لوں
جو دکھ کی نیلی جھیل میں رہتی ہے
جس پر نوٹوں کی مکڑیوں نے جالے بن ڈالے ہیں
دوسرا ٹکڑا
خود اس دیو کا قیدی ہے
میرے ساتھ ہی
ویران گھر میں رہتا ہے
اپنے آنسوؤں کی زنجیروں سے خود کو
آزاد کروں
گرا سے مار سکوں

اس ادھ کھلے صفحے نے گویا سمیر کے اندر کی دنیا کا وہ رخ مجھ پر وا کیا تھا جو بہت زرخیز تھا، لیکن

اس پر دکھ کی گہری پرچھائیں نے اپنے پنجے بری طرح گاڑ رکھے تھے جن سے ہر وقت لہو رستا رہتا تھا۔ مجھے اس میں اکھیلس Achilles دکھائی دیتا یونانی دیومالائی کردار جو اپنی لافانی طاقت کے باوجود اپنی کمزور ایڑیوں سے مات کھا گیا تھا۔ سمیر کا سینہ بھی شائد ممتا کی گرمی سے محروم رہ کر ہمیشہ کے لئے کمزور ہو گیا کتنا شاندار آرٹسٹ یا پھر شاعر ہو سکتا تھا وہ۔

میرے نزدیک تو سمیر کے ابا ہی اس کی اماں تھے۔ اس نے اپنے باپ کو بڑھاپے میں چھوڑ دیا جنہوں نے اس کی خاطر دوسری شادی نہ کی کہ سوتیلی ماں بچے سے جانے کیسا سلوک کرے گی۔ مگر میں نے اماں سے کچھ نہ کہا۔ میں جانتی تھی وہ کبھی نہیں سمجھیں گی، پھر بھی یہی ظاہر کیا کہ ہم دونوں اس کے لئے خوش تھیں۔ اماں دیر تک اس کی باتیں کرتی رہیں۔

کچھ ہی دن بعد اماں کا فون دوبارہ آیا۔ سمیر واپس آ گیا۔

’’کیوں؟ وہ تو سب سامان بھی لے گیا تھا۔‘‘

’’ہاں، اس کی ماں کو اس کے دوسرے شوہر نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اب اسے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی، لیکن سمیر تو نکھٹو اوپر سے بیمار، وہ تو الٹا اس پر ہی پڑ گیا۔ کچھ ہی دن میں اس نے نئے نویلے بیٹے کو دھتکار دیا۔ وہ کہتا ہے اب کبھی اس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔ بہت رو رہا تھا، بچوں کی طرح...... حسب معمول میں نے ہی اسے سہارا دیا۔‘‘

اماں کی بات کاٹتے ہوئے میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔

’’ہاں اصل میں تو اس کی اماں آپ ہی ہیں۔ وہ پتا نہیں اپنی پیدا کرنے والی ماں میں وہ پیار ڈھونڈتا رہا جو اسے وہاں کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ اماں اس بار بالکل خاموشی سے میری شکایت سنتی رہیں۔ میں چشم تصور سے ان کا سمیر کے لئے فکرمند چہرہ دیکھ رہی تھی اور دل میں کڑھ رہی تھی۔

اب میں خود ماں بن چکی تھی۔ ننھی نوما کی دیکھ بھال میں ایسی مگن ہوئی کہ اماں سے بات کرنے کو ترس کر رہ گئی۔ انہیں فون کرنے کا وقفہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا اماں اب سمیر کا ذکر بھولے سے بھی نہیں کرتی تھیں۔ مجھے تجسس ہونے لگا آخر ایک دن پوچھ ہی لیا۔

’’اماں! کیا سمیر لوگوں سے آپ کی لڑائی ہو گئی؟ آپ ان کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرتیں، وہ مادرانہ شفقتیں ہوا ہو گئیں کیا‘‘

’’ہاں، یہی سمجھ لو۔‘‘ اماں مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو گئیں۔ مجھے لگا دال میں کچھ کالا ہے لیکن انہیں چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔

ایک شام نوما کو کاٹ میں سلا رہی تھی تبھی ابا کا فون آ گیا۔ باتوں ہی باتوں میں سمیر کی خیریت بھی

دریافت کرلی۔ ابا چپ ہوگئے۔

''کیا بات ہے ابا! اس دن اماں بھی ایسے ہی چپ ہوگئیں تھیں...... آخر کیا ہوا ہے سمیر کو؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد ابا گویا ہوئے۔

''کیا بتاؤں...... سمیر کی ماں بہت بیمار ہوگئیں تھیں اور ایدھی ہسپتال میں داخل تھیں۔''

''ایدھی میں...... وہ تو بہت امیر تھیں نا!''

''ہاں...... تھیں تو لیکن ان کا سارا کاروبار ان کے نئے شوہر کے ہاتھ میں تھا جس نے دھوکے سے سب کاغذات پر دستخط کرالئے۔ صدمے سے جب وہ بیمار ہوگئیں تو کسی نے انہیں ایدھی میں داخل کرادیا۔ انہوں نے ہی سمیر کو اطلاع دی بیماری کی۔ سمیر مگر دیکھنے نہ گیا۔ کچھ دن میں ان کا انتقال ہوگیا۔ تب وہ ہسپتال گیا۔ مگر میت کو گھر نہیں لایا۔ وہیں لاوارثوں کے قبرستان میں تدفین کا کہہ آیا۔ کئی دن تک ہمارے گھر بھی نہیں آیا۔ پھر ایک دن دونوں باپ بیٹا میں ایک بار پھر زور کی لڑائی ہوئی اور اسی لڑائی میں یہ راز بھی کھلا...... تمہاری ماں اور میں دونوں صدمے سے گنگ ہوگئے۔ وہ نیک بخت تو کہتی ہی رہ گئی۔ ''سمیر تم نے ہمیں غیر سمجھا جو لاوارثوں میں دفن کرادیا۔ ایسا تو کوئی دشمن کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ یہ تم نے کیا کیا؟'' سمیر نے جواب میں ایسی نظروں سے ہمیں دیکھا...... دکھ کی کاٹ اندر تک دل کو زخمی کرگئی...... اس دن سے ہم اور وہ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔'' ایک لمحے کو تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کیا کہوں پھر کہیں دور سے اپنی آواز آتی سنائی دی۔ ''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا ابا، آپ دونوں نے ایسے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دیا جب اسے سب سے زیادہ جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔'' مجھے خود پر حیرت ہوئی سدا کی سمیر سے جلنے والی سعدی کیا ہوئی۔

''لیکن ہم کیا کرتے بیٹی! جب وہ خود ہی کسی سے نہیں ملنا چاہتا۔ اس نے خود کو اپنی ہی دنیا میں گم کردیا جہاں دکھ اور تنہائی کے سوا کچھ نہیں۔''

''انکل بھی کچھ نہیں کہتے اسے۔''

''وہ کیا کہیں گے، خود خاموش سے رہنے لگے ہیں۔''

لیکن آپ کو پتا لگانا چاہئے ابا...... آخر کوئی ماں ایسی کیسے ہوسکتی ہے اس کے پیچھے کچھ تو وجہ ہوگی۔''

''کوئی وجہ نہیں، بعض عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں، انہیں بس اپنی آسودگیوں سے غرض ہوتی ہے...... تم نہیں سمجھوگی ابھی۔'' ابا جانے کیا کچھ کہتے رہے مگر میرا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں لگا تھا، سمیر کی ماں اتنی بے وفا کیوں تھیں؟

مجھے گھر واپس آئے ہوئے کئی روز ہوگئے تھے- برابر میں اب اکثر خاموشی ہی رہتی لیکن سمیر کی کھانسی کی آواز رات کے سناٹے کو چیر جاتی - وہ باہر برآمدے میں کم ہی بیٹھتا - اس رات بھی اسے کھانسی کا

شدید دورہ پڑا، اماں، ابا تو شائد اس آواز کے عادی ہوچکے تھے یا کان دبا کر اپنے کمرے میں پڑے تھے، لیکن مجھ سے برداشت نہ ہوا، سارے اختلافات بھلا کر اس کے گھر کی طرف دوڑی- مین گیٹ کھلا ہوا تھا، کھانسی کی آواز کا پیچھا کرتی کمرے میں داخل ہوئی. سمیر کے ابا اسے سنبھالنے میں لگے تھے تھوڑی دیر میں جب اس کی حالت بہتر ہوئی تو نسخوں سے بھری فائل میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کچھ دواؤں کی تفصیل پوچھنے لگے، ایسا لگ رہا تھا حالات کو معمول کے مطابق ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کررہے ہوں، جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتے آئے تھے۔ کمرے میں بے نام سی اداس خاموشی نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ سمیر کا حلیہ بھی اس کے کمرے کی طرح بکھرا ہوا اور بیمار تھا۔ لگتا تھا زندگی نے ان دونوں باپ بیٹوں کی طرف دیکھ کر مسکرانا چھوڑ دیا ہو- سمیر آنکھیں موندے بستر پر کسی ہڈیوں کی ڈھیری کی طرح پڑا تھا، مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہ جا رہی تھی۔ اپنے بوجھل قدموں کو گھسیٹتی باہر کی طرف بڑھی-

''سعدی، تم آتی رہنا، تمہارے آنے سے سمیر کا دل لگا رہے گا۔'' اس کے ابا کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ میں ٹھٹک کر رک گئی۔

''نہیں...... تم کل نہیں آنا...... بلکہ کبھی مت آنا۔'' سمیر کی سرد آواز جیسے کسی کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دفعتاً اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے مڑا تڑا سا ایک کاغذ نکالا جو کسی کا خط معلوم ہو رہا تھا۔

''یہ لے جاؤ اور گھر جا کر پھوپی اماں اور پھوپھا کو بھی پڑھوا دینا۔''

''یہ مجھے ایدھی کے دفتر میں اس نرس نے دیا تھا جو امی کے آخری وقت میں ان کے ساتھ تھی۔'' اس نے اپنے کانپتے ہاتوں سے وہ خط بستر کی پائنتی کی طرف اچھال کر کروٹ بدل لی۔

وہ بوسیدہ خط اپنی بیچارگی سے مجھے تک رہا تھا...... میں پڑھتی گئی...... پڑھتی گئی۔ آخری سطر پر پہنچی تو میرے ہاتھ اسی طرح کانپ رہے تھے جیسے اسے تھماتے ہوئے سمیر کی آنکھیں اشکوں سے بھر چکی تھیں۔ یہ خط سمیر کی ماں نے بستر مرگ پر جانے سے کچھ پہلے اسے لکھا تھا...... اپنی سرد مہریوں پر پچھتاوے سے بھرا ہوا لکھا تھا......

''مجھے معلوم ہے شائد تم یہ خط کبھی نہ پڑھو پھر بھی لکھے دیتی ہوں۔ شائد تم مجھ سے کم نفرت کرو...... ہاں ساری عمر اس بات کا خیال نہ آیا...... لیکن اب جب کہ موت چند قدم کے فاصلے پر ہے اپنا بوجھ اتار دوں تو اچھا ہے۔ ہاں مجھے مردوں سے نفرت تھی پھر بھی میں نے ایک کے بعد ایک کتنے مردوں کو اپنے حسن کے جال میں پھنسایا...... انہیں لوٹا، پھر تڑپنے کو چھوڑ دیا۔ تم تو بیٹے ہو پھر بھی تمہیں چھوڑ دیا۔ کتنا تمہارا باپ گڑگڑایا تھا جب تمہیں لے کر میری چوکھٹ پر آیا تھا...... دیکھو حسن بانو...... اس ایک ماہ کے بچے کا ہی خیال کرو...... اسے تمہاری ضرورت ہے۔ مگر میں نے کمرے کے باہر ہی سے اسے دھتکار دیا تھا...... آہ...... کیوں کیا تھا میں نے ایسا...... پھر جب سردار خان سے نکاح کیا تھا...... . ایک ماہ میں ہی اسے لوٹ کر

سارے گہنے جو اس نے مجھے بنوائے تھے اور امریکی ڈالروں کی گڈیاں..... مہینوں کام آئیں..... بہت پیچھا کیا اس نے میرا..... پولیس لگوادی..... پھر بھی میں اتنی شاطر ہوگئی تھی کہ اس کے ہاتھ نہ آئی..... پھر تمہیں ایک بار پھر دھوکہ دیا..... کیوں..... تم تو اپنے ماں جیسے باپ کو چھوڑ کر میرے پاس چلے آئے تھے..... میرا پیار پانے کو..... مگر سوتے تو خشک تھے..... تمہیں پیار کیا دیتی..... میں ماں کہلانے کے قابل نہیں..... نہ ہی بیوی..... آخری بار جسے اپنایا..... جسے اپنا سمجھا تو وہی میری پیٹھ میں چھرا گھونپ گیا..... شائد اب میرے حسن کی چھری کند ہو چکی تھی..... ہاں میرے ساتھ یہی ہونا چاہئے تھا..... آگے بھی کچھ لکھا تھا..... مگر آنسوؤں کے دھبوں میں چھپ گیا تھا ..... پھر ایک لائن لکھی تھی.....

بچپن کے زخم ہرے ہی رہے۔ کاش میری ماں نے مجھے ایسے گلیوں میں کھیلنے کو نہ چھوڑا ہوتا..... دکانوں پر اکیلے سودا لینے..... سپارہ پڑھنے کو خالہ بی کے گھر گھنٹوں کے لئے نہ بھیجا ہوتا..... کاش..... میری ماں تم..... اتنی سیدھی نہ ہوتیں..... کیوں تم نے میری حفاظت نہ کی..... کیوں بیٹی پیدا کی تھی..... کیوں اللہ نے مجھے..... حسن دیا..... غریب لڑکی کو تو بدصورت ہونا چاہئے..... کوئی اس کی طرف بری نگاہ نہ ڈالے..... میں نے بھی پھر..... سارے مردوں سے خوب..... بدلہ لیا..... تم سے بھی..... تمہارا تو کوئی قصور بھی نہ تھا..... نہ تمہارے بے وقوف باپ کا..... تمہاری صورت میں مجھے اپنا چاچا نظر آیا..... بلکل ویسی ہی بڑی بڑی آنکھیں..... مجھے گھورتی ہوئی آنکھیں..... جیسے مجھے بے لباس دیکھتی ہوں..... اور تمہارے باپ کو ہوش ہی نہ تھا..... اس کے ممیرے بھائی گھر میں کس کے لئے آتے تھے..... وہ مجھے بالکل اپنی اماں کی طرح پاگل لگتا تھا..... میری حفاظت نہ کر سکا۔ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں..... یہی سمجھتی رہی ساری عمر..... مگر نہیں..... اب جب مرنے کو پڑی ہوں..... مجھے فٹ پاتھ سے..... کسی مرد نے ہی اٹھایا..... یہاں لایا..... میرے زخموں کو دھویا..... مجھے مٹی میں لتھڑے وہیں مرنے دیا ہوتا تو اچھا تھا.....''

آنسوؤں کے دھبوں نے اس غموں سے بھری تحریر کو اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔

◄◄ ● ►►

jilanisalma@hotmail.com

● افسانہ

● سبین علی

سیلمون فِش

جو آج بہت پریشان تھی۔ جب وہ مادام کے چہرے اور گردن پر نرمی سے مساج کر رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں تھکن کے آثار اور ماتھے پر تفکر کی گہری لکیریں تھیں- یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں یہاں ہر غیر ملکی ورکر کے چہرے پر تھکن اور آنکھوں میں منجمد ایک سی اداسی نظر آتی ہے۔ مگر جو میری ہم وطن اور آجکل واحد سہیلی ہے۔ میں اسے پچھلے ایک سال سے جانتی ہوں۔ مادام کچھ عرصے سے اُسی سیلون سے خدمات لے رہی ہیں۔ ان کے ساتھ اکثر وہاں جاتے میری جو سے اچھی شناسائی ہو چکی ہے۔

جو اور اس جیسے کئی اجنبی ملازمین (ہم غیر ملکیوں کو یہاں اجنبی کہا جاتا ہے) کی پریشانیاں دیکھ کر میں خداوند کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے سپانسرز بہت اچھے لوگ ہیں۔ مادام اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جاتی ہیں تو کبھی کبھار میرے لیے بھی اچھے کپڑے اور آرام دہ جوتے خرید لیتی ہیں۔ نیا فون خریدنے پر کئی بار اپنا پرانا مگر قیمتی سیل فون مجھے دے دیتی ہیں۔ سال میں چند بار کسی اچھے بیوٹی سیلون سے میری ہیئر کٹنگ وغیرہ بھی کروا دیتی ہیں۔

تیرہ اگست.....

مادام کو لمبے بال بالکل پسند نہیں اور یہ بھی پسند نہیں کہ کبھی کوئی بال کھانے سے برآمد ہو، اس لیے میرے بال ہمیشہ بہت مختصر ہوتے ہیں۔ حالانکہ مجھے اپنے لمبے اور سیدھے بال بہت پسند ہیں۔ مگر اپنی پسند کے کپڑے، بال یا اسٹائل تو مدتوں سے ایک خواب بن چکے ہیں۔ لیکن دوسروں کے حالات سن کر ہر بار میں خود کو تسلی دیتی ہوں۔ ان بیس برسوں میں کبھی مجھے جسمانی تشدد کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو اکثر گھریلو خادمائیں کنٹریکٹ کے ساتھ مقدر سمجھ کر قبول کرتی ہیں۔ تنخواہ بھی دیر سویر سے مل ہی جاتی ہے۔ میں اپنی ملازمت سے بڑی مطمئن ہوں مگر جو کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں وہ ہر وقت پریشان اور اندیشوں میں گھری رہتی ہے۔

بیس ستمبر.....

آج کا دن پھر بہت بھوجل سا تھا۔ وطن میں کہیں کھو چکے پرانے رشتے بہت یاد آ رہے تھے۔ آج جو بھی بہت الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔ مادام کا گاؤن سنبھالتے ہوئے میں اس سے اپنی مقامی زبان میں

پوچھا کہ اسے کیا پریشانی لاحق ہے۔تو کہنے لگی۔

''کیا بتاؤں سیسی! مادام کسی صورت میری تنخواہ بارہ سو سے بڑھانے پر راضی نہیں۔مجھ سے وطن میں دو ہزار کا معاہدہ کیا گیا تھا مگر جب یہاں آئی تو مادام نے کہا تم تجربہ کار نہیں ہو۔حالانکہ تب میں وہاں ملٹی نیشنل سیلون میں ملازمت کر رہی تھی۔'' بڑی مہارت سے دائرے کی شکل میں پھسلتی ویکس بال گھماتی اس کی انگلیاں دیکھ کر میں نے کہا۔

''یہ تو سراسر زیادتی ہے۔تمہیں بھلا کس کام کا تجربہ نہیں؟''

''مادام کہتی کہ تمہیں کئی بیوٹی ٹریٹمنٹس ٹھیک سے کرنا نہیں آتے۔کسٹمرز تمہارے کام سے مطمئن نہیں ہوتے۔سیدھی سادی کٹنگ کرتی ہو۔جدید انداز کا آئی میک اوور تمہیں نہیں آتا اور جانے کیا کچھ کہتی رہتی ہیں۔ان کی زبان کی پوری سمجھ آتی ہے نہ بات کی۔کئی بار پاسپورٹ واپس مانگا کہ اس سے زیادہ تنخواہ تو مجھے اپنے وطن میں مل رہی تھی مگر وہ اس پر بھی تیار نہیں۔''

''پیچھے وطن میں تمہارے بچے تو نہیں؟''میں نے پھر ذہن میں امڈ آئے ماضی کا خیال جھٹکتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''پانچ بچے ہیں.....تین پہلے شوہر سے اور دو دوسرے سے.....اوپر سے شوہر بھی بیمار..... اس کی شوگر بگڑ چکی ہے۔سمجھ نہیں آ رہی کہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔بچوں سے دور مشقت اٹھا کر بھی نہ پیسے مناسب ملتے ہیں اور نہ ہی کنٹریکٹ ختم ہونے سے قبل واپس جا سکتی ہوں۔مگر دیکھو وہ میریسا میرے ساتھ ہی آئی تھی اس کی کتنی جلد ترقی ہوئی اب اس کا شمار سینیئرز میں ہوتا ہے۔''

چار اکتوبر.....

جو کا فیس بک پر پیغام آیا تھا۔میریسا کو کسی کسٹمر کی جانب سے شدید جنسی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔اس کے ہونٹ پھٹے ہوئے، چہرہ داغدار اور جسم پر جا بجا نیلے نشانات تھے۔کل ہی مالک کے تشدد سے بنگلہ دیشی ملازمہ کے قتل کی پوری کہانی بھی اخبارات میں آئی۔ وہ کئی ماہ تک اپنے مالک کا جنسی و جسمانی تشدد برداشت کرتی رہی۔اس ملازمہ پر بار بار فرار ہونے کی کوشش کرنے کا الزام بھی بہت اچھالا گیا۔اس کے لیگل اسپانسر اور قاتل کو عدالت نے نفسیاتی مریض قرار دے کر علاج کا مشورہ دیتے ہوئے بری کر دیا۔ان حالات میں میریسا یقیناً پولیس میں کبھی رپورٹ نہیں کرے گی۔

دس نومبر.....

میں کئی دنوں تک مادام کے ساتھ جم نہ جا سکی نہ ہی جو سے ملاقات ہوئی۔چند ماہ بعد پتہ چلا کہ وہ جم اور سیلون کسی اور نے خرید لیا ہے اور ساری منیجمنٹ تبدیل ہو چکی ہے۔جو کے پاس میرا فون نمبر تھا پھر بھی

رابطہ نہیں کیا اس نے۔جانے کس حال میں ہوگی؟ اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔کہیں میری طرح وہ بھی مستقلاً پردیس کی باسی بن کر نہ رہ جائے۔میری ملازمت کے پچیس سال مکمل ہو چکے ہیں۔یہیں پر عمر بیت گئی اور اب بڑھاپے کی آمد آمد ہے۔میرے سپانسرز بھی ضعیف عمر میں داخل ہو چکے ہیں۔اب ان کی تمام اولادیں مغربی ممالک میں سکونت اختیار کر چکی ہیں۔عمر کے ساتھ بڑھنے والی تکان اپنی جگہ مگر پھر خود کو تسلی دیتی ہوں اب کام کا دباؤ بھی تو کم ہے۔صرف دو لوگوں کی دیکھ بھال ہی تو کرنا ہوتی ہے۔

پانچ جنوری.....

ڈرائیور گل خان بھی پچھلے سال اپنے وطن لوٹ گیا تھا۔اس کی جگہ آج نیا فلپینی ڈرائیور آ گیا ہے۔مگر میں نے کہاں جانا ہے اب وطن میں۔کوئی بھی اپنا نہیں جس سے رابطہ باقی ہو۔کفیل کے وہ بچے جنہیں میں نے پال پوس کر بڑا کیا تھا جب بھی یورپ سے یہاں آتے ہیں تو بڑا لحاظ کرتے ہیں۔کئی چھوٹی موٹی چیزیں بھی لاتے ہیں مگر ان سب اشیاء کی اب مجھے کوئی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

دس فروری.....

کل جو کا فون آیا تھا۔وہ اپنے سفارت خانے کے ساتھ رابطے کی کوششوں کا بتا رہی تھی تاکہ کسی طرح وطن واپس جا سکے۔وہ بہت فکرمند تھی۔اگر اسی دوران اس کے شوہر کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی تو اس کے بچوں کا کیا بنے گا؟ وہ مجھے پوچھ رہی تھی کہ آخر اتنے سال کبھی چھٹی لے کر بھی کیوں نہیں گئی۔ایک ہی جگہ اتنا عرصہ کیسے گزار دیا جبکہ گھریلو خادماؤں کا فرار ہونا تو یہاں ایک معمول بن چکا ہے۔

واپس جاتی بھی تو کس کے پاس؟ ماں باپ چل بسے تھے.....شادی ہوئی تو ناکام۔ایک بیٹی تھی جو میرے یہاں آنے کے بعد نمونیہ سے وفات پا گئی۔ پھر دل پر پتھر رکھ لیا اور وطن میں موجود اپنے کم سن بہن بھائیوں کی ذمہ داری اٹھالی۔انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرتے، ان کی ضروریات پورا کرتے یہ یاد ہی نہ رہا کہ چھٹی لے کر وطن جاؤں۔جبھی تو یہاں مادام کو کبھی تنگی نہ ہوئی اور میں نے بھی اپنی ذمہ داریوں کے علاوہ کبھی کچھ نہ سوچا۔

چار مارچ.....

گل خاں مجھے کہا کرتا تھا کہ کب تک اس طرح تنہا زندگی گزارو گی؟ یہیں کسی سے شادی یا زواج مسیار ہی کر لو۔کیا ساری عمر اسی طرح دوسروں کی خدمت کرتے گزار دو گی؟ اور میں اس سے پوچھتی خان بتاؤ بھلا زواج مسیار کی جز وقتی شادی کر کے کونسا گھر بستا ہے؟ چار دن ساتھ رہو گے پھر تم تو اپنے وطن سدھارو گے اور میں شاید یہیں مرکھپ جاؤں یا شاید وطن لوٹ جاؤں۔مگر واپس جا کر وہاں کیا کروں گی؟ اتنے سال یہاں گزارنے کے بعد اب وطن تو ایک دھندلا سا یہ بن چکا ہے۔

پندرہ اپریل.....

بہتر معاشیات کی تلاش میں ہمارا وہ حال ہوا ہے جیسے ریل کے پیچھے تیز بھاگتے مسافر کی جمع پونجی وہیں کہیں پلیٹ فارم پر دھری رہ جائے اور مسافر ریل پر سوار کسی اجنبی زمین پر جا پہنچے۔ ہمارا اصل حاصل جانے کہاں رہ گیا تھا۔ اپنے آبائی محلوں میں، ریل کی پٹڑی پر یا جدید بین الاقوامی ہوائی اڈوں پر؟ پھر ماہ و سال کے مدوجزر میں عمر کی نقدی بھی تھکے ہارے ملاح کے ہاتھ سے کشتی کی ڈور کی مانند پھسلتی چلی گئی۔ یہاں کئی قوموں کے باشندوں نے اپنی آزادیاں، خواب، شب و روز اور اپنے احساسات تک گروی رکھ کر فقط کچھ مادی چیزیں خریدی تھیں۔ وہ چیزیں بھی بیشتر لوگوں نے اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے حاصل کی تھیں۔ اور وقت اتنی تیزی سے کروٹ بدلتا ہے جیسے صحراؤں میں دن ڈھلے تک روشنی رہتی ہے اور پھر سورج ڈوبتے ہی اچانک اندھیرا چھا جاتا ہے۔ ایسے ہی عمر کا سورج اوٹ میں جا چھپا جس کا ادراک بہت دیر سے ہوا۔

یکم مئی.....

مادام کہتی ہیں اب مجھے اپنے وطن واپس چلے جانا چاہیے۔ بڑھاپا آ رہا ہے۔ اتنے بڑے گھر کے کام سنبھالے نہیں جاتے۔ وہ کسی نئی خادمہ کا بندوبست کریں گی۔ آج مادام کی بات سن کر مجھے گل خان بڑا ہی یاد آ رہا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا وقت پر لوٹ جانا چاہیے ورنہ آشیانے بھی پہچاننے سے انکاری ہو جاتے ہیں- اجنبی زمینوں پر انسان تنکوں سے بھی ہلکا ہوتا ہے۔ زمانے گزار دو خود کو پودوں کی مانند..... زمین میں گاڑ لو تب بھی اجنبی انسانوں کو بیگانی مٹی جڑیں نہیں گاڑنے دیتی۔ کوئی اندازہ نہیں ہوتا ہوائیں کب انہیں اذن سفر دے دیں۔

دس جون.....

جو واپس چلی گئی۔ جاتے وقت وہ فون نہ کر سکی تھی، بس ایک پیغام چھوڑ گئی تھی۔ وہ جم اور سیلون تیسری بار فروخت ہو چکا ہے۔ اس کی کولیگ میریسا پہلے ہی واپس جا چکی ہے۔ سالانہ میڈیکل چیک اپ میں اس کا ایچ آئی وی پازیٹیو آیا تھا تو محکمہ پاسپورٹ نے اسے ڈیپورٹ کر دیا۔ وہ سیلون شاید کسی بھی مالک کو راس نہیں آیا۔ کل جب اس سڑک سے گزری تو وہاں ایک سپر مارکیٹ کی تعمیر ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ زمینیں بھاری اور بنجر ہو جاتی ہیں..... کیا واقعی آہیں اپنا اثر رکھتی ہیں؟ لیکن اگر ایسا ہوتا تو اس روئے زمین پر انسانوں کے ستم اتنے ہیں کہ کچھ بھی باقی نہ بچتا۔

تیس جون.....

اول تو رات کو اندیشوں میں گھرے نیند ہی نہیں آتی اگر آ بھی جائے تو عجیب و غریب خواب ستانے لگتے ہیں۔ اکثر خوابوں میں مجھے آبی جھیلوں کے کنارے تعمیر پرانے لکڑی کے گھر نظر آتے ہیں۔ انہیں میں میرے بچپن کا گھر بھی ہے جہاں آنکھ کھولی، جہاں غربت اور محرومی دیکھی۔ مگر اس گھر میں ایک آزادی تھی، اپنا پن تھا۔ غربت، جھیلیں، رشتے، درخت، دوست اور پرندے سب کچھ اپنا تھا۔ اتنے عرصے

بعد یہ سب خوابوں میں کیوں نظر آنے لگا ہے۔ کیا پرانے گھر ہمیں پکارتے ہیں؟ پھر خود کو سمجھاتی ہوں کہ اکثر لوگوں کو وہ پرانے بچپن کے گھر نظر آتے ہوں جو باقی نہیں رہتے۔

دس جولائی.....

تھکن سے چور بدن لیے راتوں کو کروٹیں بدلتے اب سوچیں بھی نئے رخ اختیار کر چکی ہیں۔ مجھے ایسا کیوں لگتا ہے اس دور میں غلامی کا مفہوم بدل چکا ہے۔ اب بین الاقوامی غلامی کے لیے نئے دلکش الفاظ ہیں اور نہ صرف لوگوں بلکہ پوری پوری قوم کو غلام بنانے کے جدید طریقے رائج ہو چکے ہیں۔ معیشیت کے پھندے اس طرح پھیلائے گئے ہیں کہ غریب شخص یا قوم کے لیے اس چنگل سے آزاد ہونا دور دور تک نظر نہیں آتا۔ میں نے یہاں غیر ملکی لوگوں کو اپنے پیاروں کے لیے چند برانڈڈ چیزوں کے عوض زندگیاں رہن رکھتے دیکھا ہے۔ پھر بھی وہ اپنوں کے خلوص سے محروم رہ جاتے ہیں۔ دوریاں بیچ میں خودغرضی کی دیواریں حائل کر دیتی ہیں اور بے وطن محبتوں کے متلاشی ان دیواروں کو قیمتی تحفوں کی مدد سے پھلانگنے کی کوشش کرتے ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ تحفوں کے صرف برانڈ نیم باقی بچتے ہیں۔ خلوص محبت رشتے سب مٹی کے ڈھیر کی مانند ڈھے جاتے ہیں۔ لوگ دوسرے ممالک کی طرف ہجرت بہتر اور محفوظ مستقبل کے سپنے سجائے کرتے ہیں۔ اب سوچتی ہوں کہ آخر کامیابی ہے کیا؟ بہتر مستقبل کیا ہوتا ہے اور حاصل کسے ہوتا ہے؟ بڑے بڑے ہوائی اڈوں، سڑکوں، ہوٹلوں اور ریسارٹس میں مجھے چیونٹیوں کی مانند رینگتے بے وقعت انسانوں کا لہو پسینہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنوں اور بیگانوں کے دوطرفہ استحصال کا شکار وقت کا ایندھن بنے رہ جاتے ہیں۔ کنکریٹ کے مکان، بنک بیلنس اور قیمتی اشیاء کی چاہ میں جھیلیں، درخت، آبی پرندے سب چھوٹ جاتے ہیں مگر بہتر مستقبل پھر بھی نہیں ملتا۔

اکتیس جولائی.....

اب یہ فون ہی میرا اکلوتا دوست رہ گیا ہے۔ انٹرنیٹ پر اپنے، جو، میریسا اور گل خان جیسے لوگوں کے بے شمار قصے پڑھتے پوری دنیا کی نئی گلوبل تصویر اب زیادہ واضح نظر آنے لگی ہے۔ مجھے جلد ہی استعمال شدہ ڈسپوزایبل برتن کی مانند فارغ کر دیا جائے گا۔ پچھلی صدی میں جتنے وسیع پیمانے پر دنیا بھر میں معاشی ہجرتیں ہوئیں انہوں نے اس صدی میں نئی طرز کی ڈسپوزایبل غلامی کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ ٹشو پیپر کی مانند انسانوں کو استعمال کرو، جب تک ضرورت ہو ان کی ذہنی و جسمانی توانائیاں استعمال کرو اور جب چاہو پھینک دو۔

یکم اگست.....

میرے پاسپورٹ پر فائنل ایگزٹ لگ چکا ہے۔ کسی بھی دن فلائیٹ مجھے ان ریتلی زمینوں سے دور لے اڑے گی۔ سوچ رہی ہوں وطن پہنچ کر جاؤں گی کہاں؟ سارے رشتے ناطے تو کہیں بیچ راہ چھوٹ چکے ہیں۔ مگر اب مجھے بھی سیلمون فش کی مانند سمندر سے واپس دریا اور پھر آبائی چشمے کی طرف لوٹ جانا

چاہیے۔شاید کہیں ان پرانی آبی جھیلوں کا نشان مل جائے جہاں ہمارا لکڑی کا بنا گھر ہوا کرتا تھا۔

تیرہ اگست.....

ائیر پورٹ کا عملہ اور سیکیورٹی اہلکار جہاز کے اندر موجود تھے۔اسٹریچر پر ڈال کر دوران پرواز انتقال کر جانے والی خاتون کی نعش کو ہسپتال منتقل کیا گیا جس کی شناخت سیسی بیٹلون کے نام سے کی گئی۔اس کے پاسپورٹ پر لکھا پتہ تبدیل ہو چکا تھا اور ثاء کا پتہ لگانے کے لیے سیل فون کے تمام فولڈرز کھولے گئے مگر کسی ایڈریس کی بجائے نوٹس میں لکھی یہ تحریریں ملیں جن پر سیلمون فش کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

Shalimar Town ,Lahore(Pakistan) .
Phone 03217070662

● افسانہ

● شاھین کاظمی

پیار، پیاز اور پیلا ربن

بہت کچھ اَن کہا، اَن سنا تھا۔ لمحے پھسلے تو دکھ اندر اُتر کر برف کی ڈلی بن گیا۔ سیک کون دیتا؟ آنکھ اور من دونوں بنجر ہو گئے۔

'' تم چاہتی ہو دکھوں کا میلہ لگایا جائے؟ کسی کو اِس میں دلچسپی نہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے جہنم میں بھٹک رہا ہے۔ سائے کی تلاش میں۔ دیوانگی کی انتہا۔'' میری ہنسی میں استہزاء تھا۔

'' سائے بھی بھلا کبھی اپنے ہوئے ہیں۔''

'' اور سنو، اِس کہنے سننے کی وحشت سے جتنی جلدی باہر نکل آؤ اتنا بہتر ہو گا۔''

''تم اتنے بے رحم کیسے ہو سکتے ہو؟''

'' کہنے سے دکھ ہلکے ہوتے ہیں۔''

''محض خام خیالی ہے تمہاری۔'' میں پھر سے ہنسا۔

''خود سے محبت میرا پہلا اصول ہے۔اور اپنی ذات تک محدود رہنا دوسرا۔''

''میں تمہاری زندگی میں کہاں ہوں؟'' وہ چڑ گئی۔مشرقی دیوار والی کھڑکی کے چھجے پر بیٹھا کبوتر غٹرغوں کرنے لگا تھا۔میں نے نظر بھر کر کبوتر کو دیکھا اور پھر مسکرا کر اُس کی طرف پلٹا۔

''محبت اپنے ہونے کا جواز کیوں چاہتی ہے؟''

''مجھے تمہاری کسی فضول بات کا جواب نہیں دینا۔'' اُس کی کتھئی آنکھوں سے ناراضی کا گہرا رنگ چھلکنے لگا۔

''حیات بی بی.....!'' میں نے لپک کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

''جب الفاظ اور لہجے اندر پنپنے والے احساس کو بیان کرنے سے قاصر ہوں تو ناگفتنی، گفتنی سے زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔''

صبح کی اوس میں بھیگے کنول جیسا حسن، میرے ہاتھ کی پوروں تلے اُس کی سانسوں کا زیر و بم، میں نے آنکھیں موند لیں۔ میں جانتا تھا لمحوں میں زندگی نہیں کی جا سکتی لیکن کچھ لمحوں کو اپنایا تو جا سکتا ہے، اِن میں بہتی زندگی کو بوند بوند خشک حلق میں انڈیل کر کم از کم پیاس کو تسکین تو تھمائی جا سکتی ہے۔

''پیاس.....!''میں پھر سے اُلجھ گیا۔اور ہاتھ میں تھاما برش ایک طرف رکھ دیا۔وہ ابھی تک ناراض تھی۔تیز دوڑنے کی کوشش میں، میں اکثر راستہ بھول جاتا تھا۔لیکن اب کی بار ایسا ہوا کہ میں کانٹوں میں اُلجھ گیا۔شاید پکی عمر کی محبت ہوتی ہی ایسی ہے۔

''ہم کیوں ایک نہیں ہو سکتے؟''میں اُس کے اِس سوال سے ہمیشہ خوفزدہ رہتا تھا۔شاید اِس لیے کہ میں اچھی طرح جانتا تھا میرے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں۔عمر بھر چاہتوں کی تلاش میں بھٹکنے والا میں زمن سلمانی، مجھے پناہ ملی بھی تو کہاں۔میں نے مختلف رنگوں میں ڈوبی اپنی انگلیوں کی پوروں کو دیکھا۔میرے اندر بڑھتی پیاس مجھے اکثر خوف زدہ کر دیتی تھی.....کچھ پانے کی پیاس.....کچھ کھو جنے کی پیاس.....ایک دم وہ میرے سامنے آ گئی۔ اپنے تمام تر آدرشوں کی پروا کیا بنا، لمحہ بھر کی تاخیر کے بغیر میں اُس کے سامنے دوزانو تھا۔میری تلاش اتنی سطحی نہیں ہو سکتی تھی کہ میں حسن سے ہار جاؤں۔ وہ تو یگوں سے میرے اندر بسی تھی.....میری روح میں اُتری ہوئی.....میرے لہو کے ساتھ بہتی ہوئی.....لیکن تلاش مکمل ہونے پر بھی تشنگی جوں کی توں رہی.....اپنی تمام تر شدت کے ساتھ۔ادھورے پن کا احساس کبھی نہ مٹ سکا۔اوائل عمری کا خواب بالوں میں سفیدی اُترنے تک دل کے کسی کونے میں پلتا رہا۔اُجلے اور روشن رنگوں کی تعبیر کا منتظر۔جب تعبیر نظر آئی تو وقت مجھے کسی اور راہ پر ڈال چکا تھا۔میں نے ایک بار پھر سے برش تھام لیا اور ایزل پر چڑھے کینوس پر بے مقصد لکیریں کھینچنے لگا۔زندگی میں بے مقصدیت در آئے تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔حتی کہ اُس کی لَو دیتی آنکھیں بھی اِس پاتال سے نکالنے میں ناکام رہتی ہیں۔

'' زمن!''سادہ کینوس پر گہری پیلی لکیروں کے درمیان سے جھانکتی کتھئی آنکھیں.....میں نے اُسے ساتھ لپٹا لیا۔

''محبت اپنے ہونے کا جواز نہیں چاہتی۔''اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''یقین رگوں میں بہتے لہو کی طرح ہوتا ہے۔اِس یقین کو کبھی مرنے مت دینا۔''اُس کے سانسوں کی مہک میرے نتھنوں میں اُتر رہی تھی۔مجھے لگتا تھا میں اِس زمانے کا آدمی نہیں ہوں۔میں نے کسی اور یُگ میں جنم لیا ہے اِس لیے اِس عہد کے قوانین مجھ پر لاگو نہیں ہوں گے۔لیکن کسی الہام کی طرح اُترنے والی اِس محبت نے مجھے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر لا پٹخا۔پہلی بار مجھے احساس ہوا میں بھی اِسی دنیا کا آدمی ہوں۔رشتوں، قدروں اور اُصولوں میں جکڑا ہوا۔میرے اپنے اصول بھربھری مٹی کی طرح میرے ہاتھوں سے پھسلتے چلے گئے۔

''مجھے اپنا بناؤ گے؟''

اُس کی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔میں جو صدیوں کی جستجو کے بعد اُسے کھوج پایا تھا اَن دیکھی زنجیروں میں جکڑا ہوا بے بسی سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔''اُس کی بھیگی ہتھیلیاں میرے ہاتھوں میں آنچ دینے لگیں۔محبت کرنا اور کرتے چلے آسان ہے۔لیکن اِس محبت کو سماج کی تائید حاصل ہونے تک کا معرکہ جان لیوا ہوتا ہے۔

میرے ہاتھ تیزی سے کینوس پر چل رہے تھے۔گہرے اور بھرپور اسٹروکس میں پھیلتا پیلا رنگ، پشمینے کی گرم شال کا سالمس لیے ہوئے، کاش میں جواب دے پاتا۔

یہ محبت پیاز جیسی کیوں ہوتی ہے.....تہہ دار اور تلخ.....کاٹتی ہوئی، ڈستی ہوئی.....

کینوس پر رنگ بکھرتے رہے لیکن تصویر مکمل نہ ہو سکی۔شاید کچھ تصویریں اُدھوری رہنے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

''کیا رشتوں اور دوسری محبتوں کے بندھن اتنے مضبوط ہوتے ہیں کہ انسان اپنی روح کے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے؟''میں آقائی سرمد اہوازی کے حجرے میں تھا۔

''کیا محبت کرنا جرم ہے؟''

''ہرگز نہیں۔''

''کیا بہت کچھ کھونے کا ڈر جنت سے دور کر دیتا ہے؟''میرے سوال ختم نہیں ہوئے۔

''جنت کیا ہے؟''آقائی سرمد نے میری طرف دیکھا۔

''عزیزی جنت اور جہنم ہمارے اندر بستے ہیں۔اصل سوال یہ ہے کون سا دروازہ کھولنا ہے اور کون سا بند رکھنا ہے۔''

''کیا یہ اپنے اختیار میں ہوتا ہے؟''میں بے چین ہو گیا۔

''شاید نہیں۔''آقائی کا جواب ہمیشہ کی طرح مختصر تھا۔

''شاید ہاں۔''

''تو آپ کو بھی یقین نہیں؟''میری آواز میں حیرت تھی۔

''کوئی ایک کمزور لمحہ ہم سب کی زندگیوں میں ہوتا ہے جب یقین شک کی زد میں آ جاتا ہے۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟''

''کیا کر سکتے ہو؟''موٹے شیشیوں کی عینک کے اُس پار سے جھانکتی اُن کی آنکھیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

''کچھ بھی ترک کرنے کا یارا نہیں۔''میں نے بے بسی سے سر جھکا دیا۔

''چلتے رہو جب تک قدم ساتھ دیتے ہیں۔''

''ہجر سے اندر گھلتا رہتا ہے۔''میری آواز رندھ سی گئی۔

''کیا محبت محض پانے کا نام ہے؟''

''مگر وہ.....؟''میں نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

''محبت سود وزیاں کب دیکھتی ہے.....محبت تو بس محبت ہے، ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔''

آقائی سرمد خاموش ہوگئے۔لیکن میں اپنے اندر اُگتے شور کو بڑھنے سے روک نہ سکا۔

میں زمن سلمانی، مشہور نقاش جس کی انگلیاں رنگوں میں زندگی پھونک دیتی تھیں کبھی بھی اتنا بے بس نہیں ہوا تھا۔ مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔میرا گھر، بیوی، بچے، شہرت دولت اور میرا ہنر۔لیکن اُس مغربی کھڑکی کے شیشے کے اُس پار سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑی حیات نجدی نگاہوں میں ایسی کھبی کہ میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھا۔میں اپنا خواب اپنے آپ سے بھی چھپائے خود کو سمجھانے میں کامیاب ہو چکا تھا مگر اُس نے ہاتھ بڑھا کر ایک دم مجھے میرے اپنے اندر سے نکال لیا اور میں مزاحمت تک نہ کر پایا۔لیکن جلد ہی وہ مغربی کھڑکی ویران ہوگئی۔ چھ ماہ قبل اپنے باپ سے ورثے میں ملا مکان اُس نے صرف اِس لیے فروخت کر دیا تھا کہ وہ پرانے فیشن کا تھا۔اور یوں نگاہوں کا رابطہ بھی مفقود ہوا۔میرے اندر سناٹوں نے گھر کر لیا۔

''کیا عشق کسی خاص عمر کا محتاج ہوتا ہے؟''میرے سُن ہوتے ذہن میں سوال بھرے ہوئے تھے۔دنیا داری کا فلسفہ اور ہے۔یہاں ایک کے بعد دوسرا عشق کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔لیکن میں نے دوسرا عشق یا ہی کب تھا؟ وہ تو میرا پہلا عشق ہی تھی۔اوّلین عشق، جس کی کسک نے مجھے عمر بھر سنبھلنے نہیں دیا۔میں دیوانہ وار اُسے کھوجتا رہا، جب وہ سامنے آئی تو مجھے لگا میری تلاش تمام ہوئی۔میں کب جانتا تھا کہ عشق میں کچھ بھی مکمل نہیں ہوتا۔کبھی بھی مکمل نہیں ہوتا۔اور عمر کے اِس حصے کا عشق تو اور بھی گھائل کرتا ہے.....رُلاتا ہے.....بھنبھوڑ ڈالتا ہے.....اور انسان بے بسی سے پاؤں میں پڑی بیڑیوں سمیت عشق کے خارزار میں گھسٹتا رہتا ہے۔

کیا تھا اگر وہ مجھے پہلے ملی ہوتی تو؟

میں نے اپنی آنکھوں میں نمی اُبھرتی ہوئی محسوس کی۔

لیکن کیا واقعی عشق صرف پانے کا نام نہیں؟ کیا عمر بھر سلگتے رہنا ہی عشق کا مقدر ہے؟

مغربی کھڑکی کے اُس پار ویران سڑک جیسے میرے اندر اُتر آئی تھی۔

اٹلی کے شہر فلورینس میں ہونے والی فنون لطیفہ کی عالمی نمائش میں مجھے، زمن سلمانی کو میری پینٹنگ ''انتظار'' پر پہلے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پینٹنگ لاکھوں روپوں میں فروخت بھی ہوگئی۔لیکن میرے دل میں ٹھہرا سکوت نہ ٹوٹ سکا۔میں نے آخری بار پینٹنگ کو دیکھا۔کتھئی آنکھوں والی اُداس لڑکی بالوں میں پیلا ربن لگائے ویران راستے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

فوجی محاذِ جنگ پر ہوں یا زندگی کی جنگ میں، واپسی کا لمحہ اُن کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔اُن کے دل، جسموں سے بہت دور کہیں اور دھڑک رہے ہوتے ہیں اور اِن دلوں میں بسنے والیاں یونہی

بالوں میں پیلے ربن اٹکائے راستوں پر نظریں گاڑے بالوں میں چاندی اتار لیتی ہیں۔لیکن انتظار تمام نہیں ہوتا.....محاذ جنگ سے خبر آجانے کے بعد بھی نہیں.....محبت ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں ہوتی.....اُس میں تسلیم کی خُو نہیں ہے.....وہ من مانی کرنا خوب جانتی ہے۔

اور یہ سب جانتے ہوئے بھی میں نے بہت سخاوت سے اُس کے دامن میں انتظار کی اذیت ڈال دی اور اُس نے بھی کمال محبت سے اِس سوغات کو سمیٹ لیا تھا۔اُسے معلوم تھا اس انتظار کا حاصل لاحاصلی کے سوا کچھ نہیں۔

لیکن میں نے کہاں ناں محبت میں تسلیم کی خُو ہوتی ہی نہیں۔وہ من مانی کرنا خوب جانتی ہے۔ایک اَن کہا بندھن تمام تر دوریوں کے باوجود روز بروز مضبوط تر ہوتا گیا۔اور ہم لاحاصلی کے اِس سفر میں ہجر کی اذیتوں تلے سسکتے رہے۔

نمائش ختم ہو چکی تھی۔ہال کی روشنیاں گل ہونے لگیں۔میرے اندر سناٹا بڑھ گیا تھا۔

''کیا میں خریدار کا نام جان سکتا ہوں؟''میں نے منیجر پاؤلو سے ہاتھ ملایا اور رخصت چاہی۔

''آف کورس مسٹر سلمانی، میں آپ کو جلد مطلع کروں گا۔''

آج چھ ماہ کے بعد مجھے اٹالین منیجر کی طرف سے خط موصول ہوا۔

''تاخیر کے لیے معذرت، خریدار نے رازداری کی بنیاد پر سودا طے کیا تھا۔ مجھے کچھ وقت لگا کھوجنے میں، بہرحال تفصیل حاضر ہے۔

خریدار۔ حیات نجدی از شیراز، ایران

کُل ادائیگی۔ پچھتر ہزار یوروز،،

◂◂ ● ▸▸

Storchenstrasse 19008 St.Gallen,Switzerland
0041791284275

● **افسانہ**

● **فارحہ ارشد**

آدھی خودکشی

یہاں سب گورکن ہیں۔ لاش ملتی ہے تو رزق کا بندوبست ہو جاتا ہے.....اور وہ لوگ جو آدھے نوالے کے پیچھے خود لاش بن جاتے ہیں.....انسان.....جسم.....زندگی.....موت.....بھوک کے نیچے دبی لاوارث کہانیاں.....ملتی جلتی کہانیاں.....غریبی کی ساری کہانیاں اصلی ہوں گی اور ہر کہانی پلیجرائز لگتی رہے گی.....نیوز سائیکل ہوتی رہتی ہے ہر سٹوری کی.....سٹوری بریک

غربت پر پینل ڈسکشنز.....بگ کلک.....ہیش ٹیگ.....

یہ ایک طویل سرد ہال ہے۔ جہاں ہم سب مختلف نمبروں کی میزوں پر سفید کپڑے کے نیچے پڑے ہیں۔ ہماری شناخت ہمارے پاؤں کے انگوٹھوں پر بندھے دھاگے کے ساتھ لگی چٹ پر ہماری میز کے نمبر تک رہ گئی ہے۔

مجھے اپنا نام بھول گیا ہے مگر وہ مجھے میز نمبر سات کا جسم بُلاتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے یہاں بہت ہولناک سناٹا ہے۔ وہ ہم سے ڈرتے ہیں۔ یہاں کی دیکھ بھال کرنے یا جسموں کو لانے لے جانے کا کام کرنے والے یہاں کی سردی سے نہیں بلکہ موت کے خوف سے کانپتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں اور جسموں کی کپکپاہٹ ان کی زندگی کی علامت ہے۔ وہ ہماری طرح نہیں۔۔سرد، جامد اور خاموش۔

وہ نہیں جانتے یہاں آوازوں کا کتنا شور ہے کیونکہ وہ صرف ہمارے سرد جسم دیکھتے ہیں۔ اپنے اپنے جسموں کے پاس بیٹھے ہمیں دیکھنے یا سننے کی ان کی نظروں اور کانوں میں کوئی صلاحیت نہیں حالانکہ وہ اپنی آنکھوں دیکھے اور کانوں کے سنے پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔

کیسے اندھے اور بہرے ہیں؟

ہم وہ ہیں جن کے سرہانے بیٹھ کر کوئی رویا نہ کوئی آنکھ ہمارے لیے اشکبار ہوئی۔ کسی نے سینہ پیٹا نہ بال کھول کے بین کیے۔ ہم وہ ہیں جو لاوارث نہ تھے۔ ہم سب وہ ہیں جو اپنے وارثوں سے دور کسی بھیڑ میں گم ہو گئے۔ اور ہم وہ ہیں جو اپنے وارثوں کا پتہ نہ بتا سکے۔ ایسا نہیں کہ ہم نے بتایا نہیں مگر ہماری کوئی سنتا ہی نہیں۔ چیخ چیخ کر بتاتے رہے مگر یہ سچ ہے کہ یہ لوگ اندھے اور بہرے ہیں۔ انہیں سنائی دیتا ہے نہ دکھائی۔

پس منظر میں موت کی سمفنی بجائی جا رہی ہے.....داستان گو خاموش ہے.....داستان کے کردار بول رہے ہیں.....یہاں آوازوں کا بہت شور ہے۔

میرے ساتھ والی میز کی عورت کتنی بے چین ہے۔ کبھی اپنے جسم کی پائنتی کی طرف بیٹھ جاتی ہے تو کبھی اس کے سر کی طرف۔ کبھی اس کا دایاں بازو ہلاتی ہے تو کبھی بایاں۔ ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ ''چل اٹھ جا۔ وہ چاروں جانیں بھوک سے مر جائیں گی۔'' حالانکہ یہ بتاتی ہے کہ یہ خود بھوک سے مر گئی۔ وہ نمبر کی میز پر موٹی توندیں رکھے ہاتھ لہرا لہرا کر نالی کے کیڑے سے لے کر زمین کے اندر تک کی مخلوق کے رزق کی باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے بھوک سے مری اس عورت کو نہیں دیکھا۔ بھوک سے مر جانے والا کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ فاقے سے مرا ہے۔ وہ تو مر گیا اب انہیں کون بتائے؟

بیچاری کے پچکے گال، ہڈیوں کا پنجر بنا جسم اور پیٹ جو پشت سے جا لگا ہے، کیا یہ بھی انہیں کچھ نہیں بتاتا تھا کہ وہ لمحہ لمحہ بھوک سے مر رہی ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ سب نے اپنے اپنے پیٹ اور اپنی اپنی بھوک اٹھا رکھی ہے۔ اور اپنا پیٹ بھرا ہو تو دوسرے کی بھوک کیسے نظر آ سکتی ہے۔ پھر وہ تو ہیں ہی اندھے۔ جو کچھ انہیں دکھائی دینا چاہیے وہی نظر نہیں آتا۔

''چل اُٹھ.....بستی کو جانے والی آخری بس نکل گئی تو وہ چاروں بھوکے روتے رہیں گے۔ میلوں کا سفر طے کر کے تُو اسی لیے آئی تھی کہ یہاں منہ لپیٹ کے پڑی رہے؟ تجھے کچھ خبر بھی ہے کہ تیرے اکٹھے کیے گئے چند لقموں کی خاطر وہ سارا دن کتنا انتظار کرتے ہیں۔ تیرے جانے تک وہ بھوکے پیاسے بلکتے رہتے ہیں۔ باپ انہیں اس اوکھلی میں پھینک کر جانے کہاں چلا گیا۔ اب جب تُو بھی ان کی روٹی لے کر نہیں پہنچی تو وہ چاروں.....''

''ارے اٹھ جا.....'' وہ جانے کیسے کیسے واسطے دیتی ہے مگر جسم ٹس سے مس نہیں ہوتا۔

آہ.....بیچاری کرموں جلی.....

اور وہ جو تیسری لائن میں میز نمبر اٹھارہ کا نوجوان.....ہر موسم کے ہر پہر وہ مزدوروں میں کھڑا کام کا انتظار کرتا تھا کہ کوئی مستری، کوئی رنگ ساز، کوئی ٹھیکیدار اسے کام کے لیے بلا لے۔

بارش ہے.....وہ کھڑا ہے.....تیز دھوپ ہے.....وہ کھڑا ہے.....بڑا وقت کا پابند.....اور پھر.....

''پے در پے ناکامی نے تجھے دیہاڑی دار چُوہڑا بنا دیا۔'' وہ اپنے جسم کو تاسف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولنے لگتا ہے۔

''تُو نے کتنے جھوٹ بولے.....میں جی اقبال مسیح ولد اسحاق مسیح ولد.....مسیح.....جبکہ تُو جانتا ہے.....تُو محمد اقبال ولد محمد اسحٰق ولد محمد.....لے بُھگت اب اپنا جھوٹ۔ کسی کے حصے کی جگہ لے کر بھی ہاتھ کچھ نہ آیا۔''

گھر والوں کو خبر ہی نہیں محمد اقبال کیسے مرا۔ لوہے کے ٹرنک میں پڑا شناختی کارڈ لے کے ڈھونڈنے بھی

نکلیں تو لوگ محمد اقبال کو تو جانتے ہی نہیں۔ انہیں تو بس اتنی خبر ہے کہ اقبال مسیح مر گیا...... گٹر میں دم گھٹنے سے۔'' وہ جسم سے کہتا جا رہا ہے۔ جواب نہ پا کر اپنے جسم سے دور ہٹ کر جا بیٹھا ہے۔ اس کا پچھتاوا ہی نہیں جاتا۔

'' کہا تھا گٹر میں نہ اُتر...... مگر تُو مانتا ہی نہیں تھا۔ چھ بچوں کی چیخوں کا پگھلتا سیسہ کانوں کی نالیوں میں انڈیلنے کے بعد تمہیں سنائی بھی کیا دیتا؟'' اس نے شکوہ بھری نظروں سے اپنے جسم کو دیکھا۔ سرخ خون اسکے دل کے مقام سے فرش پر گر رہا ہے...... گرتا ہی جا رہا ہے...... اس کے خون سے گٹر کی تیز بد بو آنے لگتی ہے۔

ادھر میز نمبر بیس کا بھاری بھر کم جسم پڑا ہے۔ اپنے جسم کے سرہانے وہ پھٹے ڈھول کی آواز میں جانے کیا بولتا رہتا ہے۔

''میں سمجھا اس تار میں کرنٹ نہیں ہے۔ ریڑھی پر پڑے لوہے کے راڈ پر گری تو میں نے اٹھا کر اسے ایک طرف پھینکنا چاہا۔ مجھے بڑی جلدی تھی۔ میری بیٹی کی بارات آنی تھی اس شام۔ میں نے سوچا ایک پھیرا لگے ہاتھوں صبح صبح لگا آؤں۔ بڑی جلدی تھی مجھے۔'' بار بار وہ یہی دوہراتا رہتا ہے۔

''میں زمین پر گرا تو کسی نے پیسوں والی پوٹلی جیب میں سے نکال لی۔ اسی میں تھا میرا شناختی کارڈ۔ بارات آگء ہوگی۔ بیوی نے میرا کتنی دیر انتظار کیا ہوگا۔ پھر لوگوں کے اصرار پر بچی کو رخصت کر دیا ہوگا۔ بڑی جلدی تھی اسے بیٹی کو بیاہنے کی۔ مجھے بھی بڑی جلدی تھی۔ بڑی جلدی میں تھا میں جب تار لوہے کے راڈ پر......'' اس کی سوئی اسی ایک بات پر اٹک گئی ہے۔ اس کے پاؤں کے آبلے پھوٹنے لگتے ہیں اور لیس دار پیپ کے چھینٹے میرے منہ پر آ کر گرتے ہیں۔

اور یہ بوڑھی مائی جس کے چہرے پر اتنی جھریاں نہیں جتنے آنسوؤں کے نیل پڑے ہیں۔ بس ایک ہی جملہ اس کی زبان پر رہتا ہے۔

''میں لاوارث نہیں۔ میرے چار پتر ہیں۔ اونچے لمبے...... جوان گبھرو۔ وہ تو میں خود شوق سے شہر میں اپنے میاں کا سکھایا کام کرنے آتی تھی۔ اس روز جب وہ مجھے جوتے پر کیل لگانا سکھانے لگا تو میں نے کہا۔

''میرے جیون جوگے چار پتر ہیں۔ میں کیوں سیکھوں؟'' بڑا سیانا تھا...... بولا۔

''ان پر آسرا نہ کرنا۔ پتر ذات اپنے بکھیڑوں میں مائی باپ کو بھول جاتی ہے۔''

مجھے یاد ہے یہ کہتے ہوئے اپنی گول گدلے شیشوں والی عینک کو اس نے کوئی پانچ بار صاف کیا تھا۔ زبردستی مجھے جوتوں کی مرمت کا سارا کام سکھاتا رہا۔'' وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتی ہے...... پھر اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے آنے لگتی ہے...... پُرنم...... بازگشت جیسی۔

پھر انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ اور میرا ایکسا میری نونہہ نے سڑک پر پھینک دیا۔'' وہ رونے لگتی ہے۔

''کیا کرتی......؟ میری کھولی میں مجھے کوئی پوچھنے ہی نہ آتا۔ میں بھوکی مرتی رہتی۔ ایک روز میں

اٹھی۔ بکسے میں سے اپنے بندے کا تھیلا اٹھایا اور صابو کے ٹانگے پر شہر چلی آئی اور اس گلی کی نکڑ پر ڈیرہ جما لیا جہاں دور دور تک کوئی جوتے مرمت کرنے والا دکھائی نہ دیتا تھا۔ شام کو شیدے کی کھوتی ریڑھی پر کبھی پنڈ والی کوٹھری میں چلی جاتی۔ نہیں تو ادھر ہی پڑی رہتی۔

اس رات بہت ٹھنڈ تھی۔ کرم دین نے بتایا کہ ریڈیو پر خبروں میں آیا تھا پہاڑوں پر برف گری ہے۔ پورب سے طوفان اٹھا اور پچھّم کی طرف جاتے جاتے کتنا کچھ اپنے ساتھ سمیٹ لے گیا۔ سردیوں کی ایسی طوفانی بارش...... جیسے سب کچھ اپنے ساتھ ہی بہا لے جائے گی۔ اور ژالہ باری نے تو مانو دھرتی پر سفید چادر بچھا دی تھی۔ قہر بھرا طوفان آیا اور گذر گیا مگر سردی نے میرے کمزور وجود کو سر سے پاؤں تک ایسے کیل دیا جس کے اندر صرف موت ہی گھس سکتی تھی۔ بہت ٹھنڈ تھی اس رات۔ مجھے ایسے لگا جیسے بہت سے برفانی تودوں کے درمیان مجھے لٹا دیا گیا ہو...... بالکل اس کہانی کی رسم کی طرح جس میں بوڑھے والدین کو بیٹے اوپر پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں پر برف بننے کے لیے چھوڑ آتے تھے تاکہ وہ مر جائیں۔'' مرن جوگی کی آواز میں کیسا نوحہ تھا۔

''بہت ٹھنڈ تھی اس ر...... رررراااات......'' مجھے یوں لگا جیسے اس نے گول گدلے شیشوں والی عینک کوئی پانچویں بار صاف کی ہو حالانکہ اس نے عینک کب پہن رکھی تھی۔

''پر وہ آئیں گے۔ خیر سے میرے چار بیٹے ہیں...... چار وارث...... میں کوئی لاوارث نہیں ہوں۔'' وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور اس کی نظریں ہر بار ہی مایوس لوٹ آتی ہیں۔

''جھلی نہ ہو تو...... اس عمر میں اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ یہاں کسی کا کوئی نہیں آتا۔ ایک بار اس دنیا کی بھیڑ میں ہاتھ چھوٹ جائے تو سب کچھ گم ہو جاتا ہے...... بالکل ویسے ہی جیسے میرا سب کچھ گم ہو گیا۔ میرا کون آئے گا بھلا...... میں تو خود بھاگ نکلی تھی وہاں سے جہاں ابّے نے مجھے بڑی سی حویلی میں کام پر رکھوایا تھا۔ اتنے کنجوس حویلی والے کہ ایک روپیہ بھی تین بار ناخن پر بجا کر دیتے۔ چوکیدار کے لمبے بالوں اور مفلر والے بیٹے نے مجھے ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ میں اس کے ساتھ وہاں سے بھاگ گئی۔ وہ مجھے شہر لے آیا۔ نکاح کے وعدے پر مجھے مرد بھگاتے رہے اور میں عزت کی روٹی کے لیے ان کے ساتھ بھاگتی رہی۔ اس لکڑی کی ٹانگ والے نے تو مجھ سے دو بول بھی پڑھوا لیے۔ سارا دن میں اس کی خدمت کرتی اور رات کو شکر کرتی کہ سکون سے اپنے گھر میں سوئی ہوں۔ وہ لکڑی کی ٹانگ والا خود کچھ کر نہیں سکتا تھا اور اسے شک تھا کہ میں ایک بار پھر کسی اور کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔ آخر کتنے دن شک پالتا؟ پیسے کھرے کر لیے۔ گویا میں اپنی ہی تلوار پر جا گری۔ ایک روز مچھلیاں بیچنے والے ایک شیطان نما آدمی کے ہاتھ مجھے بیچ دیا۔ وہ کبھی مچھلی بیچنے والا رہا ہوگا۔ بعد میں ایسا نشہ لگا کہ کام وام چھوڑ دیا۔ اب اس بے رنگ و روغن سٹیمر کے پیچھے بنی جھگی میں پڑا اینٹھتا رہتا۔ جو اِدھر اُدھر سے لوٹ کھسوٹ کی وہ میری قیمت دے آیا۔ اس نے مچھلیوں کی باس سے اٹی نیم تاریک کھولی میں لا کر مجھ پر ہر نسل کے کتے چھوڑ دیئے۔ میں

بھوکی پیاسی تڑپتی رہی اور وہ چند دنوں میں ہی کورے نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر پاگل ہوگیا۔ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کا پیٹ چاک کر کے انڈے نکالنے بیٹھ گیا۔ دن رات اس کے گاہک میرے بھوکے پیاسے جسم کے ہر ممکنہ عضو کو استعمال کرتے رہے۔ آخری بار مچھلی کی سڑاند اور سستی شراب کے بھبھوکے والا منہ میرے منہ پہ ایسا چپکا کہ میری سانس پی کر ہی رہا۔ سانس تھی، ہوا ہوگئی۔ اور میں تلچھٹ کی طرح وجود کے پیندے میں بیٹھتی چلی گئی۔ موت کیا تھی ایک جھٹکا تھا کہ جو جسم کے ریکٹر سکیل پر نشان چھوڑ گیا، جس کی شدت ریکارڈ کی جائے تو ہر بار پچھتاووں کے پیمانے پر بڑھتی جائے گی..... کاش میں ایسا نہ کرتا، اے کاش یوں نہ ہوا ہوتا..... جیسے پچھتاوے.....

زندگی خود موت کو واقعہ بنا کر پیش کر دیتی ہے اور انسان ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے کہ کاش اس لمحے میں موت کو موقع نہ دیتا۔

آہ..... زندگی پانی کا بلبلہ ہے..... کب پھٹ جائے کس کو خبر؟ وہ نشے میں دھت میرے ساکت جسم کو ہی ساری رات بھنبھوڑتا رہا۔ جب سارے نشے بہہ گئے تو گٹھڑی بنا کر مجھے پرانے سٹیمر کے غلیظ ترین غسل خانے کے باہر پھینک آیا۔ پولیس آئی تو کوئی والی وارث نہ بنا۔ بہت سے بگلہ بھگت، بہت سے رنگے سیار، جو بھیڑ کے روپ میں بھیڑیے بنے مہذب ہونے کا ڈھونگ رچا رہے تھے، اسی بھیڑ کو چیرتا وہ مچھلی والا بھیڑیا بھی کانوں کو ہاتھ لگاتا آگے بڑھا۔

''جی سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں اسے اپنی کھولی میں سونے کا کہہ کر مزدوری کرنے چلا گیا۔ اللہ کی قسم میں اسے نہیں جانتا تھا۔ آخر ہم نے بھی اک روز مرنا ہے، یہی سوچ کر میں نے اسے پناہ دی۔ بچیاں تو جی سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ نہ مانی! جانے کہاں سے بارش میں بھیگتی میرے در پر اللہ نے بھیج دی تھی۔ پناہ نہ دیتا تو میں کل کو خدا کو کیا منہ دکھاتا۔ اور جب میں دوسرے روز واپس آیا تو وہ جا چکی تھی۔'' مچھلی والا پان سے بھری باچھوں سے تھوک اڑاتا رہا۔

میرا لچکتی ڈال سا بدن جس کا روپ کبھی ایک آتش سیال اور شباب شعلہ سوزاں تھا..... جس کی زیبائی کسی وقت میں شب کا غرور اور اٹھان صبح کی انگڑائی جیسی تھی۔ اب لٹا پٹا، شکست خوردہ، تھکا ہارا کئی مردہ مچھلیوں، باسی گلی سڑی سبزیوں کے درمیان میلے کپڑوں کی گٹھری بنا پڑا تھا۔ اسٹیمر والے نیچے پھینک گئے تھے۔ ٹھہری ہوئی پتلیاں، ساکن زرد جلد، نیلے کیچر ہونٹ..... موت کا عمل گذرے کئی گھنٹے بیت گئے۔ ہڈیوں کی مٹھ بنے مکھیوں بھرے چہرے والے نشئی میرے مردہ بدن کی رنگت اور ملائمت پر بھی روہو مچھلی کا گمان کر کے رالیں ٹپکاتے رہے۔

ٹھہرے پانی کی امس..... چپچپاہٹ..... چائنا کے سستے موبائلوں کی فلیش..... بالآخر کئی گھنٹے کے تماشے کے بعد لاوارث جان کر پولیس نے مجھے یہاں پہنچا دیا۔ مجھے تو وارثوں کا انتظار ہی نہ تھا۔ سارے جسم وارث کب چاہتے ہیں کہ کہیں ان کے وارث ان کی کہانی سن کر ان کی شناخت سے ہی انکار نہ

کر دیں۔ یہ سرد ہال جس میں ہلکی کسیلی موت کی بساند پھیلی ہے، ٹھنڈے جسموں سے بھری ایک پوری دنیا آباد ہے جہاں سب کی اپنی اپنی کہانی ہے۔ میں کتنوں کی کہانیاں سناؤں بھلا؟ کون یاد رکھے گا؟ ہم سب ان میں سے نہیں جن کے قصے عمر بھر یاد رکھے جاتے ہیں۔

کچے پکے قصے اور قصوں کے ہم جیسے بونے کردار۔

سانپ چنبیلیوں پر زہر تھوکتے رہیں گے اور خوشبو وہیں پڑی کہیں گلتی سڑتی رہے گی۔

بابل تیرے محلاں وچوں ست رنگیا کبوتر بولے.....

دور جہاں گھر ہیں..... وہیں دور کہیں چٹخنی گرا دی جائے گی۔ لالٹین منڈیر پر جلتی رہ جائے گی مگر جانے والے نہیں آئیں گے۔ گم ہو جائیں گے۔

سرد ہال کی نمبروں والی میزوں کی گنتی بنتے رہیں گے۔

میرے جسم کو 'عزت' دینے کی تاکید کرتے ہوئے اس سفید کوٹ والے بوڑھے نے اردگرد کھڑے لڑکے لڑکیوں کو دکھانے کے لیے سفید کپڑا میرے جسم سے ہٹا دیا ہے۔ دو گھنٹے بوڑھا میرے اعضا کو چھو کر سفید کوٹ والے لڑکے لڑکیوں کو کچھ بتاتا رہا ہے۔ میرا جسم تھک چکا ہے۔ موت کے بعد قبر سکون دیتی ہے مگر مجھے لگتا ہے ہم 'آدھی خودکشی' کیے لوگ ہیں جنہیں زندگی کی اذیت کے ساتھ ہر لمحہ مرتے رہنا تھا اور مرنے کے بعد بھی نمبروں کی چٹیں پاؤں سے باندھے اپنی باری کا انتظار اس سرد ہال میں پڑے کر رہے ہیں۔ کب ہماری ہڈیوں کی گنتی شروع ہو..... کب ہمارے پیٹ چاک کیے جائیں۔ پوری زندگی کا سکھ نہ پوری موت کا..... ہم وہی ہیں جنہیں بددعا دی گئی کہ ہمیں قبر بھی نصیب نہ ہو۔ مقدس بھیڑوں کے جلنے کی بُو کسی قدیم قصے سے آ رہی ہے۔ ان کے مقبرے تیار ہو رہے ہیں اور ہمیں زمیں نے اپنی گود میں اتارنے کا اذن نہیں بخشا۔ ہمیں کوئی چٹھی نہیں آتی نہ ہی ہمارے لیے چھال میں لپٹی کوئی مقدس کھجور آتی ہے۔ ہماری گواہی کے لیے غیب سے کوئی آیت نہیں اترتی۔ ہم آسمان اور زمین کے درمیاں معلق ہیں۔ ہم مجبور ہیں، مہجور ہیں، رنجور ہیں۔ مجھے قبرستان میں مختلف ناموں کے کتبوں والی قبروں پر پڑے زرد پتے اور خشک کالے گلاب اتنے اچھے کیوں لگتے تھے یہ اب مجھے پتہ چلا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ خودکشی میں بھی ایک قاتل ضرور ہوتا ہے۔ کیا آدھی خودکشی میں بھی کوئی قاتل ہوتا ہے؟ میں رضیہ تھی کہ رادھا..... مالتی تھی کہ نور..... جانے میرا نام کیا تھا۔ اب تو میں صرف میز نمبرے کا جسم ہوں۔''

میز نمبر سات کا اسسٹنٹ لڑکا اس میز پر پڑے جسم کو گھور رہا ہے اور ایسا بھرپور جوان جسم دیکھ کر اسے چھونے کی بے چین کر دینے والی خواہش کے زیر اثر، اس کی بھیگتی مسوں کے اوپر ناک کے نتھنے پھڑ اپھڑا رہے ہیں کیونکہ اس نے ابھی تک کسی لڑکی کے ممنوعہ اعضا کو چھو کر نہیں دیکھا!

◂◂ ● ▸▸

● افسانہ

● ھما فلک

زرمینے

فون رکھ کر وہ کچھ پریشان سا نظر آیا۔گل جاناں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی مگر اس کا غصے میں لال چہرہ دیکھ کر اسے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

''میں نے کہا تھا یہی ہوگا مگر تمہیں کسی بات کی پروا ہو تب نا! بس ماڈرن بننے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔'' کچھ دیر غصے سے ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد بالآخر وہ خود ہی بولا۔

''مگر ہوا کیا؟'' اب گل جاناں نے بھی حوصلہ کر کے پوچھا۔

''ہونا کیا ہے، لالہ نے اتنی باتیں سنائی ہیں، کہہ رہے تھے زمینیں تو بیچی تھیں کیا غیرت بھی بیچ کر کھا گئے ہو؟''

''مجھے تو لگا تھا مبارکباد کے لئے کال کی ہے۔''

''کس بات کی مبارک دیتے وہ؟''

''لڑکا ذات برادری کا ہے، دیکھا بھالا ہے، جان پہچان ہے اور سب سے بڑھ کر.....''

''ہاں اسی سب سے بڑھ کر والی بات پر ہی ان کو اعتراض ہوا ہے، وہ کچھ کہا ہے کہ میرا بس نہیں چل رہا، زمیں پھٹے اور اس میں سما جاؤں۔''

''کچھ وقت گزرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ یہ زخم کبھی نہیں بھرے گا۔تم یہ بات کیوں نہیں سمجھتی ہو بے غیرت عورت! مجھے بھی میری برادری میں سب کے سامنے بے غیرت بنا دیا۔'' یہ کہہ کر وہ غصے سے پھنکارتا باہر چلا گیا۔ گل جاناں سن سی بیٹھی رہ گئی۔

''بے غیرت عورت!'' اس کے کانوں میں بس یہ ہی الفاظ گونج رہے تھے اور جوں جوں وہ ان کی باز گشت سنتی اسے لگتا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ کافی دیر اسی طرح بیٹھی رہی پھر اسے خیال آیا کہ بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے اس لئے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی آئی۔ہنستی مسکراتی زرمینے اور پلوشے کھانا کھاتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھیں۔اس بات سے بے خبر کہ ان کی ماں کس طوفان سے

گزر رہی ہے۔گل جاناں گہری سوچ میں مصروف میز پر ان کے ساتھ ہو کر بھی وہاں نہ تھی اس نے کھانا بھی بہت تھوڑا کھایا تھا۔اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔زرمینے نے ماں کی خاموشی کو محسوس کر لیا اس لئے پلوشے کو اپنے کمرے میں جانے کا کہہ کر برتن ڈش واشر میں لگا کر ماں کے پاس چلی آئی۔وہ گل جاناں کے پاس آ کر بیٹھ گئی جو تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔زرمینے حسب عادت اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے کڑوں سے کھیلنے لگی، وہ بچپن سے یہی کرتی آئی تھی۔گل جاناں کو اس کی یہ حرکت بہت پسند تھی وہ جب اسے دودھ پلا رہی ہوتی تب بھی وہ اس کے کڑوں سے کھیلا کرتی تھی۔ایک بار گل جاناں نے اسے کہا تھا کہ وہ یہ کڑے اس کی شادی پر اسے ہی دے دے گی تو زرمینے نے بے ساختہ کہا تھا کہ یہ مجھے بہت پسند ہیں مگر صرف اس لئے کہ یہ میری ماں کے ہاتھوں میں ہیں، میری ماں کے ہاتھوں سے نکل کر نہ ان کی کوئی قیمت رہے گی نہ خوبصورتی۔آپ نے یہ کڑے ہاتھوں سے کبھی نہیں اتارنے ہوں گے۔ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اتر آئی تھی۔گل جاناں نے اس کا ماتھا چوم کر اس کی آنکھیں صاف کیں اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ یہ کبھی ہاتھ سے نہیں اُتارے گی۔

زرمینے خاموشی سے اس کے پاس بیٹھی تھی، گل جاناں بغور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ خوبصورت تو وہ ہمیشہ سے تھی سرخ وسفید چہرہ سبز آنکھیں اور سنہری گھنگھریالے بال جن کی کچھ لٹیں اس کے رخسار چومتی رہتیں۔مگر آج کل تو جیسے اس کے حسن میں مزید تازگی اور نکھار آ گیا تھا اس پر نظر ٹھہرنا مشکل تھا۔ گل جاناں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور غور سے اس کی ہتھیلی کو دیکھنے لگی۔ جہاں کچھ دن پہلے لگی مہندی کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ساتھ والی انگلی میں ایک خوبصورت انگوٹھی جگمگا رہی تھی اسی ہاتھ میں ایک بہت نفیس اور نازک گھڑی بھی بندھی تھی جسے وہ کسی صورت بھی نہ اتارتی تھی۔ اس کی دونوں نازک گوری ہتھیلیوں میں رچی مہندی ان کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔گل جاناں نے بہت پیار اور محنت سے اسے یہ مہندی لگائی تھی اور اس کے ہر ایک پھول میں اس کے اچھے نصیب کے لئے دعا کی تھی۔ اسے یوں لگا تھا کہ اس کی ہتھیلیوں کی دعائیں زرمینے کی ہتھیلیوں میں جذب ہو گئی ہیں۔

''مہندی کا رنگ بہت گہرا چڑھا ہے، تمہارا شوہر تم سے بہت پیار کرے گا۔'' زرمینے بری طرح شرما گئی۔

''میرا دل چاہتا ہے تمہیں دلہن بنا دیکھوں۔'' زرمینے کی جھکی ہوئی پلکیں شرم سے تھرتھرا رہی تھیں۔اس کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا، خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی مگر وہ منہ سے کچھ نہیں بولی۔

شام ڈھلنے تک تبریز خان گھر نہیں آیا، گل جاناں کو اب پریشانی ہو رہی تھی اس کا سیل فون بھی بند جا رہا تھا۔ جب اس نے ایک بار پھر اس کا نمبر ملایا تو ساتھ ہی دروازے میں چابی لگنے کی آواز آئی گل جاناں تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔مگر وہ کوئی بات کئے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔گل جاناں نے کھانا ٹرے میں لگایا اور کمرے میں آ گئی۔

''لے جاؤ اسے میں جب تک یہ داغ نہیں دھو لیتا کھانا نہیں کھاؤں گا، چاہے مر جاؤں۔''

”ایسا مت کہیں!“ گل جاناں نے تڑپ کر کہا۔ پھر وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”یہ پہن لو!“ اس نے ایک سرخ جوڑا زرمینے کے بستر پر رکھا۔

”کیا کوئی آ رہا ہے؟“

”ہاں! بہت خاص مہمان آ رہے ہیں۔“

”سچ......کون ؟“ زرمینے نے اشتیاق سے پوچھا۔

”پتہ چل جائے گا، تم تیار تو ہو جاؤ۔“ زرمینے کپڑے بدل کر آئی تو گل جاناں سرخ جوڑے میں کھلی خوبصورتی کو گہری نظروں سے دیکھنے لگی، اسے کسی میک اپ کی ضرورت تو تھی نہیں، گل جاناں نے اسے جھمکے دیئے جو اس نے کانوں میں پہن لئے۔ گل جاناں نے آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوما اور پانی کا گلاس اس تھما دیا۔

”یہ پی لو! دم کیا ہوا پانی ہے، نظرِ بد سے بچاؤ کے لئے!“ زرمینے ہلکا سا مسکرائی۔

”ماما جرمنی میں رہ کر اکیسویں صدی میں بھی آپ نظر پر یقین رکھتی ہیں؟“

”بیٹا جرمنی ہو یا دنیا کا کوئی بھی ملک اور کوئی بھی زمانہ برائی تو ہر وقت، ہر جگہ موجود رہتی ہے۔ ہم اپنے طور پر اس سے بچنے کی تدبیر کرتے رہتے ہیں۔“ زرمینے نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر پانی پیا اور بستر پر بیٹھ گئی۔ گل جاناں بھی وہیں بیٹھ گئی تو زرمینے نے جھٹ سے اس کی گود میں سر رکھ دیا اچانک اس کی نظر ماں کی کلائی پر پڑی۔

”ماما کڑے کہاں ہیں؟“

”اتار دیئے!“

”کیوں؟“

”بس یونہی!“ اس نے ایک سرد آہ بھری۔

”پھر سے پہن لینا۔“ مگر گل جاناں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے بچپن کا گیت گنگنانے لگی۔

میری پری/ننھی پری/جو پرستان سے آئی ہے/اپنی ماں سے ملنے کے لئے
پھر ایک دن وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر چلی جائے گی/ماں تنہا رہ جائے گی
مگر بیٹیاں تو ملتی ہی جدا ہونے کے لئے ہیں/بیٹی کی جدائی تو مقدر ہے/ہاں یہ جدائی مقدر ہے
اس کی پلکوں سے ایک آنسو کا قطرہ زرمینے کی گال پر گرا مگر وہ گہری نیند سو چکی تھی۔

جاگنگ ٹریک پر بھاگتے ہوئے اس کی نظر بائیں طرف بنے بینچ کے پیچھے پڑی تو اسے عجیب سا محسوس ہوا، یوں جیسے کوئی وہاں سو رہا ہے۔ مگر منفی 2 ڈگری میں کون ہوگا جو ایسی جگہ سوئے گا، وہ بھی بینچ کو

چھوڑ کر سردی سے اکڑی ہوئی گھاس پر؟ میری رک گئی اور پیچھے آتے ہوئے جان کا انتظار کرنے لگی۔ جان بھاگتا ہوا قریب آیا اور اسے رکا دیکھ کر وہ بھی رک گیا۔

”کیا یہ عجیب نہیں؟ ہمیں قریب جا کر دیکھنا چاہئے۔“

”چھوڑو ہمیں کیا، دوڑ مکمل کرو مجھے کام پر پہنچنا ہے۔“ جان نے بھاگنا شروع کر دیا تو میری بھی مجبوراً اس کے پیچھے بھاگنے لگی مگر اس کا ذہن اسی چیز میں اٹکا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اسی ٹریک پر ان کی واپسی ہوئی تو میری جان بوجھ کر دائیں جانب رہی، اس بینچ کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ وہ سلیپنگ بیگ وہیں موجود تھا۔ جان ابھی تھوڑا پیچھے ہی تھا میری تجسس سے مغلوب ہو کر اس بیگ کے قریب آ گئی۔ سلیپنگ بیگ کے سر کی ٹوپی کی ڈوریاں اس طرح سے کسی ہوئی تھیں کہ پہلی نظر میں اس کے اندر جھانکنا مشکل تھا۔ یوں بھی جو حصہ کھلا تھا وہ لال رنگ کے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میری نے جھک کر بیگ کو ہاتھ لگایا تو اسے اندر کچھ موجود ہونے کا یقین ہو گیا۔ مگر اس کا ذہن اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہا تھا کہ اندر کوئی سو رہا ہوگا۔ اب جان بھی اس کے قریب آ چکا تھا۔

”جان! اس میں کچھ ہے، ہمیں دیکھنا چاہئے!“

”تمہیں بہت شوق ہے ہر بات میں گھسنے کا کوئی مصیبت ہی نہ گلے پڑ جائے۔“ مگر میری اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر وہ لال کپڑا ہٹا چکی تھی، اندر جو کچھ اسے نظر آیا وہ یکدم دہشت سے پیچھے ہٹی اور جان سے لپٹ گئی۔ جان نے جھانک کر دیکھا تو اسے بھی جھٹکا لگا۔

”اب تم جو بھی کہو، میں پولیس کو کال کرنے لگی ہوں۔“ ان کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ لڑکی مر چکی تھی۔ جنگل کے اندر اس جگہ پہنچنے میں پولیس کو کچھ وقت لگا۔ انہوں نے ان دونوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور کاروائی میں مصروف ہو گئے۔

”کس قدر خوبصورت لڑکی ہے، اسے کیا ہوا؟“ میری ایک ہی بات سوچے جا رہی تھی۔ لڑکی کی کوئی شناخت نہیں ہو پا رہی تھی اس کے لباس سے انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کوئی پاکستانی لڑکی ہے جسے گلا گھونٹ کر مارا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق جب اسے وہاں لا کر ڈالا گیا تب اس کی سانسیں چل رہی تھی مگر خواب آور دوائی اور ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے شدید سردی کے باعث اس نے دم توڑا تھا۔ ٹی وی پر اس قتل کی خبر بار بار دکھائی جا رہی تھی۔ ایک لڑکے نے پولیس سٹیشن میں اپنی منگیتر کی گمشدگی پر تشویش کا اظہار کیا، اس کا کہنا تھا کہ وہ دن میں اتنا رابطے میں ضرور رہتے تھے کہ ان کو یہ خبر رہتی کہ وہ اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں مگر کل رات سے اس کا ہر رابطہ اس سے منقطع تھا اس کے گھر سے بھی نہ تو کوئی فون اٹھا رہا تھا نہ دروازہ کھول رہا تھا۔

شناخت ہو چکی تھی اور منگیتر کی مدد سے ہی اس کے ماں باپ کو زرمینے کی خالہ کے گھر سے گرفتار کر

لیا گیا۔تھوڑی سی کوشش کے بعد ہی انہوں نے اقبال جرم کرلیا تھا۔اس قتل میں ماں اور باپ دونوں ملوث تھے ماں نے خواب آور دوا پانی میں گھول کر اسے پلائی، جب کہ باپ اور چچا نے مل کر اس کا گلا دبایا اور اپنی طرف سے یہ یقین کر لینے کے بعد کہ وہ مر چکی ہے اسے اس کی دادی کی وہیل چیئر پر ڈال کر جنگل میں چھوڑ آئے ۔قتل کی وجہ انہوں نے غیرت بتائی ۔لڑکا زرمینے کے ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھتا تھا بہت سی باتیں مشترکہ ہونے کی وجہ سے ان کی آپس میں دل چسپی بڑھتی گئی اور ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی کہ دونوں کے ماں باپ کو اس بات پر اعتراض نہ ہوگا۔مگر زرمینے کا گھر میں اپنی پسند کا اظہار قیامت بن گیا تھا۔زرمینے کی ماں جرمنی میں رہتے ہوئے اس بات کو سمجھ چکی تھی کہ لڑکا اور لڑکی آپس میں ایک دوسرے سے پسند کا اظہار کر لیتے ہیں، ان کی شادی ہو جانے میں کوئی حرج بھی نہیں، یہ بات اس نے اپنے شوہر کو بھی سمجھا کر اس رشتے پر راضی کر لیا تھا۔ یوں بھی ذات برادری ایک ہونے کی وجہ سے اس میں ان کو کوئی حرج بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔مگر چچا نے یہ بات پاکستان میں بڑے بھائی تک خوب نمک مرچ لگا کر پہنچائی اس کا ایک ہی موقف تھا کہ اب لڑکیاں مرضی کی شادیاں کرنے لگی ہیں آج تو برادری کا لڑکا ہے اس سلسلے کو یہیں نہ روکا گیا تو کل غیر بھی ہو سکتے ہیں۔

بڑے بھائی نے بھڑک کر زرمینے کے باپ کو فون کیا اور اسے خوب لتاڑا۔اور زرمینے کے باپ نے اس کی ماں کو جس نے بعد میں اس داغ کو دھونے کی یہ تجویز پیش کی۔وہ اسے بہت دور دراز جنگل میں پھینک آئے تھے اور اب پاکستان جانے کی تیاری میں مصروف تھے مگر اس بات کو یکسر فراموش کر چکے تھے کہ اس کا منگیتر اسے یونیورسٹی میں نہ پا کر اس کے متعلق پوچھ سکتا ہے اس کا حل انہوں نے یہی سوچا تھا کہ اس کے رابطے کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا جائے گا۔اپنی طرف سے وہ زرمینے کو بہت دور جنگل میں پھینک آئے تھے مگر اس جنگل میں سائیکلنگ اور جاگنگ کے ٹریکس بنے ہوئے تھے جہاں سارا سال لوگ جاگنگ کرتے رہتے ہیں۔

''وہ لڑکی جو آپ کی عزت آپ کی غیرت تھی، اسے یوں سڑک پر کھلے عام پھینک کر آتے ہوئے آپ کی غیرت کیوں نہیں جاگی؟'' اس کا منگیتر شدید دکھ کی حالت میں ان سے پوچھ رہا تھا۔

''ہاں غلطی ہوگئی.....وہاں دفن کر کے آنا چاہیے تھا، مگر اس کا وقت نہیں ملا۔'' اس کے باپ کے چہرے پر شرمندگی یا تاسف کی رمق تک نہ تھی۔اس نے بیٹی کی جان لے کر غیرت بچالی تھی وہ خود کو حق پر گردان رہا تھا۔

سزا کاٹ کر جیل سے نکلے تو سامنے ہی زرمینے کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گئے وہ ایک جرمن عورت کے ساتھ کھڑی تھی اس نے نیلی جینز پر سفید بلاوز پہن رکھا تھا۔ان کی آنکھوں میں کئی برس پہلے والی زرمینے کی شبیہ جھلکی۔اس کی ایک بہت خوبصورت تصویر سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی تھی سر سے پاؤں تک سیاہ عبائیہ میں لپٹی ہوئی مہندی لگے ہاتھوں میں موبائل پکڑے ہوئے وہ ہلکے سے مسکرا رہی ہے، اس بات سے بے خبر کہ چند دن بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اس کے اپنے ہی ماں باپ اس کے قاتل بن جائیں گے ، اس کی

ماں جو اس پر جان چھڑکتی تھی لوری سناتے سناتے اس کی جان لے لے گی۔وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''میری پلوشے، میری جان!''

پلوشے جو بنی بنائی زرمینے تھی یکدم پیچھے ہٹی اور اس جرمن عورت کے پیچھے چھپ گئی۔وہ جیل کے اس تمام عرصے میں اپنے ماں باپ سے ملنے نہیں آئی تھی مگر اس کے نگراں ادارے والوں نے کہا تھا کہ یہ ضروری ہے کہ وہ ایک بار ان سے مل کر ان سے خود کہہ دے جو وہ کہنا چاہتی ہے۔جرمن عورت نے اسے تھپکی دی اور آگے بڑھ کر بات کرنے کو کہا۔پلوشے آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی آئی اس نے باپ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ماں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں سے غصہ اور دکھ جھلک رہے تھے۔

''ماما آپ نے اور بابا نے اس دن جو کچھ بھی کیا، میں نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر میں اتنا ڈر چکی تھی کہ کچھ نہیں کر سکی میں بہت چھوٹی تھی، آپ نے میری بہن کو صرف محبت کی اتنی بڑی سزا دی مگر ظلم تو مجھ پر بھی کیا، میں اس دنیا میں اکیلی رہ گئی ہوں، مجھ سے میری بہن چھین ہی لی تھی۔میرے ماں باپ بھی مجھ سے چھن گئے۔آپ کی ایک نہیں دونوں بیٹیاں مر چکی ہیں۔''

''پلوشے میری جان، ایسا نہ کہو.....'' گل جاناں تڑپ کر آگے بڑھی۔

''میرے قریب نہ آئیں، مجھے آپ سے خوف آتا ہے، آپ نے جو کچھ زرمینے کے ساتھ کیا میرے ساتھ بھی کر سکتی ہیں۔''

''ایسا نہ کہو تم ایک ماں کا دکھ نہیں جانتیں، عزت گنوا کر جینا___''

''عزت! وہ بیٹی جس کی عزت کی تمام عمر آپ نے رکھوالی کی اسے ادھ موا شدید سردی میں چھوڑتے ہوئے آپ کو غیرت نہیں آئی؟ اس بے چاری کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری تھی، آپ نے اس کے ہاتھوں سے زندگی کی لکیر ہی مٹا دی۔آپ اس سے ہر تعلق ختم کر دیتیں، مگر اس سے زندہ رہنے کا حق تو نہ چھینتیں۔'' یہ کہہ کر وہ جرمن عورت کی طرف مڑی اور اس سے جرمن میں کہا کہ وہ اب جانا چاہتی ہے۔

''زرمینے رک جاؤ۔'' گل جاناں تڑپ کر چلائی۔

''میں زرمینے نہیں پلوشے ہوں۔'' اس نے مڑ کر طنز اور تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا اور جانے کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

◂◂ ● ▸▸

Krnnberger str 8 ,63128,Dietzenbach ,
Mob: +49173 9054897

● **افسانہ**

● **مونا شہزاد**

طوائف کہانی

محفلِ ادب زوروں پر تھی۔تمام ادیب اپنے اپنے نظریات پیش کرنے میں مصروف تھے۔بات سے بات نکلی اور ذکر اس بدنام محلے کا ہونے لگا۔ جہاں پر دن سوتے تھے اور راتیں جاگتی تھیں۔جسموں کی منڈی لگتی تھی، ہوس کا دیوتا عریاں ہوکر ناچتا تھا اور میڈوسا سرسراتے ہوئے سانپوں سے بھرا سر لئے دیوانہ وار رقص کرتی تھی۔ایک ادھیڑ عمر ادیب نے اپنے چشمے کو اوپر کرتے ہوئے ایک آنکھ دبا کر معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''میاں! یہ ہم ادیبوں کا ہی قصور ہے جو طوائف کو بے بس مخلوق بنا کر ہم افسانوں، کہانیوں میں پیش کرتے آرہے ہیں۔'' تمام حاضرین محفل اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔اپنی بات کی اثر انگیزی دیکھ کر وہ چٹخارہ بھرتے ہوئے بولا۔

''ارے بھئی! میں کہتا ہوں کہ طوائف کے متعلق خود ترسی سے نکل آو۔تاریخ اٹھا کر دیکھو! یہ جسم فروشی ایک پیشہ ہے، پیشہ.....دنیا کا قدیم ترین پیشہ۔آپ سب اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟ فضول بحث ومباحثہ چھیڑے رکھتے ہیں۔عورت اس لئے طوائف بنتی ہے کیونکہ اس کے پاس ایک جنس موجود ہے۔وہ اس کی طاقت، قدر و قیمت سے واقف ہوتی ہے۔وہ قیمت لیتی ہے اپنے ناز وادا کی.....اپنے جسم کی.....کیا آپ سب نے غلام عباس کا افسانہ 'آنندی' نہیں پڑھا؟'' دوسرے ادیب نے سر دھنتے ہوئے کہا۔

''میرے پسندیدہ مصنف ہیں غلام عباس اور آنندی ایک شاہکار تحریر ہے۔'' ادھیڑ عمر ادیب بولا۔

''بھئی غور کیجئے۔جس طوائف نامی غلاظت کو شہر سے نکالا تھا وہی غلاظت ایک بیابان کو گلستان میں بدلنے میں کامیاب ہوگئی۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ پیشہ ور عورتیں تھیں جن کی پسند، ان کی ترجیح ان کا پیشہ تھا۔'' ایک جوان سالہ مصنفہ ماتھے پر بل ڈال کر بولی۔

''حضرات! آنندی ایک شاہکار تحریر ہے۔اس بات سے مجھے انکار نہیں ہے۔مگر مجھے آپ لوگوں کے نکتہ نظر سے انکار ہے۔بات صاف کیجئے۔یہاں ہم عورت ذات کی بات کر رہے ہیں، جو ماں

ہے، بہن ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے.....جس کے کئی رشتے اور روپ ہیں۔جو وقت پڑنے پر ہر پیشہ چنتی ہے۔مگر معاف کیجئے گا وہ کبھی بھی اپنی ذات کی نفی کرتا ہوا پیشہ طوائف خود سے نہیں چنتی۔اس کو معاشرہ طوائف کا پیشہ سونپتا ہے۔کوئی عورت کبھی بھی طوائف نہیں بننا چاہتی؟ اسے آپ جیسے نام نہاد عزت دار گھرانوں کے مرد ہی چکلے پر بٹھاتے ہیں۔آنندی میں طوائفوں نے کسی کو نہیں بلایا تھا۔لوگ خود ہی ان کی کشش میں اس ویرانے میں بس گئے تھے۔"

حاضرین محفل پر سکوت سا طاری ہوگیا۔شاید ایک عورت کے منہ سے نکلا کرارا سچ انھیں ہضم نہیں ہو رہا تھا۔سب نے بے چینی سے پہلو بدلے۔کچھ نے اپنے پاندان کھول لئے۔کچھ اپنے موبائل فونز پر مصروف سے ہوگئے۔محفل میں موجود چند دیگر خواتین نے سکھ کا سانس لیا اور انھوں نے جوان سال مصنفہ کو احسان مندی کی نظروں سے دیکھا۔آخر کار عورت ذات کی عزت کا سوال تھا۔ایک بوڑھی شاعرہ کھنکھارتے ہوئے کھڑکھڑاتی ہوئی آواز میں گویا ہوئیں۔

''طوائف تو ایک گالی ہے۔کوئی عورت یہ گالی نہیں بننا چاہتی۔'' محفل میں ایک حساس شاعر جس کو لوگ اقتدار اعوان کے نام سے جانتے تھے وہ بھی اتفاق سے آج کی محفل میں موجود تھا۔اس نے سر اٹھا کر کہا۔

''میں مرد ذات ضرور ہوں مگر آپ خواتین کی اس بات سے سو فیصد متفق ہوں۔عورت کا خمیر رب نے پاکیزگی اور محبت سے اٹھایا ہے۔طوائف ایک پیشہ نہیں ایک جبر ہے۔جو عورت ذات کے اوپر مردوں نے مسلط کیا ہے۔کل ہی ایک نظم میں نے 'نچنیا' کے نام سے لکھی ہے۔آپ سب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔یہ ایک کوٹھے میں پیدا ہوئی بنت حوا کی پکار ہے۔اس کا سوال ہے۔

نچنیا

شاعر: اقتدار اعوان

مقدر میں لکھے ہوئے چھن چھنا چھن/یہ گھنگرو میرے پیر پر تو بندھے ہیں
یہ نوٹوں کی قیمت پہ بل کھاتا لاشہ/ یہ لپکے..... یہ لٹکے..... یہ مٹکے..... یہ جھٹکے
سروں کی تڑپ میں بدن کی یہ تھرکن/ہوس کی صداؤں میں ملفوف واہ! واہ!
مقدر تو ہے پر..... یہ میں تو نہیں ہوں! / گو بکتی تو ہوں..... پر کوئی شے تو نہیں ہوں!
شریفوں کی عزت.....رئیسوں کی حرمت/ پلی گر نہ ہوتی نچنیا کے گھر میں!
تو میرے بھی ابا دوپٹے میں ڈھانپے/کسی شاہزادے کی دلہن بناتے
میرے بھائی کرتے وداع زیرِ قرآن/وہ ڈولی کو میری گلوں سے سجاتے
وہی پھول اب روز رندتے ہیں پیروں/دوپٹے کے دامن کی کترن کی جھالر

کرائے کے بستر سے لٹکی ہے ایسے/ سہاگن کے سر میں بھری راکھ جیسے
یہ صدیوں سے ایسے ہی چلتا رہا ہے/ اور شائد ابد تک ہی چلتا رہے گا
شریفوں کے بچوں کا تاریک نطفہ/طوائف کی جھولی میں پلتا رہے گا
نہ گھنگرو رکیں گے.....نہ سازوں کی مستی/جسم بکتا رہا ہے سو بکتا رہے گا
روح پاکیزہ جتنی بھی ہو چاہے لوگو!/ حرافہ کا دھبا ہے لگتا رہے گا
نہ گھنگرو رکیں گے نہ سازوں کی مستی/جسم بکتا رہا ہے سو بکتا رہے گا

محفل میں موجود خواتین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ کچھ مرد حضرات بھی متاثر نظر آئے۔ مگر کچھ لوگ ابھی بھی متفق ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ کچھ نے داد و تحسین دی اور کچھ لوگ بحث و مباحثے میں مصروف ہو گئے۔ رات بھیگ چکی تھی۔ رفتہ رفتہ سب حاضرین محفل نے رخصت لے لی۔ رات آنکھیں موندے کھڑی یہی سوچ رہی تھی کہ معمہ تو حل نہیں ہو پایا۔

''کیا واقعی طوائف کا پیشہ عورت اپنے شوق سے اپناتی ہے؟'' چاندنی نے چٹک کر رات کے کانوں میں سرگوشی کی اور بولی۔

''سکھی! اس معمے کو حل ہم دونوں مل کر بھی کبھی نہیں کر پائیں گی۔ اس لئے دھیرج رکھو۔'' دور ریڈ لائٹ ایریا میں گھنگروؤں کا شور عروج پر تھا۔ ہر کوٹھے پر نچنیا دیوانہ وار رقص میں مصروف تھیں۔ ان کے اردگرد رالیں ٹپکاتے ابن آدم کا ہجوم بے کراں تھا۔ نوٹ وارے جا رہے تھے۔ عجب ماجرا یہ تھا کہ تماشائیوں میں ایک بھی عورت ذات موجود نہیں تھی۔

اس کے ماتھے پر پسینہ آ رہا تھا مگر وہ ایک ٹرانس کی سی کیفیت کا شکار تھا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''جب جان کنی کی کیفیت طاری ہو جائے تو مردار بھی حلال ہو جاتا ہے۔'' اس کا ضمیر چپکے سے بولا۔

''کیا واقعی تجھ پر جان کنی کی کیفیت طاری ہے؟ کیا تجھ پر تمام حلال ذرائع کے دروازے بند ہو گئے ہیں یا تو نے خود پر حلال ذرائع کے دروازے خود بند کر لئے ہیں؟ تو لوگوں کی واہ واہ سنتے سنتے اتنا اس داد کا عادی ہو گیا ہے کہ تو صحیح کام کے لئے صحیح طریقہ بھی اپنانے سے قاصر ہے۔ اگر تیری بیوی مفلوج ہے تو دین تجھے دوسری شادی کی بھی تو اجازت دیتا ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر زیر لب کہا۔

''جب بازار کھلے ہیں تو ذمہ داری گلے باندھنے کی مجھے کیا ضرورت ہے۔'' اس نے گاڑی میں میوزک تیز کر دیا اور ایکسیلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ گاڑی زن سے رفتار پکڑ گئی۔ وہ مقررہ روڈ پر پہنچ چکا تھا۔ روڈ کی گہما گہمی کم ہو چکی تھی مگر ابھی بھی کچھ عورتیں سٹریٹ لیمپس کے نیچے کھڑی دکھائی دے رہی

تھیں۔ سردی کے باعث دھند میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے بے چینی سے ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے سوچا۔

''اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو میری سماج میں کیا عزت باقی رہ جائے گی؟'' ایک لحظے کے لئے دل کیا کہ وہ پلٹ جائے مگر رات کے گھور اندھیرے نے اس کی ہمت بندھائی۔ اس نے گاڑی روکی اور سٹریٹ لائٹ کی روشنی میں اپنی مطلوب نظر ڈھونڈنے لگا۔ اچانک ایک عورت نے کھڑکی کے شیشے کو کھٹکھٹایا۔ اس نے شیشہ نیچے کیا۔ مگر اس سے قبل کہ وہ کچھ بولتا، عورت دروازہ کھول کر پیسنجر سیٹ پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ اس نے فٹافٹ گاڑی دوڑا دی۔ گاڑی میں چنبیلی اور موتیئے کی ملی جلی سی خوشبو پھیل گئی۔ اس عورت نے شاید چنبیلی کا عطر لگایا ہوا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے دیکھا، عورت کی رنگت سفید تھی اور ناک نقشہ سبک تھا۔ اس کا جسم بہت ہی توبہ شکن، بھرا بھرا سا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں بہت ہی اداس تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ ایک مردے کی آنکھیں ہوں۔ ان آنکھوں میں مرگ کی کیفیت تھی۔ اس نے اپنی نظریں چرائیں اور اپنی توجہ عورت کے جسم کی جانب مبذول کر لی۔ اس کے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایک عجب سی مستی نظروں میں چھانے لگی۔ اس کا موڈ یکا یک بحال ہو گیا۔ اس نے بے خیالی میں ایک خواشگوار دھن پر سیٹی بجانی شروع کر دی۔

رات جیسے جیسے قریب آ رہی تھی زلیخا کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ بچے آخری بچی ہوئی مٹھی بھر دال اور چاول کی کھچڑی کھا بیٹھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے کل کیا ہو گا؟ یہ سوال پوری وحشت سے ناچ رہا تھا۔ پچھلے دو سال کی ایک ایک بچت کی پائی اس کے شوہر نصیر کی بیماری پر لگ گئی تھی۔ اس کے مرنے پر اس کا کفن دفن بھی انور خان کے اُدھار کے پیسوں سے ہوا تھا۔ انور خان جیسا سود خور بنیا کسی کو پیسے بغیر کسی غرض کے دے دے یہ بات اس وقت اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ سمجھی تھی کہ شاید خدا ترسی اس کے کافر دل میں آ گئی تھی۔ مگر پرسوں رات ہی جب وہ زبردستی اس کے گھر گھس آیا اور اس کی چیخوں پر بھی کوئی مدد کو نہیں پہنچا تب اسے پتا چلا تھا کہ زور آور درندے کے آگے لاچار بکری کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس شیطان نے بند کمرے میں اس سے قرضے کی ایک ایک پائی سود سمیت وصول کی تھی۔ اس کی آہ و بکا سب بیکار ثابت ہوئی۔ اسے زندگی میں پہلی بار پتہ چلا کہ وہ تو محض ایک جنس تھی۔ انور خان نے جاتی دفعہ آنکھ دبا کر اسے مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنے بچوں کو بھوک سے مرنے سے بچانا چاہتی ہے تو اپنی دکان سجا لے۔ وہ دس روز فیصلے کی سولی پر لٹکتی رہی۔ اس نے گھروں میں کام لینے کی کوشش کی مگر ہر جگہ اس کا رنگ و روپ آڑے آ گیا۔ محلے والوں نے اسے عدت کے دوران باہر نکلنے پر طعنوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ آخر تمام راہیں مسدود پا کر اس نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو بھوک اور افلاس کی بھینٹ نہیں چڑھنے دے گی۔ آج اس کے فیصلے کے عملدرآمد کرنے کی پہلی رات تھی۔ رات کے نو بجنے والے تھے۔ اس نے آہستگی سے اپنے ساتھ لیٹے ہوئے دونوں بچوں کو پیچھے کیا، ان کے ماتھوں پر نرمی سے بوسہ دیا، وہ کچھ دیر

تک انھیں یک ٹک دیکھتی رہی۔بچپن بھی کیسا معصوم اور بے فکر ہوتا ہے اس کی عملی تفسیر اس کے اپنے بچے تھے۔اس نے ایک سرد آہ بھری اور نرمی سے ان کے اوپر کمبل درست کئے اور پھر دبے پاوں غسل خانے میں چلی آئی۔نہا دھو کر کپڑے بدل کر وہ اپنی پرانی ٹوٹی ہوئی سنگھار میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔اس نے بے دلی سے اپنا میک اپ شروع کر دیا۔اس کے ہاتھ ابھی بھی کپکپاہٹ کا شکار تھے۔اس نے دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہا۔اس نے برہمی سے اپنے چہرے پر غازے کی تہہ کو مزید گہرا کیا۔ہونٹوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک کی ایک اور تہہ لگائی۔بالوں میں موتیے کے پھولوں کے گجرے لگائے۔اس نے کھڑے ہو کر قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔اس کا پچھلے کچھ سالوں میں کچھ وزن بڑھ گیا تھا مگر اس کے نتیجے میں اس کا جسم زیادہ کشش انگیز ہو گیا تھا۔اس پر اپنی شادی کی یہ سبز بنارسی ساڑی ابھی بھی بہت پھب رہی تھی۔اس کا شاکنگ پنک بلاوز اس کے بالائی جسم کی رعنائیوں کو چھپانے کے بجائے انھیں مزید ابھار رہا تھا۔اُسے یاد آیا کہ وہ نصیر کی فرمائش پر بھی یہ ساڑی نہیں پہنتی تھی۔اس کے اصرار پر وہ چڑ کر کہتی تھی۔:

''میاں! تمھیں تو لاج آتی ہی نہیں۔میں شریف زادی ہوں، یہ طوائف زادیوں جیسا پہناوا میں نہیں پہن سکتی۔خبردار! جو آئندہ مجھ سے فرمائش کی۔''اس نے چور نگاہوں سے اپنی کمر کا خم اور ننگے پیٹ پر نظر دوڑائی اسے وہ بہ آواز بلند 'طوائف'، 'طوائف' کے نعرے لگاتے ہوئے محسوس ہوئے۔اس نے گھبرا کر آنکھیں چرالیں۔مصنوعی سونے کا ہار اس کے سینے پر عجب بہار دکھا رہا تھا۔اس کے کانوں میں پڑے آویزے رہ رہ کر اس کے ملکھ کو چوم رہے تھے۔اس کے میک اپ زدہ پلاسٹر ڈ چہرے پر صرف اس کی آنکھیں تھیں جو اب بھی اس کی وضع قطع کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔اس کی بیوہ آنکھیں عجب سوالی سی بن کر اس کا چین غارت کرنے پر تلی تھیں۔اس نے ناگواری سے سنگھار میز پر پڑا سبز آئی شیڈ اٹھایا اور اپنی آنکھوں کے پپوٹوں کو مہارت سے رنگنا شروع کر دیا۔اس نے پھر بیچ میں شاکنگ پنک آئی شیڈ کی میچنگ کی۔مگر پتہ نہیں کیوں اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں سے سوال کا رنگ مدھم نہ ہوا۔اس نے تنگ آ کر اپنے ہونٹوں کو بھی شاکنگ پنک لپ اسٹک سے مزید رنگ ڈالا۔اس کی آنکھیں اب بھی شیشے کے دریچے میں سوالی سی بنی روئی روئی سی کھڑی تھیں۔اس نے ساڑھی کا پلو اپنے اوپر پھیلایا اور پھر سیاہ چادر اوڑھ کر کمرے سے نکل آئی۔اس نے آہستگی سے کمرے کے دروازے کو تالا لگایا اور گھر سے دبے قدموں باہر نکل گئی۔آج سردی کڑاکے کی تھی۔وہ گھر سے باہر نکل کر تاریکی کا حصہ بن گئی۔دھڑکتے دل سے مقررہ جگہ سے رکشہ لے کر وہ اپنی منزل تک جا پہنچی۔اس نے چادر تہہ کر کے رکشے میں ہی رکھی اور اسے کہا۔

''بابا بشیر! صبح چار بجے تک دوبارہ یہیں آ جانا۔''بابا بشیر کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس نے رکشے سے اتر کر ایک ٹھنڈا سانس لیا اور اپنے پلو کو پیٹ سے ہٹایا اور مٹکتی جھٹکتی مشہور چوراہے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔وہاں اس جیسی کئی بنات حوا کھڑی تھیں۔جسم کا بازار سجا ہوا تھا۔کئی لڑکیوں کے ساتھ ان کے دلال بھی تھے۔گاہک آتے تھے اور منڈی سے بھاؤ تاؤ کر کے پسندیدہ مال ساتھ لے جاتے تھے۔وہ شش و پنج میں مبتلا تھی۔رفتہ رفتہ سڑک خالی ہونے لگی۔اب وہ ہمت کر کے ایک دو گاڑیوں کی جانب لپکی مگر آج جیسے وہ نادیدہ سی ہو گئی تھی۔ہر خریدار اس کا ہاتھ جھٹک کر کسی نئی نوخیز کلی کی جانب ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔اس کی آنکھوں کے آگے سوالیہ نشان ناچ رہا تھا کہ اگر آج رات وہ خود کو بیچنے میں کامیاب نہ ہوئی تو کیا اس کے بچے بھوکے سوئیں گے؟ اسے اپنے گھر کے خالی راشن کے ڈبے یاد آ گئے۔پھر اپنی پڑوسن رشیدہ یاد آ گئی جس نے بیوہ ہونے کے ایک مہینے کے بعد ہی اپنی عدت کے دوران چوہے مار گولیاں پیس کر اپنے بچوں کو کھلائیں تھیں اور پھر خود کھا کر مر گئی تھی۔کیونکہ معاشرے کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو اس کے عدت کے دنوں کا شمار تو یاد تھا مگر اس بیوہ کے گھر ہوتے فاقوں کا شمار کسی کو بھی یاد نہیں تھا۔وہ ابھی ان خوفناک سوچوں کے مدوجزر میں ڈوب ابھر ہی رہی تھی کہ ایسے میں ایک گاڑی اسے سڑک پر رکتی نظر آئی، اس نے آخری فیصلہ کیا اور جا کر گاڑی کا شیشہ کھٹکا دیا۔ایک نئی طوائف کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

353 Sagewood Dr.
Airdrie,Alberta.
Postal code T4B3N3.
Canada.
403-992-0972 Cell number.

● افسانہ

● گل ارباب

ادھوری حقیقت

وہ بہت ساری تھیں.....کوئی سانولی کوئی کالی اور چند ایک تو ان میں گوری بھی تھیں۔
شکلیں بھی سبھی کی ایک دوسرے سے مختلف تھیں کچھ کے نقش تیکھے کچھ کے موٹے اور بھدے کوئی فراخ پیشانی والی تھی تو کسی کا ماتھا چپٹا سا تھا لیکن ان میں کچھ چیزیں مشترک بھی تھیں جن میں سے ایک تو اداسی تھی اور دوسری تھیں سب کی عمریں.....ہاں سروں پر بالوں کا نہ ہونا یا کسی کے سر پر محض چند بال ہونا بھی مجموعی تھا۔سبھی کے چہرے زرد موسموں کی تصویر تھے یوں جیسے ہلدی یا ابٹن ان کے منہ پر خوب رگڑ رگڑ کر مل دی گئی ہو اور پھر منہ دھونا بھول گئی ہوں چہروں کی زردیوں کے علاوہ ہر ایک کا باقی وجود گہرے سرخ رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

''سنو! تم مسلمان ہو؟'' نئی آنے والی سے سب پوچھ رہی تھیں۔

'' ہاں میں سنا کرتی تھی اماں تلاوت کرتی تھیں اور ابا نعت پڑھتے تھے.....شاہ مدینہ.....شاہ مدینہ.....یثرب کے والی.....سارے نبی تیرے در کے سوالی۔'' وہ ہل ہل کر نعت پڑھ رہی تھی۔

ساتھ والی سانولی سلونی نے اپنی گہری بھوری آنکھیں جھپکاتے ہوئے ناگواری سے اسے دیکھا اور نخوت بھرے انداز میں بولی۔

''ایک تو مسلمان کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔اب یہ جگہ ایسی ہے جہاں نعت پڑھی جائے؟ اتنی بڑی ہستی کا ذکر کیا جائے؟''

''تمہیں کیا مسئلہ ہے؟'' ساری مسلمان لڑکیاں ناگواری سے اسے گھورنے لگیں۔

'' جن کا ذکر ہماری مقدس کتاب میں ہے ہم پر بھی ان کا احترام فرض ہے۔''

''کاش کہ تمہارے والدین بھی دین کی کچھ الف ب جان لیتے۔اگر ایسا ہوتا تو آج تم یہاں پر نہ ہوتیں۔'' سب سے کمزور والی نے کہا تو یہ سن کر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ملال کے جلتے بجھتے دیے کا کالا سیاہ دھواں پھیل گیا۔دھویں کی تلخی ان سب کی بصارتوں میں کڑواہٹ گھولنے لگی۔

''اچھا چھوڑو،تم یہ بتاؤ بھگوان کیسا ہوتا ہے؟'' سوال کرنے والی مسلمان تھی

''میں نے صرف سن رکھا ہے اور کہتے یہ ہیں کہ بالکل ماتا جیسا ہوتا ہے۔'' سب ہنسنے لگیں۔ان کا

ہنسنا رونے سے زیادہ دردناک تھا اور قہقہوں میں سسکیاں صاف سنائی دیتی تھیں۔

''سیدھی بات کرو نا کہ بھگوان اور ماں دونوں کی ملی بھگت سے تم ادھر آئی ہو؟'' وہ یہ سن کر بپھر گئی۔

''ماں مجھے یہاں بھیجنے پر مجبور تھی۔اسے کچھ مت کہو۔وہ تو میری رخصتی پر خوب روئی بھی تھی۔گال بھی پیٹے تھے اور بابا کے سامنے ہاتھ بھی جوڑے تھے کہ مجھے یوں رخصت نہ کریں۔'' مسلمان لڑکیاں پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگیں۔

''بھلا بھگوان اور ماں بھی کبھی مجبور ہوتے ہیں؟ اور جو مجبور ہو جاتے ہیں وہ بھگوان اور ماں کیسے ہو سکتے ہیں؟'' اس کی بات پر سب چپ ہو گئیں۔

''مجھے تو کسی سے کوئی گلہ نہیں بس افسوس ہے کہ وہ لوگ خود جہاں ایک لمحہ بھی نہ رہ پاتے اس جگہ پر ہمیں بھیج دیا؟'' اس کی دکھی آواز پر وہ سب پھر سسکیوں بھرے قہقہے لگانے لگیں۔

''لوگ؟'' وہ شرمندہ سی ہو گئی اس سوال پر۔

''نہیں لوگ نہ کہو انہیں۔وہ ہمارے ماں باپ ہیں افسوس تو اسی بات کا ہے۔'' سب دیر تک چپ رہیں لیکن چپ اندر کے شور کی گھبراہٹ سے ٹوٹ جاتی تھی آج بھی ٹوٹ گئی۔چپ کے ٹوٹنے سے بھی تو کرچیاں انہی کو زخمی کرتی تھیں لیکن اب یہ زخم زیادہ تکلیف نہیں دیتے تھے کیونکہ سبھی بانٹ لیتی تھیں۔

''کوئی اچھی بات کرو نا۔'' وہ ان سب میں سمجھدار تھی شاید کسی بہت پڑھی لکھی ماں کی بیٹی تھی۔

''تم ہم میں سب سے زیادہ سمجھدار ہو لیکن کبھی بتایا نہیں کہ تمہاری ماں کیا کرتی تھی؟'' وہ تاروں بھرے آسمان کی طرف حسرت سے دیکھتے ہوئے اداس لہجے میں بولی۔

''مما بہت بڑی مبلغہ ہیں۔وہ ناامید عورتوں کے دلوں میں بجھے ہوئے امید کے دیے کو روشن کرتی ہیں.....اپنے حسن بیان کا تیل ڈال کر۔''

''اگر وہ ناامیدی کے اندھیروں کو اپنے حسن بیان سے امید کے اجالوں میں بدل سکتی تھیں تو تمہارے باپ کا جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا دل کیوں نہ بدلا؟'' وہ چپ ہوئی تو سریلی آواز والی نے وہ سوال پوچھ لیا جو سبھی کے دلوں میں تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کی دل آزاری کے خیال سے نہیں پوچھ رہی تھی کیونکہ وہ بہت اچھی تھی سب کا خیال رکھنے والی اس لیے سب اس کا بھی خیال رکھتی تھیں۔

وہ چند پل خاموش رہی پھر بغیر پلکوں والی آنکھیں کھول کر باری باری سب کی سوالیہ نظروں کا سامنا کرتے ہوئے اتنی دھیمی آواز میں بولی کہ سب کو سماعتوں کا پورا زور لگا کر سننا پڑا۔

''کیونکہ ان کا اپنا دل جہالت کے اندھیروں سے نکلنا نہیں چاہتا تھا دوسروں کے دل بدلنے والوں کو بھی باہر کی روشنی چاہیے ہوتی ہے۔اپنے دل کے اندھیرے مٹانے کے لیے۔'' خاموشی کا ایک طویل

وقفہ سریلی نے گنگناتے ہوئے توڑا۔ وہ گانے لگی۔

''مائیں نی میں کنوں آکھاں.....''

وہ سب خاموشی سے سن رہی تھیں۔

''میری ماں نے تو مجھے یہاں بھیج کر بہت اچھا۔ کیا جانتی ہو کیوں؟ اس لیے کہ وہ جہاں رہتی ہے وہاں بھی ایسا ہی ماحول ہے۔ بدبودار اور گندا۔ کم سے کم یہاں وہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتی نا۔ وہاں رہتی تو وہ اپنے ساتھ میرے درد بھی سہتی۔'' وہ پھر وہی کلام گنگنانے لگی جو اس کی ماں محفلوں میں گاتی تھی۔

''چلو کچھ کھیلتے ہیں'' یہ سن کر وہ سب اپنی اپنی بند مٹھیوں کی طرف دیکھنے لگیں جن کے درمیان پتلی سی جھلی نظر آ رہی تھی جنہوں نے انگلیوں کو الگ نہیں ہونے دیا تھا کچھ کی بھیگی آنکھیں اپنے پاؤں کی انگلیوں کے درمیان کی ایسی ہی جھلیوں کی طرف افسوس سے دیکھنے لگیں۔

''چلو اداس مت ہو۔ اپنے اپنے دلوں کے خالی کشکول میں ہم خود ہی چند پل کے سکھ بھرے سکے ڈالتے ہیں۔'' سریلی طنزیہ ہنسی کے درمیان بمشکل بولی۔

''مگر ہاتھ تو سب کے خالی ہیں بلکہ ہاتھ ہی کہاں ہیں؟'' وہ اپنی جھلی والی ہتھیلی سب کو دکھانے لگی اور باقی سب ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگیں۔

''سنو! فرض کر لیتے ہیں کہ ہم یہاں سے نکل گئے ہیں۔ سب بتاؤ نکل کر پہلا کام کیا کرو گی؟'' سبھی سوچنے لگیں۔

''میں تو اپنے لیے چھم چھم کرنے والی چاندی کی وہ پازیب خریدوں گی جس میں سبز رنگ کے نگینے لگے ہوں گے۔'' اس نے اپنے نازک پاؤں کو انگلیوں کی پوروں سے سہلا کر حسرت بھرے انداز میں کہا تو باقی مسکرا دیں۔

''میں گرم کپڑے اور سر پر پہننے کے لیے سکارف خریدوں گی۔ نظر بھی تو آئے کہ میں مسلمان ہوں یہاں تو سبھی ننگی پڑی ہیں۔''

ہندو لڑکی نے یہ بات سن کر منہ بنا لیا۔

''دین کو ظاہری حلیے تک محدود نہ کرو۔ دل اور حلیہ ایک جیسا نہ ہو تو اسے منافقت کہتے ہیں اور منافقت ننگے بدن سے بڑا گناہ ہے۔'' بدمزگی سے بچنے کے لیے ایک نے بات بدلی۔

''میں تو یہاں سے نکلتے ہی گڑیا خریدوں گی اور اسے صاف ستھرے کپڑے پہنا کر گندی جگہ سے ہمیشہ بچاؤں گی گڑیا تو پیاری ہوتی ہے اور پیاری چیزیں پیاری جگہ پر ہی بہت پیاری لگتی ہیں۔'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

ایک نے افسردگی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو خوشبو والا صابن خریدوں گی اور اس سے خوب رگڑ رگڑ کر نہاؤں گی اور منہ دھو کر پھر آئینہ دیکھوں گی۔ سنا ہے آئینے میں سب صاف نظر آتا ہے۔ اسی ڈر سے کبھی دیکھا ہی نہیں۔'' دوسری نے اسے چھیڑا۔

''ارے پگلی! یہ گندگی ایک صابن سے صاف نہیں ہوگی۔ اسے تو گنگا جل سے دھونا پڑے گا۔''

''دنیا میں اگر کوئی پانی مقدس ہے تو وہ زم زم ہے میں اس سے خود کو دھونے جاؤں گی کیونکہ میرے والدین کئی سال سے حج اور عمرے پر جاتے ہیں۔'' سب اسے طنزیہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''توبہ توبہ کتنی نیک عورت ہے نا اس کی اماں؟ اور ابا تو بہت ہی پہنچا ہوا آدمی ہے، اس لیے تو اسے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔''

''کب تک جاگتی رہو گی؟''

''روشنی تک۔ جب یہ کتے یہاں سے بھاگیں گے تب ہی سکون سے سو سکوں گی۔ یہ کتے تو کبھی بھی کاٹنے اور بھنبھوڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ انہیں ہماری ہی تو تلاش رہتی ہے۔ کتنے عجیب ہیں نا ہمارے والدین، کتوں کے رزق کی فکر رہتی ہے انہیں؟'' طنز بھرا بھیگا لہجہ بہت خالی خالی سا تھا۔

''تم کہاں جاؤ گی؟'' خاموش والی کی طرف سب سوالیہ انداز میں دیکھنے لگیں

''میں ماں کے پاس جاؤں گی اور ان سے کہوں گی ماں ایک بار اپنی آغوش میں بھر کر سینے سے لگا لو۔ میں بہت اچھی ہوں صابر شاکر اور بالکل خاموش۔ بھوک لگے گی تو ان کا دودھ نہیں مانگوں گی۔ رات کو بستر بھی گیلا نہیں کروں گی۔ بس کبھی کبھی جب بہت ڈر لگے تو ان کے سینے سے لپٹ کر خوف کو بھگاؤں گی۔ اتنی سی ماں تو وہ غیروں کی بھی بن جاتی ہیں۔ جب درس کے دوران کوئی یتیم بچی روتی ہے تو وہ سینے سے لپٹا لیتی ہیں نا؟'' سب کی آنکھیں برس رہی تھیں یہ خواہش تو سب کے ننھے دلوں میں موجود تھی۔

''چلو سب کا انٹرویو ہو گیا ہے۔ اب مل جل کر کل کے خواب دیکھنا شروع کرتے ہیں.....اور .....اور.....'' سب کے چہروں پر کرب پھیل گیا۔

''خواب؟'' ایک بڑبڑائی۔

''خواب کہاں سہیلیو؟ بھلا اتنے بدبودار ماحول میں ہم خواب دیکھ سکتے ہیں؟ خواب تو پرسکون اور گہری نیند کی ضمانت سے آتے ہیں۔'' سب نفی میں سر ہلانے لگیں۔

''مجھ سے بھی تو کوئی پوچھے کہ میں کیا خریدوں گی بازار سے؟'' گوری رنگت والی نے کہا تو سب ہمہ تن گوش ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

''میں اپنے لیے سفید جالی والا فراک لوں گی۔''

''سچ کہوں تو تم پر خوب سجے گا بھی.....پسند تو مجھے بھی بہت ہے لیکن.....'' سب اسے دیکھنے لگیں۔

''رنگت کالی ہو تو ہر رنگ اچھا لگتا ہے.....سفید کے علاوہ.....سفید کو گولی مارو۔تم کوئی اور رنگ خرید لینا۔'' وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''کتنا ظلم ہے نا؟ ان کے پاس ہمارے لیے سفید لباس بھی نہیں تھا۔''

کتے بھونکنے لگے تھے۔

اور سب کی نظریں بے اختیار اس لمبی سڑک پر جم گئیں.....منتظر انداز میں اسپتال کی بیرونی دیوار کو تکتے ہوئے سب سوچ رہی تھیں۔

''کاش کتے بلاوجہ بھونک رہے ہوں۔آج کی رات تو کوئی نہ آئے۔''

لیکن جب بھی رات کے کسی پہر کتے بھونکتے تو کوئی نئی لڑکی ضرور وہاں آتی تھی۔

''ارے یہ کیا؟'' سب کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے ناقابل یقین منظر دیکھا۔

کوئی آ تو رہا تھا لیکن کئی سالوں کی ریت آج بدلی ہوئی تھی۔آنے والا تو ایک لڑکا تھا۔اس نے قریب آ کر بدبو سے بچنے کے لیے ناک پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

''بھیا! تم یہاں کیسے ؟'' سب کی آنکھوں کا سوال گہری سانولی رنگت والی کے لبوں پر مچلا تو آنے والا دور سے پوچھنے لگا۔

''سنو تم سب لڑکیاں اتنی گندی جگہ پر کیسے رہ رہی ہو؟ میں تو یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکوں گا۔'' اس نے منہ پھلا رکھا تھا۔ایک نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

'' پہلی بار یوں کوئی تم جیسا آیا ہے۔وجہ پوچھنی تو بنتی ہے۔''

وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''یہ کاغذ وہاں رکھ دو۔'' سریلی نے لڑکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو لڑکے نے مڑ کر دیکھا وہاں کاغذوں کا ایک بڑا سا پلندہ پڑا تھا۔لڑکیوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے کی طرف بھیگی آنکھوں سے دیکھا۔وہ سب آج بہت اداس تھیں۔

''یہ انہونی کیسے ہوگئی؟'' وہ تجسس بھرے انداز میں پوچھنے لگیں۔

''ٹھہرو !ابھی دیکھتی ہوں، شاید حرامی ہے۔'' سرگوشی سب نے سنی۔ایک آگے بڑھی اور کاغذات کے پلندے میں سے اس لڑکے کی سب سے اوپر رکھی فائل اٹھالی۔الٹرا ساؤنڈ کی اس فائل میں بچے کا وزن، پوزیشن اور عمر کے ساتھ جنس بھی لکھی تھی۔سب کو تجسس محسوس ہو رہا تھا۔انہیں لگا 'ناجائز' ہے لیکن ماں کے نام کے ساتھ زوجیت بھی لکھی تھی۔

''مطلب یہ ہوا کہ جائز ہے؟'' وہ پڑھتے ہوئے بڑبڑائی۔پھر سب کے اصرار پر تیز آواز میں رزلٹ سنانے لگی۔

''رپورٹ کے مطابق تو لڑکی ہے۔'' سب اس لڑکے کو حیرانی سے گھورنے لگیں۔وہ سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولا۔

''ڈاکٹر کی ذرا سی غلطی سے آج کوڑے کے ڈھیر پر ہوں۔''

◂◂ ● ▸▸

House of SP Arbab Shafiullah, Village Ranoghari,
Near Chamkani ,Teh&Distt :Peshawar.(Pakistan)
03129423534

اقبـــال حســـن آزاد

کا

چوتھا افسانوی مجموعہ

اوس کـــے موتی

زیر ترتیب

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

موبائل نمبر : +918210498674

● افسانہ

● قرۃ العین حیدر راٹھور

اعتراف

رات کھانے کے بعد نیند کی گولی نگلنا اس کی زندگی کا معمول تھا۔اس کی ریٹائرڈ زندگی کا محور چند کتابیں، پرانی یادیں اور اس کے خیالات تھے۔کم گو تو وہ ہمیشہ سے تھا لیکن اب ضرورت کی بات کے علاوہ خاموش ہی رہتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ بولنے والا کوئی نہیں تھا۔گھر میں سب تھے لیکن اب اس نے ہی نے بولنا چھوڑ دیا تھا۔عمر کی بہتر بہاریں دیکھنے کے بعد بھی دن میں کئی بار اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک عُود کر آتی تھی کہ اس کی بیوی سعدیہ حیران رہ جاتی۔ایک ایسی بیقراری جو ایک شخص کی آنکھوں میں اظہارِ محبت کے وقت ہوتی ہے۔اس وقت اس کے چہرے سے ایسے تاثرات دِکھتے کہ جیسے میں کسی سے مخاطب ہو۔کبھی کبھی اس کے ہاتھ حرکت میں آتے کہ جیسے کسی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے۔اس کی بیوی یہ سوچتی کہ شاید دوائیوں کے زیادہ استعمال سے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔اپنے اس خیال کا اظہار اس نے اپنے بڑے بیٹے ذیشان سے بھی کیا تھا کہ اپنے باپ کو کسی نفسیاتی ڈاکٹر کو دکھائے۔بہتر سال کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی.....اب سے پانچ سال قبل تک وہ بالکل فِٹ تھا صحت منداور ہشاش بشاش۔ایک دن اس کے سینے میں بُری طرح درد اٹھا اور دفتر والوں نے بروقت ہسپتال پہنچا دیا۔دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوسکتا تھا لیکن اس کے بعد اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور گھر کا ہو کر رہ گیا۔اس نے اپنی سرگرمیاں چھوڑ دیں اور اپنا وقت گھر میں گزارنے لگا۔شروع میں بیوی کو تشویش ہوئی لیکن بعد میں وہ اس کی عادی ہوگئی۔گھر میں ان دونوں کے علاوہ بڑے بیٹے کی فیملی بھی تھی۔ بیٹا، بہو اور دو بچے۔منجھلا بیٹا فوج میں میجر تھا اور اپنی فیملی کے ساتھ باہر رہتا تھا۔چھوٹا لنڈن پڑھنے گیا تو وہیں کا ہو کر رہ گیا۔

آج بھی معمول کے مطابق اس نے دوائی کھائی اور سونے کے لئے بستر پر آیا۔بیوی بستر پر لیٹی ٹی وی پہ ڈراما دیکھنے میں مگن تھی۔

''سعدیہ!.....'' اس نے دھیرے سے پکارا۔اپنی طرف متوجہ نہ پا کر اس نے بیوی کو پھر سے آواز دی۔''سعدیہ!''

ٹی وی پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر سعدیہ کا جواب آیا۔

''جی کچھ اور چاہئے.....بتاؤ میں لا دیتی ہوں۔''

''مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے۔'' سجاد کی آواز میں کچھ تکلیف سی تھی۔بیوی کو محسوس ہوا کہ اسے شاید پھر سے انجائنا کا اٹیک ہونے لگا ہے۔اس نے موبائل اٹھایا اور بیٹے کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

''او یار! میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے تم ہو کہ اب موبائل پکڑ لیا ہے۔'' اس کی آواز میں اب تلخی تھی۔

''آپ کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے میں ذیشان کا نمبر ڈائل کر رہی تھی کہ ڈاکٹر پہ چلیں۔'' وہ جھنجھلا سا گیا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے مجھے.....بالکل ٹھیک ہوں۔تم سے کچھ شیئر کرنا چاہتا ہوں اگر تم اپنی مصروفیت میں سے کچھ وقت دو تو.....'' اس نے جملہ ادھورہ چھوڑ دیا اور اس کی جانب دیکھنے لگا۔اب بیوی کو اپنی جانب متوجہ پا کر اس نے سوال کیا۔

''کتنے سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو؟''

''جی.....یہی کوئی چوالیس سال'' کچھ حساب لگا کر بیوی نے جواب دیا۔

''کیا ان چوالیس سالوں میں مَیں نے تمہیں کوئی تکلیف پہنچائی؟'' سعدیہ کو شک ہوا کہ لازماً کوئی مسئلہ ہوا ہے۔سجاد اب بری طرح تنقید کرے گا اور اگلے کئی دن تک شکوے کرتا رہے گا۔یہ سوچتے ہوئے اسے کوفت ہونے لگی کہ ان چوالیس سالوں میں یہ خواری کیا کم ہے کہ اس کا شوہر اس پر اب تک تنقید کرتا ہے۔اب وہ خاموش بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ کیا جواب دوں کہ یہ بات یہیں ختم کر دے اور سو جائے تا کہ وہ بھی سکون سے ڈراما دیکھے۔بیوی کو خاموش پا کر اس نے خود ہی بات شروع کی۔

''ہماری شادی خالصاً ارینج میرج ہے،تم میری خالہ کی بیٹی ہو.....اگرچہ کہ رشتہ طے ہونے کے بعد بھی میرے دل میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں بن پائی۔یہ نہیں کہ میں تمہیں ناپسند کرتا تھا بلکہ مجھے تمہاری عادتیں کل بھی پسند نہیں تھیں.....آج بھی نہیں ہیں۔میں اس زمانے میں تم سے چھٹکارہ چاہتا تھا لیکن ایسا نہ ہوسکا۔مجھے لگتا تھا کہ میری ماں نے مجھ سے بدلا لیا ہے کیونکہ تم بد دماغ اور بدمزاج کے ساتھ ساتھ مغرور بھی تھی۔'' سعدیہ اب سجاد کو گھور رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ آج پھر شروع ہو گیا ہے۔کتنے سالوں سے صرف کام کی بات کرتا تھا بس۔آج اگر بولا بھی ہے تو صرف مجھ پر تنقید کرنے کے لئے۔

''ماسوا میرے بچے پیدا کرنے کے علاوہ تم نے کبھی بیوی ہونے کا حق ادا نہیں کیا۔مجھے ان چوالیس سالوں میں کبھی روٹی پکا کر نہیں دی۔تمہارے خیال میں یہ ملازموں کے کام ہیں۔تم نے کبھی میرے کپڑے الماری سے نہیں نکالے۔میں کئی مواقعوں پر چاہتا تھا کہ مجھے چائے تم بنا کر دو۔دفتر جاتے ہوئے مجھے ناشتہ بنا کر دو، یا کم از کم میرے لباس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال لو کہ میں ٹھیک لگ رہا ہوں کہ نہیں.....لیکن

تمہارے خیال میں یہ کام صرف ملازمین کرتے ہیں اور تم میری بیوی ہو۔تمہیں یہ سب سُوٹ نہیں کرتا۔تم اس وقت سوئی ہوتی تھی جب میں ناشتہ کرتا اور دفتر جاتا تھا۔ جب میری واپسی ہوتی تو میں چاہتا تھا کہ تم میرا استقبال کرو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر دو۔ہم دونوں سکون سے بیٹھ کر چائے پئیں اور اپنے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھیں لیکن ایسا بھی نہ ہو سکا۔ کیونکہ تم شام کو لیڈیز کلب گئی ہوتی تھی۔''

''آپ کو تو چڑ ہے میری سوشل ایکٹیویٹیز سے۔شادی ہوگئی اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ گھر میں بند ہو جاؤ۔سوسائٹی میں move بھی تو کرنا ہے۔اور دوسری بات یہ ہے کہ میں گھر میں بیٹھ کے کروں کیا؟ تم بھی تو ریٹائرمنٹ کے بعد ہی گھر بیٹھے ہو۔ جوانی میں کہاں تمہارے پاس میرے لئے وقت تھا۔ چھٹیاں آتی تھیں تو خود ہی گھومنے پھرنے نکل جاتے تھے۔ سارا الزام مجھ پہ نہ لگاؤ۔ جب میں تمہیں پہلے دن سے پسند نہیں تھی تو اپنی پسند کی شادی کر لینی تھی۔ پوری زندگی تمہیں مجھ سے شکوے رہے ہیں اب جب چل چلاؤ کا وقت ہے۔تمہیں اب بھی تنقید ہی سُوجھ رہی ہے۔''سعدیہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دینا شروع کیا۔معاملہ اب سنگین ہونے لگا تھا۔ ہمیشہ کی طرح بیوی کو برستا دیکھ کے خاموش ہونے کے بجائے اس نے اسی تحمل کے ساتھ بات جاری رکھی۔

''دیکھو میرا کام تم پر تنقید نہیں ہے۔اب اس عمر میں تم کہاں خود کو بدلو گی اور وہ بھی میرے لئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں ان چوالیس سالوں میں خوش رکھنے میں ناکام رہا ہوں۔ دنیا کی نظر میں میں ایک انتہائی کامیاب آدمی ہوں جس کی ملازمت کا کیریئر بہترین رہا۔ بچے میری زندگی میں اسٹیبلش ہو گئے اور اب اپنے اپنے گھر والے ہیں۔ مجھے پوری زندگی پیسے کی کمی کا سامنا نہیں رہا کیونکہ میں اعتدال پسند ہوں اللہ کا مجھ پہ خاص کرم رہا۔ میں نے جوانی ہی میں حج کا فریضہ ادا کیا اور کئی ملکوں کے سفر کئے۔ اچھے وقتوں میں وراثتی جائیداد سے یہ گھر بنا لیا جس میں میرے تینوں بیٹے اپنی اولاد کے ساتھ آرام سے رہ سکتے ہیں۔ اپنی گاڑی ہے۔ بڑھاپے میں بھی میں اور تم اپنے بچوں کے محتاج نہیں ہیں۔اگر میں نہیں بھی رہتا تو تم اپنی باقی زندگی بہت آرام سے گزار سکتی ہو۔لیکن ایک خاص بات ہے.....''اس نے اپنا جملہ ادھورہ چھوڑ دیا۔ سعدیہ اب اس بکواس سے خاصی بور ہو رہی تھی۔

''اب کہہ بھی چکیں..... مجھے نیند آ رہی ہے۔ڈراما تو نکل گیا ہے۔اب کل دوپہر میں ریپیٹ ٹیلی کاسٹ میں دیکھوں گی۔''

''یہ ہے وہ خاص بات۔ نہ تمہارے پاس میری اس بکواس کا وقت ہے..... نہ میرے پاس تمہاری چھچھوری گفتگو کے لئے وقت۔اور رہی بات تم سے جان چھڑوانے کی وہ میں نے اس وقت سوچا تھا تب ذیشان اور سلمان دونوں چھوٹے تھے۔ میں نے تمہیں طلاق دے کر دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا

تھا۔ بچے عدالت سے واپس لے لیتا۔لیکن تم نے مجھے ارسلان کے آنے کا بتا دیا اور مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔''اس کا جواب سنتے ہی سعدیہ کو تو یوں پتنگے ہی لگ گئے تھے۔

''ارادہ بدلا کیوں؟ کر لیتے دوسری شادی۔ ہو جاتی آپ کی خواہش پوری۔احساس نام کی چیز تو تمہارے اندر ہے نہیں۔لوگ پروموشنز کیسے لیتے ہیں،تعلقات کیسے بناتے ہیں یہ تمہیں کبھی نہ آیا۔اور تم کون ہوتے ہو میری گفتگو کو چھچھورا کہنے والے؟ میری تو ہر بات تمہیں بری لگتی ہے۔اگر میں اتنی ہی بری تھی تو چھوڑ دیتے نا مجھے..... لیکن نہیں بھئی..... یہ نہیں کرنا۔صرف سنا سنا کر اذیت دینی تمہیں آتی ہے؟''اب سعدیہ کی آواز گونجنے لگی۔

''تم اپنی آواز دھیمی کرو گی یا نہیں؟ تم شادی کی رات سے اسی طرح بدتمیزی کرتی آ رہی ہو اور رات کے اس پہر تمہاری آواز کمرے سے باہر جائے گی تو بیٹے بہو کو اتنا عجیب نہیں لگے گا جتنا ہمارے پوتا پوتی کو لگے گا۔''سجاد اب پھر غصے میں بڑبڑانے لگا۔

''تم جیسی عورت سے بات کرنا ہی فضول ہے جو صرف بات کا بتنگڑ بنانا جانتی ہو۔تم کسی کے جذبات نہیں سمجھ سکتی۔ تمہیں کوئی مسئلہ ہو تو ساری دنیا کو عذاب ڈال دیتی ہو لیکن میں تم سے صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ صرف باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تمام باتیں جو پچھلے چوالیس سال میں تم سے نہیں کیں.....اپنے دل کی باتیں..... میں ان باتوں کو دل میں رکھ کر نہیں مرنا چاہتا۔''

تنگ آ کر اس نے کروٹ لی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند کوسوں دور تھی اور اچانک کہیں دور سے ایک کھنکتی ہوئی آواز آئی۔

''سجاد! یار یہ تم بیوی بچوں کے ہوتے ہوئے میرے ساتھ محبت کیسے نبھا لیتے ہو۔سچ میں اگر میری شادی ہو گئی تو میرا نہیں خیال کہ میں تمہارے ساتھ محبت نبھا سکوں گی۔''اسی لمحے اس نے اپنی بھینچی ہوئی آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرے میں اندھیرا تھا اور اسے ایک بھینی بھینی جانی پہچانی خوشبو محسوس ہونے لگی اور وہ بڑبڑانے لگا۔

''مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ حنا..... میں اب اور جینا نہیں چاہتا۔تمہارے بعد زندگی میں کوئی مزا نہیں ہے۔''یہ کہتے ہوئے اس نے کروٹ تبدیل کی تو وہاں نہ تو کوئی آواز تھی نہ ہی کوئی خوشبو۔

بس یہی سوچ کے راتوں کو میں نہیں سوتا/ نیند آئی تو تیرا خواب چلا آئے گا/ پھر صبح جب کھلیں گی آنکھیں میری/تُو بھی صبح کے تارے سا چلا جائے گا۔

یہ کوئی پہلی بار تھوڑی تھا کہ سجاد کوئی سپنا دیکھ رہا ہو لیکن حنا تو اس کے لئے ایک سپنا ہی تھی۔انسان بھی بہت عجیب ہے جس کے ساتھ صرف چند گھنٹے کی رفاقت میسر آئی اس کے اثرات پوری زندگی پہ بھاری ہو گئے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔کہیں دور مسجد سے فجر کی اذان آ رہی تھی۔ وہ آرام سے اٹھا اور وضو کرنے چلا گیا۔

کمرے میں واپس آ کر وہ نماز پڑھنے لگا۔ دعا مانگتے ہوئے اسے حنا کا خیال پھر سے آیا اس کی مغفرت کی دعا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انسان جیتے جی قدر نہیں کرتا جب مر جاتا ہے تو قدر آ جاتی ہے۔ وہ پوری زندگی میں کبھی بھی باقاعدہ نمازی نہیں تھا کبھی جب چھوٹا تھا تو ماں زبردستی سب بچوں کو نماز پڑھاتی تھی۔ بڑے ہو کر زندگی کی رنگینیوں میں کھو گیا۔ صرف جمعہ کی نماز پڑھ لیتا تھا۔ سعدیہ نے کبھی بچوں کو نماز کا نہیں کہا تو اس کو کیسے کہتی؟ حنا اکثر اسے یاد کرواتی کہ نماز پڑھا کرو اور کچھ نہیں تو رب العزت کی دی ہوئی نعمتوں کا شکرانہ ادا کرنے کے طور پر ہی پڑھا لو۔

حنا اس کے ساتھ گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھتی تھی۔ پُر اعتماد اور خوش شکل۔ اس زمانے میں وہ ہاسٹل میں رہتا تھا اور وہاں انگریزی ادب میں ایم اے کر رہا تھا۔ سیشن شروع ہونے کے پہلے ہی ہفتے ان کی دوستی ہو گئی۔ وہ ہمیشہ ساتھ ساتھ دِکھتے تھے کہ ان کے کلاس فیلو ایک کی خبر دوسرے سے دریافت کرتے۔ پہلے سال کے سیشن کے اختتام پر چھٹیاں ہوئیں تو سجاد واپس اسلام آباد آ گیا۔ اس وقت اس نے محسوس کیا کہ وہ حنا کے بغیر کچھ ادھورا ہے۔ واپسی پر اس نے پہلے ہی دن حنا کو اپنی دِلی کیفیت سے آگاہ کر دیا۔ اس نے حنا سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے کیونکہ حنا کا تمتماتا ہوا مسکراتا چہرہ ہی اس کی رضامندی کا گواہ تھا۔ دن پر لگا کر اُڑ رہے تھے اور کالج کے سیشن کا آخری دن آن پہنچا۔

''آج تم میرے ساتھ گھر چلو۔ میں تمہیں اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتی ہوں۔ میں نے امی کو بتا دیا ہے لیکن وعدہ کرو تم میرے خوابوں کے رستے میں نہیں آؤ گے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں لیکچرر شپ کرنا چاہتی ہوں۔ ایک ریسرچ سکالر بننا میری زندگی کا مقصد ہے۔'' سجاد کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ خوشی خوشی اس کے گھر چلا گیا۔

کرشن نگر کی مضافاتی گلیوں میں سرخ اینٹوں والا دس مرلے کے قدیمی گھر کی نچلی منزل پر حنا کے چچا اپنے خاندان کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ تنگ ڈیوڑھی عبور کر کے قدرے کشادہ سیڑھیاں آئیں جو پہلی منزل کے صحن میں کھلتی تھیں اور صحن کی بھرپور روشنی آنکھوں کو چکاچوند کر دیتی تھی۔ صحن کے اردگرد دالان اور کمرے تھے۔ حنا کا چھوٹا بھائی صحن میں کرکٹ کی پریکٹس کر رہا تھا جس کی عمر دس بارہ سال تھی۔ ایک عام سا متوسط طبقے کا گھر جہاں کی صفائی ستھرائی اس گھر کی منتظمہ کے سگھڑ ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ حنا کے چھوٹے بہن بھائی بھی طالب علم ہی تھے اور مختلف سکول کالجوں میں پڑھتے تھے۔ گھر کے افراد کی بے تکلفی اور محبت سجاد کو متاثر کر رہی تھی کیونکہ اس کے اپنے گھر کا ماحول کافی خشک تھا۔

''جناب ایم اے کے بعد میرا ارادہ ہے کہ مقابلے کا امتحان دیا جائے۔ میرے والد بیوروکریٹ ہیں۔ اس وقت وہ حکومتِ سندھ میں ہوم سیکرٹری ہیں۔ ہم سرگودھا کے رہنے والے ہیں۔ وہاں ہماری زرعی

اراضی ہے۔ دادا فوج میں تھے۔'' وہ اپنے تئیں حنا کے گھر والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

امتحان آئے اور ختم ہو گئے اور وہ واپس اسلام آباد آ گیا۔ اس وقت اسلام آباد کو بسے محض دس سال ہی ہوئے تھے۔ ابھی شہر ویران ہی تھا۔ اس نے حنا سے وعدہ کیا تھا کہ اسے روز خط لکھے گا۔ اس نے اسلام آباد آتے ہی مقابلے کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ ساتھ میں وہ ماں کو بھی قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اور ماں اسے یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ اگر اس کا رشتہ خاندان میں نہ کیا تو اس کی بہنوں کے رشتے خاندان میں کیسے ہونگے۔ اور اگر وہ لوگ ان کے سٹیٹس کے نہ ہوئے تو.....؟ وہ بہت مشکل سے ماں کو راضی کر کے لاہور لے گیا۔ کرشن نگر یوں بھی متوسط علاقہ ہے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے ماں کا موڈ خراب ہو گیا۔

''اب تم ان بھول بھلیوں والی گلیوں میں لے آئے ہو کہ بندہ دوسری بار نہ آ سکے۔''

(اب آگے کی کہانی سجاد کی زبانی)

میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر ہم لوگ چاہتے کیا ہیں؟ ہمیں رشتے کرتے ہوئے طبقاتی فرق، حُسن، نمود و نمائش ہی کیوں نظر آتے ہیں جبکہ کردار، اقدار اور بحیثیت انسان ہونا ہمیشہ پسِ پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ لڑکی یا اس کا گھرانہ اگر آپ کے معیار کے مطابق نہیں ہے تو آپ انکار تو کرتے ہیں ہی لیکن دوسروں کی دلآزاری کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ اگر لڑکی آپ کے بیٹے کی پسند ہو تو کیا ضروری ہے کہ لازماً وہ لڑکی حرافہ ہی ہو گی جس نے آپ کے معصوم بیٹے کو اپنے چُنگل میں پھنسا لیا ہے۔ اور اس بات کا آپ برملا اظہار اس کے منہ پر کر دیتے ہیں۔ کچھ یہی سلوک میری ماں نے بھی حنا کے ساتھ کیا۔ حنا کا کیا تھا، وہ تو دوسرے کمرے نظریں جھکائے اپنے اوپر الزام تراشی سن رہی تھی لیکن اس کی ماں ہکا بکا ہماری طرف دیکھ رہی تھی کہ چند مہینے پہلے تو یہ لڑکا بہت ملنساری سے مل کے گیا ہے اب اس کی ماں ایسے کیوں کر رہی ہے؟ اب پچھلے کوئی اٹھارہ بیس سالوں سے زمانہ بہت ایڈوانس ہو گیا ہے۔ لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ پیسہ آ گیا ہے لیکن یہ سن ستر کی بات تھی زندگی ابھی پُرتعیش نہیں ہوئی تھی لیکن میری ماں اپنے خاندان، امارت اور بیوروکریسی کا رعب ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی..... وہ بھی سرکاری کالج کے لائبریرین کی معمولی تعلیم یافتہ بیوی پر۔ میں نے ماں کو روکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا آخر اٹھا اور حنا کی والدہ کو اللہ حافظ کہہ کر ماں کو ان کے گھر سے لے گیا۔ میں نے تمام راستے ماں سے کوئی بات نہ کی۔ ہم جی او آر اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں پہنچے جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے تو ماں نے مجھے خاندانی اقدار، اچھے مستقبل وغیرہ پر مفصل لیکچر دیا کہ وہ میری شادی وہیں کریں گی جہاں انہیں میرا مستقبل تابناک نظر آئے گا۔ اگلے روز اسلام آباد جانے سے پہلے میں نے حنا کے نام ایک معذرتی خط لکھا اور اسے جواب دینے کی ہدایت کی۔

اس خط کا کبھی جواب نہ آیا۔ ہر روز بہت امید کے ساتھ میں اپنی ڈاک دیکھتا۔ گھر کے ملازموں کو

بھی کہہ رکھا تھا کہ میری ڈاک فوراً مجھ تک پہنچائی جائے اور کسی اور کے حوالے نہ کی جائے۔لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ چند ہفتے بعد یہ ترکیب نکالی کہ ہر تیسرے دن حنا کو خط لکھا جائے۔لیکن یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا۔اسی طرح چھ مہینے گزر گئے اور میرے امتحان قریب آ گئے۔ مجھے راولپنڈی میں ایک انگریزی اخبار میں پروف ریڈنگ کی ملازمت مل گئی تھی اور میں یہ نوکری صرف وقت گزاری کے لئے کر رہا تھا۔ بالآخر مقابلے کے امتحان کا نتیجہ آ گیا۔میری پورے پاکستان میں اٹھائیسویں پوزیشن آئی تھی۔امید واثق تھی کہ فارن سروس کا چانس بنے گا۔ میں ٹریننگ کیلئے کراچی گیا تو ابا سے ملاقات ہوئی تو ان سے بھی اس موضوع پر بات کی۔ان کی گفتگو سے لگتا تھا کہ امی نے ان سے اس بارے میں تفصیل سے بات کر رکھی ہے۔ان کی طرف سے امید افزاء جواب نہ پا کر میں مایوس ہو گیا۔ ہمارے زمانے میں لڑکی کو بھگانے کا اتنا رواج نہ ہوا تھا اور یہ بات جتنی معیوب آج ہے اس سے کہیں زیادہ معیوب تب سمجھی جاتی تھی۔ یہ خیال دل میں آیا تو خود پر اتنی لعن طعن کی کہ ارادہ بدلنا پڑا۔

ٹریننگ کے بعد مجھے فارن سروس پہ برما بھیج دیا گیا۔ میں نے کبھی زندگی میں سیاحت نہیں کی تھی۔کبھی فرصت ہی نہ ملی۔اب اللہ کی ذات نے موقع دیا تو میں خوشی سے اپنی نئی منزل کی جانب چل پڑا۔ حنا کو میں کبھی نہیں بھولا۔اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتا رہا کہ اس کے خاندان والے کب تک اسے بٹھائے رکھیں گے اس کی شادی ان تین سالوں میں ہو چکی ہوگی۔اب کیا ہو سکتا ہے اللہ اسے جہاں رکھے خوش رکھے۔دو سال بعد میں پاکستان لوٹ کے آیا تو والدین کو میرے سر پہ سہرہ سجانے کا چاؤ چڑھ گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میری خالہ زاد سعدیہ سے میری شادی ہو رہی ہے۔ میرے خالو بریگیڈیئر تھے اور ان کی تین بیٹیاں تھیں۔انتہائی مغرور اور نک چڑھی۔ پتہ نہیں میرے والدین نے کیا سوچ کے یہ رشتہ طے کیا تھا۔خیر شادی ہو گئی لیکن سعدیہ اور میں ایک نہ ہو سکے۔ زندگی کے چوالیس سال ساتھ گزارنے کے باوجود ہماری ایک دوسرے کے لئے حیثیت ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پہ کھڑے دو مسافروں سے زیادہ نہ ہو سکی جو اپنی اپنی ریل گاڑی کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔

کچھ دنوں میں یہ تاثیر ہوتی کہ وہ وقت کے تابع نہیں ہوتے، ہماری دلی کیفیت کے مطابق رہتے ہیں۔ کچھ ایسا میرے ساتھ بھی ہوا۔ برما کی خوبصورتی نے میرے تخیل کو جلا بخشی اور دفتر کے علاوہ میرا باقی وقت حنا کو سوچتے ہوئے گزرتا۔ وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا اور تین سال گزر گئے اور میں چھٹیوں پر گھر آیا تو میرے آتے ہی والدین نے شادی کی تاریخ مقرر کر دی جس کو میں پچھلے ایک ڈیڑھ سال سے ٹالتا آ رہا تھا۔لیکن دل میں اُمنگ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔اپنی ہونے والی بیوی کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھا اور یہ کچھ کچھ باعثِ تکلیف بھی تھا۔ میں بہت باتونی تو نہیں تھا، کچھ قریبی دوست میرے مزاج سے واقف تھے، جن سے خوب گپ شپ لگتی۔ان میں حنا بھی تھی۔ دل میں خوشی کی جگہ کچھ وسوسے جنم لے رہے تھے۔ پتہ

نہیں میرے ساتھ بیوی کی بنے گی یا نہیں؟..... ماں اور ان کی بھانجی میں سلوک رہ پائے گا یا نہیں؟؟ میرا تخیل اور میری ذاتی زندگی کس حد تک آزاد رہ پائے گی؟؟؟ وغیرہ وغیرہ۔

اور کچھ ہوا یا نہیں.....شادی ہو گئی جس کے سائیڈ افیکٹ آج تک بھگت رہا ہوں۔شادی سے پہلے ہی میری پوسٹنگ وزارتِ داخلہ میں ہو چکی تھی۔اب کہیں جانے کا سوال ہی کیا تھا۔ چپ چاپ شادی شدہ زندگی گزارنے لگا۔ زندگی جینا کچھ اور ہے اور گزارنا کچھ اور۔سعدیہ کے بارے میں جتنے بھی خدشات تھے ساتھ رہنے کے بعد کئی گنا اضافہ کے ساتھ سامنے آئے۔اگرچہ کہ اس وقت رابطے کے ذرائع محدود تھے لیکن وہ میری اور میرے گھر کی تمام رپورٹ خالہ کو دینے کی عادی تھی۔اسے بارہا منع کیا لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔سختی سے بھی کہہ کے دیکھ لیا لیکن ہنوز وہ آج تک باز نہیں آئی۔اب خالہ تو حیات نہیں ہیں لیکن اپنی دونوں بہنوں سے سارا کچھ ڈسکس کرنا اپنا اولین فرض سمجھتی ہے۔ کچھ یہی حال میری دونوں سالیوں کا بھی ہے۔ان کے گھر کی پل پل کی خبر ہمارے گھر پہنچائی جاتی ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ میری بیٹی نہیں ہے نہیں تو وہ بھی اس گھٹیا عادت کا شکار ہوتی۔امی اس رویے پر کُڑھا کرتی تھیں لیکن وہ کر کچھ نہیں سکتی تھیں۔ پتہ نہیں بیٹیوں کی تربیت کرتے ہوئے ہم یہ معمولی بات نظر انداز کیوں کر دیتے ہیں جو بعد میں گھر برباد ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ خالہ سے جب بھی سعدیہ کے رویے پر بات ہوئی ان کا موقف یہی ہوتا کہ ابھی بچپنا ہے بچوں کے بعد میچور ہو جائے گی۔ ماؤں کا یہ موقف ان گنت مردوں کی پوری زندگی اجیرن رکھتا ہے۔

یوں تو پہلی اولاد والدین کو زیادہ عزیز ہوتی ہے اسی طرح میرا بڑا بیٹا ذیشان مجھے بہت عزیز ہے۔وہ اس وقت چار برس کا تھا اور میں اس کے لئے چند رنگین تصویروں والی کتابیں ایک دکان سے خرید رہا تھا کہ کسی نے میرا نام پکارا۔ میں نے چونک کر دیکھا تو عادل تھا میرا کلاس فیلو۔ میں بہت خوشی اور ملنساری سے اسے ملا۔وہ گورڈن کالج راولپنڈی میں لیکچرار تھا۔اوکاڑہ سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ہم نے ایک دوسرے کے پتے اور ٹیلیفون نمبر نوٹ کئے اور پھر سے ملنے کے وعدے بھی کئے۔ ہماری کوشش ہوتی کہ مہینے میں کم از کم ایک چھٹی کا دن اپنی مرضی کا گزارتے۔کبھی کسی ادبی محفل میں چلے جاتے.....کبھی کسی ریستوران میں گپ شپ لگاتے۔کبھی شہر کے مضافاتی علاقوں میں ٹریکنگ کے لئے نکل جاتے۔ایک دن عادل کا فون آیا کہ لاہور سے ہمارے ایک کلاس فیلو نے بذریعہ ٹیلیفون ہمیں کالج کی المنائی میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ مجھے سوچ کے ہی سرور آ گیا کہ تعلیم ختم ہو جانے کے دس سال بعد اپنے کلاس فیلوز سے ملاقات ہوگی۔دل کے ایک کونے میں امید کی ایک کرن یہ بھی جاگی کہ شاید حنا سے ملاقات ہو جائے.....شاید وہ بھی المنائی میں آئے۔

اسی امید پہ دفتر میں چھٹی کی درخواست دے دی اور مقررہ وقت پر لاہور چلا آیا۔المنائی کا پنڈال اوول میں سجا تھا۔گورنمنٹ کالج کے گیٹ میں داخل ہوتے ساتھ ہی میں اپنے حال سے بیگانہ ہو گیا.....دس

سال پرانا وقت لوٹ آیا۔ روشنی سے بقعۂ نور بنی عمارت اور سامنے گراؤنڈ میں روشن شامیانے۔ عادل اور میں اپنا پرانا وقت یاد کرتے ہوئے شامیانے میں داخل ہوئے تو میری نظر سب سے پہلے کپتان پہ پڑی۔ کپتان اشفاق ہم سے ایک سال سینئر اور کالج کی کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ میں بہت تپاک سے اسے ملا اور پھر اساتذہ کی جانب گیا تو وہاں مجھے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی..... وہ جانی پہچانی آواز حنا کے علاوہ کس کی ہوسکتی تھی۔ ایک لمحے کے لئے یوں لگا کہ گویا دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا ہو۔ ہاں..... وہ حنا ہی تھی..... ویسی ہی خوبصورت..... آنکھوں میں ویسی ہی چمک..... یوں لگ رہا تھا کہ جیسے بیچ کے دس سال اسے چھوئے بنا ہی گزر گئے ہوں۔ میں فوراً اس کے سامنے جا کھڑا ہوا وہ چونک گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''آخر تم آ ہی گئے۔'' اس کی آنسو بھری آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ میرا دل اس فنکشن سے اُچاٹ ہوگیا۔ میں جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ پورا ہوگیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور پنڈال سے باہر نکل گیا۔ فنکشن میں کیا ہوتا رہا..... اساتذہ اور طلبہ کون کون سے واقعات سناتے رہے..... ہمیں آوازیں تو آتی رہیں لیکن وہاں ان سب کو سننا کون کافر چاہتا تھا۔ اس کا ہاتھ تھامے میں برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تو اس کے وجود کا اضطراب مجھ پر طاری رہا۔ دھیرے دھیرے اس نے بولنا شروع کیا۔ وہ سوال پوچھتی گئی اور میں جواب دیتا رہا۔ والدین، بہن بھائی، نوکری، شادی، بیوی، بچے اور آخر میں مَیں..... پتہ نہیں ان دس سالوں میں کتنا عرصہ اس نے صرف میرے بارے میں سوچتے گزار دیا۔ اور جب میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے ان دس سالوں میں کیا کیا؟ تو اس نے جواب اس طرح دیا کہ جیسے اس کی زندگی کے دس سال نہیں دس دن گزرے ہوں۔

میں ایک کالج میں لیکچرار ہوں سجاد۔ بہنوں کی شادی ہوگئی ہے۔ مجھ سے بڑا بھائی رضا ابوظہبی میں ایک ریفائنری میں کام کرتا ہے۔ چھوٹا بھائی بی کام کر رہا ہے۔ ابو اور چچا اپنے اسی پرانے کاروبار میں مصروف ہیں۔ ہم نے کرشن نگر والا گھر بیچ دیا ہے۔ اب ہم علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ عید پر رضا آ رہا ہے۔ چچا کی بیٹی سے اس کی شادی ہو جائے گی۔'' میں یہ سننے کے لئے منتظر تھا کہ کب وہ اپنے بارے میں بات کرے گی لیکن وہ خاموش ہوگئی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ مجھ سے اپنے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ ڈھیٹ بن کر میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

اور تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا حنا..... تمہاری شادی کہاں ہوئی؟ تمہارا شوہر کیا کرتا ہے؟ کتنے بچے ہیں؟ کہاں رہتی ہو؟'' اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑے وقفے کے بعد بولی۔

''کیا تمہیں لگتا تھا کہ میں شادی کرلوں گی؟ میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔'' اب پریشان ہونے کی باری میری تھی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا حنا؟ زندگی ایسے نہیں گزرتی۔ کیا تم اب بھی میرا انتظار کر رہی ہو؟'' وہ مسکرائی اور بولی۔

''میرا انتظار تو کب کا ختم ہو چکا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تم سے محبت کی لیکن تم مجھے کبھی میسر ہی نہ آئے تو مجھے تمہاری محبت کے احساس سے محبت ہوگئی۔ میں نے تمہیں محسوس کیا ہے سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، تہواروں پہ..... ہر لمحہ.....'' وہ خاموش ہوگئی۔ اچانک ہی ہمارے ڈپارٹمنٹ سے گانا الاپ کرنے کی آواز آئی۔

جنہیاں تن میرے لگیاں تینوں اک لگے تے تُو جانے
غلام فرید دل او تھے دیئے جتھے اگلا قدر وی جانے

اس آواز سے ہم دونوں بہت اچھی طرح واقف تھے۔ یہ مبین تھا ہم سے کافی سینئیر..... اس کی آواز پر ہمیشہ المنائی کا فنکشن ختم ہوا کرتا تھا۔ مجھے حنا کی صحبت میں وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا لیکن میں ابھی بھی حنا سے ملنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ ہم یہیں بیٹھے رہیں۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔

''کیا تم مجھے کل مل سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''سجاد، تم نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ کل جمعہ ہے۔ صبح ملتے ہیں..... وہیں جہاں ہم اپنی دوپہریں گزارا کرتے تھے۔ باغِ جناح میں لائبریری کے سامنے والی پہاڑی پہ۔ دیکھو انکار مت کرنا..... قسمت سے ملے ہو۔ ابھی تمہیں ٹھیک سے دیکھا نہیں کہ وقت ختم ہوگیا۔ میں صبح گیارہ بجے آجاؤں گی۔ تم بھی پہنچ جانا۔'' اس نے اپنے اور میرے دل کی بات کہہ دی۔

صبح مقررہ وقت سے چند منٹ قبل میں مقررہ جگہ پر پہنچ گیا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ باغِ جناح ویسا ہی تھا جیسا دس سال پہلے تھا۔ یہاں کی خوبصورتی دیکھ کر یقین آتا ہے کہ لاہور کو باغوں کا شہر کیوں کہتے ہیں۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا وہ نہ آئی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ تقریباً چالیس منٹ بعد کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دیکھا تو سورج کی تمازت سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ وارد ہوئی۔ وہ آج بھی اتنی ہی اچھی لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے صحرا میں بارش کا پہلا قطرہ۔

''یہ سچ ہے کہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہوں، تم میری زندگی کا محور ہو۔ آج تک میں تمہیں بھول نہیں سکا۔ مجھے معاف کردو کہ میں اس وقت کوئی سٹینڈ نہیں لے سکا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے دل نے آج تک تمہارے علاوہ کسی کو قبول نہیں کیا۔ یہاں تک کہ شادی کے چھ سال ساتھ گزارنے کے باوجود میں نے دل سے سعدیہ کو قبول نہیں کیا۔ مجھے تمہاری محبت کے ساتھ ہی جینا ہے۔ تم میری امید ہو۔ مجھے اس بار ناکام نہیں کرو..... میں بکھر جاؤں گا۔" وہ خاموشی سے میری بات سُن رہی تھی مجھے لگا کہ وہ انکار کردے

گی۔ دفعتاً اس نے اپنے ہاتھ میں میرا چہرہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''سجاد! عورت اپنا محبوب کبھی نہیں بدلتی۔ یہ میری قوتِ ارادی ہے کہ میں نے کسی کو قبول نہیں کیا۔ تم میری زندگی کا سب سے بڑا سچ ہو۔ میں تمہیں اپنی محبت کی حرارت سے زندہ رکھونگی۔''

فروری کی خوشگوار دھوپ میں مَیں کھڑا ہوا اور سامنے گھاس پر لیٹ گیا۔ میں اس دھوپ کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا، آنکھیں موندے سو نہیں رہا تھا لیکن میں اس کی موجودگی سے باخبر تھا۔ گھاس، بہار کی آمد کی خوشبو، اس کے سینٹ کی مہک اور سب سے بڑھ کر عورت کے اپنے جسم کی خوشبو۔ وہ میرے قریب بیٹھی مجھے محبت بھری نظروں سے تک رہی تھی۔ اس وقت ہم دونوں دنیا سے بیگانے وہاں نہ جانے کتنی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دن وقت اور حالات کے تابع نہیں ہوتے، وہ بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔ مجھے نہیں پتا اس کیفیت میں کتنا وقت گزرا۔ میں ایک سرُور میں تھا جب اس نے جانے کی اجازت چاہی میں نے وقت دیکھا تو ہمیں وہاں بیٹھے چار گھنٹے سے زائد وقت ہو چکا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے رابطہ کے لئے پتے نوٹ کئے اور اپنے اپنے راستے نکل گئے۔

میں اسی دن اسلام آباد واپس آ گیا۔ اگلے دن میں نے دفتر سے اس کو ایک عرصے بعد خط لکھا اور جواب دینے کی تاکید کی۔ تین دن کے بعد خط کا جواب میرے میز پر تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ہم ہر دو تین دن بعد ایک دوسرے کو خط لکھنے لگے اور رابطہ مستقل کی بنیادوں پر ہونے لگا۔ حنا سے رابطے کے بعد میں بیوی سے کچھ کٹ سا گیا۔ ایک عارضی سا شرعی تعلق جو تھا اسے بھی روا رکھنے سے گریز کرنے لگا۔ اس کے بعد سعدیہ سے میری نوک جھونک مستقل بنیادوں پر ہونے لگی۔ میں اس کو وقت دینا چاہتا تھا لیکن میرا دل راضی نہ ہو سکا۔ میں کیا سوچتا ہوں اور کیا محسوس کرتا ہوں سعدیہ اس معاملے میں دماغ اور دل کے بجائے زبان کا وافر استعمال کرنے لگی۔ لیکن وہ بیوقوف عورت اس بات سے بے خبر تھی کہ جب کوئی عورت مرد کے دل سے اترتی ہے تو وہ لاتعلق ہو جاتا ہے۔ انہی دنوں میرا چھوٹا بیٹا سفیان پیدا ہوا۔ سب کی نظروں میں میری فیملی مکمل ہو چکی تھی جبکہ خود کی نظر میں مَیں ادھورا تھا۔

گاڑی سٹارٹ ہونے کی آواز سے میں قدرے چونکا۔ نظر گھڑی پر گئی، صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ لازمی بات ہے کہ ذیشان بچوں کو سکول چھوڑنے جا رہا ہے۔ میں اب تک نماز کے بعد صوفے پہ ہی بیٹھا تھا۔ جانے کب آنکھ لگی اور بیتی ہوئی زندگی فلم کی طرح چلنے لگی اور میں جاگتی آنکھوں سے سب کچھ اپنی آنکھوں سے محسوس کرنے لگا۔ بستر پر سعدیہ بے سُود سوئی پڑی تھی۔ پوری زندگی میں نے اپنی بیوی کو کبھی صبح سویرے اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس بارے میں بات کرنا تو بالکل ہی فضول تھا۔

وہ ہمت کر کے کمرے سے نکلا اور ٹی وی لاؤنج میں جا بیٹھا کیونکہ اندر سعدیہ سو رہی تھی۔ اتنے

میں ذیشان بچوں کو سکول چھوڑتا ہوا اندر داخل ہوا اور مجھ سے استفسار کرنے لگا۔

''ڈیڈی! رات آپ کی مما سے بحث ہو رہی تھی؟'' میں قدرے جھینپ گیا کہ اب اولاد کے سامنے کیا کہوں۔

''یار! وہ مجھے بولنے ہی کب دیتی ہے۔ کچھ کہہ دو تو اونچا بول کر سچا بننے کی کوشش کرتی ہے۔''

''ڈیڈی آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے مجھے پتہ نہیں۔ بچپن سے یہ ڈراما دیکھتے آ رہے ہیں۔ آپ منہ پر تنقید کر دیتے ہیں۔ مجھے دیکھیں، میں نے اپنا منہ بند رکھا ہوا ہے۔ اور وہ بھی اس لئے کہ میری بیٹی ہے۔''

''میں تمہیں کیا کہوں.....؟ تم اور میں تو ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ثوبیہ بھی تو تمہاری ماں کا پرتو ہے۔'' میری بات کے جواب میں ذیشان ایک ٹھنڈی آہ بھر کے بولا ۔ ''Daddy!you know,sometimes we have to adjust whether I love my wife or not but now this ridiculous married life has become responsibility for my children."

''تم ٹھیک کہتے ہو، پوری زندگی نہ نگل سکا اور نہ اُگل سکا۔ بس بچوں کی طرف ہم دونوں متوجہ رہے۔ ایک دوسرے کی فیلینگ کا خیال ہی نہیں کیا۔ اور اب جب میں دل کی بات تمہاری ماں سے کرنا چاہتا ہوں تو وہ میری بات کو اہمیت نہیں دیتی۔ میرے دل کی باتیں سننا نہیں چاہتی، اگرچہ کہ دوسرے کو سننا سکھ کا باعث ہے۔''

آج شاید میرے بیٹے کا دل بھی بھرا ہوا تھا۔ میری بہو ثوبیہ خالصتاً سعدیہ کی پسند تھی اور ہوتی کیوں نہ.....اس کی سگی بھانجی جو تھی۔

''لیکن ڈیڈی رات آپ لوگ بحث کیوں کر رہے تھے؟'' اتنے میں ملازم چائے لے آیا۔

''او یار! اب ہم دونوں مل کے باتیں کر رہے ہیں..... نہ ہم نے ٹی وی آن کیا، نہ موبائل دیکھا.....بس ایک دوسرے سے بات کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے جو دل میں ہے وہ ڈسکس کر رہے ہیں یہ تمہاری ماں سے نہیں ہوتا۔ اس کے پاس بکواس ڈراموں کے لئے وقت ہے میرے لئے نہیں ہے۔ اب بندہ اس بات پہ بولے بھی نا۔ یار چوالیس سال شادی کو ہو گئے ہیں، میرے دل میں بہت باتیں ہیں جو میں مرنے سے پہلے کرنا چاہتا ہوں اور بہتر ہے کہ میں اپنے دل کی بات اپنے جیون ساتھی سے کروں مگر ٹف ہے اس عورت پہ کہ اس کے پاس میرے علاوہ سب کے لئے وقت ہے۔''

میرے اس طرح کے شکوے سے ذیشان کو محسوس ہوا کہ عمر کے آخری دور میں وہ بیٹے کے سامنے بیٹھا شکوہ کر رہا ہے۔ اس نے طے کیا کہ وہ اپنے باپ کی دل کی بات سنے گا۔ اس میں حرج بھی نہیں ہے۔ ڈیڈی خاموش طبیعت بندے ہیں۔ اس عمر میں اگر ان کے ساتھ زیادہ وقت گزار بھی لیا تو کیا ہے۔ وہ نوکری

میں اتنا مصروف تھا کہ کبھی باپ کی تنہائی کا خیال نہ آیا۔ اُلٹا ماں کے ہی شکوے سنتا رہتا کہ ڈیڈی کی وجہ سے ان کی زندگی اچھی نہیں گزری۔ وہ یہ شکوے شکایتیں بچپن سے سنتا آ رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی ماں سے یہ الفاظ بھی سنے تھے کہ تمہارا کسی اور عورت کے ساتھ کوئی چکر ہے جو تم گھر نہیں ٹکتے وغیرہ وغیرہ۔

''ڈیڈی! اگر آپ شام کو فری ہوں تو ہم دونوں ذرا واک پہ چلیں، آپ بھی فریش ہو جائیں گے اور آپ مما کو چھوڑیں..... میرے ساتھ بات کیا کریں۔''

میں کافی حیران ہوا کہ میرے بیٹے کے پاس میرے لئے وقت کدھر سے نکل آیا۔ زندگی مکافاتِ عمل کا نام ہے۔ میں اپنی شادی کے معاملے کے بعد والدین سے کچھ کٹ سا گیا تھا۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی کچھ اجنبی سا تھا۔ اسی اجنبیت میں دھیرے دھیرے سب سے اس حد تک دور ہو گیا کہ ان کی آخری سانسوں تک خیال ضرور کیا، احساس کیا لیکن جان بوجھ کے وقت نہیں دیا۔ وقت کیوں نہیں دیا اس کی وجہ صرف میری لاحاصل محبت تھی جس کی تشنگی آج بھی مجھے دنیا بھر سے بیزار کر دیتی ہے۔ مجھے امید تھی کہ میں نے والدین کو وقت نہیں دیا۔ یہ بچے مجھے بالکل وقت نہیں دیں گے۔ لیکن اب جبکہ میرا بیٹا مجھے کہہ رہا تھا تو پہلے تو میں نے یقین ہی نہ کیا۔

''یار تم دفتر جاؤ، شام میں بات کریں گے۔ ابھی تو تمہیں دفتر سے دیر ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر جان چھڑائی۔ اتنے میں ملازم نے ناشتہ لگا کر ہم دونوں کو آواز دی۔ اب ہم گھر کے مرد ناشتہ کریں گے اور گھر کی خواتین ابھی بیدار نہیں ہوئیں۔

میں اپنی روزمرہ کی ہلکی پھلکی مصروفیت میں بھول گیا کہ مجھے ذیشان کے ساتھ باہر جانا ہے۔ میں سہ پہر کے وقت کچھ آرام کر رہا تھا تو کمرے میں ذیشان آن دھمکا۔

''ڈیڈی آپ تیار نہیں ہوئے؟'' میں بھول چکا تھا لیکن وہ الماری سے میرے لئے کپڑے نکالنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ہم دونوں گھر سے نکل گئے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں کچھ چوکنا سا ہو گیا کہ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے یونہی باہر لے کے جا رہا ہے۔ ایک شک سا گزرا ہو نہ ہو اسے لازماً اس کی ماں نے کہا ہے کہ باپ سے اُگلواؤ۔ وقت بدل گیا ہے لیکن میں یہ نہیں بھولا کہ گریجویشن میں جانے سے پہلے تک ذیشان ماں کا جاسوس ہوا کرتا تھا۔ مجھ پہ کافی نظر رکھتا تھا، خاص طور پر جب میں فون پر مصروف ہوتا تھا۔ اس زمانے میں موبائل فون کا تو رواج نہیں تھا لیکن سعدیہ کو شک تھا کہ میں کسی اور کے ساتھ تعلق میں ہوں۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی تو تھی نہیں انسان کا رویہ ہی بتا دیتا ہے لیکن اس معاملے میں عورت کا دل مرد سے زیادہ تیزی سے کام کرتا ہے۔ میں نے بھی کوئی کچی گولیاں تو کھیلی نہیں تھیں میں تقریباً روز ہی حنا سے بات کرتا تھا لیکن دفتر سے۔ خیر گاڑی جیسمین گارڈن کی پارکنگ میں داخل ہوئی۔ گاڑی سے اتر کر ہوا کے پہلے جھونکے

نے گویا میرا استقبال کیا ہو۔ اگرچہ بہار کی آمد آمد تھی لیکن اسلام آباد میں ابھی بھی کسی قدر خنکی چل رہی تھی۔ ویسے بھی زندگی کے اڑھائی سال جو لاہور کی سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے، باغوں میں گھومتے ہوئے آزادی کا جو احساس اس وقت تھا مجھے ہوا کے اس جھونکے نے تر و تازہ کر دیا۔

سورج غروب ہونے میں کچھ وقت تھا ہم دونوں ارادتاً ایک ایسے قطعے کی جانب بڑھے جو آباد نہیں تھا۔ میز کے گرد چند خالی کرسیاں زندگی کی بے ثباتی بیان کر رہی تھیں۔ میں ان کی جانب بڑھا اور سورج کی جانب رُخ کر کے بیٹھ گیا۔ حنا کو سردیوں کی دھوپ کس قدر پسند تھی، دھوپ میں اس کی رنگت تمتمانے لگتی۔ کالج کے شروع کے دنوں میں مَیں اسے چور نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ جب ہماری بے تکلفی ہو گئی تو تب بھی اسے اسی طرح بے تکان دیکھنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ اپنی ناک کس طرح سکیڑتی ہے، کچھ سوچتے ہوئے کس طرح بال پین کی نوک منہ میں دباتی ہے، ہوا اس کی لہراتی ہوئی زلفوں کے کون کون سے زاویے بناتی ہے۔ ہائے..... میں کیا یاد کروں اور کیا بھول جاؤں؟

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

ڈوبتے ہوئے سورج کے چند کرنیں بادلوں کو نارنجی کرتی ہوئی شعاؤں کی صورت میں افق پر پھیل رہی تھیں۔ میں یہ منظر دیکھنے میں اتنا مگن تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کس وقت ویٹر چائے کا آرڈر لے گیا۔ تازہ چائے کی مہک سے چونک کر میں اپنی خیالی دنیا سے لوٹا تو ذیشان انہماک سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔ میں کسی قدر جھینپ گیا، لیکن ذیشان نے بلا تمہید ہی بات شروع کر دی۔

''ڈیڈی.....! اتنی گہری اور مخلصانہ محبت ہی ہے کہ آپ ابھی تک بہت فِٹ ہیں۔'' میں اس بات کے لئے ابھی تیار نہیں تھا..... تھوڑا لفظوں سے کھیلنے لگا۔ ''میرے بچے! انسان خود کیلئے جیتا ہے، جس دن اگلے دن کی امید ختم ہو جائے گی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گی۔'' وہ اس طرح مسکرایا کہ گویا میرے اندر تک اتر گیا ہو۔

''سچ سچ بتائیے نہ ڈیڈی..... آپ نے ایک بھرپور زندگی گزاری ہے اور یہ لازمی طور پر مما کی وجہ سے تو نہیں ہے۔ ان میں وہ خوبیاں ہی نہیں ہیں جو ایک مرد کو اپنی جانب متوجہ رکھ سکے۔'' میں اپنے بیٹے کی سچائی سن کے حیران رہ گیا۔ اس نے مجھے کسی قدر سنجیدہ اور حیران پا کر اپنی بات کو بڑھایا۔

''آپ نے ہی تو کہا تھا کہ ہم دونوں ایک کشتی کے سوار ہیں لیکن ہم میں بہت فرق ہے۔ ہم دونوں باپ بیٹا ہیں۔ میرے چہرے پہ ویرانی اور اداسی ہے شاید کرختگی ہے اور آپ کا چہرہ سنجیدہ ضرور ہے لیکن اس پر زندگی کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔''

''کیا تم نے کسی سے محبت کی ذیشان؟'' میرے سوال کے جواب میں اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پڑھائی ختم ہوتے ہی شادی کردی آپ نے اور پھر بچے ہوگئے..... خیال ہی نہیں آیا تمام عمر.....'' وہ بیزاری سے بولا۔ ہوا کے جھونکے میرے چہرے سے ٹکرائے، فضا میں سبزے اور گیلی مٹی کی ملی جلی خوشبو تھی۔ کہیں دور کسی پرندے کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ اس تمام منظر نے میرے چہرے پہ قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیئے اور میں اس سے اپنی زندگی کے تجربات شیئر کرنے لگا۔

''اب بتاؤ..... تمہاری ماں نے تمہیں کیا کہہ کر میرے ساتھ بھیجا ہے؟'' میں نے چھوٹتے ہی ذیشان سے سوال کیا۔ وہ میرے غیر متوقع سوال سے پریشان ہوگیا۔

''ڈیڈی! آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ اور امی ایسا کیوں کریں گی؟'' میں تھوڑا غصے میں کہنے لگا۔

''تم تو بچپن سے ہی ماں کے جاسوس ہو۔ میں یہ بھولا تو نہیں ہوں تم تو مجھ پہ ہمیشہ چیک رکھتے تھے کہ میں کس سے بات کررہا ہوں کس سے مل رہا ہوں۔'' ذیشان اب خود کو جسٹیفائی کرنے لگا۔

''ڈیڈی..... یار..... تب میں بچہ تھا لیکن یہ یاد کریں کہ بڑے ہونے کے بعد میں نے ایسی حرکت کبھی نہیں کی اور چھوٹے بھائیوں کو بھی اس حرکت سے باز رکھا۔ لیکن آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے دل کی بات مما نہی سنتیں تو میں نے سوچا کہ ایک عمر میں جا کے باپ بیٹا دوست ہوجاتے ہیں تو کیوں نہ میں آپ سے باتیں کروں تاکہ آپ کی تنہائی کچھ کم ہو۔'' ذیشان کی بات سن کر میرا غصہ تو قدرے کم ہوا تو میں نے اسے سمجھانے کی غرض سے بات شروع کی۔

''یہ بتاؤ کہ اگر کوئی عورت اپنی خوشی سے اپنے شوہر کے لئے چائے بناتی ہے یا اس کی پسند کا کھانا بناتی ہے تو کیا وہ اس کی نوکرانی بن جاتی ہے؟''

''ہرگز نہیں ڈیڈی..... محبت تو نام ہے توجہ اور کیئر کا..... ایسا کرنے سے دل میں جگہ بنتی ہے نا کہ نوکرانی۔'' اس نے فوراً ہی میری بات کی تائید کی۔ میں نے اس کی بات سن کر اپنی بات جاری رکھی۔

''یہی اختلاف ہے میرا اور تمہاری ماں کا۔ اس کے خیال میں ملازم کا کام ہے گھر کا کام کرنا نا کہ بیوی کا۔ جبکہ شوہر کے چھوٹے چھوٹے کام کرنے سے اپنائیت رہتی ہے اور محبت بڑھتی ہے۔'' ذیشان گویا ہو۔

''ڈیڈی! میرے حالات بھی آپ سے کچھ مختلف تو نہیں ہیں، لیکن کیا کیا جاسکتا ہے؟''

''میری اس خزاں رسیدہ زندگی میں حنا بہار کا جھونکا ثابت ہوئی۔ حنا..... میری پہلی محبت..... جس کی محبت کے سحر میں مَیں اتنا کھو چکا ہوں کہ مجھے کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔'' ذیشان حیرت سے میرے چہرے کو تک رہا تھا۔ بات کہاں سے شروع ہوئی..... میرے کالج کے زمانے سے اور میں بے تکان بول رہا تھا۔ میں خود حیران تھا کہ واقعات کی ترتیب اور اتنی تفصیل تو شاید مجھے یاد بھی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزرا میں اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتا رہا اور ذیشان حیرت سے بت بنا مجھے سن رہا

تھا۔ اچانک مجھے وقت کا خیال آیا تو دیکھا ساڑھے دس بج رہے تھے۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے یار تمہاری ماں سوچے گی کہ آج تم مجھے ڈیٹ پہ لے گئے ہو۔'' یہ کہہ کے میں نے چھیالیس سال تمام واقعات کو ہنسی میں اڑانے کی ناکام کوشش کی۔ اس تمام دورانیہ میں میرا بیٹا ایک لفظ نہ بولا وہ کچھ حیران سا تھا۔ پارکنگ کی جانب جاتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''ڈیڈی! جس عورت نے آپ کو تمام زندگی اپنی محبت میں مبتلا رکھا آپ نے اس سے شادی کیوں نہ کی؟''

''جب تم لوگ چھوٹے تھے تو خیال آیا تھا لیکن شاید میں بزدل تھا۔ اس کی اشاروں کنایوں والی گفتگو سے لگتا تھا کہ وہ دل سے یہی چاہتی ہے کہ میں اس سے خود شادی کا کہوں لیکن اس اللہ کی بندی نے کبھی بھی نہیں کہا۔ وہ تمام عمر میرا انتظار کرتی رہی اور میں حسبِ ضرورت اسے انتظار کرواتا رہا۔'' ذیشان اب میرے بجائے حنا سے ہمدردی محسوس کررہا تھا۔

''ڈیڈی.....! میں محترمہ حنا سے ملنا چاہونگا، اتنی زبردست شخصیت لگ رہی ہیں۔'' میں خاموش رہا۔ پھر تھکی ہوئی آواز میں بولا۔

''وہ جہاں ہے وہاں سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے پاس امریکہ گئی تھی اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ مجھے اس کی موت کا چوتھے دن پتہ چلا جب میں نے اسے کال کیا اور فون اس کے بھائی نے اٹھایا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میں مروں گا تو مجھے کوئی طاقت اس سے ملنے سے نہیں روک سکے گی۔'' ہم گھر کے اندر داخل ہوئے تو وہاں وہی لاتعلقی تھی۔

مجھے یہ تو نہیں پتا کہ میری بہو کیا کررہی تھی لیکن میری بیوی سعدیہ بستر پر نیم دراز ٹی وی پر ڈراما دیکھنے میں مصروف تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ اتنی دیر تک تم لوگ کہاں تھے؟ کھانا کھایا یا نہیں..... میں کھانا لگواتی ہوں۔ یہی سوچتے ہوئے میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ باہر آیا تو دیکھا کہ ذیشان ایک ٹرے میں اپنا اور میرا کھانا گرم کرکے لایا ہے۔ میں خاموش ہی رہا اور خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

''بخدا ڈیڈی..... جس قسم کا رویہ مما کا ہے..... میں ایسی بیوی کی جگہ چار چار بیویاں لانے کو تیار ہوں۔ میرے والی محترمہ تو سو رہی ہیں۔ لیکن میرا آپ جتنا نہ ظرف ہے نہ حوصلہ۔ میں ایسی بیوی سے جان چھڑوالیتا فوراً یہ سوچے بغیر کہ آگے کیا بنے گا۔ اس گفتگو کے شروع ہونے پر سعدیہ کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔

ڈیڈی، سارا قصور ہم مردوں کا ہے، ہم کیوں دبتے ہیں اپنی بیویوں سے؟ ان کے لئے کماؤ، نان نفقہ کا بندوبست کرو، ان کی ضروریات کا خیال رکھو، بچے پیدا کرواؤ اور بعد میں ابھی میں کھانا خود گرم کرکے لارہا ہوں۔ اپنی بیوی ہے تو سوئی ہوئی ہے کہ ورکنگ وومین ہے کام کرکے تھک جاتی ہے اور مما نے تو اٹھنے

کی زحمت ہی نہیں کی ۔ یہ عزت ہے مردوں کی ہمارے گھر میں ۔ میں تو ان دونوں عورتوں کے سائے سے اپنی بیٹی کو دور رکھنا چاہتا ہوں کہ اسے بھی اپنے جیسا نہ بنا دیں ۔''

سعدیہ کا موڈ تو پہلے ہی خراب ہو رہا تھا لیکن اب تو باقاعدہ تیوریاں چڑھی واضح نظر آ رہی تھیں ۔

''مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟ کیوں فساد برپا کر رہے ہو اور یہ گھٹیا خاندان کے چھوٹے لوگوں کی طرح بی ہیو کرنا بند کرو ۔ پہلے یہ تمہارے باپ کا مسئلہ تھا ۔ اب ہمارا لونگ اسٹینڈرڈ تمہیں بھی مسئلہ لگ رہا ہے، ہو نہ ہو تمہاری برین واشنگ سجاد نے ہی کی ہے ۔'' سعدیہ نے اب ہر قسم کا لحاظ چھوڑتے ہوئے اچھی خاصی اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا ۔

''مما مجھے کون سکھائے یا سمجھائے گا ۔ یہ آپ کی وہ گھٹیا عادتیں ہیں جو ہم تینوں بھائی بچپن سے دیکھتے آ رہے ہیں آپ نے صرف ہمیں پیدا کیا ہے ۔ آپ بھول رہی ہیں ہماری پرورش آپ نے نہیں رخسانہ باجی نے کی ہے ۔ وہ جب تک ہمارے گھر رہی ہیں ہم انہی کے گرد گھومتے تھے ۔ تین سال کی عمر میں جا کے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ہماری ماں نہیں آیا ہے ۔ آپ نے کون سا ہمیں سینے سے لگا کر کبھی سلایا تھا اور میری قسمت خراب تھی کہ میں شادی کا فیصلہ خود نہ کر سکا ۔ اور آپ جیسی ہی ایک بدبخت میرے پلے باندھ دی ۔ شادی کے پہلے ہی سال میں ثوبیہ سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن علیزے کے اس دنیا میں آ جانے سے میں اپنے ارادے سے باز رہا ۔ آپ کی اطلاع کے لئے ارسلان کو خالہ کی بیٹی سے شادی کے لئے میں نے ہی روکا تھا ۔ اس وقت تو وہ بیچارہ آپ سے برا بھلا بنتا رہا لیکن آج وہ مجھے اپنا محسن مانتا ہے ۔ اس نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے اس کی بیوی بہت اچھی اور رکھ رکھاؤ والی ہے اور ویسی ہی تربیت اس نے اپنی اولاد کی کی ہے ۔ میں اپنے ولید کے لئے اپنی بھتیجی کا رشتہ کرونگا تاکہ وہ اس کرب سے نہ گزرے جس سے اس کا باپ اور دادا گزر رہے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا پرتو ہوتے ہیں ۔ ہم دونوں نے اپنی زندگی ضائع کر دی ہے اور ادھر بیگمات ہیں کہ انہیں ہماری پرواہ تک نہیں ہے ۔''

تو تم اب کیا چاہتے ہو؟ طلاق کروانی ہے اس عمر میں میری اور اپنے باپ کی یا تم نے طلاق دینی ہے اپنی بیوی کو؟ اور تم ماں کے سامنے بیٹے کو کھڑا کر دیا ہے خود مظلوم بن رہے ہو ۔ تمہیں شرم نہیں آتی ۔ جوانی میں اس کلاس فیلو کے چکر میں آہیں بھرتے رہے ہو ۔ تم سمجھتے ہو کہ مجھے پتہ نہیں چلتا ۔ تم جیسا منافق اور دوغلا شخص میں نے نہیں دیکھا ۔ اگر میں تمہیں اتنی ہی ناپسند تھی تو مجھے چھوڑ کیوں نہ دیا ۔ آج اولاد کو میرے خلاف بھڑکا رہے ہو ۔ خود کی ٹانگیں تو قبر میں ہیں میری زندگی کو مزید اجیرن نہ کرو ۔'' سعدیہ کے تیور وہی تھے ہمیشہ کی طرح سب کو ذلیل کرنے والے ۔

مما آپ حد سے بڑھ رہی ہیں ۔ آپ کو کیا میسر نہیں آیا؟ بتائیں، ایک سے بڑھ کر ایک اچھا اور مہنگا لباس اور زیور پہنتی رہی ہیں ۔ فارن ٹرپس پہ جاتی رہی ہیں، آپ کو کبھی بھی روپے پیسے کی طرف سے تنگی کا سامنا نہیں

کرنا پڑا، اپنی مرضی کا وقت گزارتی رہی ہیں کبھی شاپنگ میں کبھی بہن بھائیوں میں، کبھی سہیلیوں میں..... کبھی گھر کو وقت نہیں دیا ۔ کھانا تو ایک طرف آپ یہ بتائیں آپ نے آج تک محبت کے ساتھ ڈیڈی کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر دی ہے ۔ اگر ان کے دل میں کسی اور عورت کا خیال تھا تو اس کی بنیادی وجہ وہ خلا ہے جو آپ نے ڈالا ہے لیکن کبھی اس کو پُر کرنے کی کوشش نہیں کی ۔ یہ ڈیڈی کی بزدلی یا شاید بڑا پن ہے کہ انہوں نے آپ سے جان نہیں چھڑوائی ۔ میرے جیسا شوہر ہوتا تو کب کا چھوڑ چکا ہوتا ۔'' میں کھانا کھا چکا تھا اور دونوں کی بات بہت تحمل سے سن رہا تھا ۔

''ذیشان! آج جو ہمارے بیچ بات ہوئی اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ تم گھر آتے ہی ماں کے ساتھ الجھنا شروع کر دو ۔ یار، وقت میں بڑی خوبی ہے کہ وہ بہرحال گزر ہی جاتا ہے ۔ اب اچھا گزرا یا برا یہ ہماری سوچ پر منحصر ہے ۔ مجھے وہ تمام شکایتیں یا expectations جو اپنی بیوی سے تھیں پوری تو نہیں ہو سکتی نا! اب میں ان سب چھوٹی چھوٹی خواہشوں کا کیا کروں جن کا وقت گزر چکا ہے ۔ پچھلے کچھ سالوں میں لاحاصل خواہشوں کے لئے کڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے ۔ یاد رکھو جب وقت گزر جائے تو چاہے خواہش کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو اس میں کشش باقی نہیں رہتی ۔ اب میں کیا شکوے کروں کیا شکایتیں کروں؟ میں خود اپنی زندگی کے اختتام کی طرف جا رہا ہوں میں نے جو وقت گزارا اچھا گزار دیا ۔ ہاں آخری عمر میں تشنگی ضرور رہی کہ تمام عمر گزر جانے کے باوجود میری بیوی میرے دل کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ وہ اپنی لذتوں میں پڑی ہوئی ہے، اس کے لئے میری کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ تو میں اس کو کیوں اس بات پر مجبور کروں کہ میری بات سنے ۔ میری زندگی رہ ہی کتنی گئی ہے ۔ شاید چند ہفتے یا چند مہینے، ہو سکتا ہے کہ سال کا اضافہ ہو ۔ اسے یہ اعتراض ہے کہ میں کسی اور کی محبت میں مبتلا رہا تو اس کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ سوچنے کی ضرورت کبھی بھی اس نے محسوس نہیں کی ۔ ایک شخص کے دل و دماغ پر مہر لگ جائے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے ۔ مجھے مرنے سے پہلے اپنے دل کی بات کرنی تھی اور وہ بات میں اپنے جیون ساتھی سے کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس تو وقت نہیں ہے، تو میں نے اپنے دل کی بات بیٹے کے ساتھ کر لی ہے ۔ میں جتنا بھرا ہوا تھا تم سے بات کر کے میں نے اپنا کتھارسس کر لیا ہے ذیشان ۔ اور یاد رکھو کسی سے بات تب کی جائے جب اس شخص کی نظر میں ہماری بات کی کوئی اہمیت ہو ۔ سعدیہ کے لئے یہی کافی ہے کہ شادی کے وقت بھی اس کی میری نظر میں کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں تھی اور اب آخری عمر میں بھی اس کی میری نظر میں کوئی حیثیت نہیں ہے ۔'' میں نے اپنی بات ختم کر کے گویا زندگی کے اس باب کو تقریباً ختم کر دیا تھا کیونکہ مجھے اب اس کے ساتھ کی بھی ضرورت نہیں رہی تھی ۔

◀◀ ● ▶▶

W/o Muhammad Imran
House # 325, Block 4, sector B-1
Township, Lahore. 0333-4741379

● افسانہ

● فرحین جمال

انجام

عبداللہ اور نازیہ سکول اور کالج میں ایک ساتھ پڑھتے رہے۔دونوں کے گھروں کا فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔بچپن سے ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔جس طرز معاشرت میں جوان لڑکی لڑکا شادی کے بغیر بھی اکٹھے رہ سکتے ہیں وہاں ان کی دوستی پر کسے اعتراض ہوسکتا تھا۔البتہ دونوں کے گھرانوں کا تعلق بھی یورپ میں آبسنے والے ان ہزاروں گھرانوں میں سے تھا جو معاش کی تلاش میں یہاں آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے تھے مگر یہاں کی تہذیب میں رنگے جانے کے باوجود ان کے اندر مشرقی روایات کا رنگ باقی تھا۔کیونکہ ان روایات پر کاربند رہنا ان کی انا کو مستحکم کرتا تھا۔اسی لئے جب عبداللہ اور نازیہ کی دوستی محبت میں تبدیل ہونے لگی اور انہوں نے ایک دوسرے کو جیون ساتھی چن لیا تو دونوں گھرانوں میں اس کی شدید مخالفت ہوئی۔کیونکہ نازیہ کا تعلق جاٹ گھرانے سے تھا اور عبداللہ کے والدین کشمیری تھے اور دونوں نے اپنی جگہ اپنی اولاد کو پاکستان میں اپنے رشتہ داروں میں بیاہنے کا سوچ رکھا تھا۔پاکستان میں ان کی ذات برادری یہ کہے کہ ان کے بچوں نے اپنی مرضی سے زندگی کا ساتھی چن لیا ہے، ناقابل برداشت تھی۔دونوں نے والدین کو قائل کرنے کی کوشش کی۔مذہبی حوالے سے بھی اپنے اس حق کو استعمال کرنے کی بات کی مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔نازیہ کے بڑے بھائی آصف نے تو ابو اور امی سے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ میں اس رشتے کو کسی صورت قبول نہیں کرسکتا۔آپ بھلے کرلیں۔اور نازیہ کو بھی تنبیہ کی تھی کہ وہ یورپ کو پاکستان سمجھ کر فیصلہ کرے۔مگر جب دونوں نے کورٹ میں جا کر نکاح کرلیا تو فریقین کے والدین کو احساس ہوا کہ جس ملک میں وہ رہتے ہیں وہاں والدین کی دھونس اور ان کے احترام کے روایتی تصور کی گنجائش نہیں۔بلکہ یہ تو ان کی سعادتمندی تھی کہ انہوں نے شادی سے پہلے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی ورنہ یہاں پر تو والدین کا نام دستاویزات میں خانہ پری سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ناچار وہ لوگ کچھ نہ کرسکے۔لیکن نازیہ کے بھائی آصف اور اس کے والد چودھری صغیر نے نازیہ کو اپنا موقف بتا دیا تھا کہ ان کے لئے یہ رشتہ قابل قبول نہیں ہے۔۔بلکہ شادی کے چند ماہ بعد آصف نے اس کے آفس میں جا کر اس کو یہ بھی پیشکش کی تھی کہ اس نے اپنی ضد پوری کر لی ہے، اب وہ عبداللہ سے طلاق لے لے تو وہ اسے معاف

کرنے کو تیار ہیں۔نازیہ نے یہ کہہ کر اسے لوٹا دیا تھا کہ اس نے ضد نہیں پوری کی بلکہ شادی کی ہے۔اور اس نے والدین سے بھی منت کی کہ وہ عبداللہ کو داماد سمجھ کر قبول کرلیں۔

جس وقت عبداللہ نے نازیہ کو پک کرنے کے لئے گاڑی پارک کی اس وقت آصف کی گاڑی پارکنگ سے نکل رہی تھی۔دونوں کا آمنا سامنا بھی ہوا۔عبداللہ نے مسکرا کر اسے سر کی جنبش سے سلام بھی کیا مگر آصف نے گاڑی کو تیزی سے نکالتے ہوئے اپنے غصے اور نفرت کا اظہار کیا۔عبداللہ مسکرا دیا مگر پھر اچانک ہی اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمودار ہوئے۔آصف یہاں کیوں آیا تھا؟ کیا نازیہ سے ملنے؟ یا اتفاقاً؟ اور کیا نازیہ نے اسے خود بلایا تھا؟ اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اسے پتہ ہی نہ چلا کہ نازیہ کار کا دروازہ کھول کر برابر آبیٹھی ہے۔

''کن سوچوں میں ڈوبے ہو.....'' عبداللہ ایک دم سے یوں چونکا جیسے نیند سے بیدار ہوا ہو۔

''ہائیں! تم، تم کب آئیں؟''

''ابھی دو منٹ پہلے۔'' نازیہ نے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔عبداللہ نے لمبی سانس لی۔

''کیا بات ہے۔'' عبداللہ نے کہا'' کچھ نہیں۔'' اور گاڑی آگے بڑھا دی۔آفس سے گھر آتے ہوئے نازیہ نے خود ہی آصف کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔اس نے محسوس کیا کہ نازیہ کچھ سہمی سہمی سی تھی۔آج انہیں میٹرنٹی ڈاکٹر کے پاس بھی جانا تھا مگر اس نے فون پر، معذوری ظاہر کر کے معائنے کے لئے کوئی اگلی تاریخ لے لی۔عبداللہ اسے یہ کہہ کر تسلی دے رہا تھا کہ یہ پاکستان نہیں یورپ ہے یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں۔مگر اپنے اندر وہ بھی اس صورت حال سے مطمئن نہیں تھا۔اس لئے جب اسے ڈاکٹر نے بتایا کہ نازیہ ماں بننے والی ہے تو اس نے ایسی پوزیشن میں اسے کسی قسم کے ذہنی دباؤ سے محفوظ رکھنے کے لئے ملازمت چھوڑنے اور شہر کے مضافات میں رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔نازیہ ملازمت چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی مگر انہی دنوں خوش قسمتی سے عبداللہ کو دوسرے شہر میں ملازمت مل گئی۔تنخواہ بھی بہتر تھی اور رہائش بھی کمپنی کی طرف سے تھی۔عام حالات میں ہوسکتا ہے کہ نازیہ عبداللہ کو بھی منع کر دیتی مگر ایسی صورت حال میں اس نے بھی ہامی بھر لی۔نئے شہر میں نئی جاب پر نئے لوگوں میں وقت اچھا گزرنے لگا۔عبداللہ کی محبت اور چاہ میں اسے کبھی محسوس نہ ہوا کہ اس نے اپنے لئے غلط فیصلہ کیا ہے۔

ایک دن اچانک صبح فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے آصف کی آواز سن کر وہ سن ہوگئی۔

''ہیلو گڑیا! میں آصف بول رہا ہوں۔'' آصف اسے پیار سے گڑیا کہا کرتا تھا۔نازیہ کو یہ سن کر کچھ ڈھارس ہوئی۔

''جج۔جی، آصف بھائی!'' آصف نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

''دیکھ لو تمہیں آخر کار ہم نے ڈھونڈ ہی لیا۔ سناؤ عبداللہ کیسا ہے؟'' نازیہ نے اسی لہجے میں کہا۔

''جی وہ ٹھیک ہیں، سو رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں، لو امی سے بات کرو۔'' نازیہ کیونکہ اب خود ماں بننے والی تھی اس لئے ماں کا ذکر سن کر اس کے دل میں ایک دم ماں کے لئے تڑپ پیدا ہو گئی۔

''جی امی، آپ کیسی ہیں ٹھیک ہیں نا؟'' دوسری طرف سے اس کی ماں کی شکستہ مگر پیار بھری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

''ہاں میری نازی کیسی ہو؟ بہت یاد آتی ہو'' ان کی آواز بھرا گئی۔ نازیہ بھی رو پڑی۔

''امی! آپ رو کیوں رہی ہیں۔''

''میں رو تو نہیں رہی بیٹو میں..... میں بس، یونہی۔ کل تمہاری سہیلی دانیہ ملی تھی سپر سٹور میں، اس نے بتایا۔ تم، ماں بننے والی ہو۔ بس رہا نہ گیا۔''

اس کی ماں کا لہجہ ابھی تک بھرایا ہوا تھا۔ نازیہ کو یاد آیا کہ اس نے اپنی کولیگ دانیہ کو اپنا فون نمبر دیا تھا مگر اس نے دانیہ کو اپنی شادی کے تمام معاملات اور وہاں سے نقل مکانی کرنے کی وجہ بتا رکھی تھی۔ اس کا نہیں خیال تھا کہ اس کے گھر والوں میں سے کسی کا دانیہ سے رابطہ ہو گا۔ یا وہ اس کے بارے میں انہیں کچھ بتائے گی۔ فون سننے کے بعد وہ دیر تک اپنی ماں اور بھائی کو یاد کرتی رہی جس طرح پیار سے آصف نے نازیہ کو گڑیا کہہ کر پکارا تھا اس نے گزرے وقت کے تمام واقعات کی تلخی کو ایک لمحے کے لئے بھلا دیا تھا۔ اور جب اس کے بھائی نے فون بند کرنے سے پہلے اسے گھر آنے اور ملنے کا کہا اس سے بھی اسے لگ رہا تھا کہ برف پگھل رہی ہے۔ جب عبداللہ سو کر اٹھا تو وہ فون کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ عبداللہ نے آنکھیں ملتے ہوئے اسے اور پھر فون کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ عبداللہ کچھ کہتا یا پوچھتا۔ اس نے خود تمام روداد کہہ سنائی۔ عبداللہ ایک دم سے پریشان ہو گیا۔ مگر یہ اس کا فوری ردعمل تھا۔ جلد ہی اس نے خود پر قابو پا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو۔ برف پگھل ہی گئی۔''

نازیہ نے اس کی طرف دیکھا اور چہکتے ہوئے کہا۔

''بالکل یہی میں نے سوچا تھا۔ تم نے ہو بہو میرا خیال چرا لیا۔'' عبداللہ نے کہا۔

''جب ہماری ہر چیز سانجھی ہے تو پھر تمہارا خیال بھی تو میرا خیال ہی ہوا۔ بہر حال اس سے ایک بات تو ثابت ہو گئی نا کہ میں تمہارے خیالوں میں بھی شامل ہوں۔'' نازیہ اٹھی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ کر پیار سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

''عبداللہ! تم.....'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آواز بھرا گئی۔

''تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو۔ میں نے تو شاید تصور بھی نہیں کیا تھا۔'' عبداللہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر شوخ لہجے میں کہا۔

''ارے بہت مشکل سے تمہیں پایا ہے۔'' نازیہ نے جھٹ سے بناوٹی ناراضی سے کہا۔

''ہونہہ، مشکل سے پایا ہے اور میں نے؟'' عبداللہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''مذاق کر رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بڑی مشکل سے پایا ہے۔''

ایک دو دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر تیسرے دن جب عبداللہ آفس گیا ہوا تھا کوئی دوپہر کا وقت تھا۔ آصف کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ جس دن سے تم سے بات ہوئی ہے امی مسلسل رو رہی ہیں اور تم سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔ اگر تم اور عبداللہ اجازت دو تو میں امی کو لے کر آ جاؤں۔ نازیہ کو کچھ سمجھ میں نا آیا کہ کیا جواب دے۔ وہ اتنا ہی کہہ پائی۔ امی سے بات کروائیں۔ آصف نے جواب میں بتایا کہ امی کو ٹرینکولائزر دے کر سلایا ہے۔ نازیہ تڑپ اٹھی۔

''کیا ہوا امی کو؟'' آصف نے کہا۔

''کچھ نہیں، بس بے آرامی اور ڈیپریشن کی وجہ سے ڈاکٹر نے ہدایت دی تھی۔'' پھر اس نے پوچھا۔

عبداللہ کب دفتر سے آتا ہے۔ نازیہ نے بتایا کہ شام چار بجے تک۔ آصف نے کہا۔

''اچھا تم بات کر لینا میں رات کو یا کل فون کروں گا۔ عبداللہ سے کہنا کہ بھول جائے جو کچھ ہوا۔ ہم بھی بھول چکے ہیں اسی لئے تمہیں فون کیا ہے۔ آخر کو تم میری گڑیا ہو۔ میرے ہاتھوں میں پلی ہو۔'' آصف بول رہا تھا اور نازیہ کو کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ خواب کے عالم میں ہے یا حقیقت؟ یہ وہی آصف ہے جس نے اسے اس شادی سے باز رکھنے کے لئے سنگین دھمکی دی تھی اور شادی کے بعد بھی اسے طلاق لینے پر مجبور کیا تھا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کیسے آصف کی بات کو سچ سمجھے۔

ادھر ماں کی طبیعت کا سن کر بھی اس کا دل بے چین ہو گیا تھا۔ اس نے بادل نخواستہ بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ آصف بھائی عبداللہ کو تو میرے آپ لوگوں سے ملنے پر کبھی اعتراض نہیں تھا۔ وہ آتے ہیں تو میں ان سے طے کر کے اپنے آنے کا پروگرام بتا دوں گی۔ آصف یہ سن کر بہت خوش ہوا۔

''جیتی رہو میری گڑیا۔ مگر ابا ابھی بہت غصے میں ہیں۔ اگر تم اکیلی آؤ یا ہم تم سے ملنے آ جائیں تو آہستہ آہستہ حالات ٹھیک ہو ہی جائیں گے۔'' نازیہ نے کہا۔

''میں آپ کا اشارہ سمجھ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

عبداللہ کو ہر طرح سے نازیہ کی خوشی اور خواہش عزیز تھی اس لئے جب اس نے نازیہ کو بے قرار

دیکھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے نازیہ کو اپنے والدین سے ملانے کی ہامی بھرنا پڑی۔ اگلے ہی روز ویک اینڈ تھا۔ چنانچہ عبداللہ اسے لے کر اس کے والدین سے ملانے کے لئے روانہ ہوا۔ نازیہ کو گھر کے باہر چھوڑ کر خود چلا گیا اور نازیہ پہلی بار اپنے ہی گھر میں اجنبی بن کر داخل ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سب گھر والے اس کا خوشی سے استقبال کریں گے مگر جب وہ گھر میں داخل ہوئی تو ایک ویرانی کا سا سماں تھا۔ بستر پر امی کو لیٹے دیکھ کر وہ امی کہہ کر دوڑی مگر ان کے درمیان آصف آ کھڑا ہوا۔ اس نے آصف کو دیکھ کر آصف بھائی کہہ کر اس سے لپٹنا چاہا۔ مگر آصف نے ہاتھ سے پیچھے دھکیل کر کہا۔

''نازیہ یاد کرو میں نے تمہیں کہا تھا کہ یورپ کو پاکستان ہی سمجھنا۔ ہم لوگ اپنی روایات پر رشتوں کی قربانی دیتے چلے آئے ہیں۔'' نازیہ یہ سن کر چکرا گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اس کی ماں نے بستر سے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔

''نازیہ میری بیٹی مان لے، مان لے اپنے بھائی کا کہنا۔ اس کے سر پر خون سوار ہے۔ اس نے بہانے سے تمہیں یہاں بلایا ہے۔'' نازیہ نے آصف کی طرف دیکھا۔ اس نے کوٹ کے اندر کی جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جو بیٹی ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو سسرال جاتی ہے اسے دعا دی جاتی ہے کہ اس کا جنازہ سسرال ہی سے نکلے۔ مگر جو بیٹی گھر سے بھاگی ہوئی واپس آئے اس کا جنازہ ماں باپ کے گھر سے ہی نکلنے کی روایت ہے۔ مگر کیونکہ تم اس ماحول میں پلی بڑھی ہو تمہارے ساتھ ابو جی نے یہ رعایت کی ہے۔ تمہاری واپسی کی شرط۔ عبداللہ کو ڈائیوورس کر دو۔'' نازیہ اب ساری صورت حال کو سمجھ چکی تھی۔ اس نے اپنے ڈوبتے دل کو سنبھالا۔ آصف نے کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ تو اس نے کاغذ کھینچ کر اس کے پرزے پرزے کرتے ہوئے کہا۔

''شرم کریں۔ میں عبداللہ کی بیوی ہوں۔ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ تم سمجھو کہ تمہاری بہن اور امی آپ کی بیٹی مر چکی ہے۔۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ آصف نے اس کو دھکیل کر پیچھے کیا۔

''تم نے ٹھیک کہا۔'' آصف کی درشت آواز کمرے میں گونجی۔

''تم ہمارے لیے مر چکی ہو، مگر مرے ہوئے اپنے قدموں پر چل کر نہیں جاتے بلکہ کندھوں پر سوار ہو کر گھر سے نکلا کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے پستول نکالا اور نازیہ پر فائر داغ دیا۔ گولی نازیہ کے کندھے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو اسے کچھ محسوس نہیں ہوا پھر وہ درد سے کراہ اٹھی اور گرتے گرتے اس نے اپنی ماں کا سہارا لیا جو پتھر کا بت بنی اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ اس پر غنودگی چھانے لگی۔ آصف چیخا۔

''ماں! ہٹ جاؤ۔ میرے غصے کی آگ اس کے خون سے بجھے گی۔'' نازیہ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے درد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسی دوران دوسرے فائر کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی آصف کی چیخ سنائی دی۔ نازیہ نے آنکھیں کھولیں تو آصف فرش پر پڑا تھا اور اس کی قمیض خون سے بھیگ رہی تھی۔ سامنے عبداللہ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھی۔ اسے صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ عبداللہ نازیہ کی طرف بڑھا، بازی پلٹ چکی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عبداللہ کی طرف دیکھا۔ عبداللہ نے کہنا شروع کیا۔

''میں تمھیں چھوڑ کر جا رہا تھا لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ویسے بھی محبت کرنے والے ہمیشہ عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ چنانچہ میں یہیں دور گاڑی میں بیٹھ کر سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ میں نے غصے کے عالم میں تمہارے والد کو گھر سے نکل کر جاتے دیکھا اور میں دروازہ کھلا پا کر اندر داخل ہوا۔ عام طور پر ہماری شادی سے، جس کہانی کی ابتدا ہوئی تھی اس کا انجام روایتی طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، مگر کیا ضروری ہے کہ ایسی کہانی کا انجام بھی ایک ہی طرح کا ہو۔''

اس نے پستول سے آصف کی طرف اشارہ کیا جو ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اور پھر پولیس کو فون کرنے کے لیے اپنا موبائل نکالا اور اس کی انگلیاں پولیس کا نمبر ڈائل کرنے لگیں۔

Rue de La Station no.188
Belgium

چمراسُر

(ناول)

شمؤل احمد

مصنف کا پتہ

۲۰۱ رلّی بلوسم اپارٹمنٹ، عطاپور، حیدرآباد، تلنگانہ (انڈیا)

- افسانہ
- صائمہ نفیس

پانچویں بوتل

(نذرِ احمد ندیم قاسمی)

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ زرینہ نے پرانے لحاف اور گرم کپڑے نکالنا شروع کر دیے تھے۔ گرم کپڑوں کو دھوپ لگا کر وہ آنے والے سرد موسم میں استعمال کے لیے تیار کر رہی تھی مگر لحاف کو دیکھ کر وہ اپنے شوہر بشیر سے کہنے لگی۔

''اس سردی میں تو یہ لحاف ساتھ نہ دیں سکیں گے نئے سرے سے ان کی بھرائی کرانی ہوگی اور نئے کپڑے کا غلاف بھی بنانا ہوگا، پرانی روئی کی صفائی بھی کروانی پڑے گی اور کچھ نئی خرید کر کمی کو پورا کرنا پڑے گا۔'' بشیر اُس کی بات سن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا مگر اپنی مالی خستگی سے باخبر تھا اسی لئے صرف ایک ہوں کر کے رہ گیا۔

زرینہ بھی بشیر کی اس ہوں کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی مگر سردیوں کے موسم کا سر پر آ جانے کا سوچ کر خاموش نہ رہ سکی اور پھر بولی۔

''دیکھ بشیر سردیاں لحاف کے بنا نہیں گزریں سکیں گی۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

بشیر سوچ رہا تھا کہ ہم غریبوں کے لیے موسم کا بدلاؤ بھی ایک عذاب ہی ہے۔ ابھی پنڈا ایک موسم کا عادی ہوا نہیں کہ وہ بے وفا محبوب کی طرح بدل گیا اور دوسرا سفاک بن کر در آیا۔ سردیوں میں تو خرچہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ گرم کپڑوں کے ساتھ ساتھ گرم بستر اور جلانے کے لئے لکڑیاں اور کوئلے کا خرچہ الگ اور اتنے دنوں سے فارم ہاؤس میں کوئی مہمان بھی نہیں آیا ورنہ تنخواہ کے ساتھ ساتھ بخشش بھی مل جاتی جو اس طرح کے کاموں کی تکمیل کا مداوا بنتی۔

''اللہ سائیں سے دعا کر کہ کوئی مہمان ہی آ جائے۔'' بشیر نے بیوی سے کہا۔ اور زرینہ جھولی اُٹھا کر فارم ہاؤس میں مہمان آنے کی دعا کرنے لگی۔

بشیر اور زرینہ کی گذر بسر کا انحصار شہر سے دور بنے اس فارم ہؤس کی ملازمت پر تھا۔ جہاں بشیر کے ذمہ فارم ہاؤس کی چوکیداری، دیکھ بھال اور مہمانوں کی آمد پر ان کی ضروریات کا خیال رکھنا تھا۔ جس کے عوض اُسے ماہانہ تنخواہ مل جاتی مگر اس تنخواہ سے خریدے جانے والی چادر اس کے قد کے برابر نہ ہو پاتی، کبھی سر تو کبھی پاؤں برہنہ ہو جاتے۔ وہ تو اگر

زرینہ صابر اور سگھڑ نہ ہوتی شاید زندگی بہت پہلے اُسے تھکا دیتی۔ اسی لیے زرینہ نے ایک گائے بھی پال رکھی تھی۔ جس کا دودھ آس پاس کی کچی بستی میں بیچ کر وہ کچھ آسانیاں خرید لیتے مگر پچھلی عید قرباں پر جب مالک کے بچے فارم ہاؤس آئے تو ان کی نظر اس گائے پر ٹک گئی۔ غریب کی جیب جتنی تنگ ہوتی ہے دل اتنا ہی کشادہ ہوتا ہے چنانچہ بشیر نے اسے بھی اعجاز جانا کہ اس سے وابستہ کوئی چیز اس کے مالک کو بھا گئی ہے بشیر نے خوشی خوشی گائے ان کے حوالے کر دی۔

زرینہ کئی دن تک اپنی گائے کو یاد کر کہ آنسو بھاتی رہی مگر جب اُن لمحوں کا سوچتی جب بشیر نے بڑے فخر سے اپنی گائے کی رسی مالک کے حوالے کی اور تفخر کا جو رنگ اس کی ذات میں دیکھا تو اپنی قربانی بہت ادنی لگتی۔ مالک نے گو کہ ایک رقم زبردستی بشیر کے ہاتھ پہ رکھی مگر وہ دوسری گائے کی خریداری کے لیے ناکافی تھی اور غریب کے گھر میں رکھی رقم میں نا جانے برکت کیوں اُٹھ جاتی ہے کہ آتی ہوئی تو نظر آتی ہے مگر جاتی کہاں ہے یہ نہیں پتہ چلتا۔ اب بشیر کا ہاتھ پھر سے تنگ ہو گیا تھا البتہ یہ ضرور تھا کہ جب بھی فارم ہاؤس میں مہمان آ کر ٹھہرتے تو جاتے وقت وہ بخشش کی اضافی رقم بشیر کو ضرور دیتے اب یہ کبھی کم یا کبھی زیادہ ہوتی مگر بشیر کے سکھ کا سانس بنتی۔

زرینہ کی دعا قبول ہوئی اور فارم ہاؤس میں ایک مہمان آیا۔ بشیر کو مالک نے فون کر کے اطلاع دی کہ فارم ہاؤس تیار کر دو۔ آج میرا ایک دوست آ رہا ہے اور دیکھو ان کا اچھے سے خیال رکھنا یہ کچھ دن ٹھہریں گے۔

''جی مالک!'' بشیر نے سعادت مندی سے کہا اور یہ خوش خبری زرینہ کو سنانے چل دیا۔

شام تک وہ مہمان فارم ہاؤس پہنچ گیا۔ اکیلے مہمان کو دیکھ کر بشیر کو بہت حیرت ہوئی اور تو اور جب اُس کا ڈرائیور بھی واپس جانے لگا تو اُسے رہا نہ گیا اور پوچھ ہی بیٹھا کہ صاحب اکیلے ہی رہیں گے کیا، تو ڈرائیور نے اسے بتایا کہ صاحب کو اکیلے ہی رہنے کی عادت ہے۔

جب وہ مہمان کے کمرے میں رات کے کھانے کا پوچھنے گیا تو دیکھا صاحب جی بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے پھر باتوں باتوں نے انھوں نے اپنی اُس خواہش کا ذکر بھی کر دیا جس کے لئے شراب نوشی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ بشیر جانتا تھا کہ سب بڑے لوگوں کے شوق ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ شراب اور شراب کے ساتھ ایک ایسی جوان خوبصورت عورت کا ساتھ کہ اطاعت و فرمانبرداری جس کے پیشے کا پہلا اُصول ہوتا ہے۔ اسی لیے اُس نے نیلو کا نمبر سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جو ایسے وقت میں آ کر بشیر کی مہمان نوازی پر دھبہ لگنے سے بچا لیتی۔ چنانچہ اس روز بھی اُس نے نیلو کو بلا لیا۔ گو کہ ایسا کرتے اُسے بہت عجیب لگتا تو وہ توبہ کرنے لگتا اور اُس رات اس کی واحد پناہ گاہ زرینہ ہوتی۔

دوسرے دن وہ فارم ہاؤس کا گارڈن عبور کر کے برآمدے ہی میں بیٹھ گیا کہ نیلو جب باہر آئے تو وہ پھر اندر جائے۔ کچھ دیر بعد نیلو اپنے پراندے سے کھلتی باہر نکلی اور ہاتھ میں پکڑے پیسے اپنے گریبان میں رکھتے ہوئے اک ادا سے بولی۔

''تیرا یہ صاحب بہت عجیب ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''بشیر نے سوال کیا۔!

'' بشیرے میں جسم فروش ہوں .....اپنے کام کی پکی.....دیانتدار مگر تیرے صاحب نے بغیر محنت کے ہی مزدوری دے دی۔اپنی پوری زندگی میں، میں نے ایسا مرد نہیں دیکھا'' اب حیرت کے سمندر میں ڈوبنے کی باری بشیر کی تھی۔

'' اچھا! مگر ایسا کیوں؟''

''میں کیا جانوں؟''نیلو اٹھلا کے بولی اور کندھے اُچکائے پھر ایک بھرپور انگڑائی لی اور مسکراتے ہوئے چلی گئی۔ بشیر کو پورے دن کئی بار یہ خیال آیا مگر وہ جھٹک دیتا کہ ہوگی کوئی 'مجبوری'۔

پھر دوسری رات آئی۔مہمان نے پھر تقاضہ کیا اور بشیر نے پھر نیلو کو بلا بھیجا اور خود صبح کا انتظار کرنے لگا۔دوسرے دن نیلو نے پھر یہ ہی بتایا کہ آج بھی کچھ نہیں کیا مگر ہاں پیسے پورے دیئے جو طے ہوئے تھے بلکہ آج تو ٹپ بھی دی اور بشیر کو حیران چھوڑ کر اتراتی ہوئی چل دی۔

بشیر اپنے آپ سے ہی اُلجھنے لگا کہ ایسا کیوں ہے؟ دل ایک تاویل دیتا اور دماغ اس کو رد کر دیتا کو کہ یہ اس کا مسئلہ نہ تھا اور نہ ہی اُس پر اثر انداز ہو رہا تھا مگر ایک عام بشر کی طرح بے وجہ ہی اس کی وجہ ڈھونڈنے میں لگ گیا۔دن بیتا اور تیسری رات آ گئی۔مہمان نے پھر خواہش ظاہر کی اور بشیر نے اس کی تعمیل کے لئے نیلو کو طلب کر لیا۔آج اُس نے نیلو کو ایک پارکھی نظر سے جانچا۔نیلو ایک حسین اور مکمل عورت نظر آئی، جواں بدن کے ساتھ خود سپردگی کا تڑکا بھی.....پھر ایسا کیوں؟ اور سب سے بڑھ کر کہ اگر صاحب جی ایسے ویسے نہیں تو پھر کیوں وہ ایسی خواہش کا اظہار کرتے ہیں جس کا آخری سرا ایک ہی نتیجہ پر آ کر سوچ کے سارے در بند کر دیتا ہے۔اُس رات اُسے نیند نہ آئی۔بشیر کو جاگتا دیکھ کر زرینہ نے پھر سے اپنی ضروریات کا لمبا چوڑا حساب اُسے بتانا شروع کر دیا۔مگر وہ ذہنی طور پر کہیں اور تھا زرینہ کی کوئی بھی بات وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔زرینہ کبھی نیلو اور نیلو کبھی زرینہ نظر آتی۔اچانک اُسے ایک خیال آیا۔

صبح پھر نیلو سے سامنا ہوا تو نیلو نے ہنستے ہوئے اُسے انگوٹھا دیکھا کر نفی میں سر ہلا دیا اور اپنی ہنسی دبا کر جانے لگی مگر بشیر نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور چپ چاپ دیکھنے لگا۔

''گوری چٹی، بھرے بھرے بدن اور بڑی بڑی بے باک آنکھوں پر گھنی پلکوں کی جھالر تو کیا صاحب جی تجھے دیکھتے بھی نہیں۔''بشیر کو جب کچھ بھی سمجھ نہ آیا تو پوچھ بیٹھا۔

''نہیں.....''نیلو نے کہا۔

''اچھا! پھر کیا کرتے رہتے ہیں صاحب جی اور تو کیا کرتی ہے ان کے کمرے میں؟''بشیر کے لہجے میں تجسس تھا۔

''کچھ نہیں۔''نیلو نے بیزاری سے کہا۔

''پھر بھی۔''، بشیر نے کریدا۔

''کچھ نہیں بس صاحب جی روشنی کم کر کے غزلیں سنتے رہتے ہیں ہلکی آواز میں اور شراب پیتے رہتے ہیں کم کم پھر جب ان کی پوری بوتل ختم ہو جاتی ہے تو وہ میری جانب لڑکھڑاتے ہو بڑھتے ہیں اور بمشکل میرے قریب پہنچ کو وہیں ڈھیر ہو جاتے ہیں۔پھر میں بھی سو جاتی ہوں صبح ان کے اُٹھنے سے پہلے میں جاگ کر باہر آ جاتی ہوں۔'نیلو نے تفصیل بتائی۔

''تو تیری مزدوری۔'بشیر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''وہ تو میں جیسے ہی کمرے میں جاتی ہوں وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں کہ میز پر رکھی ہے مگر میں بھی وہ پیسے صبح ہی اُٹھاتی ہوں جاتے ہوئے۔''نیلو کے انداز میں ایک شان بے نیازی جھلک رہی تھی۔

''اُوا چھا!''بشیر کے منہ سے نکلا۔

اُس دن دوپہر کے قریب صاحب جی نے بشیر سے کہا وہ باہر جا رہے ہیں شام تک لوٹ آئیں گے۔اُن کے جانے کے بعد بشیر اُن کے کمرے میں گیا۔پہلے تو کمرے کی صفائی کی اس دوران اُس کی نظر شراب کی خالی بوتلوں پر پڑی۔بڑے سائز کی تین خالی بوتلیں وہاں ہی پڑی تھیں۔بشیر بلا ارادہ ان بوتلوں کو اُٹھا کر پہلے دیکھنے اور پھر سونگھنے لگا۔ولایتی دارو کی خوشبو اُسے اچھی لگنے لگی وہ ایک بوتل کو منہ لگا کر چاٹنے لگا پھر دوسری اور پھر تیسری.....کمزور پُشتے پر تیز بہاؤ کا پہلا وار ہی کافی ہوتا ہے اچانک بشیر کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

جب وہ گھر پہنچا تو زرینہ اپنے کاموں میں مشغول تھی۔وہ خاموشی سے زرینہ کو دیکھنے لگا۔زرینہ کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ بشیر اُسے غور سے دیکھ رہا ہے تو اس نے اچانک پیٹھ موڑی اور بشیر کے سامنے ہو کر بولی،'ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'

پھر نا جانے بشیر کو کیا سوجھی کہ اس نے زرینہ کو سب بتا دیا۔نیلو کا روز روز صاحب جی کے بلانے پر آنا اور صاحب جی کا بغیر کچھ کیے نیلو کو پیسے دے دینا۔زرینہ کی آنکھیں یہ سب سن کر پھیلتی چلی گئیں۔وہ خاموشی سے سب سن رہی تھی اور حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہی تھی کہ بشیر نے ٹھہرے پانی میں پتھر پھینکتے ہوئے یک دم کہا۔!

''کیا تو نیلو کی جگہ لے سکتی ہے؟''زرینہ نے زور سے جھرجھری لی اور بے اختیار بولی۔

''نہیں.....!''خفگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔مگر بشیر کے ذہن میں دلایتی داور کی خوشبو ابھی تک رچی بسی تھی جبھی سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''دیکھ صاحب جی کچھ کرتے تھوڑی ہیں اور مفت میں پیسے دے دیتے ہیں۔ذرا دیکھ ہمارے کئی کام بن جائیں گے۔''زرینہ خاموشی سے اِدھر سے اُٹھ گئی۔مگر بشیر کو اس کی خاموشی میں رضامندی نظر آنے لگی۔

شام میں صاحب جی واپس لوٹ آئے تھے اوران کا ڈرائیور پھر واپس چلا گیا باتوں باتوں میں اُنھوں نے بتایا کہ وہ بس دو دن اور رکیں گے پھر چلے جائیں گے اور یہ بھی کہ وہ بشیر کی خدمت سے بہت خوش بھی ہیں اس خوشی پر بشیر کو انعام بھی دیں گے مگر بشیر تو کوئی اور ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ جب وہ واپس آنے لگا تو صاحب جی نے پھر اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے متانت سے کہا بس دو دن اور تم میری خدمت کر دو۔ بشیر نے حیرانگی سے صاحب جی کو دیکھا مگر کچھ پوچھ نہ سکا۔ گھر واپس آ کر اُس نے رزینہ کو سمجھانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اُس نے دیکھا زرینہ سر پر دوپٹہ باندھے بازو ماتھے پر رکھے سو رہی تھی یہ زرینہ کی طرف سے احتجاج کا وہ انداز تھا جس سے بشیر بخوبی واقف تھا۔ سو اس نے پھر رات نیلو کو بلا بھیجا۔

آج نیلو بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی وہ شاید شام میں ہی نہائی تھی جبھی اس کے کھلے کھلے ہوا میں اُڑتے بال، نکھرا نکھرا سجا سنورا چہرہ، خود سپردگی کی دعوت دیتا وجود ذہن اور دل میں ہیجان برپا کر رہا تھا۔ بشیر نے جونہی نیلو کو دیکھا اس کے اپنے دل کی دھڑکن بڑھنے لگی۔ اس بڑھتی دھڑکن کی تھاپ میں ایک خواہش جنم لی رہی تھی۔ اچانک اس نے نیلو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ نیلو نے کوئی مزاحمت نہیں کی مگر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ بشیر کا پورا وجود سراپا خواہش بنا ہوا تھا اور نیلو جو ایک طوائف ہونے کے ناطے احساسات، جذبات اور جسم کی زبان بہت اچھے سے سمجھتی تھی بولی۔

''دیکھ بشیرے! میں تو طوائف ہوں اپنے جسم کی بیوپاری..... پھر جو بھی چاہے خرید لے۔ ہمارے پیشے میں گاہک کا کوئی معیار نہیں ہوتا بس وہ اس کی قمت دینے کا اہل ہونا چاہیے۔، تجھے تو اچھی طرح معلوم ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ بشیر کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ وہ جانتی تھی کہ غریب ضروریات کی قید سے ہی آزاد نہیں ہو پاتا عیاشی کے خواب کا تصور تو کر سکتا ہے مگر دیکھ کر تعبیر نہیں کر سکتا۔ بشیر کو نیلو کا اس طرح ہاتھ چھڑانا اچھا نہ لگا۔ نیلو کے الفاظ نے اس کے اندر کے مرد کو جھنجوڑ دیا۔

''ہاں ہاں جانتا ہوں سب جانتا ہوں۔ مگر تو یہ بھی تو دیکھ کہ میں تجھے ہی پیش کرتا ہوں حالانکہ میرے پاس اور بھی ہیں۔ تجھے تو اپنے دھندے کے سارے اُصول بھی معلوم ہونگے، کہ بیچ کے بندے کا کمیشن بھی ہوتا ہے۔'' بشیر نے اندھیرے میں تیر چلایا جو صحیح نشانے پر لگا۔ نیلو نے اپنا لہجہ فوراً چاشنی میں ڈبو لیا اور بولی۔

''تو اب تو بھی کمیشن لے گا۔ جیسے دوسرے دلال لیتے ہیں۔ تو نے یہ کام بھی شروع کر دیا کیا۔''

''نہیں میں کمیشن نہیں مانگ رہا مگر احسان کا بدلہ ضرور لوں گا''۔ بشیر نے حتمی انداز میں کہا۔ گو کہ اسے نیلو کا یوں دلال کہنا بُرا تو بہت لگا مگر دل کی مچلتی خواہش نے مصلحت کی چادر کی بکل مار لی۔ نیلو سب سمجھ کر بھی نا سمجھنے کا تاثر دیتے ہوئے بولی۔!

''اب صاف صاف بول۔''

''تو صاف صاف بات یہ ہے کہ اپنے احسان کے بدلے میں، تو اپنی ایک رات دے دے اور

کوئی کمیشن نہیں۔ نہ ابھی نہ آئندہ۔'' بشیر نے کہا۔

''منظور ہے۔'' یہ کہتے ہوئے نیلو نے لمبا سکون کا سانس لیا ورنہ اُسے اپنی کمائی میں کمیشن دینے کا سوچ کر ہی ہول اُٹھنے لگا تھا۔

''ابھی تو جا، پھر جب میں کہوں تو آ جانا۔'' بشیر نے بشاشت بھرے لہجے میں کہا۔ نیلو صاحب جی کے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور بشیر اپنے گھر۔ زرینہ اُٹھ چکی تھی بشیر نے اُس کے ساتھ کھانا کھایا اور اُسے بتا دیا کہ نیلو صاحب جی کے پاس چلی گئی ہے زرینہ مطمئن ہو گئی۔

لیکن اب بشیر نے زرینہ کو پھر سے تیار کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اب وہ نیلو کے ساتھ گزارنے والی رات کے حسین خواب بھی دیکھ رہا تھا۔ اب اُسے زرینہ کی ناراضی کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ اُس کا دل نیلو کے وصال کے خواب کی زد میں تھا اور خواہش بھرے خواب تو ویسے بھی ایسے ان دیکھے پنکھ سے جوڑے ہوتے ہیں جن کی پرواز کی رسائی چاند ستاروں سے بھی آگے کسی ماورائی دنیا تک ہوتی ہے۔ زرینہ کے لئے وہ یوں بھی مطمئن تھا کہ صاحب جی تو بے ضرر ہیں۔ ان سے نقصان کا کوئی اندیشہ ہی نہیں بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ زرینہ نے جب خدا کا خوف یاد دلایا تو بشیر نے کہا۔

''ارے جب صاحب جی کچھ کرتے ہی نہیں تو گناہ کیسا؟'' پھر زرینہ نے زمانے کی اونچ نیچ بتانا چاہی تو اُس نے یہ کہہ کر اُسے سمجھا دیا کہ 'یہ بات بس ہم دونوں میں رہی رہے گی۔ رہے صاحب جی تو وہ کون سا جانتے ہیں کہ تو کون ہے؟' زرینہ بولی۔

''دیکھ بشیرے یہ اپنی آنکھ کی شرم ہوتی ہے۔ اس کا پردہ اگر ایک بار اُتر جائے تو بڑی بربادی ہوتی ہے۔ شریف آدمی جب برائی کا رستہ اپناتا ہے تو اس کا نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔ پھر حرام کی کمائی کسی نشہ کی طرح ہوتی ہے جو عادت بنتی جاتی ہے۔'' مگر بشیر نے اپنی ہوس و خواہش کی تکمیل کے سنہرے خواب میں زرینہ کے خوف کے ہر رنگ کو پھیکا کر دیا۔

اُس رات ایک رشتے میں بندھے ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی بستر پر سونے والے دو لوگوں کے خوابوں کے رنگ مختلف تھے۔ ایک کے خوابوں میں اندیشے، وسوسے، فکرات کے ناگ اور دوسرے کے خواب میں پریاں جن کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی اور ہونٹوں پر ملن کے گیت تھے۔ اگلی صبح بشیر نے نیلو سے پھر پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں!' نیلو نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا' پتہ نہیں صاحب جی کیسے ہیں؟''

''مگر میں ایسا نہیں۔'' بشیر نے اُسے یاد دلانے کے لئے کہا اور نیلو ہنستی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

کمرے کی صفائی کے دوران پھر ایک خالی بوتل بشیر نے اُٹھائی سونگھی اور لبوں سے چاٹنے لگا۔ صاحب

جی اُٹھے اور غسل خانے چلے گئے۔ بشیر اِدھر اُدھر صفائی کرنے لگا اچانک اس کی نظر شراب کی ایک بھری بوتل پر پڑی۔ پھر ایک خیال اُس کے ذہن میں آیا کہ آج رات نیلو میرے ساتھ ہوگی اگر میں تھوڑی سی شراب بھی چرالوں تو میرا مزا دوبالا ہو جائے گا۔ اس خیال نے اُسے زیادہ نہ سوچنے دیا چنانچہ اسنے نئی بوتل سے کچھ شراب خالی بوتل میں اُنڈیلی اور اس کمی کو پوار کرنے کے لیے اس میں پانی ملا دیا۔ پھر اسے اس کی جگہ پر اُسی طرح رکھ دیا جیسے وہ پہلے رکھی تھی۔

آج بشیر کا دن ہی نہیں گزر رہا تھا اور شام آ کر دینے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی وہ کئی کئی بار رات کے بارے میں سوچ چکا تھا۔ اور تو اور وہ زرینہ کو بھی کچھ پیار اور کچھ سختی سے رضامند کروا چکا تھا۔ خدا خدا کر کے رات آئی۔ پہلے اس نے بہت کوششوں سے سمجھا بجھا کو زرینہ کو صاحب جی کے کمرے میں بھیج دیا اور پھر اپنے خالی گھر آ کر نیلو کو بلا والیا۔ نیلو جب کمرے میں داخل ہوئی تو بشیر بیٹھا چوری کی شراب پی رہا تھا۔ پھر نیلو نے بشیر کے احسان کی قیمت چکا دی۔ صبح بشیر کا اُٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا کچھ شراب اور کچھ نیلو کا خمار ابھی بھی باقی تھا مگر زرینہ کے آنے سے پہلے اُسے نیلو کو گھر بھیجنا تھا۔ تاکہ دونوں ہی بے خبر رہیں اور پھر اُسے زرینہ کا انتظار بھی تھا۔

نیلو تو اس وقت تک آ جاتی تھی۔ مگر زرینہ کیوں نہیں آئی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ زرینہ عجیب سی حالت میں گھر میں داخل ہوئی۔ زرینہ کی وہی حالت تھی جس حالت میں نیلو یہاں سے گئی تھی۔ بشیر کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی۔ وہ ایک دم آگ بگولہ ہو گیا اور بے تاب ہو کر زرینہ کی طرف بڑھا مگر اس کے قریب جا کر رُک گیا۔

اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی دن سے نیلو کو دیکھ رہا تھا تو کیا نیلو چھوٹ بولا کرتی تھی یا زرینہ نے خود کو ہی پیش کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اُس نے آگے بڑھ کر زرینہ کے بال پکڑ لیے اور دوسرا ہاتھ اُسے مارنے کے لیے ہوا میں بلند ہوا۔ وہ چیخ چیخ کر زرینہ سے سوال کرنے لگا۔

'بول ایسا کیسے ہوا؟' زرینہ نے سراسیمگی کی حالت میں اُسے بتایا کہ مجھے تو خود نہیں معلوم بس جب میں کمرے میں گئی تو صاحب جی شراب پی رہے تھے اور موسیقی سن رہے تھے۔ پھر جب اُن کی شراب ختم ہو گئی تو وہ مجھے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اُٹھے اور چل کر میرے پاس آئے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولے آج پتہ نہیں شراب نے مجھے ہوش سے بے گانہ کیوں نہیں کیا حالانکہ آج بھی میں نے پوری بوتل پی ہے اور پھر میں میں.....'' زرینہ سے آگے کچھ نہ بولا گیا۔ بشیر کی زرینہ کے بالوں پر گرفت ڈھلی ہو گئی اور ہوا میں بلند ہاتھ اُس کے اپنے ہی سر پر آ گرا۔ وہ زمین پر بیٹھتا چلا گیا اور یہ بھی نہ دیکھا اور سن سکا کہ زرینہ کے ایک ہاتھ میں شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل ہے جس سے خون ٹپک رہا ہے اور لبوں پر جملہ ہے کہ 'بشیرے میں گائے نہیں۔''

(مرکزی خیال احمد ندیم احمد قاسمی کے افسانے ''رئیس خانہ'' سے ماخوذ)

◀◀ ● ▶▶

House# 25 /A Block 2 PECHS Khalid bin Walid Road karachi
03052163750

● افسانہ

● نوشابہ خاتون

پکھیرو

وہ ایک ایک دیوار، ایک ایک دریچہ اور محراب کو بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جنھیں اس نے اپنے خون پسینہ سے سینچا تھا۔ گھر کی ایک ایک اینٹ میں اس کے پسینے کی خوشبو بسی تھی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ صبح اٹھتا، در و دیوار کو حسرت سے دیکھتا، ایک ایک چیز کو جھاڑ تا' پونچھتا' سجاتا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے ایک خاص قسم کی لذت اور طمانیت کا احساس ہوتا۔ محراب کو جھاڑتے ہوئے اس نے دیکھا کہ محراب کے نیچے والی طاق میں اس بار پھر چڑیوں نے گھونسلہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ وہ صبح سے شام تک تنکے چن چن کر لاتیں اور اپنا آشیانہ بناتیں۔ جب گھونسلہ تیار ہو گیا تو ایک چڑیا نے دو انڈے دیے۔ ان انڈوں سے دو بچے نکلے۔ بچے کیا تھے بس گوشت کے لوتھڑے تھے جن کی دیکھ بھال میں دونوں نر مادہ لگے تھے۔

یہ فطرت کا تقاضا ہے، ممتا کا بے لوث جذبہ ہے، جسے قدرت نے ہر ذی روح کو عطا کیا ہے۔ گویا زندگی خدا کے بعد ماں باپ کا دیا ہوا انمول عطیہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کی آبادی میں آج اتنا اضافہ نہ ہوا ہوتا۔

دونوں نر مادہ باری باری چرنے چگنے کے لیے جاتے۔ ایک جاتا تو دوسرا بچوں کی حفاظت کرتا۔ دشمنوں کے حملوں سے بچانے کے لیے اسے اپنے پروں میں سمیٹ لیتا۔ سیو سیو کر اسے بڑا کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پر نکلنے لگے اور جب پوری طرح پر نکل آئے وہ اُڑنے کے لائق ہو گئے تو ایک دن پھُر سے اڑ گئے۔ اپنا گھونسلہ کہیں اور آباد کر لیا۔ وہ بڑے ہی انہماک سے چڑیوں کی ان حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے کہیں کھو گیا' ماضی میں گم ہو گیا۔

چار دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ ہوا بھی طوفانی تھی۔ پورا علاقہ جل تھل بنا ہوا تھا۔ بادو باراں کے زور دار تھپیڑوں نے اس کی جھونپڑی کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کہیں سے ٹین کھسک گیا تھا تو کہیں سے پھونس اُڑ گیا تھا اور کہیں پلاسٹک اُڑ کر دور جا گری تھی۔ بارش کی بوچھار جھونپڑی کے اندر تیزی سے آنے لگی تھی۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ بس ایک پلنگ بھر جگہ بچی ہوئی تھی۔ جس پر بیک وقت تین افراد نہیں سو سکتے تھے۔ جب بیوی بچے کو لے کر سوتی تو وہ بیٹھا رہتا۔ جب وہ لیٹتا تو بیوی بیٹھی رہتی۔ کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو رہی تھیں۔ انھیں بچے کی بڑی فکر تھی۔

''منّا کے بابا!'' اس نے اونگھتے ہوئے شوہر کو مخاطب کیا۔

''اب کی برسات ختم ہوتے ہی ایک کوٹھری کا بندوبست کیجیو۔ اس جھونپڑی میں تو ہم مرجائیں گے۔ اپنا نہیں تو بچے کا خیال کرو۔''

''تو کیا سمجھتی ہو کہ مجھے بچے کا دھیان نہیں ہے۔ مجھے خود اس کی فکر ہے۔ پر کیا کروں، جیب ساتھ نہیں دیتی۔''

''اب دیکھو نا کھانے پینے کا سامان ختم ہورہا ہے۔ پانی کا زور کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے۔ آس پاس کوئی دکان بھی نہیں ہے۔ ایسے میں بچہ تو بھوکا ہی مرجائے گا۔''

خدا خدا کرکے بارش کا زور تھم گیا۔ زندگی معمول پر آ گئی۔ وہ بھی کام پر جانے خدا خدا کرکے بارش کا زور تھم گیا۔ زندگی معمول پر آ گئی۔ وہ بھی کام پر جانے لگا۔ وہ ایک کارخانے میں منشی تھا۔ بہت ہی کم تنخواہ تھی۔ بڑی مشکل سے تین افراد کی گزر بسر ہورہی تھا اور اب ایک کوٹھری کی فکر بھی ہورہی تھی۔ کوٹھری کا مالک چھ ماہ کا ایڈوانس مانگ رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے مالک کو ایڈوانس کے لیے عرضی دے دی تھی لیکن ایک منشی کو ہزار روپے ایڈوانس ملنا مشکل تھا۔ بہت ہی سوچ بچار کے بعد اس نے ایک ٹھیلا کرایے پر لیا جس پر کچھ سبزیاں اور پھل رکھ کر گنجان آبادی والے نکڑ پر بیچتا۔ صبح پانچ بجے اپنا ٹھیلا لگاتا اور نو بجے کارخانہ جاتا۔ وہاں سے واپس آ کر پھر رات کے گیارہ بجے تک سبزیاں اور پھل فروخت کرتا۔ جوڑ جوڑ کر اس نے اتنا پیسہ جمع کرلیا کہ برسات آنے سے قبل ایک کوٹھری کرایے پر لے لی۔ کوٹھری میں آنے کے بعد اس کی رہائش قدرے بہتر ہوگئی۔ فراغت ہونے پر ایک بچے نے اور جنم لیا۔ وہ بچوں کو بڑے جتن سے پال رہا تھا۔ کھان پان سے لے کر پڑھائی لکھائی میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ بچوں کی نت نئی فرمائشیں پوری کرتا۔ بڑے بیٹے نے کہا۔

''بابا اس جاڑے میں مجھے نیا کوٹ چاہئے۔ اب پرانا سوئٹر نہیں پہنوں گا۔ میرے دوست میر انداق اڑاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے! بن جائے گا تو کیوں فکر کرتا ہے۔'' لیکن وہ خود فکر میں ڈوب گیا۔ کہیں نہ کہیں سے کوٹ کے لیے پیسہ کا انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بچے کو ٹھنڈ لگ جائے۔ دیکھتا ہوں شاید مالک تھوڑا ایڈوانس دینے کے لیے راضی ہوجائے۔ ابھی وہ فکر میں ڈوبا ہی تھا کہ چھوٹے بیٹے نے کہا۔

''بابا میرے سارے کپڑے پرانے ہوگئے ہیں۔ مجھے نئی شرٹ چاہئے۔''

''وہ بھی بن جائے گی۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔''

وہ بچوں سے زیادہ خود کو باور کرانے کی کوشش کررہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے بچوں کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔

''بابا مجھے یہ چاہئے' بابا مجھے وہ چاہئے۔''

اس طرح فرمائشوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس نے کبھی بیٹوں کی فرمائشوں کو رد نہیں کیا تھا کہ وہی تو اس کے مستقبل تھے۔ حالات کچھ بہتر ہوئے تو حوصلہ بھی بلند ہوا۔ اس نے اور زیادہ محنت کرنی شروع کردی اور اتنا کچھ حاصل کرلیا کہ زمین کا ایک چھوٹا سا پلاٹ خرید لیا۔ پھر دھیرے دھیرے مکان کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔ بڑی لگن اور بہت ہی محنت مشقت سے اس نے اپنا مکان مکمل کیا۔ لیکن مکان اسے راس نہ آیا۔ بیوی داغ مفارقت دے گئی۔ گاڑی کا ایک پہیہ ٹوٹ چکا تھا۔ اب اسے ایک ہی پہیہ سے زندگی کی گاڑی کھینچنی تھی۔ لڑکے دونوں بڑے ہوچکے تھے۔ لیکن ان کا انداز جداگانہ تھا۔ انھوں نے باپ کو محنت مشقت کرتے دیکھا تھا لیکن خود اس کا مزہ نہیں چکھا تھا۔ وہ بڑے ہی ناز و نعم میں پلے تھے۔ ان کی ہر خواہش، ہر خوشی پر باپ نے خود کو قربان کردیا تھا اور اب بیوی کی جدائی اور جان توڑ محنت نے اسے قبل از وقت بوڑھا کردیا تھا۔ لیکن اپنے بچوں کو دیکھ کر وہ تازہ دم ہوجاتا۔ ساری تھکاوٹیں، سارے دکھ بھول جاتا اور ایک روز تو اس کے پورے جسم میں ایک عجیب سی توانائی بھر گئی تھی۔ وہ برسر روزگار ہوگئے تھے۔ اب اسے کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ایک بات کا دکھ تھا کہ وہ دونوں اس سے جدا ہوکر دور چلے گئے تھے۔ پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ چند دنوں کی تو بات ہے۔ بہت جلد بہوئیں آئیں گی، پوتے پوتیاں ہوں گی تو یہ گھر آباد ہوجائے گا۔ بہوئیں بھی آئیں۔ پوتے پوتیاں بھی ہوئیں۔ لیکن گھر آباد نہ ہوسکا۔ بیٹے اور دور ہوتے ہوگئے۔ ایک دن اس نے دونوں بیٹوں سے کہا۔

''بیٹا! اب میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں۔ بیمار بھی رہنے لگا ہوں۔ کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس لیے سوچ رہا ہوں کہ اس گھر کو کرایے پر اٹھادوں اور تمھارے ساتھ ہی رہوں۔'' باپ کی بات سنتے ہی دونوں بیٹے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ بڑا بیٹا تو خاموش ہی رہا۔ چھوٹے نے کہا۔

''ٹھیک ہے ابھی میں پوری طرح سیٹل نہیں ہوا ہوں۔ جب سیٹل ہوجاؤں گا تو آپ کو اپنے پاس بلالوں گا۔''

پھر جب بھی وہ دونوں فون کرتے یا گھر آتے تو وہ بڑی آس بھری نظروں سے انھیں دیکھتا کہ شاید اس بار وہ انھیں اپنے ساتھ لے جانے کی بات کریں۔ لیکن ہر بار وہ ہفتہ دو ہفتہ سیر و تفریح کرکے چلے جاتے اور وہ حسرت بھری نگاہوں سے انھیں دیکھتا رہ جاتا۔ لیکن آج چڑیوں کی کہانی نے اس پر یہ حقیقت عیاں کردی کہ قانون قدرت یہی ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ لیکن پھر بھی وہ سوچ رہا تھا کہ حیوان اور انسان میں کچھ فرق ہونا چاہئے کیونکہ انسان کو تو اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

406-Lochan EnclaveKankerBagh
Patna-800020 910216686

● افسانہ

● سرفراز جہاں

آشواسن

''ارے رامو! کہاں جارہا ہے؟ بڑی جلدی میں ہے کیا؟''

''نہیں جوجر......نہیں......ہاں حجور ہاں۔آپ کو دیکھا نہیں سرکار!'' رامو جلدی سے بولا جیسے معاملہ سنبھال رہا ہو۔مکھیا جی کے تیور چڑھ گئے۔

''دیکھا نہیں کہ دیکھ کران دیکھا کرتا ہے۔اٹھلاتا ہے بے۔''

''نہیں حجورایسی مجال کہاں؟'' رامو عاجزی سے بولا۔مکھیا جی تھوڑا اور تیور چڑھا کر بولے۔

''اس سال فصل اچھی ہوئی ہے نا۔چربی تو چڑھنی چاہئے تھوڑی......''

''نہیں حجور ایسا نہیں ہے۔آپ ہی تو مائی باپ ہیں حجور۔ایسا کیسے کرسکتا ہوں اپنا بنسیا ہے نا اسکا بڑکا بٹوا راگھب آج بھور بھئے مرگیا ہے۔ہمرا ابھی کھبر ملی ہے۔اسی کے گھر وا جارہے تھے۔'' رامو افسوس کرتا ہوا بولا۔

''ہم تو کام پر اپنے کھیتوا پر جارہے تھے مگر اب سنے پر اسکے پاس جانا جروری ہوگیا نا۔کریا کرم کے لئے سمسان لے جارہا ہے حجور۔اسی سے جلدی میں تھے تو آپ کو نہیں دیکھ سکے اور کونو بات نہیں۔وہاں سے لوٹ کر آتے ہیں سرکار تو آپ کی کھدمت میں حاجر ہونگے۔''

مکھیا جی کچھ نرم پڑے۔افسردگی سے پوچھا۔

'' کیا ہوا تھا لونڈے کو؟

'' کچھ نہیں ہوا تھا سرکار۔نہ سردی نہ کھانسی نہ بکھار آیا۔کچھو نہ ہوا تھا حجور۔رات میں الٹی اور ایک ٹٹی ہوا اور صبح میں چل بسا۔'' رامو کے آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔اس نے چھپا کر پوچھ ڈالا۔پچھلے سال اس کے بیٹے کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا کہ ذری سی سردی کھانسی اور ہلکا سا بخار چڑھا ہوا تھا اور ایک اُلٹی اور ایک پیخانہ ہوا بس۔بھگوان کو پیارا ہوگیا تھا۔یہ سوچ کر رامو اور بھی اداس ہوا اور ٹھنڈی سانس بھرنے لگا۔اتنے میں مکھیا جی نے پھر پوچھا۔

''ڈاکٹر کو نہیں دکھایا تھا کیا بنسیا نے؟

''ہاں حجور! دکھایا تھا۔ڈگٹر صاحب نے دوا دی تھی اور کہا تھا کہ بھور ہوتے ہوتے ٹھیک ہوجائے

گا مگر وہ تو بھور ہونے سے پہلے ہی بھگوان کو پیارا ہوگیا۔

''کون ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔'' مکھیا جی بات پر زور دیتے ہوئے بولے۔

وہی ڈاگٹر صاحب اپنے گاؤں والا...... پریم پرساد۔اتنا چھوٹی سی بیماری میں اتنا جلدی روپے کا بندوبست کر کے سہر لے جانا اور اتنا کھرچ کرنا ہم غریب آدمی کے لئے آسان نہیں ہوتا ہے بابو جی۔اور سمجھ میں بھی نہیں آتا ہے کہ ایسا ہو جائے گا نہیں تو ماں باپ اپنے کو بیچ کر بھی علاج نہیں چھوڑے گا حجور۔مگر یہ سب بھی بھاگیہ کی بات ہے۔'' مکھیا جی تسلی دیتے ہوئے بولے

''ہاں ہاں صحیح کہتے ہو۔جاؤ جاؤ جلدی جاؤ۔میری طرف سے بھی بنسیا کو تسلی دے دینا۔''

ٹھیک ہے حجور،ٹھیک حجور کہتے ہوئے رامو بھاگا۔مکھیا جی نے پکار کر کہا ارے رامو! پھگبوا کو بھی بلا کر ساتھ لیتے آنا۔اچھا مالک اچھا۔کہتا ہوا رامو چلا گیا۔

دوسرے دن مکھیا جی نے اعلان کروایا کہ سب گاؤں باسی پنچائت میں جمع ہوں فلاں وقت فلاں جگہ کسی کام کے سلسلے میں میٹنگ کی جائے گی جس میں سب لوگوں کی حاضری انیوارجیہ ہے۔ ٹھیک سمئے پر سبھی لوگ بتائے گئے استھان پر جمع ہوگئے۔سبھی لوگ پریشان تھے کہ مکھیا جی کون سی بندش لگائیں گے؟ مکھیا جی کیا کر بڑھائیں گے فصل پر یا اپنی زمین پر کام کی مجوری گھٹائیں گے۔سبھی خاموش سوچ میں بیٹھے تھے ابھی تک اوچھن نہیں آیا تھا جو بولنے میں سب سے تیز تھا۔سبھی اسی کا انتظار کر رہے تھے۔سب من من دعا کر رہے تھے کہ مکھیا جی کے آوے سے پہلے اوچھن آ جائے نہیں تو مکھیا جی اسے ڈانٹے گا اور وہ بھی کچھ سے کچھ بول دے گا۔مکھیا آئے اور اسٹیج پر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔اسکی بعد اوچھن آیا مگر اس بار بڑی حیرت ہوئی کہ مکھیا جی نے اسے کچھ نہیں کہا اور ہنس کر رہ گئے آج مجاج بہت خوش بوجھا وے ہے مکھیا جی کا ایسا کیا ہوگیا؟ خیر!

مکھیا جی نے بنسیا کے بیٹے کی موت پر دکھ پرکٹ کیا اور اسکی آتما کی شانتی کے لیے کھڑے ہو کر دو منٹ کا مون رکھا۔پھر پراتھنا کی۔اس کے بعد سبھوں کو بیٹھنے کا حکم دیا اور خود بھی بیٹھ گے۔سبھی لوگوں نے گاؤں کی بری ووستھا اور دینیئے استھی پر وچار ویمرش کیا۔ہر سال یہاں دو چار موت ڈائریا کالی بخار کالی کھانسی نمونیا جیسی مہلک بیماری میں ہوجاتی ہے۔گرمی جاڑا برسات کی شدت سے اور اس سے پیدا شدہ بیماری سے موتیں ہوتی رہتی ہیں۔اسے روکنا ضروری ہے۔اور دو چار مریض تو شہر لے جاتے لے جاتے دم توڑ دیتے ہیں۔سبھوں نے اپنے اپنے وچار مختلف رکھے۔بہت سوچ وچار کے بعد یہ پرستاو پارت ہوا کہ گاؤں کی بھلائی کی خاطر یہاں ایک ہوسپیٹل کا ہونا لازمی ہی نہیں بلکہ بہت ضروری ہے۔سبھوں نے باآواز بلند حامی بھری،ہاں ہاں کیوں نہیں۔بہت جروری ہے سبھی لوگوں کے پاس اتنا روپیہ نہیں رہتا کہ وقت پڑنے پر شہر کی طرف دوڑیں۔

''ہاں حجور! ضرور کچھ کریں۔'' چاروں اور سے آواز گونجی۔

''آپ سے پہلے جو مکھیا جی تھے نہ جو ر۔ان کے جو ری میں منگو دادا کی بیٹی کے پیٹ میں جونک نے کاٹ لیا۔پریم پرساد ڈاگٹر بابو نے اُکرا بچاوے کے بہت کوسس کیا مگر اسکی بٹیا نہیں بچی۔'' مکھیا جی نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

''جونک نے کاٹ لیا.....جونک کیسے کاٹتا ہے؟''

''ہاں سرکار! وہ مری نا تو اسکے منہ ناک سے جندہ جندہ جونک بہت سارا نکلا۔'' سبھوں نے گواہی.....دی ہاں ہاں جو ر۔مکھیا جی کو ماننا پڑا کہ ہاں ایسا ہوا ہوگا۔

''پچھلے سال بدھنا کا بیٹا سروسوا پوکھر میں نہاوے گیا۔اس کے پورے سریر میں جونک لپٹ گیا۔بہت خون چوس لیا سرکار۔اس کا پورا پریوار چھڑاتے چھڑاتے پریسان ہوگیا۔جہاں جہاں جونک نے کاٹا تھا وہاں سے خون کا بہنا بند نہ ہوا تب پریم پرساد نے دوا دیا تب خون بند ہوا۔''

''دو سال ہوا سرکار میری بیٹی بھی مرگئی۔'' کلوا روتا ہوا بولا۔

''میں تو اسے سہر لے جا رہا تھا کہ راستے میں ہی مرگئی۔'' مکھیا جی نے کہا۔

''شہر بھی تو بہت دور ہے۔پریم پرساد کو نہیں دکھایا تھا؟''

''ہاں بابو جی! کھایا تھا مگر اس نے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ڈلیوری کیس رہا سرکار۔وہ بھی کیا کرے جو ر۔مریض اس کے ہاتھ میں نہیں ٹھہرتا۔'' مکھیا جی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''اسی لئے تو میں نے سوچا ہے کہ گاؤں میں ایک ہاسپیٹل کا ہونا میں بہت ضروری ہے۔'' سب نے ہامی بھری اور بدھائی دی۔مکھیا جی نے کہا کہ پہلے میں یہاں کا مکھیا نہیں تھا ورنہ ابتک ہاسپیٹل ک بنوا دیتا۔ابھی بھی کچھ نہیں ہوا ہے.....بن جائے گا۔آسو اسن رکھو۔گاؤں میں آئے دن ڈاکٹر، حکیم، ہاسپیٹل کی ضرورت ہوتی رہتی ہے۔کبھی سیلاب اپنے ساتھ بیماری بہا کر لے آتا ہے اور شہر جانے کی فرصت بھی نہیں دیتا۔کبھی گرمی کے سورج کی تپش لو کی بارش کر دیتی ہے۔کبھی جاڑے سے کانپتی ہوئی دھرتی اپنے میں سمونے کو تیار ملتی ہے۔سال کے ان تین انا کونڈا اجورہ رہ کر گاؤں کو نگلنا چاہتا ہے۔اس سے بچانے کے لئے کچھ تو کرنا پڑے گا۔ابھی تم لوگ جاؤ۔میں سوچتا ہوں کیسے کیا ہوگا؟'' سبھی لوگ خوشی خوشی اپنے گھر یہ بات کرتے آگئے کہ یہ مکھیا گاؤں کا بھلا کرے گا۔

دس دن کی بعد مکھیا جی نے پھر بیٹھک کی اور سبھوں کو بلایا اور بتایا کہ میں عرضی لے کر گیا تھا ہاسپیٹل کے سلسلے میں بات کرنے کو۔سبھی یہ بات جان کر بہت خوش ہوئے۔مکھیا جی نے بتایا کے اس عرضی کو باہر تک پہنچوانا پڑے گا جس کے لئے بہت لمبا خرچ تم لوگوں کو پڑے گا۔میں تو کروں گا ہی، تم لوگوں کو بھی میری مدد کرنی پڑے گی تھوڑی بہت۔سب ایک آواز ہو کر بولے.....''ہاں جو! ر جرور جرور۔آپ بتائیں تو۔''

''تم ملوگ چندہ کر کے جتنا ہو سکے جمع کرو کیونکہ اس کے بغیر کام نہیں ہو سکے گا۔''

''ٹھیک ہے جو ر! پھسل ہو جانے دیں۔'' بیٹھک ختم ہوتے ہی سبھی لوگ اپنے اپنے گھر لوٹنے لگے۔

''چلو ایک سال کا پھسل نہیں سہی۔سمجھ لیں گے کہ اس سال سوکھا پڑ گیا۔''

مکھیا جی کا منشی سب گاؤں والوں سے کہتا کہ تم لوگ کبھی کبھی مکھیا جی کو کچھ بھینٹ پہنچایا کرو تا کہ جلدی کام کرا دیں اور دھیان ادھر ہی لگائیں ورنہ انہیں بہت کام رہتا ہے۔وہ غریب اپنے گھر میں جھگڑا کر کے اپنے بچوں کا آدھار چھین کر مکھیا جی کے گھر دینے لگے کہ ہاسپیٹل جلدی تیار ہو جائے گا۔فصل کٹی تو سبھی کسان فصل کی بکری مکھیا جی کے پاس الگ الگ جمع کر دی۔گھر میں عورتیں کلیجہ پیٹ کر اور رو کر رہ گئیں۔''سال بھر بچوں کو کیا کھلاؤں گی۔''

مکھیا جی کبھی کلو کبھی راموا اور کبھی بدھن میاں سے گھر کا کام کروا لیتے تھے۔مفت کی چاکری بھی ہوتی رہی اور ایسا کرتے بہت دن گزر گئے۔کبھی کوئی سر پھرا کسان مکھیا جی سے بھینٹ ہونے پر دعا سلام کے بعد ہاسپیٹل کے بارے میں پوچھ لیتا مکھیا جی کبھی سمجھا کر کہتے اور کبھی غصہ ہو کر کہتے علاء الدین کا چراغ ہے کیا کہ گھسا اور ہاسپیٹل حاضر۔کوشش تو کر رہا ہوں۔میں اس ہفتے بھی منسٹر کے پاس گیا تھا۔کہا ہے کہ کام ہو جائے گا۔

سبزی پھل پہنچاتے پہنچاتے پانچ برس بیت رہے تھے۔اب نیا چناؤ آنے والا ہے۔اب پھر ووٹ اسی کو دینا پڑے گا۔پانچ سال کے لئے مکھیا اسے ہی بنانا پڑے گا۔ پانچ سال تک گلامی اس کی اور کرنی پڑے گی ورنہ ہم لوگوں کا سب روپیہ پیسہ، محنت، پھل پھلیری پہنچانا سب اکارت ہو جائے گا۔

اس مکھیا کو آٹھ برس ہو گئے۔نہ علاء الدین کا چراغ ہاتھ لگا نہ ہاسپیٹل بنا۔ وہی ڈاکٹر پریم پرساد تھا۔وہی رونا وہی گانا وہی قصہ پرانا.....صرف تھا آسو اسن اور ایک آشا۔

◂◂ ● ▸▸

4928 Friar Ave Fremont ,CA ,U S A

● افسانہ

● صفیہ شاھد

نیلا پردہ گلابی کناری

''یہ کیا کر دیا.....اتنے قیمتی پردے کیوں برباد کر دیئے؟''

ابھی میں نے چند بخیے ہی ادھیڑے تھے کہ اماں عین سر پر آ کھڑی ہوئی۔ میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے سلائی واضح نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں نے ہاتھوں کو رکنے نہیں دیا۔ جہاں بخیہ ہاتھ نہ لگتا وہاں سے کپڑا الگ اطراف میں کھینچ کر سلائی ادھیڑ دی۔ ایک ایک بخیہ نکالنے پر میرے دل نے ہزار ترلے کیے اور میرے پاؤں پڑتا رہا.....مگر پاؤں پڑنے سے کیا ہوتا ہے، بخیے ادھیڑنے کا کام تو شاید وہ احساس کر رہا تھا جو اپنی تمام تلخ حقیقتوں سمیت میری رگوں میں اتر چکا تھا۔ میں نے ساری کی ساری نیلی کناری ادھیڑ کر رکھ دی۔

اماں کے کمرے میں گلابی پردہ اور میرے کمرے میں یہ نیلے رنگ کا پردہ میں نے بڑے ارمانوں سے لگایا تھا..... ہلکے نیلے رنگ کا جالی دار پردہ جس پر لگے گولڈن موتی اتار دیئے تھے میں نے۔ البتہ کناریوں پر ذرا زیادہ گہرے نیلے رنگ کی لیس تھی، نہ جانے کیوں اسے لگا رہنے دیا.....شاید وہ نیلے رنگ کا ہی ایک شیڈ تھا، تو شیڈ کی خیر ہے بس رنگ نیلا ہونا چاہیے۔ جب جب پردہ پنکھے کی ہوا سے لہراتا مجھے اپنا آپ بہت خاص محسوس ہوتا اور ایک سرشارسی مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل جاتی۔ جب سے اس نیلے رنگ سے میں نے خود کو جوڑا تھا ایک اذیت اور اطمینان باری باری میرے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے نیلے رنگ سے میری یہ انسیت گل خان کی ریڑھی سے شروع ہوئی تھی۔ سردیوں کی وہ ٹھٹھرتی شام مجھے رنگوں کی تخصیص میں ڈال گئی جب ایک خاتون گل خان سے گلی کے نکڑ پر کھڑی بحث کر رہی تھی۔

''خان بھائی! گلابی جرابیں ہی چاہئیں۔'' خاتون نے گلابی رنگ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

''نیلی یا کالی لے لو باجی۔'' گل خان کو تو بس بیچنے سے غرض تھی۔

'نہیں خان بھائی! نیلی تو لڑکوں کے لیے ہوتی ہیں۔'' اس جملے کو سن کر میرے پیر وہیں جم گئے۔

''مجھے میری بیٹی کے لیے گلابی جرابیں ہی چاہئیں۔'' خاتون بضد تھیں۔

''واااا وا.....رنگوں سے کچھ نہیں ہوتا باجی! یہی لے جاؤ۔ سردی ہی روکنی ہے۔ لے جاؤ لے

جاؤ۔'' گل خان پیشہ ورانہ انداز میں بولتا رہا اور جرابیں ترتیب سے رکھتا رہا۔ وہ دن اور آج کا دن نیلے اور گلابی رنگ میں سے اپنے رنگ کی تلاش کا جنون میری ذات کا حصہ بن گیا۔ محض دو رنگوں میں سے ایک کے انتخاب کا سفر میری زندگی پر محیط نکلا۔ گلابی رنگ کے پیچھے دوڑتے دوڑتے پیر لہولہان ہو جاتے اور سرخ خون کو دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگتا۔ مجھے یوں لگتا کہ کسی اندھیری کوٹھڑی میں قید ہوں میں جس میں میری سانس رک رہی ہے مگر میرا ہونا دکھائی نہیں دے رہا۔ یہ ہو کر بھی نہ ہونے کا احساس پل پل میری جان لیتا رہا۔ زیست کے اس سفر میں آج تک کہاں کہاں ان رنگوں کی لڑائی نہ لڑی تھی میں نے..... یہاں تک کہ بازاروں سے گزرتے ہوئے گلابی خوشبو اور نیلی خوشبو میرے وجود تک آ کر ضم ہو جاتیں اور ایک عجیب ناگوار ملی جلی سی بدبو نما خوشبو پھیل جاتی۔

''جلیل کاسمیٹکس'' کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہر مرتبہ میری نظر شیشے سے دکھائی دیتی ہوئی رنگ برنگی چوڑیوں کی جانب بھٹکتی تھی۔ میری کلائیوں میں گلابی رنگ پھڑکنے لگتا۔ نیلی تنی ہوئی رگیں اپنی جگہ حیران پریشان رہ جاتی تھیں۔ مگر میں نے کبھی قدموں کو اس جانب مڑنے نہیں دیا یہاں تک کہ اس کوشش میں نیلا اور گلابی درد میرے پورے جسم پر حاوی ہو جاتا۔ مجھے وہ دن بھی نہیں بھولتا جب جلیل کاسمیٹکس کی دکان والا زبردستی مجھے دکان میں لے گیا تھا۔

''ارے رک..... یہ سامان اٹھوا کر لے آ۔ اتنا سامان وہ رکشے والا منحوس یہیں اتار گیا کہ دکان کے آگے نالے کی کھدائی ہو رہی ہے، آگے نہیں جا سکتا۔'' میرے اندر سمائے نیلے رنگ نے سامان کے تھیلے اٹھانے پر اکسایا۔ دکان کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے خود کو رنگوں کی پل صراط سے گزارا تھا۔

''لے آ.....لے آ.....'' جیلے نے دکان کھولی اور اندر چلتا گیا۔ میرے قدم ایک لمحے کو سست پڑے مگر نیلے رنگ کی گرفت سامان پر مضبوط تھی اور گلابی چوڑیوں نے آنکھوں میں چمک بھر دی تھی۔ میں نے سامان رکھتے ہی خود کو غیر ارادی طور پر شوکیس کی جانب لپکتا محسوس کیا۔

''کچھ چاہیے کیا؟'' جیلے نے میری کمر پر ہاتھ رکھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔

''نن نہیں.....نہیں تو.....'' جیلا آہستہ آہستہ نیچے تک کمر پر ہاتھ پھیرتا چلا گیا۔ میرے ماتھے پر پسینے پھوٹنے لگے۔

''ہٹو.....ہٹو..... نیلے رنگ نے پوری طاقت سے جیلے کو دھکا مارا مگر گلابی کمر جیلے کے بازو کے گھیرے میں قید ہو گئی۔

''رک جا.....کچھ نہیں کہتا..... یہ لے جا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر میک اپ کے ریک سے بغیر دیکھے کچھ اٹھایا اور میرے ہاتھ میں رکھ کر مٹھی دبائی۔

''پکڑ.....'' اس نے زبردستی میری مٹھی بند کی۔

''کوئی دکان میں کیوں نہیں آجاتا؟''میرے سہمے ہوئے دل نے دبی دبی سی دعا کی اور میں نے کھدائی والی مٹی کو دیکھا۔دولڑکیاں مٹی پر پیر جمائے احتیاط سے دکان کی جانب بڑھ رہی تھیں۔جیلے نے بھی میری نظروں کے تعاقب میں باہر کی جانب دیکھا تو جلدی سے چھوڑ دیا۔

''چل جا.....کچھ چاہیے ہو تو آجانا۔''دکان سے نکلتے وقت میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔جاتے ہوئے پیر بہت احتیاط سے رکھے تھے مگر آتے ہوئے نالے کی مٹی میرے لڑکھڑانے کے سبب جوتوں میں بھر گئی تھی۔میں نے گھر جا کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور مٹھی کو کھول کر دیکھا۔جیلے نے مجھے ایک سرخی دی تھی۔میں نے خود کو شیشے میں دیکھا۔میرے ہاتھ ہونٹوں کی جانب بڑھے.....شوخ بھڑکیلے ہونٹ ایک لمحے کو اچھے لگے۔مگر اگلے ہی لمحے میرا دل چاہا کہ کوئی اور میرے سامنے ہوتی جس کے ہونٹوں پر یہ لالی سجی ہوتی۔یہ نیلے رنگ کی کارستانی تھی۔میں نے سرخی بستر پر پڑے میرے دھلے ہوئے مردانہ کپڑوں کے ڈھیر پر پھینکی اور سیڑھیوں کی جانب دوڑ لگادی۔

ڈھولک کی تھاپ اور رنگوں کی چھاپ سے میری لڑائی جاری تھی۔اس لڑائی کا ہر زینہ دکھ کے پلستر سے مضبوط ہوا تھا۔اماں جی نے مجھ سے نہیں چھپایا تھا کہ ایک سڑک کے کنارے سے وہ مجھے ایسی حالت میں اٹھا لائی تھیں کہ فروری کی سردی نے شاید کچھ نرمی دکھا کر ابھی میرے ہونٹوں اور ناخنوں میں ہی نیلاہٹ بھری تھی۔یہ نیلا رنگ میری قسمت میں شروع سے موجود ہے کہیں۔ہوسکتا ہے میرے آنسو بہہ بہہ کر کانوں کے پیالے میں جمع ہوئے ہوں۔مگر مجھے معلوم ہے،کانوں کے پیالے بھرنے کے بعد میرے آنسو بہہ کر مٹی میں ملے ہوں گے یا اگر کوئی چادر مجھ پر تھی تو اس میں جذب ہوگئے ہوں گے۔جس لمس نے ان آنسوؤں کو صاف کرنا تھا وہ تو چادر میں لپیٹ کر کھلی سڑک پر چھوڑ گیا تھا۔اماں مجھے اٹھا کر لے آئی لیکن قسمت کے نیل مصلحت کی کسی سفیدی سے نہیں چھپتے۔اور اس کا مزید اندازہ تب ہوا جب ذرا عمر کے گھوڑے پر سواری کی اور بے وفا زیست کے چند زینے اور طے کیے۔اب آنسو گالوں پر پھسلنے کے بجائے اندر گرنے لگے۔ان کی نمکینی کڑواہٹ میں بدلنے لگی اور اندر رنج وغم کا تھوراگنے لگا جس کے سب کانٹے ہر ہر انتڑی میں پیوست ہوگئے۔

اماں مجھے اپنا سہارا مانتی ہے۔میرے بازو پر بنی مچھلیاں یہ اشارے دیتی ہیں کہ میں طاقتور ہوں۔اماں مجھے چھپاتی نہیں تھی،سب کے درمیان رکھنا چاہتی تھی۔مگر جب'' پورے''اپنی کالونی میں میرے وجود پر اعتراض کرنے لگے اور گرو مجھے اپنے خاندان میں لانے کی ضد کرنے لگے تو اماں مجھے لے کر یہیں گرو کے قریب آبسی۔اماں نے مجھے میک اپ سے بچایا،مجھ سے گھنگھرو چھپائے لیکن زمانے کی نظروں میں میرے لیے کوئی ایک رنگ سجانے میں ناکام رہی۔وہ میرا حوصلہ بڑھا کر مجھے باہر کام کے لیے بھیجتی ہے۔باہر جاتے ہوئے میرے کچھ حصے گھر میں ہی رہ جاتے ہیں اور گلابی پردے سے لگ کر سسکتے

ہیں،جبکہ باہر سے واپس آکر نیلے پردے سے لپٹ کر کچھ حصے باقی کا گریہ کرتے ہیں۔اماں کو معلوم نہیں کہ چلتے چلتے کب مجھے دو حصوں میں بٹنا پڑتا ہے،سودا سلف اٹھاتے ہوئے میرا وجود نیلے رنگ کو اوڑھ لیتا ہے اور جسم میں جوش بڑھنے لگتا ہے،طاقت کے نشے کا سرور رگ رگ میں اتر جاتا ہے۔مگر گھر واپس آکر شیشے کے سامنے آتے ہی گلابیاں چھلکنے لگتی ہیں۔میں نے کئی مرتبہ شیشے کے سامنے بیٹھ کر گلابیوں پر ملال کیا۔بالوں میں پھیرنے کو جب جب ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ ایک خاص ادا سے لہرا جاتا اور انگلیاں بھی نزاکت سے لہرا کر بالوں میں پیوست ہو جاتیں۔مجھ سے ہاتھ کا یوں لہرانا برداشت نہیں ہوتا جبھی تو پٹھے اکڑا کر ذرا تیزی سے بالوں کی جانب ہاتھ بڑھایا،اس کوشش میں انگلیاں اور ہاتھ تو سیدھے رہتے مگر کندھا لچک کھانے لگتا،بازو لہرانے سے باز نہ آتا اور گردن بھی دائیں جانب ہلکا سا جھٹکا کھا جاتی۔کچھ میں نے دو رنگوں کی یہ لڑائی اپنی مرضی سے اختیار کی تھی اور کچھ حالات وواقعات کھینچ کھینچ کر مجھے اس میدان جنگ میں لے آتے تھے۔میرے ذہن کو کچوکے لگانے میں اس سبزی فروش کا کردار بھی ناقابل فراموش تھا جو گلی میں اکثر آتا تھا اور اماں آواز لگاتی تھی۔

''نور محمد.....!''اس دن بھی اماں نے سلائی مشین کے پاس بیٹھے بیٹھے آواز لگائی تھی۔

''ہاں اماں.....کیا ہوا.....؟''باہر سبزی والا آواز لگا رہا ہے جاؤ سبزی لے آؤ۔کچھ بنالوں کم بخت گیس پھر چلی جائے گی۔''میں نے دوڑ لگادی۔سبزی والے سے ایک پاؤ بھنڈی کہی تو اس نے مجھے گاجر،مولی،اور کھیرا اٹھا اٹھا کر ان کا ریٹ بتانا شروع کر دیا۔مجھے لگا اس نے غلط سنا تھا میں نے ہکلاتے ہوئے تصحیح کی۔

''نہیں نہیں.....بھنڈی!.....مگر بھائی.....نہیں ٹھیک ہی سنا تھا۔میں نے اس کی ذومعنویت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔مگر جب اس نے سبزی کے ہر شاپر میں نظر بچا کر خراب ٹماٹر اور گلی سڑی مرچیں ڈالیں تو میرے گلابی رنگ چھلک پڑے اور گلابی لہجے پر سوار الفاظ دہن سے باہر کود پڑے۔

''کانا ٹماٹر کیوں ڈال رہا ہے؟''میں نے غصیلے لہجے میں کہا جسے اس نے مکمل نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔

ملاوٹ نہیں بھاتی تھی مجھے.....یہ ملاوٹ کہیں کا نہیں رہنے دیتی انسان کو۔مگر''پورے''یہ سب نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ ان کے پاس آنے والے رنگ برنگے نوٹ بھی آخر میں ایک ہی عدد بن جاتے ہیں۔رنگوں کے فرق تو میری دنیا میں تھے۔انہی خیالوں میں دہلیز پر پاؤں دھرے ہی تھے کہ اماں پر نظر پڑی۔اماں اپنی آنکھوں کے عین سامنے سوئی کو دو انگلیوں میں دبائے بیٹھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں دھاگا تھا جسے بار بار ہونٹوں کے درمیان دبا کر گیلا کرتی اور سوئی کے ناکے سے گزارنے کی کوشش کرتی۔کافی دیر کوشش کرنے کے بعد اماں نے مجھے پکارا۔''نور محمد.....!''میں نے گہرے خیالوں سے غوطہ کھا کر سر باہر نکالا۔

''ہاں اماں.....!''

''یہ سوئی میں دھاگہ ڈال دے۔سب دھواں دھواں لگ رہا ہے۔''اماں کو ایسے دیکھ کر مجھے یہ بات اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اب سلائی کڑھائی سے زیادہ دن تک چولہا روشن نہیں رہ سکتا۔میں نے کام کا ارداہ کر لیا تھا اور اسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے الیاس بھٹے والے سے کام کہا تو پہلے وہ مسکرایا پھر کہنے لگا۔

''کم سے کم پندرہ سولہ اینٹیں ڈھونے کے لیے بھی کمر تختہ ہونی چاہیے۔تم ان نزاکتوں سے وہی کام لو جو لینا چاہیے۔اگر شام کو آجاؤ تو خوب رونق رہے گی۔'' آنکھ دبائے مونچھوں کو تاؤ دیتا الیاس مجھے جیلے جیسا خبیث لگا۔

واپسی کے تمام راستے جیلے کی دی ہوئی لیپ اسٹک،اس کا کمر پر ہاتھ پھیرنا،ٹھیکدار کا مشورہ،اماں کی دھندلائی آنکھیں، پیٹ میں دہکتا بھوک کا دوزخ،دورنگوں کی لڑائی،خواہشوں کا روگ،حسرتوں کا سوگ، قدرت کی ناانصافی کا گریہ اور دم توڑتے شکووں کی آخری ہچکیوں کی زد میں میرا پورا وجود گھرا رہا۔آنسو بہہ بہہ کر گریبان میں جذب ہوتے رہے۔رنج کی انگلی تھامے صحن کے بیچ و بیچ میری غمگین آنکھیں کمروں کے دروازوں میں لٹکتے پردوں پر جا ٹھہریں۔اپنے اصل سے لڑائی اتنی آسان نہیں ہوتی۔میرے اندر گھٹن اور اضطراب نے شدت اختیار کر لی مجھے اور کچھ سجھائی نہ دیا تو میں نے بھاگ کر میرے کمرے کے دروازے کے آگے سے نیلے پردے کو کھینچ لیا۔کیلوں سے اٹکا اماں کے کمرے کا گلابی پردہ بھی چرتا ہوا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے نیلے پردے کی کناری ادھیڑ دی اور کانپتے ہاتھوں سے گلابی پردے کو کاٹ کاٹ کر پٹیاں بنائیں اور بے ڈھنگی سی لیس نما گلابی فرل بنا کر جیسے تیسے نیلے پردے کے ساتھ لگا دی۔دورنگوں سے سجا یہ پردہ مجھے بہت عجیب احساس سے دوچار کرنے لگا۔میں اچھی طرح جان گیا کہ کوئی ایک رنگ میرا نہیں ہے۔یہ دورنگوں کا امتزاج ہی میری نیم پلیٹ تھا۔شکست کا احساس،کرب اور اذیت کی لہریں دورنگوں میں لپٹ کر میری آنکھوں کے راستے میرے پورے وجود میں اترنے لگیں۔میں نے گلی والا دروازہ کھولا اور پردہ دروازے کے باہر لٹکا کر اپنے آنسو صاف کرتا اندر چلا آیا۔اماں کو اب گھنگھرو مجھ سے چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔

◂◂ ● ▸▸

Al-Rahim General Store,House N0-146,
Gali no-13,Nai Abadi,Khanna Pul,
Rawalpindi(Pakistan)
03368813369

● **افسانہ**

● **روبینہ فیصل**

خصوصی اجازت نامہ

کرونا کا وہ مریض جانتا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو نہ چھو سکتا ہے نہ قریب سے دیکھ سکتا ہے، پھر بھی وہ انہیں آخری دفعہ دور سے ہی سہی مگر دیکھنا چاہتا تھا۔اسے احساس تھا کہ وہ اس دنیا میں اب کچھ ہی گھنٹوں کا مہمان ہے۔بیس سال پہلے جب وہ دنیا کے اس ترقی یافتہ ملک میں آیا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک پسماندہ ملک سے ترقی یافتہ ملک میں ہجرت کرنے کے باوجود اس کی موت اتنی ہی لاوارث اور بے یارومددگار ہو گی جتنی کے اس کے اپنے ملک میں ہو سکتی تھی۔برسوں کا یہ سفر اور ترقی کا یہ راستہ کتنا بے معنی تھا۔جس دنیا کو ٹیکنالوجی نے جوڑ کر ایک گاؤں بنا دیا تھا،اسی دنیا کو ایک ننھے سے جرثومے نے پھر سے بکھری ہوئی دنیا بنا ڈالا تھا۔دلوں کے فاصلے،جسمانی فاصلوں میں بدل چکے تھے۔

''خدیا!! تو کیا تیرا قہر اس جرثومے کی صورت ہم پر برس رہا ہے۔لیکن میں نے تو آج تک کوئی ایسا گناہ نہیں کیا جس کی ایسی سزا مجھے ملے کہ آخری سانسیں اپنے پیاروں سے دور لوں؟''

''خدا کرے تم ایسی موت مرو کہ تم پینے کو پانی مانگو اور کوئی اپنا تمھیں پانی نہ پلا سکے۔تم نے جس 'زندگی' کی خاطر مجھے ٹھکرایا ہے وہی 'زندگی' تم پر عذاب بن کر ٹوٹے.....!''سنسناتی ہوئی یہ آواز یک دم اس کے ماضی کے دریچوں سے نمودار ہوئی اور اس کے کان کے پردوں کو پھاڑتی گئی۔اس نے بے اختیار کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

''کیا کانوں میں بھی درد شروع ہو گیا ہے؟'' نرس سیفٹی لباس میں منہ پر ماسک پہنے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔وہ اسے کیا بتاتا کہ ایک غریب، بے بس اور معصوم روح کو استعمال کر کے راستہ بدلنے کی سزا خدا نے سنانی ہی سنانی تھی۔

''مجھے میرے بیوی بچوں سے ملوا دو۔خدا کا واسطہ.....میری آخری خواہش ہے.....انسانیت کی خاطر.....خدا کے واسطے میں صرف دور سے دیکھوں گا۔''اس کے بجائے وہ بولا اور پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔نرس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔یہ مریض درد کی شدت اور سانس بند ہونے کی تکلیف سے کم چلاّ تا تھا، اپنے پیاروں سے ملنے کو زیادہ تڑپتا تھا۔سب جانتے تھے یہ کسی بھی لمحے مر سکتا ہے۔اس مریض کے لئے کورنا وائرس کا حملہ جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔مریض کی کل کمائی اس کے بیوی بچے ہی تھے، اس کی سب محبتیں اپنے

گھروندے کے لیے محدود تھیں۔ وہ محبتوں کی ساری شدتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید رکھتا تھا۔ وہ بچوں کو 'میری زندگی' اور خود کو سب سے برتر سمجھنے کا فلسفہ گھول گھول کے پلایا کرتا تھا۔ اس نے دن رات محنت کر کے اتنی دولت اکھٹی کر لی تھی کہ دنیا کو رشک اور حسد میں مبتلا کر سکے۔ نئی نئی گاڑیاں، بڑا سا محل نما گھر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بچے، ہر سال دنیا کے کسی بھی ملک کا ایک ٹرپ.....ایسی زندگی جس کی خواہش میں کروڑوں لوگ مر جائیں۔ وہ ایسی ہی زندگی جی رہا تھا۔ یہ سب کچھ اچانک یورپ کے ٹرپ سے واپسی پر ہی ہو گیا تھا۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ کرونا پوزیٹو ہو گیا۔ وہ اس کرونا کے قرنطینہ کو بھی زیادہ سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ اسے کینڈا کے ہیلتھ کے نظام پر مکمل بھروسہ تھا۔ اب بھی مرتے دم تک اسے یقین تھا کہ کم از کم وہ اس کی فیملی کو اس سے ضرور ملا دیں گے۔ اسی انسانیت کی خاطر تو اس نے اپنا ملک چھوڑا تھا، جہاں انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ آخر کار ڈاکٹروں نرسوں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس وبائی مرض میں انہوں نے اسے اس کے خاندان سے ملوانے کا وعدہ کر لیا۔ ہسپتال والوں نے دن رات ایک کر کے صفائی ستھرائی کی اور وزیٹرز کی سیفٹی کو مکمل طور پر یقینی بنانے کے بعد اس کے گھر فون کیا گیا۔ مریض کی بیوی نے فون اُٹھایا۔ نرس نے مریض کی آخری خواہش بتائی اور ساتھ میں اس کی تسلی کی خاطر ساتھ میں ہسپتال کے تمام خصوصی انتظامات کے بارے میں بھی آگاہ کیا۔ فون سپیکر پر تھا، بچے بھی سن رہے تھے، سب نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ بچوں کا وہ انکار نرس تک پہنچا دیا۔ یہ سن کر نرس بہت حیران ہوئی اور اس نے ایک بار پھر تمام حفاظتی انتظامات کی یقین دہانی کروائی پر ماں کا انکار اٹل رہا۔

''ماں بن کے نہ کہہ رہی ہیں۔ بیوی بن کر سوچیں، بچے نہ سہی آپ ہی آ جائیں۔'' نرس نے اسے سمجھانا چاہا۔

''میری طرف سے بھی انکار ہے۔ جب وہ یورپ کے ٹرپ پر جا رہے تھے تو ہم نے بہت منع کیا تھا۔ شکر ہے مرض کی علامتیں جہاز میں ہی شروع ہو گئیں اور وہ سیدھے ہسپتال چلے گئے ورنہ ان کے فیصلے کی سزا ہم سب بھگتتے۔ ہم ان کے لئے یہیں سے دعا کر دیں گے۔''

نرس کی آنکھیں ہی نہیں دل بھی بھر آیا۔ اس نے فون رکھنے سے پہلے دل میں دعا کی ''اے اللہ! جب میں اس مریض کے کمرے میں جاؤں تو اس کی منتظر آنکھیں، جو کل سے 'خصوصی اجازت نامہ' ملنے کے بعد چمک رہی تھیں، بند ہو چکی ہوں۔'' اس کے اندر مریض کو 'موت سے زیادہ مردہ' خبر سنانے کی ہمت نہیں تھی!!!

◂◂ ● ▸▸

3615 rainpark court Mississauga,ontario.
canada.L5M 6X6-ph#14379826601

● **افسانہ**

● **نشاط پروین**

واپسی

نہ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کی آنکھ کھل گئی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ شور کیسا ہے۔ پھر اس کے کانوں میں یہ آواز آئی کہ باندھ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی بیدار ہو گئے تھے اور اب وہ سب مل کر چیخ چلا رہے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے اپنے کھیتوں پر پہنچا۔ وہاں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ ساری فصل ڈوب کر برباد ہو گئی تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اپنی بے بسی، بے کسی اور لاچاری پر آنسو بہانے لگا۔ اب کیا ہو گا؟ گزر بسر کیسے ہو گی؟ بینک سے قرضہ لے کر بیج اور کھاد خریدا تھا۔ فصل لہلہانے لگی تھی تو اسے امید بندھی تھی کہ بینک کا قرضہ چکانے کے بعد بھی اتنی رقم بچ جائے گی کہ سارا سال آرام سے گزرے گا۔ مگر اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ گاؤں میں زیادہ تر لوگ غریب ہی تھے لہذا کہیں سے کوئی قرض یا مدد ملنے کی بھی امید نہیں تھی۔ بڑی مشکل گھڑی تھی۔ اس کی بیوی بھی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ بچے الگ پریشان تھے۔ خیر کسی طرح رات کٹی اور صبح کا اجالا پھیلا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کا منظر تھا۔ کھیت تو ڈوبے ہی تھے کئی گھروں میں بھی پانی گھس آیا تھا۔ ایسے وقت میں سبھی ایک دوسرے کی مدد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ سرکاری مدد بھی آئی۔ پھر دھیرے دھیرے حالات معمول پر آنے لگے۔ لوگ اپنے روزمرّہ کے کاموں میں لگ گئے۔ اس نے بھی چاہا کہ پھر سے زندگی کو واپس پٹری پر لایا جائے لیکن اب کھیتی باڑی سے اس کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ بہت سوچ وچار کے بعد اسے ایک راستہ سوجھا، کیوں نہ شہر جا کر محنت مزدوری کی جائے۔ اس کے گاؤں کے بہت سارے لوگ پہلے ہی سے بڑے شہروں میں کام کیا کرتے تھے اور اچھے پیسے کماتے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پھر ایک روز وہ اللہ کا نام لے کر شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ چنانچہ شہر پہنچ کر وہ کام کی تلاش میں لگ گیا اور بہت جلد اسے کام بھی مل گیا۔ آمدنی بھی اچھی ہونے لگی تھی۔ اپنا خرچ پورا کرنے کے بعد وہ باقی رقم گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ شہر میں کام کرتے کرتے اسے خیال آتا کہ کھیتی کرنا بھی کتنا مشکل کام ہے۔ سال بھر جی توڑ محنت کرنے کے بعد بھی پریشانی لگی رہتی تھی۔ کھیت میں بوائی کرنے کے بعد اس کی دیکھ بھال کرنا، رات رات بھر پہرا دینا، جانوروں اور دنگوں

سے کھیت کی حفاظت کرنا۔اس پر سے کبھی سیلاب، کبھی سُکھاڑ اور کبھی کوئی اور وجہ۔وہ سوچتا کہ اچھا ہی ہوا کہ وہ شہر آ گیا اور کام دھندے سے لگ گیا۔دن بھر محنت کرو اور شام کو مزدوری لے جاؤ۔نہ کوئی فکر نہ کوئی غم۔

مزدوری کرتے کرتے اسے کام کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ایک دن اس کی ملاقات کسی فیکٹری کے مالک سے سے ہوگئی اور پھر اسے فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔اب اسے کام کم کرنا پڑتا تھا اور ماہانہ تنخواہ ملنے لگی تھی جبکہ مزدوری میں یہ ہوتا تھا کہ کبھی کام ملا اور کبھی کام نہیں ملا۔

وہ ہر ماہ ایک بار اپنے گھر کا چکر لگاتا۔اس کے گھر کی حالت سدھر رہی تھی۔بیوی بچوں کی صحت بھی اچھی رہنے لگی تھی۔بچے گاؤں کے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔گاؤں والے بھی اس کی تعریف کرتے اور کہتے کہ اس نے بہت اچھا فیصلہ کیا کہ شہر چلا گیا ورنہ گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے؟

وقت گزرتا گیا۔اس کی بیوی بھی سگھڑ اور ہوشیار تھی۔اس نے پیسے بچا بچا کر اپنے کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکان کو دھیرے دھیرے پختہ کرانا شروع کر دیا۔لیکن وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔زندگی راستے پر آئی تو اس نے نئے نئے خواب بھی دیکھنے شروع کر دئے۔اب تک وہ کرائے کی ایک جھونپڑی میں تنہا رہتا آیا تھا لیکن جلد ہی وہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان لے کر اپنے گھر والوں کو شہر لانا چاہتا تھا تاکہ وہ سب ایک ساتھ رہیں اور اس کے بچے شہر کے اسکول میں پڑھ سکیں۔

ابھی وہ مستقبل کے تانے بانے بُن ہی رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ چین میں کوئی نئی وبا آئی ہے جس سے لوگ دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔اور پھر سننے میں آیا کہ اب دوسرے ممالک بھی اس کی چپیٹ میں آتے جا رہے ہیں۔لیکن اپنے ملک میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی اور سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا۔لیکن یہ اطمینان زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔یہاں بھی اس خطرناک وائرس نے دستک دی اور فضاء میں ایک انجانا سا خوف پھیل گیا۔ہر شخص سہما سہما سا دکھائی دینے لگا۔اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے جنم لینے لگے۔اس نے اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں۔سب کچھ حسب معمول تھا۔زندگی رواں دواں تھی اور سارے کام اپنے مقررہ وقت پر انجام پا رہے تھے۔پھر ایک دن اس نے سنا کہ پردھان منتری آج رات آٹھ بجے قوم کے نام کوئی پیغام نشر کرنے والے ہیں۔اور پھر جب رات آٹھ بجے یہ اعلان ہوا کہ ملک بھر میں اکیس دنوں کے لیے لاک ڈاؤن کر دیا گیا ہے۔آنے جانے والی سبھی سواریوں کو روک دیا گیا ہے اور یہ حکم نافذ ہوا ہے کہ جو جہاں ہے وہیں رہے گا تو سبھوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ادھر سارے کام دھندے بند ہو گئے۔فیکٹریوں میں تالے لگ گئے۔مشینوں کی آوازیں بند ہو گئیں اور مزدور لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب پیدل ہی روانہ ہو گئے۔اس نے بھی اپنا مختصر سا سامان اُٹھایا اور پیدل چلنے والوں کے قافلے میں شامل ہو گیا۔اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا گھر یہاں سے کتنے میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں تک پہنچنے میں اسے کتنے دن لگیں گے۔مگر ابھی یہ

سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔وہ تو بس ایک بھیڑ کا حصہ تھا۔اس سفر میں ان بے یار و مددگار لوگوں کو طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔بھوکے پیاسے پیدل چلنے والوں کو پولس والوں نے کہیں ڈنڈے مارے تو کہیں مرغا بنایا اور کہیں جانوروں کی طرح گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کیا گیا۔راستے میں بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو کر لقمۂ اجل بھی بن گئے۔مگر جو سخت جان تھے وہ چلتے رہے۔وہ بھی کسی طرح تین دن اور تین رات کی مسافت کے بعد اپنے گاؤں پہنچا۔گھر جانے سے پہلے راستے میں اسے اپنے کھیت ملے جو ویران پڑے تھے۔انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اپنے کھیت کی ایک مٹھی مٹّی کو ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور روتے ہوئے بولا۔

''اب میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔کبھی نہیں۔''

◂◂ ● ▸▸

Shah Colony,Shah Zubair Road,Munger-811201 (India)
Mob: 91 82104 89478

منصور خوشتر نئی صبح کا استعارہ

مرتب: کامران غنی صبا

صفحات:۲۸۸ قیمت : ۳۰۰/روپے اشاعت : ۲۰۱۹

زیر اہتمام

المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ

سبھاش چوک، دربھنگہ، بہار (انڈیا)

● **افسانہ**

● **فرحین خالد**

شکستہ خواب

زندگی اگر بے کیف ہوتو اس میں آنے والا کوئی بھی بدلاؤ، معنی نہیں رکھتا ہے اور نہ ہی مزاج میں ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ایسے میں انسان روبوٹ بنا اپنے ریموٹ کے دبائے بٹنوں کی لہر میں چھپے احکامات نبھاتا جاتا ہے جبکہ اس کی اپنی کوئی چوائس نہیں ہوتی۔ نئے گھر میں آئے ہوئے مجھے ایک مہینہ ہو گیا تھا پھر بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔حالانکہ شہاب نے یہ گھر اپنی پسند کا سہی میرے نام پہ لیا تھا، اپنا من پسند فرنیچر میرے ساتھ جا کے آرڈر کیا تھا، اسی طرح گھر کی کلر اسکیم خود ہی پسند کر کے میری حامی بھی لے لی تھی۔اس نے کہا تھا کہ یہ سب وہ میرے لیے کر رہا ہے کیونکہ میں اس کی پہلی محبت تھی مگر...... میں خوش نہیں تھی۔

مجھے اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں تھا۔مجھے بس جینے کو کہا گیا تھا اور وہ بھی بغیر چوں و چرا کیے۔ہار تو میں نے اسی دن مان لی تھی جب ماں جی نے ابا کے کہنے پہ مجھ سے پندرہ سال بڑی عمر کے شخص سے میرا ناطہ جوڑ دیا تھا۔ان کے خیال میں مستحکم مستقبل کے لیے شوہر کا مالی اعتبار سے مضبوط ہونا ضروری تھا۔اماں کہتی تھیں، حال کو بھلا کون جیتا ہے؟ سب گزرے ہوئے کل کو یاد کر کے آنے والے کل کی فکر میں جیتے ہیں۔سو میرے حال کو بھی تلف کر کے شاندار مستقبل کے حوالے کر دیا گیا۔کاش کہ میرے والدین نصیب بھی لکھ سکتے جس میں بے حساب خوشیاں میری منتظر ہوتیں جنھیں پا کے میں اپنا حال بھول جاتی۔ لیکن اگر ایسا ہو سکتا تو ہم خدا کو کیونکر مانتے؟؟

مجھے لگتا ہے کہ میں اپنے کتبے پہ ۱۵ کا ہندسہ کندہ کرواؤں گی۔یہ عدد میری زندگی پہ ایسے ہی راست چسپاں ہوتا ہے جیسے ہاتھوں میں دستانہ۔میں نے پندرہ بار نئی زندگی کی جھلک دیکھی تھی اور وہ ہر بار ایک گام آ کر منہ موڑ گئی تھی اور یوں میں ماں بننے کی سعادت سے محروم رہ گئی۔شروع کے پانچ سال تو شہاب ہی فیملی بڑھانے کے حق میں نہ تھے کیونکہ ان کی بیڈروم لائف متاثر ہوتی تھی پھر سمندر پار ہجرتوں کے بھنور نے انہیں لپیٹے رکھا اور اس دوران کتنے ہی معصوموں کو ہم اپنی غلطیوں کی بھینٹ چڑھاتے رہے تا آنکہ قسمت نے ہم سے ہی منہ موڑ لیا اور میں بانجھ ٹھہرائی گئی۔میری الماری میں ایک سیف ہے جس کا کوڈ نمبر پندرہ ہے۔آج الماری ٹھیک کرتے ہوئے میرے ہاتھ اس کی طرف غیر ارادی طور پہ بڑھ گئے۔میں نے

آہستگی سے کھولا اور اس کے اندر رکھے اپنے قیمتی اثاثوں کو ٹٹولا...... کچھ کو باہر بھی نکالا۔ وہ نرم و ملائم، نیلے اور گلابی رنگ کے ننھے منے بچوں کے کپڑے تھے جو میں نے ہر زچگی میں شوق سے خریدے تھے۔یہ میرے شکستہ خواب تھے جن کی تعبیر کو میں نے شدت سے چاہا تھا اور جن کی محرومی نے میرے اندر وہ خلا پیدا کر دیا تھا جو دنیا کی کوئی نعمت پوری نہیں کر سکتی تھی۔میرے اندر درد کا ایک فشار تھا جو جاری رہتا اور جب کبھی تھمتا تو ٹیسیں ہوک کی صورت میں اُٹھا کرتیں تھیں جن کو میں کھانس کھانس کر رفع کیا کرتی تھی۔۔

''پتہ ہے...... ہر جوڑے کا ایک نام بھی رکھ رکھا ہے میں نے......''

اس وقت میری انگلی تھامے صوفیہ کی آستین تھی...... تین مہینے کی رہ کے مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔آج ہوتی تو پورے سات سال کی ہوتی۔یہ خیال آتے ہی میں نے اس قمیص کو آنکھوں سے لگا لیا تا کے اس کے لمس کو محسوس کر سکوں، اسکی بھینی بھینی خوشبو کو سونگھ سکوں۔مگر دروازے کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔میں نے جلدی سے ان آرزوؤں کو لپیٹ کے رکھ دیا کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ شہاب کو ان کے بارے میں علم ہو۔اس کے خیال میں تو سب کچھ اچھا تھا۔اس نے آسمان کے چاند تارے میرے قدموں میں لا کے رکھ رکھے تھے اور سمجھ رہا تھا کہ میرے لیے وہ کافی ہوں گے۔

گھنٹی بجے جا رہی تھی اس لیے میں نے جلدی سے باہر کا دروازہ کھولا تو سامنے کوریئر والا کھڑا تھا۔۔اس نے ڈبہ دیا تو میں نے سائن کر کے بے دلی سے لے لیا۔سوچا کہ شہاب نے پھر مجھے بہلانے کے لیے کچھ منگا لیا ہوگا۔ میں نے ڈبے کو وہیں کاؤنٹر پہ رکھا، ڈپریشن کی دوا لی اور بستر میں جا کے ڈھ سی گئی۔

میری آنکھ کھلی تو جو پہلی چیز محسوس ہوئی وہ کچن سے آنے والی اٹالین کھانے کی خوشبو تھی۔ پتہ نہیں کیوں شہاب کرتا ہے یہ سب؟ کھانا تو میں نے پکایا ہوا تھا۔مگر شہاب پھر بھی نئی سے نئی ترکیبیں ڈھونڈتا ہے......خواہ مخواہ! مجھے تو ہر کھانے کا مزہ ایک سا ہی محسوس ہوتا ہے...... پھیکا...... بے ذائقہ......گھڑی پہ نظر پڑی تو پتہ چلا کہ مجھے سوتے ہوئے پانچ گھنٹے گزر گئے تھے۔میں نے انگڑائی لی اور سست قدموں کے ساتھ کچن کا رخ کیا۔مگر دروازے میں ہی مجھے شہاب نے روک لیا اور آنکھیں بند کرنے کو کہا میں نے منع بھی کیا مگر وہ خود میری آنکھوں کو بند کر کے مجھے کندھوں سے تھامے ڈائننگ روم میں لے گیا۔آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہاں کا منظر ہی نرالا تھا۔پورا کمرہ کانچ کی قندیلوں سے روشن تھا۔میز پہ رکھے جا بجا دیے جل رہے تھے جو رنگ برنگی سیپی نما پیالیوں میں خوبصورتی سے سجائے گئے تھے اور عین ان کے درمیان ایک سفید گلابوں کا گلدستہ کچھ اسطرح سجا تھا کہ اس کی بیلیں گلدان کے اطراف میں بھی جھول رہی تھیں۔میں یہ سجاوٹ دیکھ کے مسکرا دی۔شہاب کی طرف دیکھ کے پوچھا۔

''آج کوئی خاص بات ہے جو میں بھول رہی ہوں؟'' وہ بھی جواباً مسکرایا اور بولا۔

''ہے ناخاص بات!''اس نے شیفتگی سے میری نظروں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

'' آج ہی کے دن میں نے یہ طے کیا تھا کہ میں صرف اور صرف تم سے شادی کروں گا!''

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

''تمہیں اتنی پرانی باتیں کیسے یاد رہتی ہیں؟''وہ ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

''میری یادداشت میں ایک چھلنی نصب ہے جس میں صرف خوشی دینے والی باتیں باقی رہ جاتی ہیں اور ساری باتیں آپ ہی آپ زائل ہو جاتی ہیں۔''

وہ بولتا جا رہا تھا اور کھانا پیش کرتا جا رہا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں کون سی مٹی کا بنا ہوا ہے۔اس پہ کسی بات کا اثر کیوں نہیں ہوتا۔کھانے کے بعد ہم دونوں ٹیرس پہ رکھے جھولے پہ جا بیٹھے تھے۔اس نے انڈونیشیا سے منگائی خاص سگرٹ جلا کے مجھے پیش کی تو میں نے کش لگا کر اپنے اندر جمے دھوئیں کو راہ دی۔ یہ اسی کا شوق تھا۔کہتا تھا کہ اس کو سگریٹ پینے والی عورتیں بہت پُرکشش اور پراعتماد لگتی ہیں۔ اس لیے میں بھی پینے لگی تھی۔سوچتی تھی شاید اسی طرح میری قوت ارادی بڑھ جائے مگر اسکا موقع ہی نہیں آتا تھا۔شہاب خود ہی سب فیصلے کر لیا کرتا تھا۔

'' رابی!.....رابی!!''اس نے میرا نام لے کے دوبارہ پکارا تو میں چونکی۔وہ مجھے بتا رہا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے ترکی جا رہا ہے اور کوشش کرے گا کہ جلدی واپس آ جائے۔وہ بول رہا تھا اور میری آنکھیں اپنے مقابل پہاڑوں کی چوٹیوں کو تک رہی تھیں۔کبھی میرا بھی شوق ہوا کرتا تھا کوہ پیمائی کا.....کیسے کیسے ناقابل یقین خواب دیکھ لیتا ہے انسان! یہ سوچتے ہوئے مجھے اپنی حماقت پہ ہنسی آ گئی غالباً شہاب نے بھی کوئی چٹکلا کہا ہوگا۔مجھے ہنستا دیکھ کے وہ سمجھا کہ اسی کی بات پہ ہنسی ہوں۔کہنے لگا۔

''چھوٹی سی گڑیا لگتی ہو تم ہنستے ہوئے۔''میری ہنسی اسی وقت گلے میں پھنس گئی تھی۔مجھے اچھو سا لگ گیا۔شہاب اندر جا کے پانی لایا جو مجھ سے پیا نہیں گیا۔ مجھ سے سانس نہیں لی جا رہی تھی اور شہاب پریشانی میں کبھی مجھے کمر پہ تھپکتا تو کبھی اوپر دیکھنے کو کہتا۔بالآخر کچھ دیر بعد میری حالت غیر ہو کے آہستہ آہستہ سنبھل رہی تھی۔شہاب نے مجھے کندھے سے سہارا دے کر اٹھایا اور کہا۔

''اندر چلو منیا! تو میں بپھر گئی۔میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کے کہا۔

''میں منیا نہیں ہوں۔میں چالیس سال کی ادھیڑ عمر عورت ہوں جس کی گود آج تک ہری نہیں ہوئی اور اب ہو بھی نہیں سکتی،مگر تم کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟تم سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتے ہو اور گھر آ کر مجھے کسی پالتو جانور کی طرح پچکار کر اپنی بچوں کی محرومی پوری کر لیتے ہو مگر کبھی یہ سوچا ہے کہ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں؟''

وہ ششدر ہوا،حیران آنکھوں سے میری جانب تک رہا تھا کیونکہ میں نے کبھی ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی مگر شاید میں بھی اپنی برداشت کی آخری حدوں کو پہنچ گئی تھی لہٰذا بولتی چلی گئی۔

''میری زندگی ایک دائرے کا سفر ہے جس میں پچھتاوا،رنج،ناامیدی اور بے سکونی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔دم گھٹتا ہے میرا اس تنہائی میں.....تھک گئی ہوں اپنی آرزوؤں کا لاشہ ڈھوتے ڈھوتے۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کو اپنا فیصلہ سنا دیا

''مجھے ایک بچہ گود لینا ہے.....بس.....''اور میں اسے اکیلا چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی۔

صبح اٹھی تو اپنی سائیڈ ٹیبل پہ رکھا پیغام دیکھا۔اٹھا کے پڑھا تو لکھا تھا''واپس آ کے بات کریں گے۔''میں نے وہ پرچہ برابر رکھی ویسٹ باسکٹ میں لڑھکا دیا اور چھت کو تکنے لگی۔

پانچ روز بعد جب شہاب آیا تو وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا۔میں نے اس سے معمول کے مطابق بات کی مگر ہمارے درمیان کی گئی آخری بحث کی کشیدگی موجود تھی۔رات کھانے کے بعد ہم ٹیرس پہ بیٹھے کیوبن سگار پی رہے تھے تو شہاب نے بات شروع کی۔

'' رابی! میں نے اس ٹرپ کے دوران بہت سوچا اور اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ میں غلط تھا.....اور تم درست تھیں۔ہمیں واقعی ایک بچہ گود لے لینا چاہیے۔''

میں اسے دیکھ کر مسکرائی اور اپنی نحیف آواز میں کہا۔''اچھا؟''وہ اٹھ کے میرے برابر میں آ کے بیٹھ گیا تھا اور ہاتھ تھام کے بولا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم کل ہی حدیقہ اطفال چلیں گے اور ایک لڑکا گود لے لیں گے۔''

فرط جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے تھے۔شہاب کے اندر بات کرتے ہوئے ایک خوشی بھی تھی اور ولولہ بھی تھا کہنے لگا۔

''اور میں نے تو اس کا نام بھی سوچ لیا ہے۔اس موقع پہ میں نے اس کے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے اسے خاموش کر دیا۔مجھے شہاب کے مزاج میں یکسر اتنے بڑے تغیر کی توقع نہیں تھی۔میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا تو وہ راضی خوشی میرے پیچھے ہو لیا۔میں اسے ایک کمرے میں لے گئی جو ہمارے کمرے کے برابر میں تھا۔ اس کا دروازہ کھول کے اس کو اندر جانے کو کہا تو اس نے بھی حیرانی سے اندر جھانکا،اور پھر غیر یقینی سے میری جانب دیکھا۔میں نے نظروں سے اس کو قریب جانے کو کہا،سامنے پالنے میں ایک شیر خوار بچہ لیٹا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔میں نے اسے بتایا کہ تمھارے جانے کے اگلے دن ہی میں اسے لے آئی تھی۔انہوں نے جب مجھے بچے دکھائے تو مجھے سب سے پیاری یہ لگی''شہاب کا گلا کچھ سوکھ رہا تھا۔اس نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔

''لڑکی ہے؟'' میں نے فخر سے کہا۔

''ہاں۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''اچھا.....اب نیا نام سوچنا ہوگا'' میں نے بچی کو گود میں اٹھایا اور شہاب کی بانہوں میں دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے اپنی بیٹی کا نام صوفیہ شہاب درج کرادیا ہے۔'' شہاب نے اس روئی کے گالے کو تھاما تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا اور ایسا محو ہوا اس کو کھلانے میں کہ بھول ہی گیا کہ کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔

اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا کہ جس پہاڑ کے دامن میں، میں برسوں سے کھڑی تھی آج آخر کار اسے سر کر آئی ہوں۔

◄◄ ● ►►

839-C Hill road Phase 6.
Bahria Town Islamabad.
Phone..+923015204271

اکیسویں صدی کا ہندوستانی معاشرہ

اور

تصوف کی معنویت

ترتیب وتقدیم

پروفیسر سید شاہ حسین احمد

صفحات:۲۴۴ قیمت : ۴۰۰ اشاعت : ۲۰۱۹

ناشر

خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۶ بہار (انڈیا)

● افسانہ

● ناہید طاہر

مایا

میری چھوٹی سی دنیا.....افلاس اور بے روزگاری نے میری اس دنیا کو اپنی بانہوں میں ایسے جکڑ رکھا تھا کہ زندگی کی تمام رونقیں اور چمک جیسے معدوم ہو کر رہ گئیں۔ بیوی کا ساتھ اور اس کا پیار میرے حوصلے کبھی پست ہونے نہیں دیتا تھا۔ بیوی ہر صبح مجھے اپنے پہلو سے جگا کر کام کی تلاش کے لیے بھیج دیتی، شام جب میں تھکا ہارا ناامید لوٹتا تو وہ مسکرا کر مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی۔ زندگی کی کشتی یوں ہی امید اور ناامیدی کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہچکولے کھائے جا رہی تھی۔ دن رات کی پریشانی سے بچنے اور مکدر فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے میں اکثر بیوی کو لے کر باہر گھومنے نکل جاتا۔ جب ہم سنہری شام جو ہو ساحل سمندر پر ننگے پیر دوڑ رہے ہوتے اور وہاں کسی ٹھیلہ سے سستی سی بھیل پوری، چٹ پٹا چاٹ کھانے لگتے تو بیوی کی تمام اداسی ختم ہو جاتی اور واپسی میں، میری بیوی سکوٹی چلا رہی ہوتی میں اس کی کمر کے گرد بانہوں کا دائرہ تنگ کیے بیٹھا رہتا۔ سکوٹی کی رفتار تیس سے آگے نہیں بڑھتی، کیونکہ اس سے تیز رفتار وہ کبھی نہیں چلاتی تھی۔ میں کبھی اکتا جاتا یا پھر وقفے وقفے سے میری انگلیاں شرارت سے مچل اٹھتیں.....ساتھ ہی اس کے کاندھے پر سر رکھے رومان خیز انداز میں گنگنانے لگتا تو وہ بھی میری گنگناہٹ میں شامل، کھلکھلا کر ہنستی چلی جاتی اس کی یہ کھلکھلاہٹ تیز ہونے لگتی جب میں اس کے بدن کو گدگدانے لگتا۔ یوں تو زیست نے بے شمار آزمائشیں بخشیں تھیں۔ اس کے باوجود مجھے اپنی بیوی رب العالمین کی طرف سے ایک بہترین تحفہ نظر آتی اس بات کا شکر ادا کرتے ہوئے میری زبان نہیں تھکتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد مجھے جاب مل گئی۔ اس کے ساتھ ہی زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ کسی نے جیسے میری زندگی کی بہتی پرسکون ندیا میں کنکر پھینکا تھا جس کی وجہ سے ایک تلاطم برپا ہوا۔ بیوی اور خوشیاں اس تلاطم امواج میں بہتی چلی گئیں۔

حادثات کہیں بھی کسی بھی وقت رونما ہو سکتے ہیں، چاہے وہ خطرناک ہوں یا حسیں وخوشگوار۔ سوشل میڈیا کے ذریعے ایک شب کوئی 'مایا' نامی لڑکی نے دوستی کی پہل کرتی ہوئی سلام بھیجا۔ وہ دہلی کی رہنے والی تھی۔ میں پتہ نہیں کن کمزور لمحات کے تحت اس کے نفسیات کا شکار بن بیٹھا۔ لفظوں کا کھیل کھیلنے میں وہ بہت ماہر تھی۔ دل پر دستک لگا کر دلوں سے کھیلنا بھی اسے خوب آتا تھا اس نے جم کے بازی کھیلی اور جیت حاصل کرتی

رہی اور میں مسلسل ہارتا چلا گیا۔ شاید اس کی اپنی زندگی کی نہ کام حسرتیں تھیں جو وہ ان لمحاتی دوستی کے ذریعے مکمل کرنے کی آرزو لیے کسی شمع کی طرح جلتی چلی جا رہی تھی۔ اضطراب، خالی پن، محرومیوں سے اس کی گہری آشنائی تھی۔ اس کے دل اور روح پر کئی چھالے اور زخم تھے۔ جنہیں محبت کے مرہم کی ضرورت تھی۔ مگر اسے حلال ،حرام کی بہت تمیز تھی جس کی وجہ سے وہ ان کاغذی پھولوں سے اجتناب کرتی۔ سوائے شوہر کے کسی اور کو اپنی محبت کے قابل سمجھنا، اس کے نزدیک گناہ عظیم اور سب سے بڑی خیانت تھی۔ اس کا دامن کچھ ایسی محرومیوں سے پُر تھا، جن کی وحشتوں تلے وہ کبھی کبھی پاگل ہو جاتی اور مسلسل کئی کئی دن تک روتی رہتی۔ وہ ان وحشت زدہ دائروں سے فرار تو چاہتی تھی، لیکن اپنے اس دائرے سے کبھی باہر نکلنا اس کو گوارہ بھی نہ تھا۔ گفتگو کے رنگ ہر زاویہ کو چھو کر عروج حاصل کرتے تب اچانک وہ خود اس کھیل سے بیزار کھٹ سے آف لائن ہو جاتی۔ اس کا ذہن اور دل دونوں ہی منتشر تھے۔ اس کی آواز میں بے پناہ درد پوشیدہ تھا۔ وہ محرومیاں کا بوجھ اٹھائے تلخ سفاک لگتی تو کبھی پھولوں کی طرح ملائم۔ میری بیوی محبت جیسے جذبے سے تہی دامن میرے قصر دل کی سیڑھیاں تیزی سے اترتی چلی گئی، جتنی تیزی سے مایا ان سیڑھیوں کو پھلانگ کر میرے دل تک پہنچی تھی۔

مایا نے کئی داستانیں سنائیں..... ہر داستان میں اس نے دل توڑا تھا.....وہ صرف اپنی بے قراریوں کا قرار ڈھونڈتی رہتی تھی۔ دلچسپ داستان سنا کر جب وہ قہقہے لگاتی تو اس کے یہ قہقہے بالکل کھوکھلے ہوتے۔ ایسا لگتا تھا وہ بھی کہیں نہ کہیں مٹ چکی.....فنا ہو چکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ مایا دلوں سے کھیل کر اپنی ادھوری اور کھوکھلی محبت کی تشنگی کو سیراب کرنا چاہتی تھی یا اپنے کھوئے ہوئے احساسات کو پانے کی کوشش.....!

مایا جیسے میری مشیر تھی۔ اس کید ماغ میں بے شمار بتیاں روشن تھیں۔ زندگی کا فلسفہ، تجربہ، مشکلات اور ان کا حل اس کے پاس موجود ہوتا۔ وہ خود کو سائیکاٹرسٹ کہتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بہتوں کی بہتر رہبری اور علاج کیا تھا، لیکن ذاتی زندگی میں وہ خود ڈپریشن کا شکار تھی۔ اسکی دبی دبی سرگوشیاں، کبھی بے نام سی خموشیاں اور کبھی سسکیاں جو وہ اپنی زیست کی گھٹن آمیز ماحول سے گھبرا کر میرے گوش گوار کر دیتی۔

مایا میں اتنی خوبیاں تھیں کہ میں اس کی قابلیت پر حیران رہ جاتا۔ گھڑ سواری، کارڈ ریئونگ، سنگنگ کے ساتھ ساتھ وہ ادبی ذوق بھی رکھتی تھی۔ اس نے کئی نظمیں بھی لکھی تھیں۔ اکثر راتوں کا ایک طویل حصہ ندیم قاسمی کی رومانوی اشعار کے نظر ہو جاتا یا پھر یاسیت میں ڈوبی شاعری۔ اس کا بس چلتا تو وہ مکمل رات مجھ سے ندیم قاسمی کا کلام سنتی لیکن میں مجبور تھا جو اس کی آرزو کی تکمیل نہیں کر پاتا۔ مجھے بیوی کے حقوق بھی تو نبھانے ہوتے۔ جب بھی میں کوئی تخلیق لکھتا وہ اس پر کئی گھنٹے تبصرہ اور تبادلہء خیال کرتی۔ مجھے تعجب ہوتا جب وہ میری ہر تازہ تخلیق پر اپنا قیمتی وقت صرف کرتی۔ میں ہنس کر کہتا۔

''کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتی ہو؟''

''بس ایسے ہی.....یا کبھی کہہ دیتی۔'' آپ دل کے قریب ہیں، ورنہ تو میں کسی کی تخلیقات پڑھتی بھی نہیں۔ میں نے اپنے آفس کے سسٹم پر آپ کے نام کا پاسورڈ رکھا ہے۔ یقین کر لیں۔'' یہ انکشاف واقعی بہت خوب صورت تھا۔ میں متاثر ہوا۔

''رات گہری ہوگئی ہے، اب آپ سو جائیں!'' وہ کہتی لیکن اس کی باتیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ جب وہ شب بخیر کہہ دیتی تو میں بے قرار ہو جاتا۔ بالکونی میں چلا آتا، بے شمار سگریٹ پھونکنے کے باوجود میرے سینے کی تپش میں کوئی کمی نہ آتی، تب میں بڑی بے بسی سے بال نوچتا ہوا سسک اٹھتا۔ میں جیسے مکمل پاگل ہو گیا تھا۔ اس سائیکاٹرسٹ کو بے پناہ چاہت سے نواز کر خود کی نگاہوں میں شرمندہ تھا۔ جب کہ مجھے یہ احساس تھا کہ مایا کی محبت وقت گزاری اور ایک سراب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ تو اپنی وحشتوں سے گھبرا کر دل کا سکون تلاش کرتی ہوئی مجھ تک پہنچی تھی۔ اس نے خود اقرار کیا تھا کہ وہ کسی سے پیار نہیں کر سکتی.....کسی سے دوستی قائم نہیں رکھ سکتی۔ اگر کوئی مسلسل رابطے میں رہا تو اس کا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ وہ تو صرف اپنے دکھی دل کی تسکین چاہتی تھی۔ اس نے خود ہی کہاں تھا کہ وہ کبھی بھی اس کی زندگی سے غائب ہو سکتی ہے کیونکہ وہ آدم بیزار بھی ہے۔ میں بہت منتشر تھا۔ میری زندگی بکھر کر رہ گئی تھی۔ ایک دن میں نے پاگل پن کی حد کر دی اور بیوی کو اس کے میکے چھوڑ آیا۔ جب اس بات کی آگاہی ہوئی تو مایا حیران رہ گئی۔ اس نے ایک دن اچانک ترکِ تعلق کر لیا۔ بقول اس کے ''میرے گناہوں کی وجہ سے دنیا پر مصیبت چھا رہی ہے۔ مجھے تمام رابطے منقطع کرنا ہوگا'' دلوں میں اپنے تئیں محبت کی چنگاریاں سلگا کر وہ اپنی محرومیاں تاپنے کی عادی تھی۔ اسے صحراؤں کی خاک چھانتے ہوئے خود کو سراب بنا کر مسافروں کو اپنے پیچھے دوڑانے میں لطف آتا تھا۔ جب مسافر پیاس کی شدت سے دم توڑ دیتا تب وہ سفاکی سے سراب بن کر کہیں تحلیل ہو جاتی۔

میں صرف ایک مرتبہ اس سے ملاقات کرنا چاہتا تھا.....اسے دیکھنا چاہتا تھا.....چھو کر احساس کرنا چاہتا تھا کہ حقیقت میں وہ انسان ہی ہے یا کسی اور جہاں کی مخلوق؟ اس سانحہ کے بعد میں نے کسی سے دوستی نہیں کی.....کسی کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دی۔ گویا میرے وجود کے گرد ایک دیوار سی بن گئی تھی جس کے اندر میں قید ہو کر رہ گیا۔

ایک دن اچانک مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا جہاں وہ مقیم تھی۔ آفس کا کچھ کام آ گیا تھا۔ میں نے لاکھ انکار کیا لیکن حالات نے مجھے مجبور کر دیا۔ اگر نہیں جاتا تو میری جاب بھی جا سکتی تھی۔ رات کی فلائیٹ تھی۔ ساڑھے نو بجے میں وہاں پہنچا۔ صبح اٹھا تو وقت دیکھا ساڑھے سات بج رہے تھے۔ آفس میٹنگ گیارہ بجے تھی۔ میرے دل کے کسی گوشے میں ابھی تک اس کی یادیں زندہ تھیں سو میں نے نہا دھو کر ان راستوں کی کھوج میں نکل گیا جو اس نے کبھی بتائے تھے۔ وہاں گھنے درختوں سے آراستہ ایک بہت بڑی

عمارت کھڑی تھی جو سرمئی رنگوں سے مزین تھی۔

''مجھے سرمئی رنگ بہت پسند ہے۔میرا آشیانہ بھی سرمئی رنگوں سے سجا ہے۔''اس کی آواز ذہن کے کسی گوشے سے نکل کر جیسے سماعت سے آٹکرائی۔میں نے ایک جھرجھری سی لی۔سامنے بڑا سا بورڈ نظر آیا۔میں نے کپکپاتے قدموں تلے گیٹ سے داخل ہوتا ہوا لان کے احاطے میں قدم رکھا۔جہاں درختوں کے پتے ہولے ہولے جھول رہے تھے اور ان سے خوفناک سی سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔سیکورٹی نے مجھے روک لیا۔

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''ما.....یا.....مجھے مایا سے ملنا ہے۔''میرا گلا پتا نہیں کیوں خشک ہو رہا تھا۔

''اوہ.....!''اس نے عجیب انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ آگے اس لاؤنج سے گزر جائیں ایک ویٹنگ لاؤنج نظر آئے گا۔بس وہاں دائیں جانب کاونٹر پر اپنی تفصیل درج کروادیں۔آپ کو اجازت مل جائے گی۔''میں نے ماتھے کا پسینہ خشک کیا اور آگے بڑھ گیا۔لاؤنج میں شیشوں سے مزین خوب صورت کھڑکیوں سے صبح کی کچی دھوپ میری ادھوری محبت کی طرح لرزتی دکھائی دی جو خنکی کے قہر پر قابو پانے پر نااہل ثابت ہو رہی تھی۔میں نے کاؤنٹر پر مایا کی تفصیل درج کروائی اور ساتھ ہی اپنی بھی۔ایک کارڈ دیا گیا جس پر'ملاقاتی نمبر ستر ہ' لکھا ہوا تھا۔میں نے سوالیہ انداز سے کارڈ اور اس شخص کو دیکھا تو کاؤنٹر پر کھڑا شخص معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔میں سمجھنے سے قاصر تھا۔

''آپ مایا کو جانتے ہیں؟''

''وہ سائیکاٹرسٹ ہے؟''میں نے دھیمی آواز میں کہا

''وہ فلسفی ہے۔''اس شخص نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا ہوا کہا۔جواب میں میں نے ماتھے کا پسینہ خشک کیا اور نظریں چرائی۔

''کیا آپ کو بھی اس سے محبت ہو گئی؟''

''کیا مطلب؟''جواب میں اس شخص نے تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھا اور سر کو خفیف انداز میں جھٹکا دیتے ہوئے نہایت سرد لہجے میں ایڈرس سمجھانے لگا۔

''آپ دائیں سے ہوتے ہوئے بائیں مڑ جائیں۔کچھ ہی دوری پر اس کا کمرہ نظر آئے گا۔لیکن آپ کے پاس صرف چند منٹ ہیں۔ملاقات کا وقت ساڑھے نو بجے ختم ہو جائے گا۔''میں نے بے اختیار اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا نو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔میں نے بہت سوچا کے واپس پلٹ جاؤں لیکن دل کے ہاتھوں مجبور آگے بڑھا۔پیچھے سے اس شخص کی بدبداہٹ میری سماعت سے آٹکرائی۔

''پاگل!!''

سامنے سفید شفاف پردوں سے گھیرا ایک کمرہ نظر آیا۔میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔دوسرے ہی پل میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔اس کے اردگرد مشینوں اور تاروں کا ایک جال بچھا ہوا نظر آیا۔شاید اسے الیکٹرک شاک بھی دیا گیا تھا۔اس کا مکمل جسم کمزور دکھائی دیا۔''مایا!''میں نے دھیرے سے آواز دی اور اپنی نم آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''پہچانا مجھے؟''مایا کی آنکھوں میں آشنائی کے رنگ چھلک آئے۔

''کیوں آئے ہو؟''اس کی خوبصورت آواز ہمیشہ کی طرح سماعت میں رس گھول گئی۔

''تمہیں کیا ہو گیا؟''میرے اندر مچلتے ہوئے کرب نے لفظوں کو نمی بخشی۔میرے استفسار کو اس نے یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سرد لہجے میں دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔کچھ توقف بعد کمزور آواز میں گویا ہوئی۔

''میں بیمار ہوں۔اس سرمئی آشیانہ میں گزشتہ کئی سالوں سے قید ہوں۔میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔اب تو مجھ سے میرا موبائل بھی چھین لیا گیا ہے۔''اس کے لہجے کی بے بسی نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

''آپ.....یہاں سے.....چلے.....''اچانک اس کی آواز ہمیشہ کی طرح ٹوٹنے لگی۔اس نے بہت کوشش کی لیکن الفاظ نے ساتھ نہیں دیا اور وہ گونگی بن کر بھیگی پلکیں چھپکانے لگی۔اس کی آنکھوں میں نہ محبتیں تھیں اور نا ہی انسیت.....ہجر کا کوئی کمزور دیا بھی جلتا دکھائی نہ دیا۔وہ سچ ہی کہتی تھی کہ اسے کسی سے محبت نہیں۔میری بے تاب نگاہیں اس کی نگاہوں کی سرد مہری کے حصار کو توڑنے میں نہ کام رہیں۔میں نے پژمردہ وجود کے ساتھ اپنا رخ پھیر لیا۔

''مایا.....پاگل.....سترہ!'' اس کی نقاہت میں ڈوبی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔میں دوڑتا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا۔مجھے اس دماغی ہسپتال میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔میں نے زندگی کے کئی خوبصورت دن کھو دیئے تھے جن کا ازالہ بھی باقی تھا۔

◂◂ ● ▸▸

W/O Abu tahir Ahmed ,Project manager, Saudi ceramic co.
P. O.Box No#40487,Second industrial city,Alkharj Road
RIYADH-11499.K.S.A
Mobile: +966504509215,nahidtahir2000@yahoo.com

● افسانہ

● صوفیہ کاشف

زرد خواب

مجھے ایک شام تلاشنی تھی۔ایک شام جو میں کبھی کھل کر جی نہ سکی تھی،ایسی شام جو میری دوشیزہ نگاہوں سے بنا چھوئے ، بنا جیے گزر گئی تھی۔ میں صدیوں کی مسافتیں طے کرتی کتنی دور سے آئی تھی مگر وہ شام جو بہت پیچھے سے مجھے اکثر شدت سے صدا دیتی تھی۔سرسبز گھاس سے بھرے میدان بدلتے موسم کے سبب دور دور تک پیلے پتوں سے بھر رہے تھے۔خاکروب روز صبح سرخ اینٹوں پر جھاڑو پھیر کر صاف کرتے ،شام تک تمام روشیں خشک مرجھائے اور اداس پتوں سے پھر سے بھر جاتیں۔سورج کی چندھیا دینے والی دھوپ ٹھنڈی پڑ چکی تھی، جگہیں اور مقام روشن روشن نہیں دھندلے سے دکھتے۔سردی لباس میں گھس کر چٹکیاں کاٹنے لگی تھی،نرم گرم شالیں لپیٹنے کا موسم تھا۔میں سرشام اپنے آفس سے نکلتی،خزاں سے اٹا دن برہنہ سر الوداعی بوسے کے لیے میرا منتظر کھڑا ملتا۔زردی ٹوٹ کر درختوں پر اتر رہی تھی، ہوائیں پورب سے پچھّم تک وجد میں رہتیں، مستی میں سرد ھنتیں، رقص کرتیں، ناچتیں، میرے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتیں۔شام کا سرخی مائل دھندلکا سہ پہر سے ہی زمین سے لپٹنے لگتا۔میں دفتر سے ہاتھ میں کچھ قلم اور کتابیں لیے باہر قدم دھرتی تو پتے میرے قدموں کے نیچے چرمرانے لگتے۔دم مرگ آہیں کراہتیں، دہائی دیتیں۔

''مجھے کچھ لمحوں کی زندگی اور بخش دو۔'' اور میں انکے نوحے سنتی کبھی ان کے کنارے رک جاتی، ہاتھ میں اٹھاتی ،سہلاتی، گال سے لگاتی۔ کھلے دھنک رنگ مسکراتے پھولوں کو بہاروں اور خوشبوؤں کو سونپ کر میں جا سکتی تھی، مگر تھکی ہاری جوانیاں، شکستہ حالی، دم مرگ نفوس مجھے جکڑ لیتے تھے۔محرومیاں میرے قدموں کو زنجیر کر دیتیں۔میں خزاؤں کو ٹھکرا کر کبھی نکل نہ سکی تھی۔سوا کثر سوکھے پتوں کے کنارے ٹھہر کر میں شام غریباں کے کچھ مرثیے ضرور سنتی۔بنا بولے بنا آواز پیدا کیے میں کچھ سسکیاں بھر لیتی۔درد کا سینے سے دل اور دل سے روح تک کا ایک سُوتا لے لیتی۔میری لال اونی چادر سوکھی گھاس میں پھنس جاتی، میرے بال ہوا کی اٹھکیلوں سے الجھ الجھ جاتے۔ایسی ہی اک شام میں کاغذوں اور قلموں کو سینے سے لگائے سرد ہوا کی سرگوشیاں سنتے ،شام کا حزن پیتے جب برآمدے کی سیڑھیوں سے اتری تو وہ یہیں املتاس کے پیلے درختوں کے جھنڈ کے قریب بہتی ٹھنڈی ندی کے پاس کھڑا میری راہ تکتا تھا۔میرے اندر سے ایک سسکی سی گونجی۔

''کیا اسے آج ہی ملنا تھا؟ جب زندگی خزاؤں کے صفحات پر اپنی نشانی ثبت کر چکی تو وہ بہار کا سندیس لے کر کیوں میری راہ گزر میں آیا تھا؟''

''ایک بار تو مجھے آنا ہی تھا.....رستوں کی دھند اور جاڑا جانے شکستہ حال ہڈیوں میں کتنی برف اتار دے۔زادراہ کے لیے تھوڑی سی حدت.....'' اس کی نگاہیں فریاد کناں تھیں۔

''مجھے اور خواب مت دینا۔میرا قبرستان کم پڑ چکا ہے۔'' آہیں بھرتی ایک فریاد اپنے وزن سے میرا سر جھکا رہی تھی۔

''میں تو خود سپنوں کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔خدا کے لئے مجھے روشنی کی کوئی رمق لوٹا دو۔''ہم سوکھتے درختوں، لال، پیلے اور خاکی پتوں سے بھری شاہراہ کی ایک پنگڈنڈی پر ساتھ بیٹھے تھے۔

''تم کہتے تھے تمھاری زندگی بھرپور ہے؟'' میری آنکھیں سوال در سوال اس کو ٹٹولتی تھیں اور اس کا چہرہ زمانوں کی قسمیں کھا رہا تھا کہ وہ کس قدر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو چکا ہے۔

قریب سے کسی فاختہ نے الوداعی گیت چھیڑا تھا۔دور کہیں درختوں پر چڑیاں گئے دن کے بین میں مگن تھیں۔شام ڈھل رہی تھی۔سردی اتر رہی تھی۔آسمان کے گھیرے میں زردی مکمل گھل چکی تھی۔تھکے ہوئے مسافر گھروں کو لوٹ رہے تھے۔زمین کے مشرقی کنارے سے ایک پورا چاند درختوں کے پتے سرکاتا حیرانی سے جھانکنے لگا تھا۔ بیتاب چاندنی سے نظر چراتے ندی کے کنارے ہم سر جھکائے بیٹھے تھے۔میں جانتی تھی دونوں ہی تھک چکے تھے۔شال لپیٹتے کاغذات سنبھالتے میں اس کے قریب سے اٹھی اور دور دکھائی دیتے باہر جانے کے رستے پر چلی۔ ہر وہ قدم بھاری تھا جو اس کی صدا کو کچل رہا تھا۔میں وہ صدائیں سن سکتی تھیں جو کبھی ہونٹوں سے جدا ہی نہ ہو سکیں ہوں۔میں ان کہی التجاؤں کو کچل سکتی تھی، کچل رہی تھی۔گیٹ کی طرف نظر ٹکائے قدم بڑھاتے اس کی نگاہیں طلب بن کر مجھے کھینچ رہی تھیں۔میرے کان ایک لفظ، محض چند حرفوں کو ترس رہے تھے اس کے باوجود کہ جانتی تھی کہ رک نہیں سکوں گی۔میرے قدم شل ہو چکے تھے۔خزاں میری رگ رگ میں اتر چکی تھی۔اس کی آنکھوں کے دیوں کے سوا اب اور کہیں بھی روشنی نہ تھی۔ مجھے خبر تھی وہ بھی میری نہ تھی۔

گیٹ تک پہنچ کر باہر نکلتے نکلتے میں نے ایک بار مڑ کر اس پنگڈنڈی کی طرف دیکھا تھا جس پر زرد خواب کو میں بنا جیئے بنا چھوئے چھوڑ آئی تھی۔ وہ میری سمت ہی دیکھتا تھا، بن بولے صدا دیتا، بن کہے پکارتا تھا۔ہزار شامیں ڈھل چکیں، ہزار صدیاں بیت گئیں۔میں آج بھی اسی دہلیز پر کھڑی بن جیئے خواب کو تک رہی ہوں۔وہ زرد شام میں لپٹا، خزاں رسیدہ پتوں میں گمشدہ سپنا آج بھی میری شال کی حدت کو ترس رہا ہے۔

◄◄ ● ►►

Sofiakashif,flat 404,binfahad building 25,Alwarqa 1,Dubai,UAE

● **افسانہ**

● **صبیحہ تزئین**

گڑیا میلی ہوجائے گی

گڑیا میلی ہوجائے گی

یہ شہر، یہ وسیع وعریض بے کنار شہر جس کی ہلچل میں ہم جیسے تیز گام بھی رفتار کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کے شور میں اپنی آواز بھی بے صدا ہوجاتی ہے اور چمک دمک آنکھوں کو ایسا خیرہ کرتی ہے کہ اپنا وجود بھی دھندلا نظر آتا ہے۔ اس کی مصروف زندگی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکتی۔ یہاں بڑے سے بڑا حادثہ ہوجائے، لوگ گردن گھما کر ایک بار دیکھتے ہیں اور دوسرے لمحے اپنے اپنے کام میں مگن ہوجاتے ہیں۔ یہ نا تمام مہیب سڑکیں جس کو نہ جانے اب تک کتنے ہی معصوموں اور بے گناہوں کے سرخ لہو نے دھویا ہے، لیکن یہ آج بھی اسی طرح کالی اور میلی ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی یہ بلند عمارتیں کتنے ہی لوگوں کو بے گھر اور بے نشان کر کے اپنی سربلندی پر نازاں کھڑی ہیں۔

رات کے پچھلے پہر میں اپنی نیند اور خواب کی وادی سے دور، اپنے پندرہ منزلہ فلور کے ڈی لکس فلیٹ کی بالکنی سے اس شہر کا نظارہ کر رہی ہوں، زندگی کی رونق سے بھرپور یہ شہر رات کے اس پہر کتنا بے بس اور لاچار لگ رہا ہے۔ یہ سڑکیں جن کو دن میں کراس کرنا ایک جوکھم بھرا کام ہے، اس وقت کیسے کسی چاپ کی منتظر لگ رہی ہیں۔ اندھیرے میں کھڑی یہ عمارتیں بھیڑیوں کی وہ ٹولی لگ رہی ہے جو اپنی مدھم اور بجھی بجھی آنکھوں سے اپنے شکار پر نشانہ سادھ رہی ہوں۔

دیکھتے ہی دیکھتے ابھی کچھ دیر میں صبح ہوجائے گی۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی شہر کی سانسیں چلنے لگیں گی، وہی شور وہنگامے شروع ہوجائیں گے اور یہ ویران وسنسان شہر ایک بار پھر انسانی اور مشینی جنگل میں بدل جائے گا۔

میں اپنی بالکنی میں کھڑی کھڑی تھک گئی ہوں۔ اکثر رات کے اس پہر میں خود کو اس شہر ہی کی طرح ویران محسوس کرتی ہوں۔ ساری ہلچل اور شور شرابے شام ہوتے ہوتے ماند پڑ جاتے ہیں اور خاموش طویل رات کی بانہوں میں تھک کر سو جاتے ہیں۔ صبح سے میری بھی مصروفیت شروع ہوجائے گی۔ مجھے صبح سویرے چائے پینے کی عادت ہے اور یہ بہت پرانی ہے۔ مجھے یاد ہے بچپن میں جب میں چائے پینا چاہتی

تھی تو ممی مجھے چائے کے مضر اثرات بتاتیں۔ ''نہیں بیٹا مینو، بچے چائے نہیں پیتے۔'' کیوں؟ میں پوچھتی! ''چائے پینے سے بھوک مر جاتی ہے۔'' جواب آتا۔ میں پھر بھی ضد کرتی تو بڑے لاڈ سے کہا جاتا ''چائے پینے سے میری گوری گوری گڑیا کالی ہوجائے گی اور دور دیس سے آنے والا شہزادہ تمہیں پسند نہیں کرے گا۔'' میں ڈر جاتی اور اس اَن دیکھے شہزادے کے خوبصورت نقوش اپنے ذہن میں بنانے لگتی۔ کیا سوچنے لگی مینو؟ آواز پھر آتی۔ ''کچھ نہیں'' میں کہتی اور چائے کو بھول جاتی۔ ابھی میرے ہاتھوں میں ایک بڑا مگ ہے چائے کا، اور یہ روز کا معمول ہے۔ مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ شاید کوئی آواز یہ کہتے سنائی دے کہ ''بیٹا نہار منہ چائے پینا اچھا نہیں۔'' کبھی کبھی تو بے ساختہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہوں کیا واقعی کوئی ہے۔ پر افسوس!.....

لوگ کہتے ہیں میں ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہوں۔ شہر کے پاش ایریا میں بہترین فلیٹ میں رہتی ہوں۔ گھر میں آرائش وآسائش کے ضروری اور غیر ضروری سامان موجود ہیں۔ لگژری کار ہے جسے میں خود ڈرائیو کرتی ہوں۔ کبھی کبھی یہ گاڑی مجھے اپنی زندگی کی طرح لگتی ہے جسے میں اپنے اشارے پر چلا سکتی ہوں۔ میں ایک کامیاب عورت ہوں اور میں نے اب تک جو چاہا وہ سب پایا ہے، مایوسی اور محرومی کیا ہے یہ میں نہیں جانتی۔ ایسا لوگوں کو لگتا ہے۔

میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد بڑی لاڈلی اور چہیتی اور خوبصورت بھی۔ ان باتوں نے مجھے ضدی اور سرکش بنا دیا۔ مجھے اپنی ضدیں منوانا بھی خوب آتا تھا۔ ''آج مینو نے کھانا نہیں کھایا۔'' ممی کی آواز آئی۔ ''کیوں؟'' یہ پاپا کا سوال تھا۔ ''بس اسے کوئی نیا ویڈیو گیم چاہئے آج کے آج۔''

''ارے.....تو اتنی سی چیز کے لیے تم نے بچی کو دن بھر بھوکا کیسے رہنے دیا؟ یہ پاپا کی آواز تھی جس میں فکر، پریشانی اور ممی کے لیے غصہ سبھی کچھ موجود تھا.....اسی طرح کے جملے آئے دن میرے لیے بولے جاتے۔ میں نے کبھی بھی اپنے آس پاس رہنے والوں کے بارے میں نہیں سوچا۔ مجھے لگتا ہے میں سب سے اچھی ہوں، ہر اچھی چیز پر سب سے زیادہ میرا حق ہے۔ میرے ممی، پاپا مجھ سے محبت کرنے کے لیے مجبور ہیں اور میری ہر جا و بے جا خواہش پوری کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔

بہت دور کسی مسجد میں ابھی فجر کی اذان ختم ہوئی ہے۔ آسمان پر ہلکی نیلی، اودی روشنی پھیل رہی ہے، ہوا میں خنکی ہے، پرندے گھونسلوں سے نکل رہے ہیں، راستوں پر حرکت شروع ہوگئی ہے۔ اس طرح کا منظر، یہ ہوائیں، فجر کی اذان میرے ماضی میں مجھے یاد نہیں کیونکہ اس وقت تو میں بے خبر میٹھی نیند سوئی ہوتی تھی۔ یہ مناظر، یہ لمحات تو پچھلے کچھ برسوں سے میرے ساتھی ہیں۔

ابھی ذرا دیر میں میرے بیٹے اسکول جائیں گے۔ پھر میں بھی دفتر کے لیے نکل جاؤں گی۔ دفتر میں میری بڑی دھاک ہے، ہر کوئی 'میڈم جی' کہتا ہے۔ میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ کسی سے بات نہیں

کرتی۔کسی بات سے خوش نہیں ہوتی۔ پتہ نہیں کیوں؟

ایم بی اے مکمل کرنے کے بعد میں نے اسی دفتر میں انٹرن شپ کی تھی۔ یہاں کی چکا چوند اور باس کا رعب ورتبہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ اچانک میرے ذہن میں ایسے ہی کسی دفتر کے مالک ہونے کا احساس جاگا۔ میں نے سب طرف نظر کی تو دیکھا کہ ایسی خواہش تو ہر انسان کی ہے،۔ ہر شخص اوپر اٹھنا چاہتا ہے۔شہرت اور پیسہ کمانا چاہتا ہے۔اور اس کے لیے اکثر اسے بھاری قیمت بھی چکانی پڑتی ہے۔ یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

آج میرے پاس ہر چیز موجود ہے جو میں چاہتی تھی۔دولت،عزت،رعب،رتبہ۔مگر ان سب کے باوجود میرے اندر ایک خلا ہے،ایک کھوکھلا پن، گہرا اندھیرا جسے محسوس تو کر سکتی ہوں لیکن اسے پُر نہیں کر سکتی۔

میرا باس عمر اور تجربے میں مجھ سے کافی بڑا تھا۔ پتہ نہیں کیسے کس پل میں اس کے سامنے کمزور پڑ گئی اور اپنی ساری ضدیں، سرکشی اور تنک مزاجی کے باوجود دنیا کی آسائشوں کو زندگی کا حاصل سمجھا اور اس کی شرطوں پر زندگی کا سودا کر لیا۔وہ سارے اچھوتے انوکھے خواب جو ہر لڑکی کا اثاثہ ہوتے ہیں، سب دولت اور عیش وعشرت کے سیلاب میں کہیں بہہ گئے۔

''مما ہم اسکول کے لیے نکل رہے ہیں، بائے'' بچوں نے کہا۔'' ٹیک کیئر بیٹا، بائے'' حسب معمول یہ میرا جواب تھا۔

میرے گھر کے سامنے سے گزرنے والی یہ سڑک پتہ نہیں کہاں تک چلی گئی ہے۔ جہاں تک میری نظر جاتی ہے، بالکل سیدھی سپاٹ اور ہموار۔ ایسا لامتناہی راستہ جس پر چلتے ہوئے بہت جلد تھکن اور بوریت کا احساس ہونے لگتا ہے۔اس سڑک پر میں نے کسی کو رکتے، ٹھہرتے نہیں دیکھا۔ مجھے اپنی زندگی بھی اسی سڑک کی طرح لگتی ہے، جس میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں۔کوئی سگنل نہیں۔ نا ہی ٹھہرنے کے لیے کوئی وجہ۔ بس ایک سیدھا سپاٹ راستہ ہے جس پر چلتے رہنا ہے، بنا رکے بنا مڑے۔ پتہ نہیں کب تک؟

◂◂ ● ▸▸

G-58, Battikal,Garden Reach
Koklata 700024
sabihatazeen1@gmail.com

● **افسانہ**

● **فرزانہ روحی اسلم**

قلاش

جب وہ اپنی کتابِ زیست کا حساب کرنے بیٹھی، تو اسے معلوم ہوا کہ پچیس برس کے ساتھ میں جو کچھ اسے ملا ہے اس کا حاصل تنہائی ہے۔عمر عزیز کی نقدی ٹٹولی تو اس گٹھری کو بھی خالی پایا۔سونا چاندی روپیہ پیسہ تو تھا نہیں جو تھا اسے شادی کے ابتدائی دنوں میں بوقتِ ضرورت یا بلاضرورت فروخت کیا جا چکا تھا۔کتابِ زندگی میں تعریفیں، ستائشی جملے، شاباش یا اک چھوٹا سا ستارہ تک نہ تھا، جس سے بچپن میں اس کی کاپیاں بھری رہتی تھیں۔ وہ خود ہی ہنس پڑتی کہ زندگی نہ کوئی درس گاہ ہے اور شریکِ حیات استاد، کہ ہر روز شاباش اور کئی ستارے ملا کریں۔

خاوند کا یہ حال تھا کہ دن چڑھے گھر سے نکلتا اور رات گئے، گھر میں داخل ہوتا۔ یہ اس کے روز کا معمول تھا ماسوائے چھٹی کے دن کے جب وہ سارا دن سویا پڑا رہتا۔ جو شادی بیاہ، منگنی، عقیقہ اور سالگرہ کے دعوت نامے آتے انھیں وہ خود ہی نبیڑ آتا۔کبھی نہ اسے لے کے جاتا نہ ہی ایسا کوئی خیال ظاہر کرتا۔حالانکہ اکثر دعوت نامے گھر پہ ہی آیا کرتے۔ وہ انھیں دیکھتی اور خیالوں ہی خیالوں میں اپنا لباس ترتیب دے کر منتظر رہتی کی کب اسے جانے کا کہا جائے۔مگر تاریخ گزر جاتی اور وہ دن اس کا منہ چڑاتا رہتا۔ وہ گھر پہ بچوں میں خود کو مشغول کر لیتی۔اس کی امید اس وقت ٹوٹتی جب وہ رات گئے ڈکار لیتا ہوا گھر میں داخل ہوتا۔

ایک بار اس نے ایک دیرینہ سہیلی کو یاد کرتے ہوئے اس سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا تو اس نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔''ہم سوشل لائف افورڈ نہیں کر سکتے۔'' وہ تب اس بات کا مطلب اپنے ذھن میں کھوجتی ہی رہ گئی تھی۔ چھ اولاد کی مصروفیات میں خود کو بہلائے رکھتی۔ وہ جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے، وہ بھی ان کے ساتھ ہی سنبھلتی رہی، گویا شجرِ حیات ایک بار پھر سرسبز وشاداب ہونے لگا تو اس کے خاوند کو فکر ہوئی اور شک کا ناگ پھن اٹھانے لگا۔

کون یقین کرے گا اس بات کا کہ وہ اسے سمجھ نہ سکی تھی۔ یا وقت بدل گیا تھا، یا پھر اس میں بدلاؤ آ گیا تھا۔یہی وہ بات تھی جو وہ اکثر خود سے پوچھتی۔اس سے پہلا سوال یہی کیا جاتا جب اس کا کیریئر تھا اور اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ کہ شادی کے بعد ملازمت نہیں چھوڑے گی، جسے اس نے سخت محنت، جدو

جہد، اور مقابلہ کر کے حاصل کیا تھا، تو اب کیوں پیشہ کے خانے میں ''امورِ خانہ داری'' لکھتی ہے۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن اسے کردار کشی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ بھی اس کی طرف سے جسے اس نے خاندان کی مخالفت کے باوجود اپنی زندگی میں شامل کیا تھا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ آئے دن کے طنز و تیر نے اسے صدمے سے ادھ مرا کر دیا تھا۔ کئی بار اس نے سوچا واپس میکے چلی جائے تاہم اس نے جب بھی ایسا قصد کیا اپنی ماں کو اپنے دروازے پہ کھڑا پایا۔ وہ سب کچھ بھول کر ماں کی مہمان نوازی میں جت جاتی۔ ایسی ہی آنکھ مچولی جاری تھی کہ ایک دن منا بھی گود میں آ گیا۔ اب تو اس کا خاوند آتے جاتے کہتا۔ ''منا کیسے پلے گا؟'' یعنی اسے ڈر لاحق رہتا تھا کہ کسی دن وہ ضرور اپنے حالات سدھارنے کا بہانہ کر کے ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوگی۔ منے کے حوالے سے وہ ہمیشہ ایک ہی بات کہتی کہ ''منا ویسے ہی پلے گا جیسے میں پلی بڑھی ہوں۔'' وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پاتا یا سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ بس اتنا جانتا تھا کہ اس کے خاندان میں عورت نہ پڑھتی ہے نہ گھر سے باہر نکلتی ہے اور اسے بھی یہی جاہلانہ رواج پسند ہے۔

ایک کے بعد ایک کی لائن لگتی گئی گویا اس کا کام اب آبادی میں اضافہ کرنا رہ گیا تھا۔ تاہم وہ اس وقت پل پلا جاتی جب کسی بچے کا دودھ ہوتا نہ پیمپر، اک بسکٹ مانگتا تو دوسرا ڈبل روٹی، تیسرے کو دو انڈے چاہئے تو پانچویں کو کیک، دو غٹا غٹ سارا دودھ پی جاتے پھر سارا دن ریں ریں کرتے۔ ہر وقت وہ حساب کتاب ہی کرتی اور شوہر آ کر پوچھتا کل جو ڈھیر سارا سامان آیا تھا کہاں گیا؟ اپنے ڈھیر سارے بچے کو نہیں دیکھتا اس کے خیال میں جو ہوا پی کر زندہ تھے۔

وہ وقت کی چادر میں پاؤں چھپاتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب ایک ساتھ بڑے ہو گئے۔ کبھی اخراجات اور شوہر کے حساب کتاب سے تنگ آ کر وہ کوئی ملازمت کر لیتی، اس وقت بچوں کو ان کی نانی سنبھالتی، جسے چار چھ ماہ بعد اسے چھوڑنا پڑتا۔ کیوں کہ خاوند کی جانب سے پیسے کا مطالبہ شروع ہو جاتا۔ اسے قطعی یہ منظور نہ تھا کہ کما کر گھر کے اخراجات پورے کرنے کے بجائے شوہر کو تھما دے۔ وہ بھی ایسے خاوند کے جس کے خاندان میں عورتوں کو کچھ دینے کا رواج ہی نہ تھا۔ اور وہ ایسے گھر کی تھی جہاں محبت، توجہ، ستائشی جملے، اچھے القاب اور وہ سب کچھ جس کی عورتوں کو آرزو ہوتی، برسات ہوتی رہتی تھی۔

اب وہ بار بار کہتا کہ ''کیوں تعلیم یافتہ ہو کر گھر میں پڑی رہتی ہے۔ بچے بڑے ہو گئے خود کو دیکھ لیں گے، اپنے کسی پرانے دفتر کو جوائن کر لو۔'' وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتی ہوئی کہتی، ''تمھاری دنیا الٹی کیسے چلنے لگی ہے۔ جیسے پہلے گزارا ہوتا رہا ہے اب بھی ہو جائے گا۔ مجھے کون سا چاند پہ پلاٹ خریدنا ہے۔'' سارا دن گھر میں پڑی اپنی سابقہ زندگی سے روشنی کشید کرتی رہتی۔ اسے اس حال میں دیکھ کر اس کا شوہر حیران ہونے سے زیادہ شکوک میں مبتلا ہو جاتا۔ کہ وہ جانے کس کے خیالوں میں غرق رہتی ہے۔ وہ اس کی روز بروز بڑھتی

ہوئی بلڈ پریشر، شوگر، سر درد کی دواؤں کی بڑھتی ہوئی مقدار دیکھنے کے بجائے، اپنے شبہات میں اضافہ کرتا چلا جاتا۔ کسی کا بھی نام یا خیال اس کی زبان پر آتا اسے وہ اس کی پیشانی پر ٹانک دیتا۔

پچیس برس بیت چکے تھے اسے یہ سنتے ہوئے کہ اس کا ہر عمل، تمام طور طریقے غلط ہیں۔ اسے تو کچھ آتا ہی نہیں۔ اولاد سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا الزام بھی اسی کے سر تھوپ دیا جاتا۔ کبھی کبھار وہ سوچتی کہ یا تو اس کا شوہر کم حوصلہ ہے یا وہ بے بس۔ ان کی زندگی کی گاڑی اب تک کیسے چل رہی ہے۔ اس جیسے کئی سوالات وہ خود سے کرتی ہوئی اس نتیجے پر پہنچی کہ کچھ لوگوں کو اپنی کمی کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عورت کو گالی تو دیتے ہیں لیکن طلاق نہیں دیتے، البتہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ دوسرا فریق خود خلع لے۔ ان کی فطرت میں دینا ہوتا ہی نہیں، چاہے وہ طلاق ہی کیوں نہ ہو، اور طلاق کی صورت میں تو مال و اسباب کی واپسی بھی ہوتی ہے۔ طلاق بھی تو دینی پڑتی ہے تحریری یا زبانی طور پہ ہی سہی۔ تب اس نے اپنے سسرال کی تاریخ کھنگالی تو علم ہوا کہ ان کے خاندان میں کبھی کسی کو طلاق نہیں دی گئی البتہ خلع لینے والیاں بے شمار تھیں۔ دینے کے جملہ معاملات میں وہ خاندان ''قلاش'' تھا۔

◂◂ ● ▸▸

Flat.no. 106.First Floor.Maryam residency.
Sector. Eleven.C.2.North Karachi. (Pakistan)
+92 3333141770

تحقیقی تبصرے

ظفر کمالی

صفحات: ۲۴۰ قیمت : ۳۰۰ اشاعت : ۲۰۱۷

مصنف کا پتہ

ایم ایم کالونی، مل روڈ سیوان، بہار (انڈیا)

● افسانہ

● شوبی زہرا نقوی

زخمی پرندہ

انسان جینے اور سکون حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا کبھی خود حالات کے مطابق ڈھلتا ہے اور کبھی حالات کو اپنے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ کبھی خوش وخرم رہتا ہے اور کبھی حالات کے آگے بے بس ومجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن نہیں معلوم یہ وقت کا جابرانہ رویہ ہے یا حالات کی ستم ظریفی کہ انسان کی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب انسان زندگی گزارتا ہے موت کے لیے.....اور موت کو یاد کرتا ہے سکون کے لیے۔ بارہ دری میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹے ہوئے میر سرفراز عبداللہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرے اندر کا پرندہ پھڑ پھڑا اٹھا اور میں یادوں کے حسین تاج محل میں پہنچ گئی۔ جہاں چچا میر سرفراز عبداللہ ایک شہزادے کی طرح دیوڑھی پر موجود ہوتے۔ حویلی میں چاروں طرف نوکر چاکر اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ چچا حویلی میں ادھر سے ادھر حکم چلاتے پھرتے۔ لیکن کس کی مجال تھی جو چچا کی نافرمانی کردے اور انھیں نگاہ بھر کر دیکھ لے۔

ابھی میں تخیلات کی سیر پر نکلی ہی تھی کہ گولی کی آواز کے ساتھ ایک پرندہ پیڑ سے بارہ دری میں آگرا اور میں ایک جھٹکے سے تخیلات کی دنیا سے حقیقی دنیا میں لوٹ آئی۔ گولی کی آواز سے سوئے ہوئے چچا کا جسم تھرتھرا گیا اور میرے ذہن ودل پر ایک عجیب سا لرزہ طاری ہوگیا۔ کہ یکا یک بینڈ اور باجے کی آواز نے چاروں طرف شادمانیوں کے نغمے بکھیرنے شروع کردیے۔ اور ڈھول اور جھانجھر سے فضا مسرور ہواٹھی۔ اتنے میں چچی اندر سے گہنا گئے سورج کی طرح نمودار ہوئیں۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیتے ہوئے فرطِ مسرت سے مجھے سینے سے لپٹالیا اور بٹھاتے ہوئے بولیں۔

''ویر پال کے پوتے کی بارات چڑھ رہی ہے۔ کئی روز سے تیاریاں ہورہی تھیں، آج کل پورے گاؤں میں اسی کا چرچا ہے۔''

''ویر پال.....کون ویر پال.....؟'' میں نے ذہن سے وقت کی گرد کو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے یہاں جو چمن کی دیکھ بھال کرتا تھا۔'' چچی نے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا ویرو کا کا!''

''ہاں! بیٹی وہی۔ نہ اب چمن رہا اور نہ اس کا مالی۔ خزاں نے ہر شے کو اپنے لپیٹے میں لے لیا ہے۔ ساری بہاریں روٹھ گئیں۔'' یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں بوجھل ہوگئی۔ وہ آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''اس کا پوتا اب مکھیا ہے'' اس کے بعد وہ اپنی جھکی ہوئی کمر کو تھامے چچا کی پائیتیوں بیٹھ گئیں۔ اور ایک بار پھر میں سوچنے لگی۔

زندگی کی ہر چال اپنے بس میں نہیں ہے وقت کی بساط پر قسمت کا مہرا کب کون سی چال چل جائے معلوم ہی نہیں ہوسکتا۔

دن کے اجالے پر رات کی سیاہی پھیل چکی تھی اور موسیقی کی تیز آواز فضا میں پھیلے ہوئے سناٹوں پر قابض ہونے لگی تھی۔ میں بھی بارات کا نظارہ کرنے کے لیے چوکھٹ کی آڑ لے کر کھڑی ہوگئی۔ لیکن اب بھی بیتے ہوئے دن میرے ذہن کے تاروں پر رواں دواں تھے۔

رات کی تاریکی کو چھانٹتی ہوئی ویر پال کے پوتے ہریش کی بارات جب میر سرفراز عبداللہ کی حویلی کے سامنے پہنچی تو روشنی سے منور ہواٹھی ہر چیز کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے سورج سلامی کے لیے نکل آیا ہو۔ موسیقی کی تیز آواز نے ہر شے میں اس طرح ارتعاش پیدا کردیا تھا جیسے ہر ذی اور غیر ذی روح بارات کا جشن منا رہی ہو۔ دولہا کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ستاروں کی چھاؤں میں سفید گھوڑوں سے آراستہ ومزین رتھ پر راجہ اندر کی سواری نکل رہی ہو۔ چاروں طرف عوام اور خادمین کا مجمع تھا۔ رتھ کے آگے آگے خواص اور پیچھے پیچھے اندریاں خوبصورت ملبوسات میں جلوہ گر پھولوں کی بارش کررہیں تھیں۔ دوست، احباب جھوم جھوم کر شادماں ہورہے تھے اور مجمع میں موجود خاص لوگ دولہا کے اوپر سے پیسے نچھاور کرتے ہوئے ہوا میں اچھال کر اپنی خوشی کا اظہار کررہے تھے۔ جس سے ناچنے گانے والوں میں ہڑدنگ مچ جاتا اور پیسے لپکنے کے لیے لوگ ایک دوسرے پر گر گر پڑتے تھے۔ ہریش کچھ وقت پہلے ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے گاؤں لوٹا تھا اور گاؤں میں ہونے والے الیکشن جیت کر گاؤں کا مکھیا بن گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ ہریش کا پورے گاؤں میں چرچا تھا اور لوگ گھروں سے نکل نکل کر بارات کی منھ دکھائی کررہے تھے۔

برسوں سے اجڑتی جارہی حویلی سے میر سرفراز عبداللہ کا سات سال کا پوتا عاطف بھی کرتہ پاجامہ اور سر پر ٹوپی لگائے ہوئے بارات کی سلامی کے لیے نکل آیا تھا۔ بارات حویلی کے قریب رُکی تو حویلی جو آثار قدیمہ بن گئی تھی کے در ودیوار میں لرزش پیدا ہوگئی، بنیاد لڑکھڑانے لگی اور وقت کی گرد اب سے حویلی پر پڑیں جھریاں نمایاں ہونے لگیں، حویلی کی یہ لرزش صرف شور وغل کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ بہت کچھ اضطرابی کیفیت گزری ہوئی یادوں کا ماتم تھی جو حویلی اپنے پرانے دنوں کو یاد کرکے کررہی تھی۔ کیونکہ اسی حویلی کا ایک وقت وہ بھی تھا جب یہاں کی

اینٹ اینٹ جوان تھی اور ہر خاص وعام کی نگاہ اسی پر ٹھہر جاتی تھی۔ میر سرفراز عبداللہ کے والد میر شیخو گاؤں کے مکھیا تھے۔ ان کے یہاں گاؤں کے لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ہر وقت نوکر چاکر گھر کے کاموں میں مصروف رہتے تھے کسی کے لیے چائے بن رہی ہے تو کسی کے لیے سلفہ تیار ہو رہا ہے تو کوئی چلم بھر رہا ہے۔ یہ وہ وقت تھا جب گاؤں کے بڑے بڑے لوگ بلا کسی تفریق کے ایک ساتھ بیٹھ کر کسی کی بخیہ ادھیڑتے اور رفو کرتے تھے۔

میر سرفراز عبداللہ جب اس حویلی سے بارات لے کر نکلے تھے اس وقت یہ حویلی نئی نویلی دلہن کی طرح سجائی گئی تھی۔ حویلی کے بارہ دروں سے صدقہ دیا گیا تھا۔ ماں اور بزرگ عورتیں بلائیں لے لے کر دعائیں دے رہی تھیں۔ رشتہ دار، دوست واحباب قیمتی لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ بہنوں نے نیگ مانگنے کے لیے بھائی کو گھیر لیا تھا۔ کمین اور رزالے اپنا حصہ لینے کے لیے جمع تھے۔ میراثنیں شادمانیاں گا رہیں تھیں۔ غرض کہ پوری حویلی میں ایک ہنگامہ تھا۔ میر سرفراز عبداللہ کی بارات جس وقت حویلی سے نکلی تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک عظیم الشان شہنشاہ قلع فتح کر نے کے لئے نکلا ہے اور لوگ اس کی متوقع کامیابی کا جشن منا رہے ہیں۔ میر صاحب چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہنے ہوئے دوست واحباب کے ساتھ گھوڑے پر آگے آگے تھے اور سپاہی ہاتھ میں بھالے لیے ہوئے پیچھے پیچھے تھے۔ گاؤں کا عام اور خاص ہر آدمی بارات میں شامل تھا۔ اگلے روز میر شیخو نے پورے گاؤں کو اصلی گھی میں پکا ہوا دعوت ولیمہ دیا تھا۔ یہ گاؤں کی پہلی شادی تھی جس میں کھانے کا اتنا اہتمام کیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج تک اس بارات کے چرچے لوگوں کی زبان پر تھے اور لوگ قصہ کہانی کی طرح اپنے بچوں سے اس بارات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ لیکن آج یہ حویلی اپنی کشش کھو چکی تھی۔ گرداب بلا نے حویلی کی بنیاد میں دیمک لگا دی تھی۔ در و دیوار کی مٹی جھڑنے لگی تھی اور چھت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ میر سرفراز عبداللہ کے پوتے احمد اور عاطف نے تو ہمیشہ سے حویلی کی نیو کو بیٹھتے ہوئے ہی دیکھا اور جب سے میر سرفراز عبداللہ کے اکلوتے بیٹے میر مشتاق عبداللہ فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہوئے اس وقت سے تو جیسے اس حویلی کا برا وقت شروع ہو گیا تھا۔ بیٹے کی موت نے ہاشمی بیگم کو وقت سے پہلے ہی ضعیف کر دیا تھا۔ بہو نور جہاں نے خاموش رہ کر خود کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر لیا تھا۔ جوان بیٹے کی موت سے میر سرفراز عبداللہ کی کمر جھک گئی تھی۔ وہ جھکی ہوئی کمر سے بیٹے کی لاش کے بعد پانچ بچوں کی مسلسل ذمہ داری کا بوجھ تو ڈھوتے رہے لیکن اب ان کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ اسی لیے تمام جائداد آہستہ آہستہ وقت کی نذر ہوتی جا رہی تھی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ گھر کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ تمام جائداد میں صرف یہ حویلی بچی تھی وہ بھی اب عجیب اور متغیر حالت میں تھی اور بارات کے شور سے چیخ اٹھی تھی اور نہ صرف حویلی بلکہ بستر پر پڑے ہوئے میر سرفراز عبداللہ بھی زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑا اُٹھے تھے۔ ان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے شور وغل سے دل کا دورہ پڑ رہا ہے۔ جب سے میر مشتاق فساد کا شکار ہوئے تھے اس وقت سے وہ شور وغل سے اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ اسی اضطرابی کیفیت میں انھوں نے احمد کو آواز لگائی۔ لیکن شور وغل کی وجہ سے ان کی آواز کی کسی تک رسائی نہ ہو سکی اور وہ بے بس ہو کر بستر پر گر گئے کہ

اچانک اینٹوں کے گرنے کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ سب آنگن کی طرف دوڑے۔ تیز آواز کی تھرتھراہٹ سے ایک درنیست ونابود ہو گیا تھا اور میر سرفراز عبداللہ اضطرابی حالت میں بستر پر تڑپ رہے تھے۔ احمد نے جب دادا کو تڑپتے دیکھا تو ان کے پاس پہنچ کر ان کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ احمد سمجھ گیا تھا کہ زیادہ شور وغل کی بدولت دادا کی حالت مضطرب ہے اور اسی لیے وہ تیزی سے دروازے کی طرف دوڑا تا کہ شور کو بند کرا سکے۔ لیکن میر سرفراز عبداللہ کی لڑکھڑاتی آواز نے اسے باہر جانے سے روکا اور انھوں نے احمد کے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا۔ احمد باہر جانا چاہتا تھا لیکن دادا کی بگڑتی حالت نے اسے وہیں بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔ میر سرفراز عبداللہ کو شاید فساد کی یاد آ گئی تھی ان کے دل پر خوف طاری ہو گیا تھا اور اسی لیے انھوں نے احمد کو سینے سے لپٹا لیا۔ وہ احمد کو باہر جانے نہیں دینا چاہتے تھے پھر انھیں اس بات کا علم بھی تھا کہ اب یہ آوازیں دھیرے دھیرے پورے معاشرے پر چھا گئی ہیں اسی لیے اس آواز کو کم کرنا مشکل ہے۔

میر سرفراز عبداللہ پر اس شور وغل سے اور لرزہ طاری ہوتا جا رہا تھا۔ انھوں نے سب کو اپنے پاس اکٹھا ہو جانے کو کہا۔ لیکن پوری حویلی میں عاطف کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ وہ عاطف کو دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے بار بار عاطف کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ بارات حویلی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ احمد عاطف کو حویلی میں تلاش کرنے کے بعد باہر نکل گیا تھا لیکن حویلی کے باہر بھی عاطف کا کہیں نام ونشان نہیں تھا اس نے عاطف کو چاروں طرف دیکھا اور پھر وہ عاطف کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے حویلی سے دور بارات کی بھیڑ تک پہنچ گیا کہ تبھی اچانک اس نے دیکھا ناچتی گاتی بھیڑ میں سے کسی نے عاطف کو باہر کی طرف دھکا دیا ہے۔ احمد نے بڑھ کر اس کو سنبھالا۔ عاطف کے چہرے پر ہنسی تھی۔ احمد نے عاطف کے کپڑے درست کیے اور ہاتھ پکڑ کر گھر کی طرف لے جانے لگا۔ احمد نے دیکھا کہ عاطف کی مٹھی بند تھی۔ اس نے عاطف کی بند مٹھی کو ہی پکڑا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ میر سرفراز عبداللہ نے عاطف کو آتے دیکھا تو کچھ سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش کی کہ تبھی اچانک احمد نے عاطف سے مٹھی کھولنے کے لیے کہا اور نہ کھولنے پر زبردستی اس کی مٹھی کھول دی۔ عاطف کی مٹھی سے چند سکے پھسل کر زمین پر رقص کرنے لگے جنھیں وہ بارات سے لوٹ کر لایا تھا۔ احمد نے آگے بڑھ کر دادا کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن میر سرفراز عبداللہ سے سنبھلا نہ گیا اور وہ سنبھلتے سنبھلتے بستر پر گر پڑے۔ پیسوں کی کھنکھناہٹ نے ان کے پورے وجود میں ہلچل مچا دی تھی اور پھر اسی بے چینی کے عالم میں انھوں دو ہچکیاں لی اور آنکھیں بند کر لی۔ وقت کی شاخ پر بیٹھا ہوا یہ زخمی پرندہ سانسوں کی ڈور کو توڑتا ہوا ابدی نیند میں ڈوب گیا۔

◂◂ ● ▸▸

D%Amir Asgar naqvi
98,new basti abdullapur Qila Road ,Meerut
Pin code:250001
Email id:shubeenaqvi1@gmail.com

● افسانہ

● ابصار فاطمہ

دوبوری عزت

وہ اپنی پانچ چھ بکریوں کو لیے گھومتی گھامتی گاؤں سے ذرا دور نالے تک نکل آئی تھی۔ چلتی جاتی تھی اور ہر ہر چیز کو غور سے دیکھتی جاتی تھی۔ کسی چیز کو دیکھنے میں زیادہ مگن ہوتی تو اردگرد کا دھیان ہی نہیں رہتا تھا۔ اب بھی جھاڑی میں لگے ایک جالے کو دیکھنے میں میں لگ گئی جس پہ ایک مکڑی بیٹھی تھی اور ادھر ادھر منڈلاتی مکھی کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مکھی قریب آتی تو مکڑی بھی آگے بڑھ کے حملے کی کوشش کرتی اور مکھی فوراً پیچھے ہو جاتی۔ کچھ دیر یہی آنکھ مچولی چلتی رہی پھر آہستہ آہستہ مکڑی جالے سے بھی باہر نکل آئی اور جھاڑی پہ چلتے چلتے مکھی کو پکڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ مکھی کو اندازہ بھی نہیں ہو پایا اور مکڑی سے بچنے کی کوشش میں وہ عین جالے کے پاس آ گئی۔ مکڑی ایک دم جھپٹی تو مکھی پیچھے ہوتے ہی جالے میں پھنس گئی۔ مکھی کو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ مکڑی اسے جان بوجھ کے جالے تک لے آئی تھی۔ وہ یہ کشمکش دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ مکڑی کے جھپٹنے پہ ایک دم اچھل گئی۔

''اے جیجل۔''

اچانک ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ ان نے مڑ کے دیکھا تو چاچا رحمت کھڑا تھا۔ وہ ایک دم خوش ہو گئی۔

''چاچا کیا لایا شہر سے میرے لیے؟''

''یہ لے شہر سے رنگین کلپ لایا ہوں جیسے شہر میں تیری جیسی بچیاں لگاتی ہیں۔ دیکھ ان پہ چھوٹی چھوٹی گڈیاں بھی بنی ہیں۔'' چاچا رحمت نے کلپ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ چاچا رحمت اس کا سگا چاچا نہیں تھا مگر گاؤں کا رواج تھا کہ ہر بڑے کو چاچا ہی کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ چاچا کہتا تھا کہ جیجل دنیا کی سب سے پیاری بچی ہے۔ وہ شہر جاتا تھا تو اپنے بچوں کے لیے کچھ لائے یا نا لائے مگر جیجل کے لیے کچھ نا کچھ ضرور لاتا تھا۔ سات سالا چھوٹی سی جیجل کو چاچا رحمت بہت پسند تھا۔ اس کے پاس جیجل کی وہ لامتناہی بے سروپا باتیں سننے کے لیے بہت وقت تھا جو کبھی اماں ابا نے نہیں سنیں۔ ابا تو سارا دن باہر ہوتا تھا۔ کچھ وقت کھیتوں میں گزار کر باقی وقت گاؤں کے ہوٹل پہ باقی مردوں کے ساتھ باتوں میں یا مرغے لڑا کے

گزارتا تھا۔ اماں صبح صبح تو کھیتوں پہ کام کے لیے جاتی تھی۔ دوپہر کو واپس آ کر جو گھر کے کاموں لگتی تو ان کا اختتام مغرب کو اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ بس شام میں جس وقت ابا کچھ دیر کے لیے گھر آتا تھا وہ وقت اماں کے کام سے بریک کا ہوتا کیوں کہ روز کسی فریضے کہ طرح اماں ابا کسی نا کسی بات پہ لڑتے، ابا اماں کو مارتا بیچ میں ماں کو بچانے کی کوشش کرتی۔ جیجل کے بھی ایک دو لاتیں گھونسے پڑ ہی جاتے۔ اور اماں بھی بعد میں اپنا غصہ نکالنے کے لیے بھی جیجل کو ہی مارتی تھی۔ وہ دونوں تو اس جنگ کے بعد اپنے معمول کے کاموں میں لگ جاتے اور جیجل کسی کونے میں بیٹھی سسکتی رہتی۔ اماں، ابا کو تازی روٹی بنا بنا کر دیتی جاتی اور سارے دن کی روداد سناتی جاتی جو ابا ہوں ہاں کر کے سنی ان سنی کرتا رہتا۔

اب جیجل نے روز کی مار سے بچنے کا یہ حل نکالا تھا کہ اسکول سے آ کر وہ یا تو محلے کے بچوں کے ساتھ گلی ڈنڈا وغیرہ کھیلنے نکل جاتی یا بکریاں لے کے گاؤں اور اس کے اردگرد کے علاقے میں چراتی پھرتی تھی۔ اتفاق ایسا ہوتا کہ چاچا رحمت بھی کہیں نا کہیں سے نکل آتا اور اپنی گود میں بٹھا کر دنیا جہان کے قصے سناتا اور اس کی سنتا۔ اسے چاچا رحمت کے پاس رہنا اچھا لگتا تھا مگر جب وہ ادھر ادھر سہلاتا تھا تو بہت عجیب لگتا تھا جیسے جسم پہ کیڑے مکوڑے رینگ رہے ہوں۔

آج بھی جیجل باتوں میں لگی تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ شام سے رات ہو گئی۔ وہ جب واپسی کا سوچتی چاچا کوئی دلچسپ قصہ شروع کر دیتا۔

شام ڈھلنے لگی تو اماں کو غصہ آنے لگا۔ انہوں نے سوچ لیا کہ آج تو ہر حال میں ابا سے کہہ کر اس کو ایسا سیدھا کروائیں گی کہ پھر دوبارہ دیر کرنے کی ہمت نہیں کرے گی، باہر جانے سے روک وہ سکتی نہیں تھیں کیونکہ اگر جیجل نہ جاتی تو انہیں بکریاں لے کے جانا پڑتا جس کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ مگر جب شام گہری ہو کر رات میں بدل گئی تو ابا اور اماں دونوں کو تشویش ہونے لگی۔ ایک تو لڑکی ذات پھر آج کل تو حالات بھی ایسے ویسے ہی تھے۔ اماں کو ہول اٹھنے لگے۔ ان کے ذہن میں بار بار دو مہینے پہلے والا واقعہ آنے لگا جب ساتھ والے اکسی گاؤں میں ایک بچے کے ساتھ غلط کام کر کے اس کا گلا دبا کے کھیتوں میں پھینک گئے تھے۔ اماں اور ابا واقعی بہت پریشان ہو گئے تھے۔ پہلے تو دونوں نے محلے کے گھروں میں پتا کیا پھر ابا ہوٹل پہ بیٹھے لوگوں سے پوچھنے گاؤں سے باہر چلا گیا۔

زیادہ تر کو تو پتا ہی نہیں تھا۔ ایک دم بشیر کو یاد آیا۔

''تو رحمت سے پوچھ کے دیکھ وہ عموماً اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔''

''عموماً ساتھ ہوتی ہے کیا مطلب؟'' ابا کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ رحمت کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ کافی عرصے سے الٹے سیدھے کاموں میں ملوث ہوتا تھا۔

''ہاں کئی دفعہ ہم نے اسے جیجل کے ساتھ دیکھا ہے۔''

''تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے؟''

''لو تم تو مجھ پہ ہی ناراض ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ بچی ہے، اس کا کیا بگاڑے گا۔''

''ابھی کسی کو پتا ہے کہ رحمت کہاں ہے؟'' ابا نے بحث کرنے سے بہتر سمجھا کہ پہلے جیجل کو ڈھونڈ لے۔

''ہاں وہ تو جب میں ادھر آ رہا تھا تو نالے کی طرف جاتا نظر آیا تھا شام میں۔'' بچل نے بتایا تو ابا فوراً نالے کی طرف چل دیا۔ نالے سے کچھ ہی آگے گیا ہوگا کہ ابا کو چاند کی روشنی میں دھندلا دھندلا سا رحمت بیٹھا نظر آ گیا۔ وہ مشکوک انداز میں کچھ کر رہا تھا۔ کچھ اور قریب گیا تو اس کی گود میں سوتی جیجل بھی نظر آ گئی۔ رحمت کا ہاتھ اس کی فراک میں تھا۔ ابا غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ آگے بڑھ کے رحمت کو گریبان پکڑ کے اٹھا لیا۔ جھٹکے سے جیجل کا سر زمین پہ لگا اور وہ ایک دم جاگ گئی۔ ابا کو غصے میں دیکھ کر وہ فوراً گھر کی طرف بھاگی جبکہ ابا رحمت کو مارتا ہوا گاؤں کے بیچ لے آیا۔ شور سن کے سب ہی جمع ہو گئے۔ سب غصے میں رحمت کو لعن طعن کرنے لگے۔ کچھ بڑوں نے آگے بڑھ کے معاملہ سنبھالا اور فیصلہ اگلے دن جرگہ میں کرنے کا مشورہ دے دیا۔ ایک رات کے لیے رحمت کو وڈیرے کی بیٹھک میں بند کر دیا گیا۔

اگلی شام پھر گاؤں والے جمع ہوئے۔ ابا ابھی بھی غصے میں تھا اس کا کہنا تھا کہ ابھی اور اسی وقت رحمت کو پولیس کے حوالے کر کے پرچہ کٹوایا جائے۔ پہلے تو جرگہ اسے سمجھاتا رہا پھر ایک دم وڈیرے کو غصہ آ گیا۔

''تمہیں شوق ہے پولیس تک معاملہ پہنچا کر برادری کی عزت اچھالنے کا تو شوق سے جاؤ ہمیں پھر بڑا بنا کے بٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ جا کر اخباروں میں بھی اپنی عزت کا تماشا لگوا لو۔'' ابا فوراً معافیاں مانگنے لگا۔ اسے پتا تھا جرگے کا فیصلہ نہ ماننے مطلب برادری اور گاؤں دونوں چھوڑنا ہے۔ ابا کی حامی بھرنے پہ وڈیرا رحمت سے مخاطب ہوا۔

''کیوں رحمت تو بتا؟ کریں تجھے پولیس کے حوالے یا یہیں معاملہ ختم کریں۔'' رحمت نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''سائیں آپ کے حکم سے سرتابی کی مجال ہے کیا؟ جتنی گندم کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔''

''نہ رحمت نہ۔ عزت کا بدلہ عزت۔ تیری بھی تو بیٹی ہے ایک۔ جیجل کے باپ مولا بخش کو عوضے میں دینی ہوگی۔''

''سائیں میرا جرم اتنا بڑا نہیں ہے کہ میری بیٹی عوضے میں دی جائے۔ اور پھر یہ معاملے تو گندم کی بوری پہ طے ہو ہی جاتے ہیں۔'' رحمت نے شاید کسی پرانے فیصلے کا حوالہ دیا تھا۔

''ہو جاتے ہیں مگر یہ لڑکی ذات کا معاملہ ہے۔'' رحمت گڑگڑانے لگا۔ اتنے میں ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا ہجوم میں سے نکل کے آگے آیا۔

''وڈیرہ سائیں! معاملہ ختم کریں۔ دو بوری گندم کافی ہے۔ ویسے بھی مرد کی ذات تو عورت سے بڑی ہوتی ہے ناں، تو بس جتنی میری عزت کی قیمت لگائی تھی اتنی کافی ہے۔ آپ کی دی ہوئی دو بوری گندم ابھی پڑی ہے میرے گھر میں..... نہیں اترتی وہ کسی کے حلق سے لے لیں، کسی اور کی عزت کی قیمت بنا کے۔''

◂◂ ● ▸▸

Flate # 202 Al amin Towers, Minara Road,
Sukkur, Sind, (Pakistan)03313162917
absarfatima@hotmail.com

اقبال حسن آزاد

کی اولین تنقیدی تصنیف

نثری اصناف ادب

اور

طنز و مزاح کی روایت

صفحات ۱۵۲ قیمت ۳۰۰/ سنہ اشاعت اول ۲۰۱۴

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

موبائل نمبر : +918210498674

● افسانہ

● فاطمہ عثمان زاھد

بیم ورجا

وہ بچپن سے ہی اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب پہچانتے تھے، خوب جانتے تھے۔ جب وہ ہنستی، وہ اس پر حاوی ہو جاتا.....اور جب وہ اکیلی ہوتی تب بھی وہ اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ پل کر جوان ہوئے تھے.....فرق بس اتنا تھا کہ اب وہ اسے اپنے وجود میں چھپا سکتی تھی.....اسے چھپانا آتا تھا۔ اب وہ سرکشی کے لبادے میں اسے ڈھانپ لیتی تھی۔ لوگ جو چاہتے اسے کہتے رہتے۔ اب وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ اس کی اماں کہتی ''رجا! اپنے آپ سے باہر نہ ہوا کر.....لوگ کیا کہیں گے.....کسی اچھے گھر میں تیری شادی نہیں ہوگئی۔''

اور وہ کہتی مجھے نہیں کرنی شادی.....کتنی بار سمجھاتی وہ اپنی اماں کو مگر وہ نہیں سمجھتی تھیں۔ کبھی کوئی رشتہ لے آتیں، کبھی رشتے کرانے والی کے گھر کے چکر لگاتیں۔ اگر کوئی رجا کو دیکھنے آجاتا تو پہلے وہ کمرے میں تیار ہونے کے بہانے بند رہتی اور بعد میں مہمانوں کے سامنے آکر ایسا برتاؤ کرتی کہ دوبارہ اس گھر کی دہلیز پہ وہ قدم نہ رکھتے۔ اماں بیچاری کو پتہ بھی نہ چلتا کہ رجا کمرے میں اس کے ساتھ وقت گزار کے آئی تھی۔ اس کی بات کو رجا ایسے مانتی تھی جیسے کسی الہامی کتاب کی آیت۔ وہ جو کہتا تھا وہ اسی طرح کرتی تھی.....اور کیوں نہ مانتی اس کی ہر بات۔ بچپن میں سب لوگوں نے مل کر جب اس کی اماں کو دلہن بنایا تھا تب وہی اس کا دلاسہ بنا تھا۔

پھر رجا کو جب سوتیلے باپ کی چیرتی پھاڑتی محبت سہنی پڑی تھی، تب بھی وہی اسے سنبھالتا تھا اور سمجھاتا رہتا تھا کہ چپ رہے گی تو سب صحیح ہو جائے گا ورنہ اماں تو اس کو مار ہی ڈالے گی۔ لہذا رات وہ اس کے دامن میں منہ چھپا کر رو لیتی اور صبح ڈھٹائی سے جی گزارتی۔

اب وہ کیسے اماں کے کہنے پر اسے چھوڑ کر، اس کی نافرمانی کر کے شادی کر لیتی۔

آج وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اماں رہی تھی نہ اماں کا شوہر۔ رجا کی عمر ڈھل گئی تھی مگر وہ آج بھی جوان تھا۔ وہ آج بھی اس پر ایسے ہی حاوی ہو جاتا جیسے بچپن میں وہ اس سے اپنی ہر جائز ناجائز بات منوایا کرتا تھا.....بیشک وہ کمزور ہوگئی تھی مگر وہ تو مضبوط تھا۔

یہ خوف ہی تو تھا جو اس کا اپنا تھا۔

یہی خوف جس نے اس کے سامنے جنم لیا تھا اور اس کے ساتھ ہی پھلتا پھولتا رہا تھا۔ صرف اسی کو حق تھا کہ وہ اپنی مرضی رجا پر مسلط کرتا یا پھر اس کی مرضی کا گلا گھونٹ دیتا۔

وہ بہر حال رجا کا اپنا تھا۔

آج وہ اپنے خوف کے دامن میں بڑھاپے کو جنم دینے جا رہی تھی۔

◂◂ ● ▸▸

9:House Number Hill View Street
Safari Villa:1 Bahria Town
Rawalpindi Punjab Pakistan
+92-3365214832

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثـــالـــث

کا

فکشن نمبر (شمارہ نمبر ۹۔۱۰)

صفحات ۴۴۸ قیمت ۳۰۰/روپے

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

موبائل نمبر : +918210498674

● خط

● ڈاکٹر فریحہ ظفر

ایک خط.....علی گڈھ سے

72,New Whidia
Abdullah Hall
A.M.U
Aligarh
13.05.06

ممی، پاپا! السلام علیکم

میں یہاں خیریت سے ہوں۔ ہاسٹل میں بہت کم لڑکیاں بچی ہیں۔ امتحانات کے بعد زیادہ تر لڑکیاں اپنے گھر چلی گئی ہیں۔ ہم لوگ تو یہاں کو چنگ کرنے کے لئے رکے ہوئے ہیں۔ دن بھر لُو چلتی ہے لیکن میرا کمرہ ٹھنڈا ہے۔ یہاں ہم لوگ چار وقت نماز پڑھتے ہیں۔ فجر میں آنکھ نہیں کھل پاتی ہے۔ جمعہ کے روز سورہ کہف پڑھتے ہیں۔

میرے بال اب لمبے ہو گئے ہیں۔ آپ نے جو ائیر رِنگ دی تھی، وہ یہاں سبھوں کو بہت پسند آیا۔ ہم لوگوں کے کامن روم کا افتتاح ہو گیا ہے، لیکن ابھی ٹی وی نہں آئی ہے۔ افتتاح کے موقع پر میلاد ہوئی تھی۔ اس میں بہت اچھی اچھی باتیں بتائی گئیں۔

آج یہاں میڈیکل کے داخلے کے لئے ٹیسٹ تھا۔ اتنے سارے لوگ آئے تھے کہ لگ رہا تھا کہ عبداللہ ہال میں شادی ہے۔ ہما آپی اور شکیبہ آئی تھیں ملنے کے لئے۔ ہما آپی نے آپ کا بھیجا ہوا سامان دیا۔ تھینکس فار ایوری تھنگ۔ آج کل میں روز دہی جماتی ہوں .....آدھے پیکٹ دودھ کا جو یہاں ملتا ہے۔ روم نمبر ۶۹ میں ایک کلثوم آپا ہیں۔ انہوں نے ہی دہی کا جوڑن دیا تھا۔ چائے اور کُرکُرے بند۔ آج لبنیٰ آپا آئی تھیں۔ کہہ رہی تھیں، بال بہت اچھے لگ رہے ہیں اور کتنی گوری ہو گئی ہو۔

یہاں آم تو ملتا نہیں ہے۔ ہم لوگ مینگو شیک پیتے ہیں۔ آپ لوگ میرے لئے آم لے کر آیئے گا۔ جب ندا یہاں امتحان دینے آئے گی تو میرے ساتھ رہے گی، انشاء اللہ۔ ایک رات کا سو روپیہ لیتے ہیں۔ میں نے مہندی بھی خریدی ہے۔ جب یہاں ہم دونوں بہنیں ہونگی تو ہم لوگ مہندی لگائیں گے۔ میں نے پرسوں بھی مہندی لگائی تھی۔ اچھا رنگ آیا ہے.....ایک دم میرون۔

رات میں کبھی کبھی پندرہ بیس منٹ کے لئے بجلی گُل ہو جاتی ہے تو میں ٹیرس پر جا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ چاند ہوتا ہے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنے گھر کی بالکونی میں بیٹھی ہوں۔ لیکن کم بخت مچھر سارا مزا کرکرا کر دیتے ہیں.....ڈنک مار مار کر۔

ایک لڑکی ہے.....سمیرہ.....روم نمبر ۶۸ میں۔ آج اس کی سالگرہ ہے۔ رات ہم لوگ ویمنس کالج گئے تھے.....پھول چوری کرنے.....سمیرا کے لئے۔ میں، طوسیہ اور بتول آپا۔ سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا۔ ایک پولیتھن لیا اور ایک قینچی۔ واچ مین بھائی نماز پڑھ رہے تھے۔ ہم لوگوں نے خوب سارے پھول توڑ لئے اور بھاگے بھاگے آ گئے.....گاتے ہوئے.....چوری میرا کام۔ لیکن پھولوں کی چوری کو چوری تھوڑے ہی کہیں گے؟

آپ لوگ جب آیئے گا تو میرے لئے ایک ساؤس پَین لیتے آیئے گا۔ میرے موبائل کا چارجر بھی خراب ہو گیا ہے۔ ایک لڑکی ہے فاطمہ.....اس کے چارجر سے چارج کرتی ہوں۔

ندا سے کہنا پڑھائی وڑھائی کرے۔ مونگیر میں پلس ٹو کرنے لائق کوئی اسکول نہیں ہے۔ اور یہاں تو میں بھی کچھ مدد کر دیا کروں گی۔ میں نے تو یہیں آ کر پڑھنا سیکھا ہے۔ لیکن جب سب لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہاں مارکس اچھے نہیں ملتے ہیں تو ڈر لگتا ہے۔۔ آپ لوگ میرے لئے دعا کیجئے گا۔ اللہ بہت بڑا ہے۔ اندھا یقین ہے مجھے اس کی ذات پر۔ اسی لئے شاید میں ہر بات میں کہیں نہ کہیں ایک چھوٹی سی خوشی ڈھونڈ لیتی ہوں۔ الحمدُ للہ۔

میری پیاری بہن ندا!

بھئی تم کو میں سلام ولام نہیں کروں گی۔ ہاں! تم سلام کرنا سیکھ لو۔ انشاء اللہ یہاں آؤ گی تو سینیئرس تم سے سلام کروا کروا کر تمہیں تھکا دیں گی۔ کہیں گی:

''ہاتھ اُٹھا کر، نظریں جھکا کر ہر آپا کو کہو، السّلامُ علیکم آپا.....السّلامُ علیکم آپا۔'' دل لگا کر سیریئسلی پڑھائی کرو۔ کچھ بھی چھوڑنا مت۔ Try to grasp the base of everything. سمندر کے اوپر تیرنے سے موتی نہیں ملتے۔ اس کے لئے غوطہ لگانا پڑتا ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ ٹی وی کم دیکھا کرو۔ یہاں تو ٹی وی ہے ہی نہیں۔ ایک روز ہم لوگ اولڈ وحیدہ گئے تھے.....'ہم ساتھ ساتھ ہیں' دیکھنے۔ ڈے اسکالرس سب کہہ رہی تھیں، ''گینگسٹر دیکھا؟ کیا فلم ہے یار! کرش کا پرومو دیکھا؟ رتیک کیسا لگتا ہے؟ چائنا ٹاؤن کے گانے سنے؟'' سن سن کر پاگل ہو گئے ہم لوگ۔ بھئی ہم لوگ ہوسٹلرز ہیں۔ ہمارے پاس کہاں ٹی وی اور وی سی آر۔

ندا! تم پڑھائی کرو۔ مجھے پتہ ہے تم جب جب محنت کرتی ہو تب تب اچھے نمبرات حاصل کرتی ہو۔ But the key of this lock is hard work. یاد کرو وہ دن جب میں رات کے دس

بجتے بجتے سو جاتی تھی اور تم رات کے دو دو بجے تک پڑھتی رہتی تھی۔ وقت آ گیا ہے کہ تواریخ کو دہرایا جائے ۔چلو لگ جاؤ کام پر..... مشن علی گڈھ۔ دیکھو! نوٹرے ڈیم کا گیارہواں بارہواں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور کالج کی تو بات ہی چھوڑ دو۔

یہاں اسکول میں ہم لوگوں نے ساری ٹیچرز کا Pet Name رکھ چھوڑا ہے۔ ایک ہیں ممتاز حسین میڈم۔ ان کو ہم لوگ حسینہ کہتے ہیں۔ ''ارے کس کا پیریڈ چل رہا ہے؟ حسینہ بیگم کا؟؟'' دو بہنیں ہیں .....رخسانہ میڈم زولوجی کی اور شبانہ میڈم بائیلوجی کی۔ انہیں ہم لوگ رخشی اور شبّو میڈم کہتے ہیں۔ ایک ہما میڈم ہیں..... کم سِن ہیں اور بالوں میں چھوٹی چھوٹی فینسی بٹس لگاتی ہیں۔ انہیں ہم لوگ بے بی کلپ میڈم کہتے ہیں۔ ہماری وارڈن کا نام نورصبا میڈم ہے۔ ہم لوگوں نے اسے Modify کر کے نور جہاں بنا دیا ہے ۔لڑکیوں نے تو ہماری ہیڈ گرل عفّت آپا کو بھی نہیں چھوڑا۔ ان کا نام عفّت سے بدل کر آفت کر دیا گیا ہے۔

تمہارے لئے دو شعر عرض کرتی ہوں:

لمحہ لمحہ وقت گزر جائے گا
کچھ ہی دنوں میں اکزام آ جائے گا
اب بھی وقت ہے، دو چار لائن پڑھ لو
ورنہ پاس کیا مُنّا بھائی کرائے گا

میرے پیارے بھائی ثالث!

تمہاری بہت یاد آتی ہے۔ کیسے ہو اور تمہارے فرینڈس کیسے ہیں؟ اسکول میں تو اب چھٹی ہو گئی ہو گی۔ یاد ہے جب پچھلے سال میں تمہیں ہیری پوٹر کی کہانی سناتی تھی اور تم ندا اور ممّی بہت شوق سے سنتی تھیں۔ رات میں جب ہم لوگ بالکونی میں لیٹے رہتے تھے اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ کتنا مزا آتا تھا ۔ یہاں امتحان کے بعد ہم لوگ ہیری پوٹر سناتے تھے ایک دوسرے کو۔ اب تم خود سے پڑھا کرو۔ گرمی کی چھٹیوں میں پہلا حصہ پڑھ لینا۔ جب ندا یہاں آئے گی تو میرے نام ایک بہت بڑا سا خط لکھنا۔ اس میں سب کچھ لکھنا..... اپنے دوستوں کے بارے میں، کرکٹ کے بارے میں۔ تمہارے پاس اب تک کتنے اسٹیکرز جمع ہوئے ہیں؟ کیا کوئی نیا دوست بنا ہے؟ گرمی کی چھٹیوں کے لئے ہوم ورک ملا ہو گا۔ میں تو ابھی تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ تم دل لگا کر پڑھنا۔ اس بار تمہیں بہت اچھے نمبر لانے ہیں۔ اور کرکٹ میں بہت ساری سنچری بھی بنانی ہے۔ ٹی وی کم دیکھا کرو۔ آنکھ خراب ہو جاتی ہے اور پھر جسّی کی طرح موٹے موٹے چشمے لگ جاتے ہیں۔ لیٹ کر بھی پڑھائی مت کرو۔ بابو! گھر میں سب تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ تم اب بڑے ہو گئے ہو۔ لیکن پھر بھی گھر میں سب سے چھوٹے ہی رہو گے۔ پاپا، ممّی، ندا آپی اور میں..... سب

تمہیں بہت پیار کرتے ہیں۔ جب میں سوچتی ہوں کہ میرا چھوٹا سا بھائی نماز پڑھتا ہے اور قرآن بھی تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ ممّی کہہ رہی تھیں کہ وہ ٹی شرٹ جو میں تمہارے لئے بنگلور سے لائی تھی، تم پر بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مجھے پتہ ہے کہ میرا بھائی ہے ہی اتنا اسمارٹ کہ اس پر ہر ڈریس اچھا لگتا ہے۔ اور کھانا وانا ٹھیک سے کھاتے ہو نا؟ Love You,Miss You اور خط ضرور لکھنا۔ اور پڑھائی بھی دل لگا کر کرنا ۔ہم سب کے لئے دعا کرنا۔ ندا اور میرے رزلٹ کے لئے بھی دعا کرنا اور ممّی پاپا کا خیال رکھنا۔

فقط

فریحہ

◂◂ ● ▸▸

RIMS.Ranchi(Jharkhand)

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثـــالـــث

صفحات ۲۲۴ عام شمارے کی قیمت ۱۷۵

ملنے کا پتہ

ثالث پبلیکیشنز، شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

موبائل نمبر : +918210498674

● تبصرے

نام کتاب: جنگل کی آواز
صنف: افسانہ
مصنفہ: نجمہ محمود
قیمت: 300/روپے
صفحات: 267
اشاعت: 2011
ناشر: وژن پبلیکیشنز، علی گڈھ
مبصر: سلمیٰ حجاب

خلیل جبران کے ایک قول کے حوالے سے جب ایک آزاد روح قلم ہاتھ میں لے کر محسوسات کے بحر بیکراں میں اترتی ہے تو وہ گوہر آبدار اپنے دامن میں سمیٹ لاتی ہے جن کی آب وتاب سے ماحول روشن ہو جاتا ہے۔ شاہراہِ حیات پر چراغ خود بخود جل اٹھتے ہیں۔ الوہیت کے نور سے سرشار و معمور وجود روحانی اپنے جسمانی پیکر کی قید سے آزاد ہو کر افلاک وسعتوں میں جب سفر کرتا ہے تو ان ماورائی حقائق کا انکشاف کرتا ہے جو منبع حیات ہیں! پروفیسر نجمہ محمود کی یہ تمام ادبی تخلیقات اسی زمرے میں رکھی جا سکتی ہیں۔ یعنی گوہر آبدار شاہراہِ حیات کے روشن چراغ اور انکشافاتِ حقائق۔

پروفیسر نجمہ محمود کا زیر نظر مجموعہ ''جنگل کی آواز'' نثری تخلیقات کے اعتبار سے مجمع البحرین ہے۔ جس میں افسانے، تذکرے اور مختصر ناولیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مصنفہ کے ادبی قد و وقار کے بارے میں مختلف مصنفین کی قیمتی آراء مضامین کی شکل میں شامل ہیں۔ جن میں سے بیشتر اردو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں مثلاً سید حامد، سجاد ظہیر، قاضی عبدالستار، سلام بن رزاق اور عظیم اختر وغیرہ۔ جو مصنفہ نے خود پیش لفظ کے عنوان سے اپنے تخلیقی سفر کی مختصر تاریخ بیان کر دی ہے۔ یوں ان کی تمام ادبی کاوشیں ایک طرح سے ان کے ارتقائی سفر کے مختلف پڑاؤں ہیں.....اپنے آپ میں منزل بھی ہیں اور نئی منزلوں کے نقیب بھی۔ تیرہ سال کی عمر میں (۱۹۵۵) لکھا گیا افسانہ ''پڑاؤ'' اور ۱۹۹۹ء میں تحریر کردہ افسانہ ''وجود کے سوتے سے جدا'' بھی شامل ہے۔ ان تمام افسانوں کا سب سے بڑا وصف ہے ان کی انفرادیت۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بھی۔ اپنی تخلیقات کو جنھیں ایک عام قاری افسانہ ہی شمار کرے گا، ''کہانی''، ''تذکرے''،

''افسانے'' اور ''ناول'' کے عنوانات سے تقسیم کر دیا ہے۔ مطالعہ کرنے کے بعد کہانی اور افسانے کا فرق قاری کی سمجھ میں آ جائیگا۔ کسی خاص لمحہ کو گرفت میں لے کر کرداروں اور واقعات کے اردگرد الفاظ کے تانے بانے کی مدد سے ایک مخصوص تاثیر پیدا کرنے والے بیانیہ کو مصنفہ نے کہانی کا نام دیا ہے۔ واقعہ نگاری نے ان تمام کہانیوں کے کہانی پن کو برقرار رکھا ہے۔ افسانہ نسبتاً ایک وسیع کینوس پر حرف بیان کے مختلف رنگوں کے امتزاج سے بنائی ہوئی وہ تصویر ہے جس کے پیش منظر میں ادیبہ خود اور پس منظر میں وہ پوری کائنات جلوہ افروز ہے جس کا وہ ایک ''جزو'' ہے۔ وہ ''جزو'' جو کل تمام وسعتیں اور آفاقیت خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔ حجاب امتیاز علی کے رنگ میں لکھتے گئے تین طرحی افسانے (طرحی افسانے مصنفہ کی ذہنی اختراع ہے جو بالکل نئی ہے) اپنے اندر کائنات وسعت اور آفاقیت سمیٹے ہوئے ہیں۔ ادب، فلسفہ، مذہب، تصوف، شعریت اور موسیقیت کے حسین امتزاج سے ان سب افسانوں میں ماورائی حسن پیدا ہو گیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہر قاری اس سے وہ حظ نہ اٹھا سکے جس کے زیر اثر یہ تحریریں نذر قرطاس کی گئی ہیں۔ شعور کی عمیق گہرائیوں میں پیوست احساس کی جڑوں کی آبیاری کر کے شجر حیات کو پھلنے پھولنے اور ثمر بار کرنے کی سعی کرنا پیکر خاکی میں اسیر روح کو آزاد کرنا، احساس کے سوئے ہوئے چشموں کو آبشار کرنا۔ اور ایک حسین دنیا کے قصور کو زندگی دینا۔ یہ سب ان تخلیقات کا مقصد ہے جو یقیناً نیک بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

انگریزی اور اساطیری ادب سے متاثر ادیبہ نے جا بجا ایسے حوالے بھی دئے کہ علم کی آفاقیت پر یقین آ جاتا ہے۔ انسانی وجود کی حقیقت اور عالم گیریت پر شبہ نہیں رہتا ہے۔ تلاشِ حق ہمالیہ کی گھپاؤں میں ہو یا 'غارِ حرا' میں تلاش حق ہی ہے۔ وہ منزل وہ جہاں تمام راستے ختم ہو کر بس ایک نور میں تبدیل جاتے ہیں۔ خود آگہی کے جس منزل پر پہونچ کر ادیبہ نے ان افسانوں اور ناولوں کی تخلیق کی ہے وہ الہام کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ افسانے نہیں یہ تو الہامی نثری شاعری ہے جس میں مصرعے وسعت پا کر افسانے بن گئے ہیں۔ حقیقت نگاری ہے مگر اساطیری انداز کی'' نثر نگاری شاعرانہ انداز کی، منظر نگاری ہے تو افسانوی میں فلسفیانہ انداز کی، کردار نگاری مصورانہ انداز کی۔ اور ان سب کے امتزاج سے ایک خوابناک ماحول پیدا ہو گیا جس کے حسن میں قاری گم بھی ہو سکتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر پانے کی آرزو بھی کر سکتا ہے۔

مجموعہ میں یکجا تمام تخلیقات کی ترتیب سے مجموعہ میں از خود ایک سوانحی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اپنے بارے میں کچھ مصنفہ نے خود کہہ دیا، کچھ دوسرے مصنفین نے اور کچھ خود مصنفہ کی تحریروں نے! اپنی تخلیقات کو یوں پیش کرنے کا طریقہ بھی اپنے آپ میں ایک قدرت رکھتا ہے۔ اپنی تخلیقات کے معیار کے بارے میں اپنی رائے پیش کرنا بھی ایک نیا قدم ہے۔ یہ تبصرہ مجموعہ کے مجموعی تاثر کے زیر اثر تحریر کیا گیا ہے۔ ان کہانیوں اور افسانوں یا کسی خاص کہانی یا افسانہ کے معیار و مقام کا فیصلہ اہل نقد و نظر ہی کریں گے۔

موجودہ دور کی افسانہ نگاری (جس میں تخیل کی نفی اور حقیقت نگاری پر زور دیا جاتا ہے) کی دنیا میں یہ افسانے جو مقام پائیں مجھے اس سے غرض نہیں مگر یہ سچ ہے ایک سچے، دیانتدار، ایمان دار، ذی حس اور فطری ادیب کو یہ تمام تخلیقات اس دنیا میں ضرور لے جائیں گے۔ جہاں اسکو حسنِ فطرت سے اپنی آہنگی کا سرور طاری ہو جائیگا اور اپنے نورانی وجود کا احساس اجاگر ہوگا۔ نجمہ محمود صاحبہ انسانیت کی خدمت کو ادب کا فرضِ اولین سمجھتی ہیں اور اسی مقصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہیں۔ خدا انھیں کامیابی عطا کرے۔ آمین۔

یوں تو میں ہمیشہ ہی یہ لکھتی ہوں کہ کتابیں خرید کر پڑھیں مگر اس مجموعہ کیلئے میں خاص طور پر یہ اپیل کر رہی ہوں کہ اسے ضرور پڑھیں۔ خواہ قرض لے کر پڑھیں۔ دردِ دل کو اور دیدۂ بینا کو کھول کر پڑھیں تاکہ گلشن ادب سے آئے ہوئے ان مہکتے ہوئے جھونکوں سے آپ کی روح سرشار ہو سکے۔

ادیبہ محترمہ سے ایک گذارش ہے، اپنی بالکل نئی اور خوبصورت تحریروں کے ذریعہ انھوں نے سوئے ذہنوں اور خوابیدہ روحوں پر دستک دی ہے۔ ان دستکوں سے دروازے کھل بھی سکتے ہیں اور دروازہ کھولنے والے سوالات بھی کریں گے۔ ان تمام استفسار کے جوابات کے لئے وہ تیار رہیں۔ اگر والہانِ ادب کے قلم سانس لے رہے ہیں تو ردعمل کا اظہار ہوگا۔

◂◂ ● ▸▸

نام کتاب: روح دیکھی ہے کبھی؟
صنف: افسانہ
مصنفہ: ھما فلک
قیمت: 500/روپے
صفحات: 192
اشاعت: 2018
ناشر: انہماک انٹرنیشنل پبلیکیشنز، ۶/غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور (پاکستان)
مبصر: اقبال حسن آزاد

ھما فلک کا تعلق پاکستان سے ہے اور وہ فی الحال جرمنی میں مقیم ہیں۔ سوشل میڈیا کے وجود میں آنے کے بعد افسانہ نگاروں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد ہمارے سامنے آئی ہے۔ یہ وہ قلمکار ہیں جنہیں اردو جرائد و رسائل میں بوجوہ جگہ نہیں مل پائی یا انہیں بہت ہی کم موقع دیا گیا۔ فیس بک اور دیگر ذرائع ابلاغ نے ان کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا اور انہیں ادبی دنیا سے روشناس کرایا۔ سیدہ آیت (سیدہ راحیلہ

شیرازی، مدیرہ انہماک انٹرنیشنل فورم و جریدہ) اپنے تعارفی مضمون ''فلک نامے اور فلکسانے'' میں یوں رقم طراز ہیں: ''ھما فلک اردو ادب اور آن لائن ادبی فورمز کی ایک معتبر ہستی ہیں۔''

ھما فلک بھی انہی فنکاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کی ادبی عمر بہت زیادہ نہیں ہے لیکن انہوں نے اردو ادب کو کئی عمدہ افسانے دئے ہیں۔ ''روح دیکھی ہے کبھی؟'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس میں سترہ افسانے شامل ہیں: ہلدی والی، وقت سے پرے، ببول، اگر، دی ونش فے، سچا، ایوارڈ، حسرت، تلاش، وفادار، وہ لمس، دلداری، ایک ادھوری کہانی، زنجیریں، خزاں موسم کے گلاب، کاسہ باز، آخری پیغام۔ لیکن ''روح دیکھی ہے کبھی؟'' کے عنوان کا کوئی افسانہ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ مصنفہ کا تحریر کردہ حرف آغاز ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:

''روح دیکھی ہے کبھی؟ یہ سوال میرے اندر ہمیشہ ایک ہلچل سی مچا دیتا ہے۔ روح کو دیکھنے اور محسوس کرنے کی خواہش مچل جاتی ہے۔ سوچتی ہوں سوال پوچھنے والے نے یہ سوال جانے کس خیال سے کیا تھا۔ شاید کسی سے پوچھا ہے کہ اس نے روح دیکھی ہو، اسے محسوس کیا ہو تو اسے بھی بتا دے یا شاید اس نے اپنی تلاش کو پا لیا اور اب پوچھ رہا ہے، روح دیکھی ہے کبھی؟..... میں انہیں اپنے لفظوں میں ڈھونڈ رہی ہوں۔ ان لفظوں کو کہانیوں کا پیرہن دے کر..... میرے اندر کچھ کہانیاں ہیں اور کچھ کہانیوں کے اندر میں ہوں۔ یہ کہانیاں میرے اندر سانس لیتی ہیں..... مجھے زندہ رکھتی ہیں..... مجھے خوشی دیتی ہیں..... اداس کرتی ہیں..... مجھے تڑپاتی ہیں..... اور سکون دیتی ہیں..... یہ میری روح ہیں۔ میں ان کو لکھ کر دیکھتی ہوں اور چھو کر محسوس کرتی ہوں۔''

اس کے علاوہ گلزار ملک اور قاضی اعجاز محور کے مضامین اور ھما فلک کے مختلف افسانوں پر ارشد عبد الحمید، ڈاکٹر ریاض توحیدی، ڈاکٹر اقبال حسن آزاد، میر وسیم عشرت معین سیما، وحید قمر اور سید تحسین گیلانی کے تبصرے بھی شامل ہیں۔

ھما فلک کا بیانیہ سادہ مگر دلچسپ ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کا تانا بانا اپنی اردگرد کی زندگی سے بُنا ہے۔ ان کے کردار جیتے جاگتے اور متحرک ہیں۔ مکالمے فطری ہیں۔ چند افسانے خاص طور پر لائق توجہ ہیں مثلاً ''ہلدی والی''، ''وقت سے پرے''، ''اگر''، ''سچا'' اور ''خزاں موسم کے گلاب''

ھما فلک کے یہاں امکانات کی ایک وسیع دنیا ہے۔ ان کا ادبی سفر جاری و ساری ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں وہ مزید تہہ دار اور معنی خیز افسانوں کی تخلیق کریں گی۔

نیک خواہشات کے ساتھ!

◂◂ ● ▸▸

نام کتاب: رعنائیاں درد کی
صنف: شاعری
مصنفہ: عثمانہ اختر جمال
قیمت: 300/روپے
صفحات: 294
اشاعت: 2019
ناشر: عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر ایم۔اے۔او۔جوہر

عثمانہ اختر جمال کا شعری مجموعہ ''رعنائیاں درد کی'' دیکھنے اور پڑھنے کا موقع ملا۔محرمہ نے کئی زبانیں سیکھی ہیں جیسے اردو، ہندی، انگریزی، سنسکرت، فارسی، عربی وغیرہ۔اتنی ساری زبانیں سیکھنا اپنے آپ میں بہت بڑی بات ہے۔ساتھ ہی اپنے ملک سے دور رہ کر اور بہت ساری ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اردو ادب کی خدمت کرنا آسان کام نہیں ہے۔اس مجموعے میں غزلوں کے علاوہ نظمیں، گیت، سہرے، رخصتی، قطعات اور رباعیوں کے علاوہ کچھ مزاحیہ کلام بھی شامل ہے۔

عثمانہ اختر جمال اپنے پُرخلوص انداز اور شاعرانہ طرز اظہار کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔ان کے پاس مطالعہ کی توانائی بھی ہے اور مشاہدے کی تازگی بھی۔ساتھ ہی ساتھ ان کے اشعار میں وہ درد ہے جو دل سے نکل کر آنکھوں تک آجاتا ہے۔یہ اشعار دیکھئے۔

یہ دل کی تڑپ ہے جو ملتی ہے سنانے کو — یہ کیسا درد ہے جو رلا دیتا ہے بیگانے کو
اس کو رلا دیا ہم نے اپنی داستاں سنا کر — دل کو سکوں ہوا ہے اپنا اسے بنا کر
مجبور محبت میں جینا ہے بہت مشکل — دل کہتا ہے اب تو اشکوں کی تمنا کر

عثمانہ اختر جمال کی غزلوں میں تنہائی کا احساس، قدروں کی شکست وریخت، رشتوں کی پامالی اور زندگی کی بے معنویت ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔یہ اشعار دیکھئے۔

مانا کہ مجھے تجھ سے پیار بہت ہے — در پر ترے آنا دشوار بہت ہے
زندگی پر اب میرا اختیار نہیں ہے — شہنائی کے سوا کوئی غم گسار نہیں ہے
یاد میں تیری اب گزرے گی زندگی تمام — پانی کا ایک بلبلہ ہے کوئی آبشار نہیں ہے

عثمانہ اختر جمال کو زندگی کی رنگا رنگ کیفیتوں، تجربوں اور غموں کی برسات کی تصویر کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کا ہنر خوب آتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

تم دور چلے جاؤ گے یاد تو ہم آئیں گے — پھر بھی تم سے دور کبھی نہ ہم جائیں گے
جانے کا تم نام نہ لینا دل کی دنیا آباد رہے — دل اجڑا تو اس کے ساتھ ہم بھی اجڑ جائیں گے

عثمانہ اختر جمال نے اپنے چاروں طرف مایوسیوں، محرومیوں، کربناکیوں اور تلخیوں پر نظر ڈالی ہے۔انہوں نے افسردگی، بے زاری، بے بسی، بے چارگی، کسک، چبھن اور درد تنہائی کو نزدیک سے دیکھا ہے اور انہیں اپنے اشعار میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

کیا لے کر آئی ہے یہ شام غمگیں — بچھڑے ہوئے کچھ لوگوں کی جدائی کا درد
رکھیں گے ہم سنبھال کر اپنے آنسوؤں کو — بہ گئے تو بن جائیں گے میری بے وفائی کا درد

اچھی شاعری کے لیے موسیقیٔ الفاظ ساتھ نغمگیٔ خیال کا ہونا بہت ضروری ہے۔یہ بات تو ہر اچھی شاعری کے لیے کہی جاسکتی ہے لیکن غزل کے لیے یہ روح رواں کا درجہ رکھتی ہے۔پروفیسر مہدی علی کا یہ اشعار دیکھئے۔

پی جایئے آنسو کو آنکھوں کو نہ نم رکھئے — میرا نہ سہی لیکن اپنا تو بھرم رکھئے
بہتر ہے کہ آئینہ شفاف رہے دل کا — اور بات اگر دل میں رکھئے بھی تو کم رکھئے

عثمانہ اختر جمال کی پوری شاعری پروفیسر مہدی علی کے درج بالا اشعار کی غمّاز نہ سہی لیکن اس سے قریب تر ضرور ہے۔زندگی کے غم کو چھپالینا بہت بڑی بات ہے۔مگر ایسا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔عثمانہ اختر جمال کو جو غم ملے اسے انہوں نے چھپایا نہیں بلکہ اپنے ساتھ اپنے قارئین کو بھی اپنے غم میں شریک کیا ہے۔

◂◂ ● ▸▸

مکتوبات

● امید کرتی ہوں آپ خیریت سے ہوں گے۔ بڑی نوازش آپ کی کہ آپ نے رسالے کا تازہ شمارہ پڑھنے کو فراہم کیا۔ ثالث کا تازہ شمارہ بھی پچھلے شمارے کی طرح بے حد دلچسپ رہا۔ اسے پورا پڑھنے میں حالانکہ مجھے وقت ضرور لگ گیا مگر میں نے ایک ایک تحریر کا لطف اُٹھایا۔ اس میں شامل سبھی افسانے اور مضامین کا انتخاب بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے۔ ایک دو افسانوں کو چھوڑ کر سبھی افسانے معیاری ہیں۔ اس بار کی شخصیت حسین الحق صاحب کے بارے میں آپ نے بھرپور معلومات فراہم کیا۔ آپ اسی طرح کسی نہ کسی نامی گرامی ادبی شخصیت سے ہمارا بھرپور تعارف کراتے رہیں۔ آئندہ شمارے کے لیے آپ کو افسانہ ''دو نیناں'' بھیج رہی ہوں۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ دعا ہے کہ اس کڑے دور میں پرماتما آپ کو اور آپ کے پریوار کو اس وبا سے محفوظ رکھے۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ، انڈیا)

● ''ثالث'' جنوری تا دسمبر ۲۰۱۹ء کا گوشۂ حسین الحق پسند آیا۔ کیونکہ اس گوشے میں پروفیسر حسین الحق کی زندگی، پیشہ اور ادبی خدمات پر جاندار مضامین پڑھنے کو ملے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا مضمون اس وجہ سے بھی اہم ہے کہ انہوں نے عالمانہ انداز سے حسین الحق کے فن، فکر اور افسانہ نگاری پر روشنی ڈالی ہے۔ دیگر مضامین مثلاً حسین الحق کے دو مجموعے (پروفیسر محمد حسن)، نئے انداز فکر کا افسانہ نگار (ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی)، حسین الحق کی افسانہ نگار (مشتاق احمد نوری)، زخمی زخمہ (اظہار خضر) اماوس میں خواب (ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی) حسین الحق کے افسانے کی پزیرائی (عشرت ظہیر) وغیرہ بھی موصوف کی شخصیت اور افسانہ نگاری کو اچھے ڈھنگ سے موضوع گفتگو بنا رہے ہیں۔ تنقیدی تجزیہ کی بات کریں تو فنی، تکنیکی اور تنقیدی طور پر اظہار خضر کا مضمون ''زخمی زخمہ'' خاصے کی چیز ہے۔ دراصل کسی بھی معیاری فن پارے کا تجزیہ اسی طرح سے موزوں رہتا ہے نہ کہ کسی افسانے کی کہانی کو دہرانا۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ معیاری تحریرات کا حامل ہے۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی (کشمیر، انڈیا)

● تقریباً ایک ماہ دہلی میں قیام کے بعد آج ہی گیا واپس آیا ہوں۔ ڈاک پر نظر ڈالی بہت سارے خطوط اور رسالوں کو دیکھتے ہوئے ثالث شمارہ ۱۴ پر نگاہ جم سی گ ء۔ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ہی رسالے کے بیک کور پر معروف وممتاز اور خوبصورت افسانہ نگار حسین الحق کی خوبصورت تصویر۔ اور مشمولات فہرست سے ہویدا فکر انگیز تخلیقات کی آباد کائنات۔

زیر نظر شمارہ میں گوشہ حسین الحق کی پیش کش کی افادیت اور خوش سلیقگی کے سبب ایک عجیب اور سحر انگیز کشش محسوس ہوتی ہے۔

اقبال حسن آزاد نے اداریہ کے تحت حسین الحق کی شخصیت اور فن کے بیان میں کچھ ایسی خوش اسلوبی کو بروئے کار لایا ہے کہ ان کی شخصیت کا دلکش خاکہ مرتب ہو گیا ہے۔ جس میں حسین الحق کے انداز گفتگو اور لب ولہجہ کے بہترین پہلو بھی اجاگر ہوئے ہیں اور ادب وشعر کے تعلق سے ان کا انداز فکر اور ان کی حیثیت بھی متعین ہوگ ء ہے۔

الفاظ میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ کسی کی محبت اور کرمفرماء کا بار اٹھا سکے۔ اقبال حسن آزاد نے میری مختصر تحریر کو اس شمارہ میں شامل کر کے مجھے سرخروء عطا کردی۔ اور اس طرح گویا میں خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گیا۔

بہرحال اس شمارہ کی تدوین وترتیب کے لئے اقبال حسن آزاد کو مبارکباد اور حسین الحق کو بھی مبارکباد کہ ان کی تخلیقات کی آفاقیت کے سبب اس شمارہ کی دلکشی ہے۔ عشرت ظہیر (گیا، انڈیا)

● حال ہی میں ڈاک سیر سالہ ''ثالث''، ''حسین الحق'' نمبر موصول ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ حالات نے اس قدر رنڈھال کر رکھا ہے کہ کچھ بھی سوچنے، پڑھنے کے لئے ذہن راضی نہیں ہوتا۔ روز نئی خبر، روز نیا ظلم، ہر طرف چیخ پکار، خاص کر یوپی کے حالات، نفرت بھرے ویڈیوز وغیرہ پریشان و حیران کئے ہوئے ہیں۔ طاقت ور ظالم حکمران ملک کی معیشت کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بھکت عوام کی آنکھوں پر ایسی ہری پٹی بندھی ہے کہ انھیں ہر طرف ہرا ہی ہرا سجھائی دیتا ہے۔ بھوکے رہ لیں گے، بے روزگاری سے، مہنگائی سے، بڑھتے ٹیکس سے اور بھارت کی گرتی ساکھ سے الغرض کسی بھی گڈھے سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی اگر حق بات کہتا ہے تو وہ پاکستانی قرار دیا جاتا ہے۔ ملک میں تعلیم پر حملہ کیا جا رہا ہے جو ہر یونیورسٹی رام پور لائبریری، دار العلوم دیوبند لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لائبریری پر جس طرح پولیس نے کارروائی کی ہے افسوس ناک ہے۔ جامعہ اور جے این یو کے ساتھ بنارس ہندو یونیورسٹی تک میں دنگائی گھس گئے اور لاٹھیاں چلائی گئیں۔ طالب علموں پر ظلم کرنے والے کھلے عام نعرے

لگاتے گھوم رہے ہیں۔ مخالفت میں بولنے والوں کو سزائیں دی جا رہی ہیں۔ بنا کسی جرم اور وارنٹ کے گرفتاری ہو جاتی ہے اور پولیس کتنی بے دردی سے ڈنڈے اور گولیوں کا استعمال کر رہی ہے۔ ایسے پر آشوب دور میں کیسے ادب کا مطالعہ کیا جائے اور کیسے ادب پر بات کی جائے۔ چھ یا سات سال کے بعد بھی ہمارے پاس کوئی پلان نہیں ہے کوئی طریقہ نہیں ہے اس ظلم سے اور جن روح فرسا مظالم کا اندیشہ ہے ان سے خود کو اور قوم کو محفوظ رکھنیکے لئے۔ اس وقت ملک میں اقلیت کے پاس اپنی تاریخ کو یاد کرنے کے علاوہ کوئی چہرہ نہیں ہے۔ ایک آخری چہرہ مسائل مین ابوالکلام کا بھی اب دنیا سے اٹھ گیا۔ پھر کون ہے آج ہمارے پاس اپنی قوم کا قائد؟ اب پوری قوم صرف ماضی کے سنہری دور کو یاد کر رہی ہے۔ آج کسی کو پروا نہیں کہ تمھاری وراثت کیا ہے، کیا کیا تم نے بنوایا تھا، آج تمہارے بزرگوں کا ہی نہیں بلکہ تمھارا خود کا کمایا اور اکٹھا کیا ہوا تم سے چھین لینے کی مکمل تیاری کر لی گئی ہے۔ کون سا سنہری دور؟ جو دو سو سال پہلے تھا، جس کا زوال بھی عیش پرستی کی بنا پر ہوا تھا؟ اسی دور کا بدلا تم سے لیا جا رہا ہے۔ سچ کیا ہے اس سے کسی ہو کوئی سروکار نہیں۔ اب سب سے اہم ہے کہ اپنا اس ملک میں پیدا ہونا ثابت کرو۔ جتنا سوچوا تنا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ افففف میں بھی کہاں نکل گئی۔ رسالے پر بات کرنے بیٹھی تھی اور زمانے کی بپتا سنانے لگی۔

خیر بہت دن کے بعد یہ ادبی رسالہ ''ثالث'' تپتی دھوپ میں پھوار پڑھنے جیسا کام کر گیا۔ دل کو سکون ملا کچھ ذہن کو آرام ملا افسانوں کی دنیا میں توانائی کا احساس ہوا۔ اس نمبر کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں گوشہ حسین الحق، یعنی ادب کی ایک اہم شخصیت کی زندگی سے واقفیت کا موقعہ ملا۔ حسین الحق کی تخالیق طویل عرصے سے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ اس نمبر میں ان کی زندگی کے بہت سے نئے رموز سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ابتدا میں ہی ایک خاکہ "اب فقط رہ گئی افسانہ طرازی اے دوست" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ " تمھیں ہر جگہ، ہر موقع پر اپنے آپ کو منوانے اور اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کا جنون سا تھا۔" بھیڑ چال سے بچنا اور حدود کو پھلانگ جانا جیسی جرات حسین الحق کی بلندی کا راز ہے۔ ناول اور افسانہ لکھنا تو عام بات ہے اور ہو بھی یہی رہا ہے روز نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں، نئے مصنف جنم لے رہے ہیں لیکن اعتبار کس کو حاصل ہو رہا ہے یا اب تک کن لوگوں کو مقام ملا یہ اگر دیکھا جائے تو کوئی شک نہیں کہ اس کے لئے راہ سے ہٹ کر چلنا نہایت ضروری ہے۔

حسین الحق کے فن پر مختلف پہلوؤں پر اس نمبر میں تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔ اس میں شامل مضامین

کے ذریعہ افسانے اور ناول پر بات کی گئی ہے۔ اداریہ اقبال حسن اور حسین الحق کی ابتدائی ملاقاتوں کا بیان ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے خود میرے محسوسات ہوں۔ میں بھی جب کسی کتابوں میں پڑھے ہوئے مصنف سے پہلی دوسری مرتبہ ملتی ہوں تو ڈر خوف، گھبراہٹ، مزاج سے ناواقفیت کی بنا پر یہی حال میرا ہوتا ہے۔

آخر میں کہنا چاہوں گی کہ مجھے واقعی اس رسالے کے مطالعے کے بعد اپنی روح میں سادگی کا احساس ہوا ہے۔ شکریہ ''ثالث!''

عزہ معین (ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی، انڈیا)

ثالث کا شمارہ نمبر۱۴ دستیاب ہوا۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ثالث کے اس شمارے میں اردو کے لیجنڈ افسانہ نگار حسین الحق پر ایک گوشہ شامل ہے۔ اس گوشے میں عبدالصمد کا خاکہ دلچسپ اور بے لاگ ہے اور حسین الحق کی شخصیت اور فن کو تصویر کرنے میں کامیاب ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی کا مضمون تفصیلی ہے اور حسین الحق کے کئی افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتا ہے خصوصاً ''سوئی کی نوک پر رکا ہوا لمحہ'' پر ان کا آبزرویشن اور بیکٹ کے ایک افسانے سے اس کا تقابلی مطالعہ بہت اہم اور قابل مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی کے مطابق حسین الحق نے زندگی کے عصری حقائق کی تلخیوں کو شدت سے محسوس کیا ہے اور اپنے تمام ردِ عمل کو ایک مخصوص تہذیبی پسِ منظر میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر افصح ظفر نے ''ناگہانی'' کا مطالعہ کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ناگہانی ایک بہت خوبصورت اور لطیف بیانیے کی حامل کہانی ہے جس میں نظام کے تہ و بالا ہونے اور نظام کے اندر سانس لینے والوں کے آہستہ آہستہ اور اندر اندر ٹوٹتے اور مرتے رہنے کا ایک افسوسناک سلسلہ جاری ہے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے ''نیو کی اینٹ'' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصنف نے کہانی وضع کرنے کے لیے کسی میکانکی ترکیب کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی وہ کسی قسم کا آئیڈیلزم یا رسمی تلقین کا وظیفہ لے کر نکلے ہیں۔ فاروق ارگلی کے نزدیک حسین الحق صرف کہانی کار کہنا ان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ درحقیقت وہ ایک مفکر و فلسفی، تاریخ داں، متصوف، ماہر نفسیات، معلم اور عالمی ادبیات کے عارف بھی ہیں۔ ڈاکٹر منظر اعجاز کے مطابق حسین الحق کے تقریباً تمام افسانے معاشرتی زندگی اور سماجی حقائق کے عکاس ہیں۔ مشتاق احمد نوری نے اپنے مضمون ''حسین الحق کی افسانہ نگاری......ایک جائزہ'' میں لکھا ہے کہ حسین الحق کی کہانیوں میں فلیش بیک کی بہت عمدہ مثال دیکھنے کو ملتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کا استعمال ترپ کے پتّے کی طرح بھی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے حسین الحق کے ناول ''اماوس میں خواب'' کا نہایت تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب

ہیں کہ اس ناول میں جہاں موجودہ زمانے کی حسیت یعنی روح عصر ہے وہیں بھرپور جذباتیت اور مادیت وروحانیت کے درمیان پھنسے ہوئے فرد کی چھٹپٹاہٹ بھی ہے۔

''ثالث'' کے اس شمارے میں حسین الحق کی شخصیت اور فن کے حوالے سے جتنے بھی مضامین شامل ہیں ان کے مطالعے سے حسین الحق کی مجموعی تخلیقی صلاحیتوں سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔حسین الحق پر'' ثالث'' کا اتنا گرانقدر اور ضخیم گوشہ شایع کرنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اس شمارے میں فرحین جمال اور ڈاکٹر صادقہ نواب سحر سے لے کر بلال مختار، نیاز اختر اور نشاط پروین تک نوعصری افسانہ نگاروں کے افسانے بھی شامل ہیں جس سے ثالث کے ادبی کمٹ منٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔فرحین جمال کا افسانہ'' پلاسٹک کے بوئے'' کا آغاز گرچہ موت اور زندگی کی فلسفیانہ تعریف سے ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ افسانہ آخر تک اسی نہج پر چلے گا مگر پاسکل کے کردار اور لاشوں کے ساتھ اس کے پیشہ ورانہ رشتے اور انہیں سجانے سنوارنے اور پیکنگ کی مہارت نے افسانے کو دلچسپ اور لائق مطالعہ بنا دیا ہے۔ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے افسانے ''ایک مزدور کی موت'' کا بیانیہ اور مرکزی خیال دونوں زندگی سے بہت قریب ہیں اور یہ افسانہ ایک ایسے مسئلے کو بیان کرتا ہے جو ہمارے سسٹم کی ناقص کارگردگی، کرپشن اور اس کے نشیب و فراز سے عبارت ہے۔محمد جمیل اختر کا افسانہ ''بوڑھے آدمی کا خواب'' ایک نفسیاتی افسانہ ہے جس میں ایک ریٹائرڈ بزرگ صادق حسین کی نفسیات کو بیان کیا گیا ہے جو اپنے بیٹوں کے کناڈا شفٹ ہونے اور اپنی بیوی کی موت کے بعد پارک میں ایک ادھیڑ عمر کی اداس خاتون سے ایک بنچ پر ملتے ہیں اور پھر کئی روز تک مسلسل ملاقات کے بعد بھی اس خاتون سے اس کی اداسی کا سبب دریافت نہیں کر پاتے مگر ہر روز خاتون ان کے خواب میں پریشانی کے عالم میں دکھائی دیتیں۔اس اجنبی خاتون کی کئی دنوں تک پارک سے غیر حاضری کے بعد وہ پریشان ہو جاتے ہیں اور ہر کسی سے اس کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔افسانے میں دلچسپ موڑ اس وقت آتا ہے جب پارک کے بچے بھی ان سے پوچھنے لگتے ہیں کہ ''انکل! کیا آپ ان خاتون کو تلاش کر رہے ہیں جنہوں نے سیاہ دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے۔عمر پینتیس سال ہے اور ان کی آنکھیں بالکل آپ کے جیسی ہیں۔'' ایک ایسی خاتون میں جس کا وجود بھی شاید نہیں ہے اتنی گہری دلچسپی افسانے کے مرکزی کردار صادق حسین کی تنہائی اور نفسیاتی کشمکش کو بیان کرتا ہے۔''ثالث'' میں شامل سارے افسانے اچھے ہیں۔اتنے خوبصورت انتخاب کے لیے مبارکباد۔

شعری حصہ مختصر ہے۔کوئی نظم اس شمارے کی زینت نہیں بنسکی۔میری خواہش اور گزارش ہے کہ

شعری حصے کی ضخامت میں اضافہ کیا جائے۔

مجموعی طور پر'' ثالث'' کے مشمولات عصری ادب کی نمائندگی کرتے ہیں اور موجودہ ادبی ماحول میں اس رسالے کی اہمیت اور افادیت کا جواز پیش کرتے ہیں۔ سلیم انصاری (جبل پور انڈیا)

- ثالث کا تازہ شمارہ نمبر 14 اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ نظر نواز ہوا۔معروف فکشن نگار حسین الحق کے فن اور شخصیت پر مشاہیر کے وقیع اور قابل قدر مضامین اس شمارے کی جان ہیں۔حسین الحق صاحب کے قیمتی گوشے کے علاوہ بھی اقبال حسن آزاد صاحب نے اس شمارے میں خوبصورت شعری ونثری تخلیقات کو شامل کر کے شمارے کی صوری ومعنوی جہات کو مزید دلچسپی عطا کی ہے۔ہندوستان اور بیرون ممالک کے تمام تخلیق کاروں کو اس شمارے میں شمولیت کے لئے قلبی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔مدیر محترم اقبال حسن آزاد صاحب اس خوبصورت کتابی سلسلے کی مستقل اور باقاعدہ اشاعت کے لئے بجا طور پر ستائش کے حقدار ہیں۔

وسیم احمد فدا (ہاپوڑ، انڈیا)

- اقبال حسن آزاد کی ادارت میں شایع ہونے والا کتابی سلسلہ'' ثالث'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔۲۲۴ صفحات کے اس شمارے میں حمد، نعت، غزلیں، حسین الحق پر گوشہ۔مضامین، افسانے، تبصرے وغیرہ شایع کیے گئے ہیں۔پورا پڑھنے میں تو وقت لگے گا۔اس میں چھپی ایک غزل جو مجھے اچھی لگی وہ یہاں آپ کے ساتھ سانجھا کر رہا ہوں۔شاعر ہیں افتخار حیدر (لاہور، پاکستان)۔

ڈھلکتی شب کے ستاروں کا دکھ نہیں سمجھا — کسی نے ہجر کے ماروں کا دکھ نہیں سمجھا
میں آپ غرق مناظر کی خوشنمائی میں — سلگتے جلتے چناروں کا دکھ نہیں سمجھا
لگائے فتووں کے انبار پینے والوں پر — کسی نے بادہ گساروں کا دکھ نہیں سمجھا
الاؤ تاپتے بیٹھے ہوؤں کی جھرمٹ میں — بھڑک کے بجھتے شراروں کا دکھ نہیں سمجھا
ہر ایک منزل مقصود پر نگاہ رکھی — جھلستے راہ گزاروں کا دکھ نہیں سمجھا
زمانہ جھولیاں بھرنے میں ہی رہا مصروف — مراد دیتے مزاروں کا دکھ نہیں سمجھا

سریش کمار (علی گڈھ، انڈیا)

◂◂ ● ▸▸